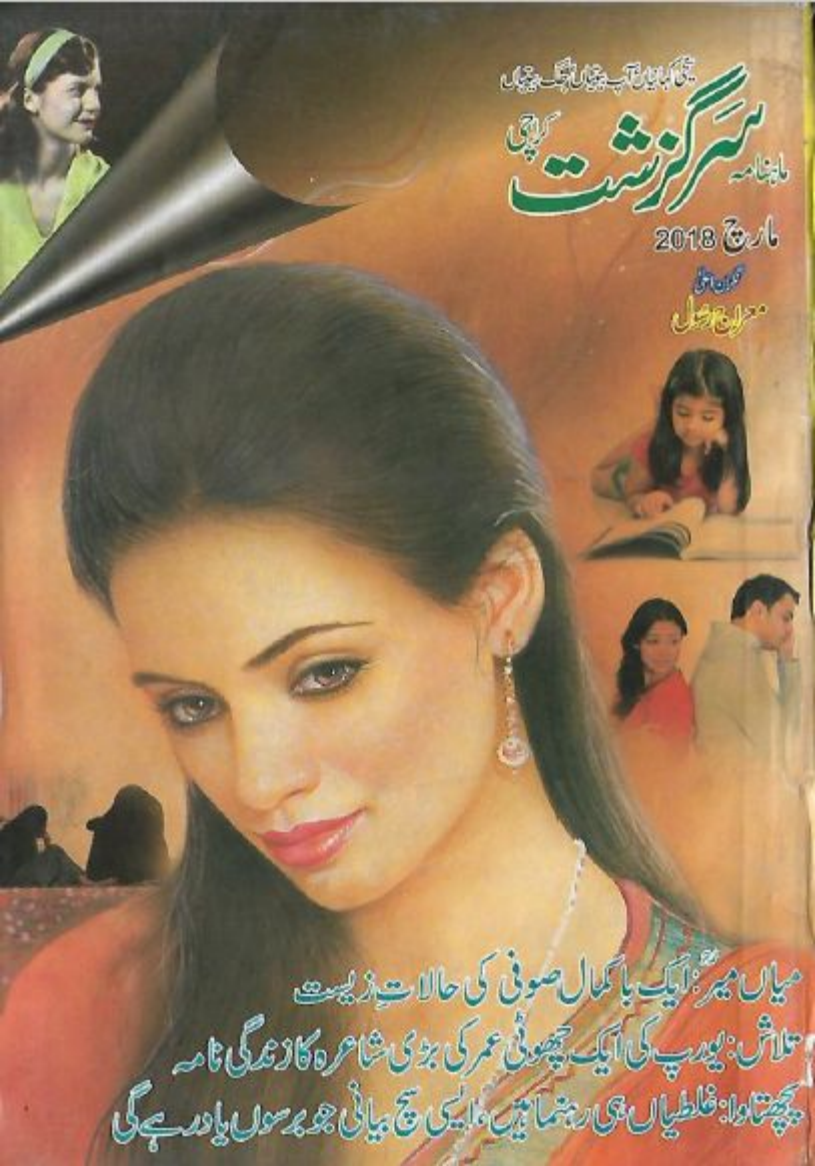

سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
مارچ 2018
معراج رسول
میاں میرؒ: ایک باکمال صوفی کی حالاتِ زیست
تلاش: یورپ کی ایک چھوٹی عمر کی بڑی شاعرہ کا زندگی نامہ
پچھتاوا: غلطیاں ہی رہنما ہیں، ایسی سچ بیانی جو برسوں یاد رہے گی

سرگزشت
ناصح — ادارہ — 07
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادرِ روزگار کا تعارف

گفت و شنید
شہرِ خیال — مدیر اعلیٰ — 08
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
حضرت میاں میرؒ — ڈاکٹر ساجد امجد — 16
ایک صوفی باکمال کا زندگی نامہ

روداد عجب
تلاش — زویا اعجاز — 35
وہ معروف شاعرہ تھی لیکن بے وفائی نے اسے خودکشی پر مجبور کر دیا

تذکرہ
مرگِ تنہا — اے آر راجپوت — 59
وہ ماڈلنگ کی دنیا کا ستارہ تھی لیکن دکھوں سے ہار گئی

تاریخی واقعہ
مزارِ بیکسی — زین مہدی — 65
شاعرِ اعظم شہنشاہِ ہند اور غداروں کا تذکرہ

جنگ عظیم
فرار — سید احتشام — 83
میدانِ جنگ میں ایک کرنل گرفتار ہوا تھا

فلم نگری
بلبلِ بنگال — انور فرہاد — 95
پاکستان کی ایک معروف گلوکارہ کا زندگی نامہ

حیرت انگیز
آتشی موت — علقب اشعر — 111
پُراسراریت بھری عجیب اموات کا ذکر

سفر کہانی
شمشال سے ٹورنٹو — ندیم اقبال — 117
جیالوجیالی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

دلچسپ و عجیب
سخت جان — فرزانہ نکہت — 135
اس ملک کے باشندوں کا تذکرہ جو سخت جان ہیں

معاشرت
ناسور — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی — 138
ایک معصوم نوجوان کی خوں رنگ لہو گرما دینے والی داستان

پہلی سچ بیانی
پچھتاوا — فضہ خان — 174
اس کی زندگی بھی عجیب تھی وہ جو چاہتی تھی پا نہ سکی

دوسری سچ بیانی
شکست — شائستہ — 191
ایک دل کی دنیا زیر و زبر کر دینے والی سچ بیانی

تیسری سچ بیانی
اس پار — اصغر علی — 205
کشمیر کی سرحد پر رونما ظلم کی داستان

چوتھی سچ بیانی
خالہ خالدہ — فہمی فردوس — 212
ایک ہی گھر میں اس کے دو شوہر رہ رہے تھے

پانچویں سچ بیانی
نوحہ — نوشاد عادل — 215
معاشرے میں پھیلے شکاریوں کی شقی القلبی

چھٹی سچ بیانی
گناہِ بے لذت — عذرا احمد — 224
اس نے ایک ناکردہ گناہ کی سزا پائی

ساتویں سچ بیانی
اقتدار — بلال شیخ — 235
سیاست کی بساط پر سجے مفاد کے مہروں کا آئینہ

آٹھویں سچ بیانی
شجرِ عشق — سید سخاوت — 243
عشق کی سہ رنگی، کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے

نویں سچ بیانی
قاتل لکیر — یاسین صدیقی — 269
انسانی کمزوریوں کی ایک عجب داستان

سوغات
پارچے — قارئین / ادارہ — 0
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 02 ❖ مارچ 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ ظہیر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

CPNE
MEMBER APNS

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

معاشرے کے بدلتے رویے پر مبنی ایک کہانی یاد آ رہی ہے، جو یوں ہے ''کار تیزی سے دوڑ رہی تھی، عنایت دھڑا دھڑ سیلفی لے رہا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سلیم نے کہا ''ایک میری بھی لے لے۔''

عنایت نے ہاتھ مزید باہر نکال کر سیلفی لی تھی کہ کار کو جھٹکا لگا۔ سلیم نے فوراً کار سنبھالی اور یہ جا وہ جا۔ سڑک پر گرا راہ گیر تڑپ رہا تھا۔ لوگ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ ایک مجمع سا لگ گیا تھا۔ مختلف اینگل سے سیلفی لے رہے تھے۔ زخمی کی کراہ رہ رہ کر گونج رہی تھی کہ کوئی مجھے اسپتال پہنچا دے۔ یہ آواز آصف نے بھی سنی تھی۔ اس کا دل رو اٹھا تھا اس لیے جلدی جلدی اس نے فیس بک پر اسٹیٹس اپ ڈیٹ کیا۔ ''اف اللہ! ابھی ابھی میں نے ایک خوفناک حادثہ دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ زخمی کو بچا لے۔''

کہنے کو یہ ایک کہانی ہے لیکن ذرا سوچیں، ہم اخوت و بھائی چارے کو مفاد کے آتشکدہ میں راکھ کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ زخمی کو اسپتال لے جانے یا اس کی مدد کرنے کے بجائے سیلفیاں لینے، فلم بنانے اور اپ ڈیٹ پوسٹ کرنے میں جتے رہتے ہیں۔ اسلام نے جو تعلیم دی ہے کیا ہم اُسے رد نہیں کر رہے ہیں؟

معراج رسول

ناصح

مالوے اور گجرات کی سرحد پر ایک قصبہ ہے، نام اس کا ''دوحد'' ہے۔ یہیں وہ 22 اکتوبر 1618ء میں پیدا ہوا۔ کچھ ہوش سنبھالا تو اسے رزم گاہ کے آداب سکھائے جانے لگے۔ تلوار بازی، نیزہ بازی میں وہ طاق بنتا گیا۔ تعلق اس کا خاندان تیمور سے تھا اسی لیے اس کی دلچسپی تلوار و سنان سے بہت زیادہ تھی۔ خاندان کے دیگر افراد کی طرح اسے بھی ہاتھیوں کی جنگ دیکھنا بہت پسند تھا۔ جب وہ چودہ سال کا ہوا تو وہ ہاتھیوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے میدان میں پہنچا... اس کے خاندان کے تمام افراد میدان کے کونے میں بنے محفوظ جگہ پر بیٹھے تھے لیکن وہ میدان میں کھڑا ہو گیا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں ہاتھی زور آزمائی کرنے لگے۔ وہ انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ ایک ہاتھی نے حریف کو اس زور کی ٹکر ماری کہ وہ گر گیا۔ فاتح ہاتھی اسے پیروں سے کچلنے کے لیے لپکا تھا کہ شکست خوردہ ہاتھی پھرتی سے کھڑا ہوا اور مقابلہ کرنے کی بجائے میدان سے فرار ہونے لگا۔ فاتح نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا پھر مڑا اور اس طرف بڑھنے لگا جہاں وہ نوجوان کھڑا لڑائی دیکھ رہا تھا۔ فاتح ہاتھی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے اپنے گھوڑے کو مستعد کرایا اور تلوار سونت لی۔ جیسے ہی ہاتھی اس کی طرف آیا اس نے تلوار چلا دی۔ ہاتھی زخمی ہو کر اور غضب ناک ہو گیا۔ اس نے طیش میں آ کر اسے گھوڑے سمیت ہوا میں اچھال دیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر گرا ہاتھی نے اسے پیروں سے روندنے کی کوشش کی۔ اس نے دوبارہ تلوار چلائی۔ مقابلہ دیکھنے آئے لوگ سراسیمہ ہو گئے۔ میدان میں بھگدڑ مچ گئی تھی کہ دو تین امرا ہتھیار اٹھائے مدد کو آ گئے۔ انہوں نے پے در پے وار کر کے اس ہاتھی کو میدان سے بھگا دیا۔ باپ بیٹے کو ہاتھی سے نبرد آزما دیکھ کر مضطرب ہو گیا تھا۔ اس نے غلاموں کو حکم دیا کہ میرے بیٹے کو فوراً لایا جائے۔ جب اسے باپ کے پاس لایا گیا تو باپ نے اسی وقت ایک لاکھ اشرفی اس پر سے صدقہ کر کے غربا میں تقسیم کر دی۔ باپ کی فہم و فراست سے وہ واقف تھا اس لیے وہ بہادری کے جوہر دکھا دکھا کر انہیں مرعوب کرتا رہا یہی وجہ تھی کہ باپ نے اسے اپنا جانشین سمجھا اور وہ باپ کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس کے مقابلے میں جتنے بھی بھائی آئے انہیں شکست ہوئی۔ حاکم بننے کے بعد اس نے حکومت قائم رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ بہادری کے ساتھ علم و فراست کو بھی اہمیت دیتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے بھی اسی کی طرح بہادری کو ترجیح دیں۔ اپنی اس خواہش کو وہ بیٹوں کے سامنے بٹھا کر بیان کرتا، بزرگوں کے حالات بیان کرتا کہ تمہارے دادا جان کا یومیہ اس طرح تھا'' وہ شکار کو بیکاروں کا مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ وہ چار گھڑی رات رہے خواب گاہ سے باہر آ کر وضو کرتے تھے اور درود و وظائف میں مشغول ہو جایا کرتے تھے پھر فاضل عالموں کی جماعت کے ساتھ فجر کی نماز پڑھتے تھے پھر جھروکا درشن میں تشریف لاتے اور درشن کرنے والوں کو اپنا دیدار کراتے تھے پھر چار گھڑی دن چڑھے دیوان عام میں آ جاتے تمام چھوٹے بڑے منصب دار حاضر رہتے۔ دیوان اعلیٰ اہل خدمت کی تجویز اور صوبوں کے کروڑیوں، امینوں، فوجداروں اور ناظموں کی جان نثاری اور حسن خدمت کے واقعات عرض کر کے ان کی امید کا دامن گوہر مراد سے بھر دیتے، پھر خاصہ کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کو ملاحظہ کرنے چلے جاتے پھر ایک پہر چڑھے دیوان خاص کو رونق بخشتے۔ بچو! تم بھی ایسا ہی کرو۔'' اس کی یہی فہم و فراست دیگر شہنشاہان مغلیہ سے اسے الگ کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی حکومت نہایت خوش اسلوبی سے ہند پر قائم رہی تھی۔ اس مغل شہنشاہ کو ہم اورنگ زیب عالمگیر کہتے ہیں۔

☆☆☆

شہر خیال

عبیرا علی

☆ سیف خان کا خلوص نامہ کوئٹہ سے۔ ''جنوری کے ''شہر خیال'' میں اپنا خط دیکھا تو شمارہ کچھ زیادہ ہی دلنشیں و رنگیں لگا۔ اعجاز حسین لدھیانہ کی ''کاوش'' اوّل قرار پائی تھی بھرپور تبصرے اور مسند صدارت کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آس پاس سید ذیشان حیدر کاظمی، خالد شیخ طاہری، منشی محمد عزیز یے، عبدالودود عامر، شاہد ذوالفقار، کوثر اسلام، شبینہ گل اور ایمانے زارا شاہ کے جانے پہچانے نام ہنستے مسکراتے نظر آئے تو یقین مانیے محفل کا مزہ دوبالا ہونے لگا تھا۔ یک نکی سرگزشت میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کا احوال موجود تھا۔ بیشک مزاح نگاری اور مزاح نگار ہر خطے کے ادبی حوالوں میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ پہلا مضمون ''معلم ثانی'' شمارے کا خاص مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب بڑی خوبصورتی سے ان حالات کو زیرِ تحریر لائے جب فلسفہ، منطق، ریاضی اور موسیقی جیسے علوم عباسی خلفاء کی توجہ اور کاوشوں سے علماء اور طلباء کے لیے عرب دنیا میں نئے مضامین بننے لگے۔ ابونصر فارابی ایسے ہی دور میں ابھرے اور اسلامی افکار پر اپنے فلسفے کی گہری چھاپ چھوڑ گئے۔ موسیقی، منطق، سیاست، تاریخ سمیت کئی ایک پہلو مضمون میں نہایت خوبصورتی سے پروئے گئے تھے۔ خاص کر شہر بغداد کی تعمیر و ترقی اور انتزال تک کا احوال نہایت مختصر مگر پُراثر انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ مضمون کے بعض حصے بہت لطیف رہے۔ خاص کر الصاحب بن عباد اور سیف الدولہ جیسے حکمرانوں کے سامنے ابونصر کی پیشی اور انہیں اپنے فن سے حد درجہ متاثر کرنے کا احوال بیحد متاثر کر گیا۔ مضمون کا اہم حصہ فارابی کے تحقیقی کام اور علمی مباحث کا وہ مختصر کا احوال تھا جو آخر کے پیراگراف میں دیا گیا تھا۔ ''وہ چاول یا دال کا دانہ اچھال کر اسے چوپ اسٹکس (Sticks Chop) سے ہوا میں پکڑ لیتا۔'' مرگِ ناگہاں نمبر اور اس سے پہلے بھی میری دلی خواہش تھی کہ مشہورِ زمانہ مارشل آرٹس کے آئیکون اداکار بروس لی کے بارے میں سرگزشت کے صفحات پہ کچھ پڑھنے کو مل جائے اور اس بار عبداللہ احمد احسن نے ''شعلہ صفت'' کی صورت یہ خواہش پوری کر ہی دی۔ پہلی مرتبہ اردو زبان میں اس نابغہ روزگار کے بارے میں اتنی تفصیل پڑھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ بروس لی کی اچانک اور پُراسرار موت سے متعلق متنازع حوالوں کا ذکر اگرچہ بہت کم کیا گیا تھا تاہم اس کے کیریئر اور نجی زندگی پہ سیر حاصل گفتگو کی گئی تھی۔ وارنر برادرز کے بینر تلے بننے والی اس کی پہلی سپر ہٹ فلم کی نمائش سے محض 6 روز قبل بروس لی کی اچانک موت اور نامکمل فلم گیم آف ڈیتھ کی ری شوٹنگ اور نمائش کے حوالے سے کافی نئی باتیں جاننے کو ملیں۔ سرگزشت کے قارئین کے لیے بہرحال یہ ایک یادگار آرٹیکل کی حیثیت رکھے گا۔ آخر میں دیئے گئے بروس لی کے حوالے سے کچھ حقائق اور اقوال نے گویا مضمون کو چار چاند لگا دیئے۔ زویا اعجاز اس بار ایک ''باغی'' برطانوی نواب لارڈ بائرن اور اس کی شاعری کا احوال نوکِ قلم پہ لائی تھیں۔ زویا اعجاز کی لفاظی سادہ سے موضوع کو بھی خاص بنا دیتی ہے۔ مضمون میں اگرچہ جارج بائرن کی شاعری کا حوالہ کم اور اس کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز کا ذکر زیادہ تھا۔ تاہم جارج کی تلون ورنگین مزاجی قریہ قریہ گھومنے کی عادت۔ متنازع عدا ئیات دیگر حوالوں کا ذکر بھی خوب رہا۔ ذہنی آسودگی کے لیے کچھ عرصہ بجرے میں قیام کے بارے میں پڑھا تو بے اختیار ناصر ملک کا ناول ''جنت'' یاد آگیا۔ اور جناب سرگزشت کا شمارہ ہو اور فلمی ستاروں کا ذکر نہ ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ انور فرہاد صاحب ''سپر رائٹر'' میں زخمی کانپوری صاحب کا تذکرہ لے آئے تھے۔ کانپوری صاحب نے فلمی صنعت سے وابستہ نغمہ نگاروں، گلوکاروں، اداکاروں، ہدایت کار اور موسیقاروں کے حوالے سے جو تخلیقات لکھیں ان سے پہلی مرتبہ شناسائی ہوئی۔ خود فرہاد صاحب بھی مشہور ایکٹر ''رنگیلا'' پہ کتاب لکھ چکے ہیں۔ جان کر خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ ہمارے فنکاروں کا کیا کام ضبطِ تحریر میں لایا جاچکا ہے۔ نئی پیڑھی اس سے بہر طور کبھی نہ کبھی ضرور استفادہ حاصل کرے گی۔ ہمارے ہاں قلم اور فنکار پہ لکھنے والوں کی کاوشیں اکثر عدم توجہی کا شکار ہی رہتی ہیں۔ پورا مضمون اسی موضوع کو شدت سے باور کراتا رہا۔ حالانکہ اس صنعت سے جڑے رپورٹرز اور تجزیہ نگاروں کا دیگر ممالک میں ایک نام اور ایک

مقام ہوتا ہے۔ ''عینک'' عجیب دلچسپ و معمے سے بھری تحریر ثابت ہوئی۔ ایک عینک جو تین مشہور شخصیتوں کی موت کا سامان بن گئی۔ مختصری تحریر نے پرانی بھولی بسری کہانیوں کا انداز یاد دلایا اور خوشگوار تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ سلمٰی اعوان صاحبہ بنگالی زبان کے نوبل انعام یافتہ شاعر، فلسفی اور افسانہ و ناول نگار رابندر ناتھ ٹیگور کا ذکر خیر لے آئی تھیں۔ مضمون کی سب سے اہم بات ٹکڑوں میں بنا۔ وقفے وقفے سے بیان کردہ انداز بیاں ہی رہا جس نے انتہائی دلچسپ انداز میں ٹیگور صاحب کی فنی و ذاتی زندگی پہ کئی طرح سے روشنی ڈالی۔ (سلمٰی اعوان کا شمار بڑی مصنفہ میں ہوتا ہے 30 سے زائد کتب بازار میں ہے۔ سفرنامہ نگاروں میں بڑا مقام ہے) شکیل صدیقی صاحب کا ''بائیسکل'' بھی ہلکا پھلکا دلچسپ اور معلوماتی مضمون ثابت ہوا۔ ایسی ہی تحریریں تو سرگزشت کو دیگر تمام ڈائجسٹ سے منفرد رنگ دے جاتی ہیں۔ سچ بیانیوں میں وردہ خان نے ''گناہ'' کی صورت ان ماؤں کی کوتاہی کی کتھا جو اوٹ پٹانگ طریقوں سے اپنا حمل ضائع کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس کی وجہ سے ابنارمل بچوں کی پیدائش کی شرح ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ صحت مند ازدواجی زندگی اور بچے کی پیدائش میں وقفوں کے حوالے سے کسی مستند ڈاکٹر سے مشورہ لینے کی بجائے اکثر و بیشتر لوگ اتائی حکماء کے نذر ہو جاتے ہیں اور نتائج کافی بھیانک نکلتے ہیں۔ کہانی ایک اہم موضوع کی طرف متوجہ کرانے میں کامیاب رہی۔ بہت اچھے!! برادر افتخار حسین اعوان کی ''ندامت'' آزاد خیال دانشوروں اور ان کے تازیانہ انجام کی غماز تحریر ثابت ہوئی۔ سجاد کو تو احساس ہو گیا تھا آخر میں کہ وہ اور سندس کن حدود کو پھلانگ چکے تھے اس لیے بھی شاید اپنے آنے والی زندگی کو بچا سکے۔ اکثر لوگ البتہ ان آفاقی اصولوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے اور پھر نتیجتاً خود بھی کرب و عذاب میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کا جینا بھی دوبھر کیے رکھتے ہیں۔ عمدہ و شمولیت افتخار برادر ''بری عورت'' سب سے بہترین سچ بیانی ثابت ہوئی۔ مریم کا پھوٹ پھوٹ کر رونا جہاں التفات کو آوارگی سمجھنے والوں کے منہ پر ایک تھپڑ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہیں یہ بات بھی شدید اہمیت رکھتی ہے کہ غیر کو اتنا موقع ہی کیوں دیا جائے کہ وہ بھڑک جائے۔''

☆ **ذوالفقار علی ملک مانسہرہ سے۔** ''اک عرصے بعد دوستوں نے یاد کیا تو حاضر ہوں۔ پہلے سرگزشت کا ذکر ہو جائے۔ ماہنامہ **سرگزشت** اس گھنے سایہ دار پیپل کی مانند ہے جہاں ہر ماہ گاؤں ''Global Village'' کی چوپال سجتی ہے اور جس کے سائے تلے خاص و عام بھی اہم کلام ہوتے ہیں۔ سرپنچ مدیر سرگزشت ہی ہوتے ہیں جو سب کو برابر توجہ دیتے ہیں خواہ وہ مرد کہستانی ہو یا بندہ صحرائی و میدانی، کوئی بھی ہو۔ یقیناً سرگزشت اک علمی اور عوامی پرچہ ہے جو ہر خاص و عام کا محبوب ہے وہ محبوب جس کا باقاعدہ انتظار کیا جاتا ہے جس کی ہر ہر ادا (تحریر) کو سراہا جاتا ہے، نہ صرف عوامی سطح پر بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسے بھرپور پذیرائی ملتی ہے اور یہ سب مدیر سرگزشت کی کوہ کنی اور جگر آزمائی کا مآل ہے کہ سرگزشت جوئے شیر کی مانند ہر پیاسے کو سیراب کرتا ہے۔ اس علمی، ادبی اور عوامی چوپال میں مجھ جیسا اناڑی بھی کچھ نہ کچھ کہہ کے داد پاتا اور جوش و جذبے سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس بار شہر خیال کے جن دوستوں نے مجھ ناچیز کو یاد کیا اللہ انہیں تا دیر سلامت اور خوش حال رکھے (آمین)۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! یاد آوری کا از حد شکریہ۔ میں تو اب بھی شہر خیال کا مستقل باشندہ ہوں۔ عرض کیا نا کہ کبھی کبھار ہی کوئی بات کر جاتا ہوں وگرنہ تو میرے مضامین مدیر سرگزشت کی کمال توجہ سے لگتے ہی رہتے ہیں۔ میں اک مزدور آدمی ہوں غم روزگار اور غم جاناں دونوں ہی کندھوں پہ سوار رہتے ہیں۔ ایک سے انکار تو دوسرے سے راہ فرار نہیں۔ اُمید ہے آپ سب اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں گے کہ یہی حاصل ہے۔ مہورہ کے زیابت الشال آپ کی مثبت تنقید نے دل میں ٹھنڈک سی ڈال دی۔ یقیناً مضمون کے بہاؤ میں جملہ غلط بندھ گیا۔ صفحہ وسطر کی بھی نشان دہی کی گئی۔ شکر گزار ہوں آپ کا بی۔ راحت وفا راجپوت! یاد ش بہ خیر۔ آپ غالباً میرا پہلا افسانہ ''مَیں بسیکہ'' پڑھ کے تبصرہ بھی کر چکی ہیں۔ شہر خیال میں جی آیاں نوں، کاغذ قلم کے لیے تو وقت نکالنا بلکہ گریبان پکڑ کے چھوٹنا پڑتا ہے۔ کراچی کی بہن سدرہ بانو ناگوری بھی گاہے ماہے یاد کر لیتی ہیں۔ پشاور کے انور اعجاز، بورے والا کے رانا محمد شاہد، بہاولپور کی بُشریٰ افضل اور وحید ریاست بھٹی سب کا شکر گزار اور دعا گو ہوں۔ ہاں البتہ میرے شہر مانسہرہ کے علی زمان مغل، وزیر خان (جبل) ذوالفقار احمد دانش اور دیگر ساتھی عرصہ سے مسلسل چپ ہیں شاید دُنیا کے بکھیڑوں نے جکڑ رکھا ہے انہیں۔ بہرحال کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ سرگزشت کی باتیں سب کے لیے وا ہیں اور ہمیشہ رہیں کی صرف خلوص اور معیار شرط ہے۔ لاریب کہ سرگزشت ایک پھل فروش ہے۔ لے کر علم بہ دوشِ عالم تک سب کا منظورِ نظر ہے اسی کا نام توازن بلکہ حسنِ توازن ہے۔ مدیر سرگزشت کی کاوشیں لائق تحسین اور دُعا کی مستحق ہیں کہ سرگزشت مقدار کا نہیں معیار کا نام ہے اور انشاءاللہ رہے گا۔''

☆ رانا محمد شاہد کی بورے والا سے آمد۔ ''اداریے میں معراج رسول صاحب کی آخری لائنز ہمارے اور اسلاف کا فرق بتا رہی ہیں۔ دور کیوں جائیں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح جب گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالتے ہیں تو اپنی تنخواہ ایک روپیا مقرر کر لیتے ہیں جب کہ 1936ء میں جب وہ وکیل تھے تو 1500 روپیا ان کی فیس تھی پھر بطور گورنر جنرل کہتے ہیں کہ چائے پینے کا تکلف بھی قومی خزانے پر کیوں ڈالا جائے۔ وزراء گھر سے چائے پی کر آیا کریں اور انصاف تو ہر معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے جب یہ نہیں ہوگا تو پھر وہی ہوگا جو شیرِ خدا حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ ''کفر کا نظام چل سکتا ہے، ظلم اور ناانصافی کا نہیں۔'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یک نکی سرگزشت بھی دلچسپ رہی۔ ''شہر خیال'' کے تبصرے خاص نمبر کے حوالے سے تھے۔ ''شہر خیال'' کا فونٹ مزید چھوٹا کر دیا گیا (خاص نمبر کی وجہ سے بہت زیادہ خطوط آگئے تھے جن میں ایک چوتھائی خطوط کو جگہ ملی) خاص نمبر میں ناصر حسین رند نے ''شہر خیال'' کے ان ساتھیوں کا ذکر کیا تھا جو ہمیشہ کے لیے

ہمیں چھوڑ گئے۔ ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ ناصر بھائی سے بھی گزارش ہے کہ اتنی لمبی چھٹی نہ کیا کریں۔ اس دفعہ اعجاز حسین لدھیانہ کا تبصرہ سرفہرست تھا۔ نزاہت انشال آپ نے سچ لکھا، تخلیقی لوگ نصابی تعلیم و ڈگری کے محتاج نہیں ہوتے۔ آج بہت سے ایسے ادیب و شاعر ہیں جنہوں نے کالج و یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی مگر انہیں پڑھے بغیر ہمیں ڈگری نہیں ملتی۔ ظفر ندیم دہرہ! ایک طویل عرصے بعد آپ کا نام پڑھا۔ 'شمیر خیال' میں آتے رہیے گا۔ عمران جونانی بھی کافی دیر بعد دکھائی دیے۔ امیر حمزہ اشرف! والدہ کے حوالے سے آپ کے جذبات و احساسات پر مشکور ہوں۔ عبدالجبار رومی! آپ قصور سے آئیں تو ضرور ملاقات کے لیے آئیے گا۔ منشی محمد عزیز! آپ کا خط بھی اچھا لگا۔ اس دفعہ 'شمیر خیال' میں کافی نئے نام نظر آئے۔ دعا ہے کہ سرگزشت کی مقبولیت چار سو پھیلے۔ ڈاکٹر ساجد امجد ایک بڑے مسلمان مفکر ابو نصر الفارابی کی داستان حیات لکھ رہے تھے۔ ان کی موت جن حالات میں ہوئی پڑھ کر دکھ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے سچ لکھا کہ ان سے بڑا اثاثہ اور کیا تھا۔ بروس لی پر عبداللہ احمد حسن کی تحریر دلچسپ رہی۔ کراچی کی ماضی کی یادگاروں کا تذکرہ ڈاکٹر اقبال ہاشانی نے خوب کیا۔ تحریر معلوماتی اور انداز بیان دلچسپ رہا۔ سلمیٰ اعوان نے رابندر ناتھ ٹیگور کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے پردہ اٹھایا۔ رابندر ناتھ ٹیگور ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت سے محبت کرنے والے بڑے انسان بھی تھے۔''

☆ عبدالحکیم ثمر کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''حسب معمول سرگزشت مستقل اور مقبول سلسلوں سے فیض یاب ہو کر اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنا من پسند نگر ''انور فرہاد کی فلمی نگری'' کی سیر کو چل پڑے۔ برسوں بیت گئے مگر اس نگری کی آب و تاب ماند نہ پڑ سکی۔ وقت اور حالات کے نہ جانے کتنے بے رحم تھپیڑوں کو سہہ لیا لیکن اپنے بچھڑ جانے والے اور موجود فنکاروں کی باتیں ان کی داستانیں روح کو تڑپا دینے والی یادوں کو مٹنے نہیں دیا۔ آج بھی اس کی امین ہے اس امانت کو ہم تک پہنچانے میں انور فرہاد کی انتھک محنت اور جستجو شامل ہے۔ یہ انہی کی جستجو اور کھوج کا کمال ہے کہ ہم آج بھی ان بیتے ہوئے دنوں کی رنگینیاں اور دودھ کسک محسوس کرتے ہیں۔ وہ پرانی یادیں، یادگار فلمیں، مدھر اور رسیلے گیت دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والے سنگیت، فنکاروں کی کہی ان کہی داستانیں جو ہم کبھی لڑکپن سے اپنی جوانی تک دیکھتے اور سنتے آئے تھے ایک بار پھر اسی ماحول میں خود کو سانس لیتا محسوس کرتے ہیں۔ اب آتے ہیں چند سچ بیانیوں کی طرف، کہنے والے کہہ گئے ''عورت ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا''۔ ندیم احمد کی ''بری عورت'' کی مریم بھی اسی قبیلے کی ہے مگر معاشی بدحالی کا شکار وہ اپنا جسم نہیں مجبوری بیچتی ہے۔ جب اس کی شرقی آنکھوں کا سحر لوٹا تو اس کی غیرت لوٹ آئی۔ پسند کی شادی کو کبھی الوٹ بندھن سمجھا جاتا تھا۔ دولہا دلہن کی محبت اور چاہت سیمنٹ کی حیثیت رکھتا تھا مگر افسوس! آج ہمارے بے حس معاشرے نے پسند کی شادی کو ڈیتھ وارنٹ بنا دیا ہے۔ نہ جانے کتنے پریمی جوڑے، کتنی لیلائیں، کتنے مجنوں اور ہیر رانجھے اس نام نہاد غیرت کے بے لگام گھوڑے کی ٹاپوں تلے پس کر پیوند خاک ہوگئے۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔ ''میں ان تمام قارئین کا مشکور ہوں جو میری تحریر پر پسندیدگی کی مہر لگا رہے ہیں۔ اعجاز حسین لدھیانہ، خانیوال کا شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو جوبن پر قرار دیا۔ خالد شیخ طاہری، نزاہت انشال، سید ذیشان حیدر کاظمی کا خصوصی طور پر شکریہ۔ منشی عزیز نے کا تجزیہ حیران کر گیا۔ بڑی محنت کی ہے، عمران جونانی، ظفر ندیم دہرہ، امیر حمزہ، رضا احمد اعوان، اعجاز حسین سحار، عبدالجبار رومی، محمد ابراہیم درانی، کوثر اسلام، شاہد ذوالفقار کے علاوہ بھی تمام تبصرہ نگاروں کا شکریہ۔ عبداللہ احمد حسن کی تحریر ''شعلہ صفت'' اور زویا اعجاز کی ''ہانی'' بہت پسند آئی۔ سلمیٰ اعوان کی ''شاعر'' اور عاطر شاہین کی ''پسند کی شادی'' لاجواب تحریر ہے۔ ''تعاقب شب'' اور ''ندامت'' بھی پسند آئی۔''

☆ ظفر ندیم دہرہ کا تجزیہ حیدرآباد سے۔ ''فروری کا شمارہ پیش نظر ہے۔ آپ نے خوب لکار خانہ سجایا۔ سرورق بامقصد، پُراثر اور سادہ تھا۔ پسند کے معیار پر پورا اترا۔ ''معلم ثانی'' کے بارے میں تحریر مدلل، فکر انگیز اور ایمان افروز تھا۔ ''شعلہ صفت'' بروس لی کے حالات زندگی اور کارناموں کا احاطہ کیے ہوئے تھا جو کہ حقیقت نگاری کی ایک عمدہ مثال تھا۔ ''شہر نامہ'' بھی خوب تھا اگرچہ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں مگر دل مسوس کر رہ گیا۔ علی سفیان آفاقی کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ وہ فلم نگری کے میدان کے منفرد شہسوار تھے۔ مرنے والے خود تو آسودہ خاک ہو جاتے ہیں مگر اپنے چاہنے والوں کو یادوں کا کفن پہنا جاتے ہیں۔ ندیم اقبال پردیس کی زندگی کے بارے میں اپنے تجربات بطریق احسن بیان کر رہے ہیں، ویل ڈن۔ ''ناسور'' کا ہر صفحہ سنسنی کی لہر دوڑاتا ہے۔ صفحہ اول سے حرف آخر تک دلچسپیاں ہی دلچسپیاں ہیں۔ کہانیوں میں ''گناہ'' انسانی وزندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ''پسند کی شادی'' کا یہی انجام ہونا تھا جو کہ پریمی جوڑے کا ہوا۔ ''کاش'' کی محترمہ ماضی وہم کا شکار نظر آئیں۔ ''ندامت'' کی سندس اور سجاد مولانا کا وعظ سن کر صراط مستقیم پر آگئے۔ یہ ایمان کی جیت ہے۔ ''فین'' ایک بے سروپا کہانی تھی۔ اس شمارے میں شامل دوسری تحریریں بھی اچھی ہیں۔ اعجاز حسین سحار، سید امتیاز حسین بخاری کو شریک محفل دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔''

☆ کوثر اسلام کا تجزیہ صوابی سے۔ ''صبر آزما انتظار کے بعد یکم فروری کو سرگزشت نے اپنے درشن کرائے۔ دور دراز علاقوں میں رہنے والے سرگزشت کے شیدا دوست ہی جانتے ہیں کہ مہینے کی آخری تاریخیں کتنی کٹھن ہوتی ہیں۔ الفارابی کی تصویر کو دیکھتے ہی پتا چلا کہ ڈاکٹر

ساجد امجد کا مضمون ضرور ہوگا۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ کافی فکر انگیز تھا۔ معاشرے میں انصاف کا قتل ہوگا تو ڈاکوؤں کی تعداد بڑھتی ہی رہے۔ حکمرانوں کو جب ذاتی مفادات عزیز ہوں اور وہ سرکاری خزانے کو اپنا خزانہ سمجھیں تو پھر معاشرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یک گمی سرگزشت ''مزاح نگار'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تھی۔ یہ صفحہ ہمیشہ سے ہی زبردست رہا ہے۔ اس بار کے نئے دوستوں نے 'شمیر خیال' کی رونق بڑھائی۔ اعجاز حسین کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ ہیروز کو خراج تحسین پیش کرنے کا ان کا مشورہ زبردست ہے اور اس پر ادارے کا عمل قابل تحسین۔ خالد شیخ طاہری نے تقریباً پورے ڈائجسٹ کا تجزیہ کیا۔ منشی عزیز، عبدالودود، عامر شاہد، ذوالفقار، ایمانے زارا شاہ اور سیف خان کے تبصرے کافی دلچسپ تھے۔ شکر ہے سیف خان نے خاص نمبر کی وجہ سے سرگزشت کے ساتھ دوبارہ ناطہ جوڑا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا ایک دلچسپ معلوماتی مفید اور سبق آموز مضمون تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے الفارابی کی زندگی ان کے جدوجہد اور نظریات پر سیر حاصل بحث کی۔ الفارابی کی ماں کے قول پر تمام والدین کو عمل کرنا چاہیے کہ بچے کو وہ بننا چاہیے جس میں اس کا دماغ خوب چلتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول الفارابی نے مابعد الطبیعات کا فلسفہ اسلامی نقطہ نظر کے ساتھ پیش کیا کہ کائنات کے تمام مظاہر عقل محض سے وجود میں آئے اور دنیا کی تمام اشیاء اس کی پرچھائیاں ہیں لیکن شریعت عقل محض عقل کل یا عقول عشرہ پر یقین نہیں رکھتی بلکہ شریعت کے مطابق ہر چیز کا خالق اللہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول حران کے یونانی جو اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے انہوں نے صابی کا نقب اختیار کیا تاکہ ان کا شمار بھی اہل کتاب میں ہو حالانکہ صابی بہت پہلے سے موجود تھے۔ اپنے ماں باپ کا دین چھوڑنے والوں کو صابی کہا جاتا تھا اس وجہ سے مشرکین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی صابی کہا کرتے تھے۔ ستارہ پرستوں کو بھی صابی کہا جاتا تھا قرآن میں اگرچہ ان کا ذکر ہے لیکن بحیثیت اہل کتاب کسی بھی جگہ نہیں اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو کہا جاتا تھا۔ ہمارے صاحب اور اس کے مصاحبین کو سلانے اور ایک ساز سے سیف الدولہ اور درباریوں کو مسحور کرنے پھر ہنسانے اور رلانے کا واقعہ کافی دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ یہ الفارابی ہی کا کمال تھا کہ اس نے سر اور تال کو ریاضی کے خطوط پر ترتیب دیا۔ آخر میں الفارابی کے نظریات (نظریہ تعلیم نظریہ علم نظریہ سیاست) اور شہری ریاستوں کی اقسام نے اس مضمون کو چار چاند لگا دیے۔ الفارابی کے قتل نے بہت افسردہ کر دیا۔ سب کچھ تفصیلاً ذکر کرنے کے باجود ڈاکٹر صاحب نے آخر میں الفارابی کے والدین کے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ پھر وہ کبھی ان سے ملے یا نہیں۔ ''شعلہ صفت'' میں عبداللہ احمد حسن نے بروس لی کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ مجھے فلم بینی کا شوق نہیں اس لیے بحیثیت اداکار بروس لی سے ناواقف تھا البتہ بچپن میں بحیثیت مارشل آرٹس ماہر اس کا نام ضرور سنا تھا۔ فنون حرب و فلسفہ پر بروس لی کے 65 کتابوں نے کافی حیران کر دیا۔ مضمون کے آخر میں ان کے متعلق حقائق کافی دلچسپ تھے۔ ان کے اقوال بہت مفید اور قابل عمل ہیں۔ خصوصاً نمبر 3، 5، 9، 11، 14۔ ''شہر نامہ'' ڈاکٹر اقبال ہاشانی کا معلومات افزا مضمون تھا۔ ترقی جہاں سہولتیں لاتی ہے وہاں کئی چیزوں سے محروم بھی کرتی ہے۔ شہر نامہ میں کئی مقامات کے نئے اور پرانے ناموں سے واقفیت ہوئی مصنف نے اس سوال کا بہت عمدہ جواب دیا ہے کہ کچھ عمارتیں جیسے ریڈیو پاکستان بولٹن مارکیٹ وغیرہ اب بھی موجود ہیں جب کہ کیفے جارج پارسیوں کی عبادت گاہ وغیرہ ختم ہوگئے یہ اس لیے کہ اول الذکر کراچی کے سنہرے دور میں تعمیر ہوئی تھیں جب کہ آخر الذکر کراچی کے پُرآشوب دور کی ہیں جب کراچی کا شمار دنیا کے بڑے شہروں میں ہونے لگا۔ واقعی وقت کا ریلا سیلاب کی مانند ہے جو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ ہانی نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ تشبیہات و استعارات سے مرصع زویا اعجاز کی تحریر کافی دلنشین ہوتی ہے۔ زویا نے لارڈ بائرن کی زندگی کافی تفصیل سے بیان کی۔ بائرن اگرچہ بڑا ادیب اور شاعر تھا لیکن کئی عورتوں کی زندگیاں اس نے برباد کیں۔ ایک ادیب کسی کی زندگی سے نہیں کھیلتا۔ اس کے قول و فعل میں تضاد تھا۔ ہاؤس آف لارڈز میں انسانوں کو ان کا اصل مقام دینے کی بات کرتا، انسانی بے وقعتی کے خلاف بولتا لیکن عملی زندگی میں اس نے انسانوں کو کتنا بے وقعت کیا۔ مذہب کی باتیں کرتا لیکن خود کتنا مذہبی تھا۔ جنگ یونان میں اس کی شرکت کا فیصلہ انتہائی غیر دانشمندانہ تھا۔ یونان میں کسمپرسی کی حالت میں موت مکافات عمل کا نتیجہ تھی۔ جنگ کے حوالے سے زویا اعجاز کا نظریہ بہت عمدہ ہے۔ یقیناً جنگ میں سب سے پہلے اخلاقیات اور اقدار کا خاتمہ ہوتا ہے انسان حیوانیت کے درجے تک جا پہنچتا ہے لہو کی چاٹ اسے اپنے جیسے انسانوں کی بے حرمتی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ فلم بینی میں عدم دلچسپی اور فنکاروں اور فلمی ستاروں سے عدم واقفیت کی بنا پر فلم نگری نہیں پڑھتا لیکن اس بار اس میں کتاب کا تذکرہ تھا تو تھوڑا بہت پڑھا۔ میں اب بھی باقاعدگی سے لائبریری جاتا ہوں اور رات کو سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھتا ہوں۔ ٹی وی اور فیس بک کی وجہ سے کتب بینی متاثر نہیں ہوئی بلکہ ختم ہوئی ابن صفی اور جاسوسی دنیا کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ''عینک'' نے پُراسرار کہانی کی تشنگی کسی حد تک دور کر دی۔ ابو الفرح ہمایوں نے خوبصورت انداز میں ترجمہ کیا۔ عینک یا دوسری بے جان اشیاء نہ کسی کی جان لے سکتی ہے نہ دے سکتی ہے۔ بس انسان کا اعتقاد یا وہم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو واقعات جنم لیتے ہیں۔ ''شاعر'' میں سلمیٰ اعوان نے ٹیگور کے احوال بیان کیے اگر مضمون میں غیر ضروری طوالت نہ ہوتی تو اچھا ہوتا اس کے باوجود نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ شکیل صدیقی نے ''بائیسکل'' کی تاریخ خوبصورت انداز میں پیش کی۔ ٹوردی فرانس ریس کی تفصیلات سے لے کر سائیکل میں بتدریج پیش رفت چین کی ترقی، اس کی چوریوں اور سب سے بڑے 135.10 فٹ لمبی سائیکل تک خوبصورت داستان تھی۔ ''ناسور'' کو پڑھنا موقوف کر دیا۔ ''ہیت بازی'' کا گوشہ اچھا ہے مگر اس میں کچھ نئے تجربات بھی کرنے چاہییں۔ سچ بیانیاں اس بار بہت شاندار تھیں۔ پہلی سچ بیانی ''بری عورت'' بہت سبق آموز تھی۔ آج کل ڈاکٹروں اور اسپتالوں کا مقصد صرف لوگوں سے پیسے بٹورنا ہی رہ گیا ہے۔ بے جا ٹیسٹ اور دوائیوں کے ذریعے بل میں اضافہ کرتے ہیں۔ ندیم کی طرح ہزاروں لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ مریم

مجبور تھی لیکن اسی طرح اپنے حسن کے ذریعے پیسے اینٹھنا بھی تو درست نہیں۔ ''گناہ'' بہت عمدہ سچ بیانی تھی جو بچہ بھی دنیا میں آتا ہے وہ اپنے ساتھ اپنا رزق لے کر آتا ہے۔ بے شک پالنے والا اللہ ہے ہم تو صرف ایک ذریعہ بنتے ہیں۔ صباحت قابل معافی بالکل بھی نہیں تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو جیتے جی مار دیا۔ ''وبالی'' رونگٹے کھڑی کرنے والی خوفناک سچ بیانی تھی۔ ہوس کا بھوکا مرد ہمیشہ سے عورت سے مات کھاتا چلا آیا ہے۔ واجد کی غلطی چھوٹی نہیں تھی بہت بڑی تھی جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا یہ پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ یوسف ہمارے علاقے صوابی کا تھا۔ ''ندامت'' صرف سندس اور سجاد کی نہیں بلکہ معاشرے کے ہر گھر کی کہانی ہے کوئی بھی اپنی غلطی ماننے پر تیار نہیں۔ موبائل اور فیس بک سے پہلے لڑکیوں کو گھریلو کام اور ذمہ داریاں سیکھنی چاہییں۔ افتخار حسین نے بہت اچھا پیغام دیا۔ ''کاش'' میں ایک نفسیاتی illusion optical کا ذکر کیا گیا۔ میرے خیال میں نیلما کو اگر ایسی کوئی بیماری تھی تو ان دنوں میں تھی جب شجاعت کھو گیا تھا۔ 20 سال بعد جب اس کی زندگی تلفر کے ساتھ خوش و خرم گزر رہی تھی ایسی بیماری کا ہونا عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن قدرت کے کارخانے میں کچھ بھی بعید نہیں۔ ''سبق'' میں غلام رضا جعفری نے بہت اچھا سبق دیا۔ پاکستانی خون اپنی تاثیر نہیں کھوتا۔ جولی نے حیدر کی آنکھیں کھول دیں۔ واقعی اسلامی گھریلو نظام سے بہتر کوئی اور نظام زندگی نہیں۔ آخر میں ایک درخواست ہے کہ بین الاقوامی ادب اور تراجم کی طرف تھوڑی سی توجہ دی جائے اور پُراسرار کہانی یا واقعہ جس کی عقل کوئی توجیہہ بیان نہ کر سکے دوبارہ شروع کیا جائے۔''

☆سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ ''سرورق کی حسینہ اداس اداس سی لگی، پتا نہیں کس سوچ میں گم تھی لیکن جب ''شمیم خیال'' میں جھانکا تو اس کی اداسی کی وجہ سمجھ آ گئی کیونکہ 'شمیم خیال' میں ہمارا خط جو نہیں تھا۔ محکمہ ڈاک کی مہربانی سے ہمارا خط 'شمیم خیال' کی زینت نہ بن سکا۔ نئے اور پرانے سبھی دوستوں کے تبصرے خوب تھے۔ اداریہ میں ایک اور سنی کہانی پڑھی، ایک مردہ اور بے ضمیر معاشرے کی جیتی جاگتی کہانی بے گناہ اور نہتے شہریوں کو مار کر پولیس مقابلے کا نام دینا پولیس نے اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔ محافظوں کی وردی میں لٹیرے چھپے بیٹھے ہیں۔ ہم تو اس معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں بچیاں، مرد، جوان، بوڑھا کوئی محفوظ نہیں ہے۔ جہاں معصوم اور پھول سی بچیوں کو درندگی اور شیطانیت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ کس کس کا کریں ماتم کس کس کا کریں سوگ، قاتل بھی ہم ہی لوگ ہیں مقتول بھی ہم ہی لوگ۔ ''ناسور'' اتفاقات، معجزات، کرشمات اور حادثات کی ایک کڑی ہے۔ ''باغی'' ایک خوب صورت شاعر کی الجھنوں بھری زندگی کا بغاوت نامہ ہے۔ ابتداء میں خوف اور کرب جھلکا تو انتہا یونان کی سرزمین پر ہوئی۔ بڑا عجیب سا شخص تھا گورڈن بائرن پل میں تولہ پل میں ماشا۔ سلمٰی اعوان نے بڑے سلیقے اور ہلکے پھلکے انداز میں اپنے پسندیدہ شاعر کو خراج تحسین پیش کیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں نسرین کا ایرانی حسن، سحر کی معصومیت اور ہمارے ندیم بھائی ٹورنٹو کی بہاروں کا لطف دوبالا کر رہے تھے۔ فنٹاسٹک۔ ندیم بھائی جیتے رہیے اور پارک کے بارے میں آپ نے خوب کہا ٹورنٹو کے تفریحی مقامات واقعی خوب صورت ہیں۔ ایک ہمارے ہاں کے پارک ہیں کہ کبھی سال میں ایک آدھ بار تفریح کے لیے چلے بھی جائیں تو وہاں کی گندگی، مضر صحت اشیاء کی فروخت دیکھ کر ہی گھبراہٹ سی طاری ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال ہاشمانی ''شہرنامہ'' کے سنگ ہمیں پرانے کراچی کی سیر کرا لائے۔ حسین ماضی کا کربناک حال، کاش پھر سے وہ پرانا کراچی اور اس کی پُرسکون فضا میں لوٹ آئیں۔ ''بری عورت'' پڑھ کر فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ برا کہیں تو کسے کہیں عورت کو یا مرد کو کیونکہ برائی کی طرف تو دونوں ہی مائل تھے۔ عورت کی اداؤں نے ہی مرد کو خطا کرنے پر مجبور کیا تھا اور خطا عورت کی ہو یا مرد کی سزا کے مستحق تو دونوں ہی ہوتے ہیں۔ ''ظلمت شب'' میرے وطن کی ایک جنت نظیر وادی کا دل دکھاتا تذکرہ، وہ وادی جسے اب جنت لکھتے ہوئے بھی قلم لرزنے لگتا ہے۔ وہ سسکتا ہوا کشمیر جس کے باسی پاکستان کی محبت میں سالہا سال سے ڈٹے ہوئے ہیں وہ نہ جھکنے کو تیار ہیں۔ نہ بکنے کو تیار ہیں وہ لڑ رہے ہیں جواں مردی سے، بہادری سے، عزم سے اور حوصلوں سے اور نہ جانے کب تک ان کی یہ جنگ جاری رہے گی۔ دعا ہے کہ خدا پاک کشمیریوں کی ساری مشکلوں کو آسان فرما دے۔''

☆رضا احمد اعوان، بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ''قصور میں سات سالہ معصوم زینب کے اندوہناک قتل، درندگی، حیوانیت اور ظلم کی انتہا کے بعد اب ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ... انسانیت مر گئی ہے۔ زینب کا اندوہناک قتل انسانیت کے ماتھے پر کوئی پہلا بدنما داغ ہوتا تو ہم بھی حکمرانوں اور سیاستدانوں کی طرح درگزر کر دیتے لیکن اس ملک میں تو انسانیت کی بے جان روح پر مزید کسی داغ کے لیے اب کوئی جگہ نہیں بچی۔ بے جان جسم کا تو ایک بار جنازہ اٹھتا ہے لیکن ہم نے تو اس ملک میں ہر ہفتے، ہر مہینے انسانیت کا جنازہ اٹھتے دیکھا۔ میں درندوں کے ہاتھوں انسانیت کا جنازہ بننے والی معصوم ایمان کا نوحہ لکھوں یا فاطمہ کی درد بھری کہانی بیان کروں؟ میں انسان نما حیوانوں کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر جان دینے والی نوزیہ کے بدقسمت والدین کا غم بانٹوں یا تہمینہ کے معصوم جسم کے بکھرے ٹکڑے جمع کروں؟ میں اس بے حس دنیا کو نور فاطمہ کا جنازہ دکھاؤں یا عائشہ آصف کے معصوم چہرے کا دیدار کراؤں؟ میں لائبہ کے ظلم ناک اور دردناک موت پر آنسو بہاؤں یا ثناء کی مظلومانہ شہادت پر سینہ چھاک کر کے خاموشی کا رونا روؤں؟ میں والدین کی اس کل کائنات کی انسانیت کے ہاتھوں تماشا بننے پر ماتم کروں یا اس سات سالہ زینب کے بدقسمت والدین کو گلے لگا کر اس سماج کے خلاف چیخوں، چلاؤں؟ زخم کوئی ایک ہوتا تو اس کا مرہم بھی کہیں سے مل جاتا لیکن یہاں تو اب ہمارا پورا جسم انسانی درندوں، بھیڑیوں، حیوانوں اور ہوس کے بیماریوں کے ہاتھوں زخمی اور دل چھلنی ہیں۔ پھول اور کلیوں کی مسل اور مسخ شدہ خون آلود نعشیں اٹھاتے ہماری آنکھیں اب خشک اور دل پھٹ چکے ہیں۔ اب آتے ہیں فروری کے شمارے کی طرف! ''معلم ثانی''

ڈاکٹر ساجد امجد کی خوب صورت معلوماتی تحریر تھی۔ عبداللہ احمد حسن کی تحریر ''شعلہ صفت'' عالمی اداکار بروس لی کے متعلق تھی جس سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''سپر رائٹر'' انور فرہاد کے قلم کا ایسا شاہکار ثابت ہوئی جس کی تعریف کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ زخمی کانپوری کا نام تو بہت سنا لیکن ان کی شخصیت اور حالات سے پہلی مرتبہ واقفیت ہوئی۔ سلمٰی اعوان کا مضمون ''شاعر'' اس بار متاثر نہ کر سکا۔ ''ناسور'' قدرے بہتری کی طرف رواں دواں ہے۔ ''بیت بازی'' بہت زبردست رہی۔ تقریباً 95 فیصد اشعار معیاری تھے۔ سچ بیانیوں میں بری عورت، گناہ اور ندامت بالترتیب پہلے، دوسرے، تیسرے نمبر پر رہیں۔ 'شمیم خیال' میں شاہد ذوالفقار، کوثر اسلام صوابی اور نزاہت افشاں کے تبصرے پسند آئے۔ مجموعی طور پر فروری کا شمارہ دلکش، معیاری اور پسندیدہ تھا۔''

☆محمد احمد رضا انصاری کی شگفتہ بیانی کوٹ ادو سے۔ ''چھ، سات ماہ بعد خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ نئے سال کا پہلا شمارہ مرگ ناگہاں نمبر یکم جنوری کو مل گیا تھا۔ اداریہ میں آپ نے بالکل صحیح لکھا کہ آپ کے ادارے کے چاروں میگزینز میں سرگزشت انفرادیت کا حامل ہے۔ دس روپے زیادہ بڑی رقم نہیں۔ 70 روپے سرگزشت کی مناسب قیمت ہے۔ 'شمیم خیال' میں کچھ نئے اور کچھ پرانے بھی تھے۔ سب نے خوب لکھا۔ سالانہ تجزیہ میں پڑھا کہ مابدولت کے پورے سال میں صرف دو خط شامل اشاعت ہوئے۔ اس سال ان شاء اللہ پانچ چھ خطوط شامل کروانے کا ارادہ ہے۔ مرگ ناگہاں میں سب لکھاریوں نے بہت اچھا لکھا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی ایک قسط پھر مس ہو گئی۔ ہم دسمبر کا شمارہ نہیں پڑھ سکے۔ ''جاسوسہ'' نور وا عنایت کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھ رکھا تھا لیکن اس مضمون میں ان کے حالات زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی۔ چاند گرہن، مرگ فنکار، چھوٹی سی جان، دانشور، بنجارا، ذمہ دار اور دیگر سچ بیانیاں بھی اچھی لگیں۔''

☆وکیل الرحمٰن کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''قیمت بڑھانے کے موضوع پر بات کرنا چھوٹی بات ہے۔ آرٹس کونسل میں مشتاق یوسفی صاحب کی کتاب 1200 کے بجائے 800 میں ملی۔ بک اسٹال والے کو کہا کہ اگر 8000 مانگتے تو وہ بھی کتاب کے لیے حاضر ہے۔ انمول رسالے کتابیں خریدنا، آدمی کے ذوق شوق کی بات ہے۔ سرگزشت کا جواب نہیں۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ شاہکار ہے۔ بارہ مصالحے کی چاٹ ہے، ڈاکٹر ساجد امجد بھی مشہور لکھاری ہیں دیگر مواد بھی قابل تعریف ہے۔''

☆انجم فاروق ساحلی کی تشریف آوری لاہور سے۔ ''امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ ایک نئی کاوش ''رقابت'' پیش خدمت ہے کچھ اور نئی تحریریں بھی بھیج چکا ہوں۔ آپ کے ناول ''فاکیہ'' کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اچھی معیاری کاوش ہے۔ ایران کے ایک غریب آدمی کی کہانی ہے۔ براہ مہربانی میری کہانیوں کی طرف توجہ فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیے۔''

☆اعجاز حسین سحار کا تبصرہ نور پور تھل سے۔ ''ہر ماہ پرچا موصول ہوتا ہے تو سوچنے بیٹھ جاتا ہوں کہ کس سلسلہ کو تبصرہ کے لیے منتخب کیا جائے۔ کئی اپنے وقت کے نابغہ روزگار، تاریخ دان، محقق، مذہبی علم میں یکتا اور حاکم وقت کو بھی تعظیم و عزت پر مجبور کر دینے والی شخصیات ہیں۔ فلمی شخصیات، کھلاڑی، حادثات، کسی صنف میں انقلاب برپا کر دینے والے۔ دلچسپ واقعات، شکاریات، سفرنامے، معاشرے کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے مقالات اور میرا پسندیدہ موضوع سچ بیانیاں ہیں۔ کسی ایک پر سیر حاصل بحث و گفتگو کی جائے تو اس کالم میں مناسب حد تک اپنا حصہ ڈالا جا سکتا ہے۔ دوستوں سے بات نہ کی جائے تو بھی ناراضگی کا خوف رہتا ہے یوں کئی پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ میری یہ وضاحت یادداشت میں محفوظ رہے گی تو کئی مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اعجاز حسین لدھیانہ منفرد انداز میں یاد کرنے اور سراہنے کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔ ''شہرنامہ'' پڑھ کر ماضی ہمارے سامنے آ گیا۔ کئی تاریخی عمارتیں اور دیکھے ہوئے سینما گھر نوحہ کناں دکھائی دیے۔ اب وہاں بار نہیں، گودام اور پلازے معرض وجود میں آ چکے ہیں جس کی کچھ ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں اصل سیاپا اب شروع ہوا ہے۔ وعدے، منصوبے اور مستقبل کے پروگرام کسی انہونی کا پتا دے رہے ہیں۔ ارادوں کی مضبوطی میں یہ لائحہ عمل طے نہیں ہوا کہ آئندہ کا ساتھ کس رشتے سے ہو گا۔ گو ٹھہراؤ اور خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے لیکن ندیم صاحب کی طبیعت دھما کا خیز فیصلے کرنے والی نہیں لگتی۔ اخلاقی قدروں کا بول بالا رہے گا لیکن تجسس آنے والے واقعات پر نگاہ رکھنے کو اکسا رہا ہے۔ دیکھیں اب پٹاری سے کیا اور کب برآمد کیا جاتا ہے۔ ''بائیسکل'' خاصے کی چیز ہے اور ابھار سے لے کر ترقی کا سفر، وقت کے ساتھ تبدیلیوں اور جدید آلات کا استعمال سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''

☆منشی محمد عزیز میمن نے لندن سے لکھا ہے۔ 'شمیم خیال کی صدارت اعجاز حسین لدھیانہ کے نام تھی، مبارک باد قبول فرمائیں۔ ان کے علاوہ سید ذیشان حیدر کاظمی، قیصر خان، احمد خان توحیدی، امیر حمزہ اشرف، اعجاز حسین سحار، طاہر الدین بیگ، عبدالودود عامر، کوثر اسلام اور سیف خان کا خصوصی طور پر مشکور ہوں کہ انہوں نے میرا مرتب کیا ہوا سرگزشت کا سالانہ تجزیہ پسند فرمایا اور شکریہ جناب کبیر احمد عباسی صاحب کہ آپ نے بھی ناچیز کی حوصلہ افزائی کی۔ خالد شیخ طاہری، سیف خان اور ایمان نے زارا شاہ کو ''شمیم خیال'' کی محفل میں تشریف لانے پر دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اعجاز احمد راحیل کی کشمیر کے حالات کے پس منظر میں لکھی تحریر ''ظلمت شب'' پڑھی۔ جنید

کی عظمت وجرأت کو سلام۔ انڈین آرمی سے نبرد آزما جنید کو محبت ملی تو وہ بھی کس موڑ پر، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں کسے معلوم تھا کہ دلی کی رادھا، خدیجہ بن کر کشمیر کی آزادی کی جنگ میں جنید کے شانہ بشانہ کھڑی ہو گی۔ افتخار حسین اعوان کی مختصر مگر پُراثر تحریر ''ندامت'' پڑھی۔ سچ تو یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ان جدید ترین سہولیات نے برائی اور بے حیائی کو جنم دیا ہے۔ سرورق کی کہانی ''بری عورت'' کے متعلق عرض ہے کہ مریم نامی نرس کا رویہ بالکل غلط تھا کیونکہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مرد تو پہلے ہی گویا ''تیار'' بیٹھا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے شریعت میں عورت کو حکم ہے کہ وہ کسی نامحرم سے بات کرتے ہوئے اپنا رویہ اور لہجہ سخت رکھے۔ چہ جائیکہ مریم اپنے اس مریض کے اتنا قریب ہو گئی۔ وردہ خان نے اپنی تحریر ''گناہ'' میں ایک عورت کا اعتراف جرم بیان کیا۔ صباحت جیسی لاکھوں ہزاروں عورتیں یہ قبیح فعل محض اپنی ''فٹنس'' برقرار رکھنے کے لیے معمولی سمجھ کر کرتی ہیں۔ ''پسند کی شادی'' میں عاطر شاہین نے ایک پریمی جوڑے کی ناخوشگوار انجام سے آگاہ کیا۔ ''جھوٹی غیرت'' کا ایسا مظاہرہ اکثر دیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ ''دیالی'' پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اف خدایا ایک چڑیل نے کس طرح سے ایک ابن آدم کو اپنے چنگل میں پھنسا لیا لیکن صد شکر کہ بالآخر اللہ کے ایک نیک اور برگزیدہ بندے زاہد یوسف کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی، خس کم جہاں پاک۔ واجد کو بروقت سنبھل جانے کا ایک موقع تو قدرت نے اس بزرگ کی صورت میں دیا تھا جس سے اس کی ملاقات سید جنات شاہ کے مزار پر ہوئی تھی لیکن اس نے اس بزرگ کی ظاہری حالت کے پیشِ نظر اس بات کو اہمیت نہ دی اور نتیجے میں ایک چڑیل کے جال میں پھنس گیا۔ اس کہانی سے کم از کم دو سبق ملتے ہیں کہ کسی کی ظاہری شکل وصورت کی بنا پر اسے کبھی حقیر نہ سمجھو اور دوئم تنہائی میں اپنے نفسانی جذبات کو قابو میں رکھو۔ ''ناسور'' میں اس مرتبہ بھٹی صاحب نے بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر اقبال ہاشانی ''شہر نامہ'' کے عنوان سے کراچی کے خوب صورت ماضی کی عمدہ سیر کروا رہے تھے۔ زویا اعجاز نے ''باغی'' کے عنوان سے لارڈ بائرن کے حالاتِ زندگی سے آگاہی دی۔ اس کے غیر فطری تعلقات کا پڑھ کر افسوس ہوا کہ ایک طرف اتنا قابل شخص اور دوسری طرف......!! شاید اس معاشرے میں یہ سب اتنا معیوب ومعتوب نہیں سمجھا جاتا۔ آخر میں یہ بتا دیں کہ گزشتہ ماہ ''دلچسپ ومنفرد'' کے عنوان سے ایک تحریر بھیجی تھی، اس کے انجام سے آگاہ کر دیں۔ (حوالے درج نہیں ہیں)''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا محبت نامہ قصور سے۔ ''فروری کا سرگزشت 23 جنوری کو موصول ہوا۔ شمارے کے ہاتھ آتے ہی دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے اس کے خاص نمبر کو مجلد کروا کے رکھا جائے۔ میرے خیال سے اس کا ہر شمارہ ہی لاجواب ہوتا ہے جو جلد بندی کرا کر رکھنے کے قابل ہے۔ اس طرح محفوظ رہتا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی مختصر مگر اہم سرگزشت زبردست تھی۔ ''معمہ خیال'' سے اعجاز حسین لدھیانہ کا ''مرگ ناگہاں'' پر تبصرہ زبردست رہا۔ ایسے ہی کسی بھی نمبر پر تبصرہ کرنا اور پھر پہلے نمبر پر آنا اعزاز کی بات ہوتی ہے، بہت مبارک ہو۔ دوسرے نمبر پر خالد شیخ طاہری نے بھی خوب محفل جمائی۔ بھرپور تبصرہ کیا، ویلڈن۔ نزاہت افشاں نے بھی شاعروں کے حوالے سے اپنی رائے کا خوب اظہار کیا۔ ذیشان کاظمی نے بھی اچھا تبصرہ کیا۔ اس کے علاوہ قیصر خان، ظفر ندیم، عمران جونانی، امریشہ، احمد خان توحیدی، امیر حمزہ اشرف، رضا احمد اعوان، اعجاز حسین سحار، طاہر الدین اور میرا خط جو آخری لمحے پر پہنچا وہ بھی دسمبر کا (جنوری پر تبصرہ کل ملا اور یہ پہلے آگیا)۔ منشی محمد عزیز میمن، شاہد ذوالفقار، کوثر اسلام، شبینہ گل، سیف خان اور آخر میں ایمانے زارا شاہ نے بھرپور تبصرہ نگاری کی اور سبھی نے اپنی بساط میں بہت اچھا لکھا۔ رانا شاہد، ناصر حسین رند، سدرہ بانو اور امتیاز حسین بخاری اس دفعہ کہاں رہ گئے۔ جب کہ پرانے تبصرہ نگاروں میں انور عباس شاہ، روبینہ نفیس انصاری، بشریٰ افضل، رضوان تنولی اور آفتاب احمد نصیر بھی کبھی نظر نہیں آئے پلیز سبھی لوگ محفل میں آئیں اور اپنی بھی خیر خبر دیں۔ فارابی نے موسیقی کا ایک آلہ ایجاد کیا تھا جس کے بجانے سے لوگ پہلے ہنسے پھر روئے اور آخر میں سب ہی سو گئے۔ نصاب کی کتاب میں صرف اتنا ہی پڑھا تھا، معلوم نہیں تھا کہ ابونصر فارابی نے وہ آلہ کیسا بنایا تھا اور کن لوگوں کے درمیان بجایا تھا۔ ''معلم ثانی'' تحریر پڑھی اور سب کچھ معلوم ہو گیا ایسا علم دوست شخص جس نے عمر کا ایک لمحہ ضائع کیے بغیر قلم سے ناطہ جوڑے رکھا اور کتاب کو اپنا ساتھی بنایا ایسی ہمہ جہت شخصیت کو جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ ''اگر کل میں مر جاؤں تو بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ جو میں کرنا چاہتا تھا میں نے کر لیا ہے۔''

☆ نصر اللہ خان داؤد خیل میانوالی سے رقم طراز ہیں۔ ''ماہنامہ سرگزشت سالنامہ 2018ء بعنوان ''مرگ ناگہاں'' نمبر پڑھا۔ بہت اچھا اور پسند آیا۔ پہلی سچ بیانی سبق آموز اور دکھی تھی۔ فلمی کہانی میں اداکار نغما کی خودکشی کافی اداس کر گئی۔ مرحوم بہت بڑے فنکار تھے۔ ناکام اداکار میں اظہار قاضی کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔ رسالے کی قیمت اگر بڑھانی تھی تو کم از کم صفحات بڑھا دیں (صفحات بڑھائیں گے تو قیمت مزید بڑھے گی) بڑی خواہش تھی کہ صفحات بڑھا دیے گئے ہوں گے۔ پس ورق جو کہ کبھی فلمی کہانیوں کے بارے میں ہوتا تھا۔ اس کو بھی بند کر دیا گیا ہے۔ براہِ مہربانی کوشش کریں کہ پہلے والی کچھ چیزیں رہنے دیں۔ دسمبر سال 2017ء کا شمارہ اس دفعہ بنگالی تذکرے کے بغیر تھا ایسا لگا کہ 47 برس کے المیے کو ہم بھول چکے ہیں۔ امید ہے کہ اگلے کسی شمارے میں توجہ فرمائیں گے (ڈھاکا فلم انڈسٹریز کے فتح مصطفی کی سرگزشت تو تھی) ''بیت بازی'' اور ''علمی آزمائش'' کافی اچھی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنت قبول فرماتے ہوئے اور ترقی عطا فرمائیں۔ آپ کا ادارہ رات دن ترقی پائے، (آمین)۔''

☆ شاہد ذوالفقار کی ہری پور ہزارہ سے آمد۔ ''پہلی بار سرگزشت کا انتہائی بے چینی سے انتظار تھا۔ آخر خدا خدا کر کے پچیس تاریخ کو

سرگزشت کا دیدار ہو ہی گیا۔ سب سے پہلے خطوط والا صفحہ نکالا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کے دل کو ڈھارس ہوئی۔ بہت سے جانے پہچانے نام بھی نظر سے گزرے جن میں سیف خان، ایمانے زارا، خالد شیخ، کوثر اسلام، شبینہ گل، عبدالودود عامر شامل ہیں۔ ان سب کے تبصرے بہت شاندار رہے خاص طور پر سیف خان نے تو گویا محفل ہی لوٹ لی۔ ان جانے پہچانے ناموں کے علاوہ پہلا تبصرہ جو کہ اعجاز بھائی نے لکھا وہ بھی بہت اچھا تھا۔ فہرست میں زویا اعجاز کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ساتھ ہی شاعر کا تذکرہ دیکھ کے خوشی دوگنی ہو گئی۔ ''باغی'' نام کی یہ تحریر پڑھ کے میں حیران رہ گیا۔ یورپ میں کیا اتنے سال پہلے بھی اتنی فحاشی تھی کہ ایک شاعر جو نواب بھی تھا اور کسی سیاسی عہدے پر بھی براجمان تھا، اخلاقی حوالے سے اتنی گمراہی کا شکار تھا۔ کسی کو بھی نہیں بخشتا۔ اب کوئی شخص چاہے جتنا اچھا شاعر ہو اگر وہ اچھا انسان نہ ہو تو کیا فائدہ۔ بہت نفرت محسوس ہوئی اس کردار سے مگر اس کے باوجود اس عجیب وغریب شخص کے بارے میں پڑھ کے معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔ زویا آپی نے بہت زیادہ محنت اور تحقیق سے یہ تحریر لکھی۔ یورپ کے شاعر کے بعد برصغیر کے شاعر کے بارے میں پڑھنا شروع کیا جسے نوبل انعام بھی ملا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری پہلی بار اس تحریر میں پڑھی۔ تحریر شاندار تھی۔ یہ فرق ہے یورپ اور برصغیر میں۔ یورپی شاعر کے برعکس رابندر ناتھ نہ صرف شاعر اچھے تھے بلکہ اچھے انسان بھی تھے۔ شاعروں کے علاوہ مجھے فلمی دنیا کے بارے میں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ زخمی کانپوری کی تحریریں تو نظر سے گزرتی رہی ہیں ان کے بارے میں جان کے بہت اچھا لگا۔ تحریر بہت اچھی لگی۔ ''بائیسکل'' بھی معلومات سے بھرپور تحریر رہی۔ ''عینک'' ویسے تو بڑے مزے کی لگی مگر اینڈ نے سارا مزہ خراب کر دیا۔ عبداللہ احمد حسن نے بروس لی پر خوب لکھا۔ ساجد امجد کی تحریر سے پتا چلا کہ سرورق پر بنی تصویر ابونصر الفارابی کی تھی۔ الفارابی پر ایک سبق بھی پڑھا تھا اسکول میں۔ اس میں لکھا تھا کہ فارابی نے ایک ایسا موسیقی کا آلہ ایجاد کیا تھا کہ جو اسے سنتا پہلے ہنسنے لگتا، پھر رونے لگتا اور پھر سو جاتا۔ میں بہت حیران تھا کہ وہ آلہ پھر کہاں گیا۔ ساجد امجد کی تحریر اس انتظار میں پڑھتا رہا کہ اس آلے کے بارے میں شاید کوئی تفصیل ہو۔ زیادہ تفصیل تو اس آلے کے متعلق نہیں ملی تاہم ذکر مل گیا۔ ''شہر نامہ'' میں پرانے کراچی کی جھلک دکھلائی گئی۔ میں نے تو کبھی کراچی نہیں دیکھا مگر خواہش بہت ہے دیکھنے کی۔ ہمارے ہاں سے بہت سے لوگ کراچی جاتے ہیں اور کراچی کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں لیکن اس تحریر میں کراچی کے بارے میں جیسے بتایا گیا ایسے کبھی کسی نے نہیں بتایا اس لیے بہت اچھا لگا۔ سچ بیانیوں میں ''بری عورت'' بہت اچھی کہانی تھی۔ اگر کوئی لڑکی کسی سے ہنس بول لے تو ہر کوئی اس سے فری ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اس کہانی سے ایک خوبصورت پیغام ملا کہ ہنس کے بولنا مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔ وردہ خان کی ''گناہ'' عاطر شاہین کی ''پسند کی شادی'' سید سخاوت کی ''دیالی'' بھی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ وردہ نے ایک گناہ گار کا گناہ جان کے اس کو تسلی دلاسا دینے کے بجائے تعلق ہی توڑ لیا یہ بات اچھی نہیں لگی۔ ''پسند کی شادی'' میں پہلے صفحے سے ہی اینڈ کا اندازہ ہو گیا تھا تاہم اچھے انداز میں لکھی گئی تھی اس لیے بوریت نہیں ہوئی۔ افتخار حسین کی ''ندامت'' بھی سبق آموز تحریر رہی۔ موبائل کی وجہ سے بہت سے گھر اجڑے ہیں مگر چلیں شکر ہے اس تحریر میں وہ بچ گیا، یہ سندس کو عقل آ گئی۔ غلام رضا کی ''سبق'' بھی بہت پیاری تحریر رہی۔ لیکن نے بہت دکھی کیا، یہ تحریر لگتا ہے مرگ ناگہاں نمبر کے لیے لکھی گئی تھی۔ نیلما بٹ کی ''کاش'' بھی پُراسرار مگر اچھی تحریر رہی۔ ظفر جیسے شوہر کسی بھی عورت کی خوش قسمتی کی انتہا ہے جو اتنے سال بعد اپنی بیوی کو پچھلے شوہر کی یادوں میں گم ہونے کے باوجود اس کا ساتھ دیتا رہا۔ اعجاز احمد راحیل کی ''ظلمت شب'' کشمیر کے موضوع پر اچھی تحریر تھی مگر اس کہانی کو طول بہت زیادہ دیا گیا۔ بار بار ایک جیسے واقعات کی وجہ سے بعض جگہوں پر بوریت بھی ہوئی۔ قسط وار ابھی نہیں پڑھ سکا۔ کہانیوں کے ساتھ دی گئی حاشیوں میں معلومات بہت اچھی لگیں۔ معراج رسول کا اداریہ اور ایک صفحے پر دی گئی تحریر ''مزاح نگار'' بھی پسند آئی۔ ''بیت بازی'' میں شعر بہت عمدہ تھے۔ کیا شعر میل بھی کیا جا سکتا ہے جیسے تبصرہ میل کرتے ہیں؟ (بالکل میل کر سکتے ہیں) ''علمی آزمائش'' بھی اچھا سلسلہ ہے تاہم مجھے تو کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ کس شخصیت کے بارے میں ہنٹس دی گئی ہیں۔''

☆ ناصر حسین رند کا خلوص نامہ بہاولپور سے۔ ''سب سے پہلے مرگ ناگہاں نمبر کی کامیابی کی مبارک باد۔ اعجاز حسین لدھیانہ کافی عرصے بعد نظر آئے اور آتے ہی کرسی صدارت مل گئی۔ کیا خوب تبصرہ تھا۔ ان کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ ہر ماہ کسی ایک ہیرو، غازی یا شہید کی کہانی شامل کی جائے (انشاءاللہ جلد یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا) عمران جونانی، احمد خان توحیدی بھی موجود تھے۔ اعجاز حسین سحار کمال ہے جو بھول کر بھی ہمیں بھی یاد کریں۔ ہمارے ''معمہ خیال'' کے پرانے ساتھی منشی عزیز میمن بھی موجود تھے۔ ان کی مرگ ناگہاں نمبر میں سالانہ رپورٹ تعریف کے قابل تھی لیکن اس میں صرف ایک کمی تھی وہ یہ کہ جہاں انہیں کہانیوں کا نام لکھنا چاہیے تھا وہاں انہوں نے رائٹروں کا نام لکھا ہے۔ کوثر اسلام پُراسرار کہانیوں کی حمایت کرنے کا انتہائی شکریہ۔ آپ کی اس محبت کا ثمر ''عینک'' اور ''دیالی'' کی صورت میں نظر آیا۔ اس دفعہ ''جاسوسی'' اور ''سسپنس'' کے باسیوں نے ''معمہ خیال'' پر حملہ کر دیا جن میں پیش پیش سیف خان، ایمانے زارا شاہ، شبینہ گل، کوثر اسلام، عبدالودود عامر، امیر حمزہ اشرف، سید ذیشان حیدر کاظمی اور خالد شیخ طاہری شامل تھے۔ مرگ ناگہاں نمبر جو کہ ایک سپرہٹ شاہکار تھا۔ سچ بیانیوں میں ''گناہ'' میں وردہ خان سے صرف اتنا کہنا ہے کہ نفرت گناہ سے کرو نہ کہ گناہ گار سے، آپ کو صباحت سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔''

دیر سے موصول خطوط: نرگس افروز، ساجد خان، لاہور۔ شہناز شنواری، ملتان۔ قائل خان، کوئٹہ۔ نرجس امداد حسن، خیرپور میرس۔ الشان طاہر، حیدرآباد۔ نعمان اشرف، پشاور۔ راحیل احمد، کوٹ وادن۔ ظفریاب حسن، شیخوپورہ۔ امداد علی شاہ، میرپور خاص۔ منظر حسین، سرگودھا۔

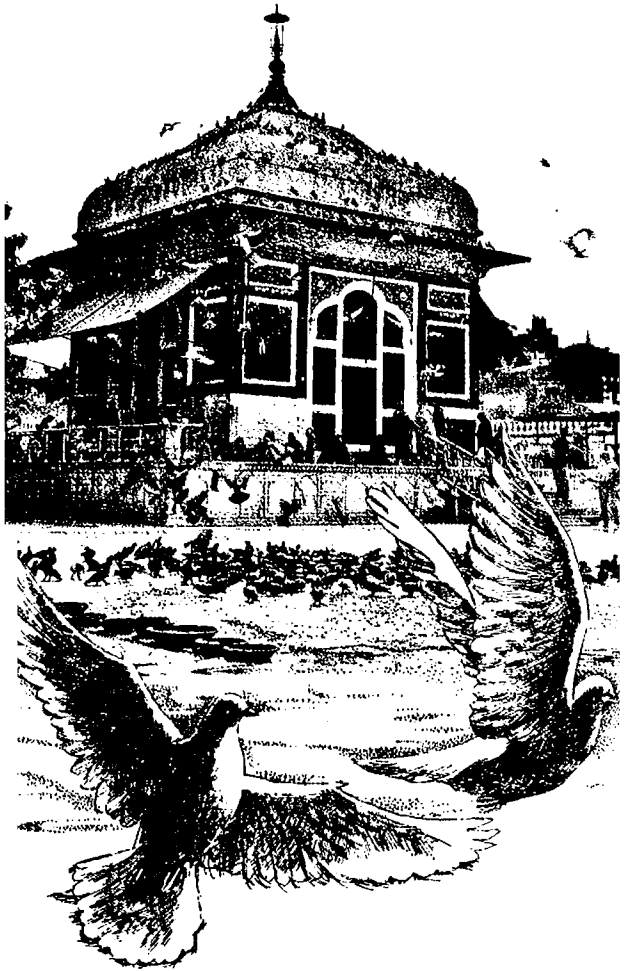

حضرت میاں میرؒ

ڈاکٹر ساجد امجد

اولیاء اللہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے، دنیا ان کے در پر جھکتی ہے مگر ان کو جھکا نہیں سکتی. ان کے دربار سے فیض کا وہ دریا بہتا ہے جس سے ہرخاص و عام فیض اٹھاتا ہے اور ایسی ایسی کرامات نظر آتی ہیں جو عقل کی حیرانی کا باعث ہیں اللہ تعالی کے برگزیدہ بندوں میں کیسی کیسی قوت آجاتی ہے اس کا احوال.

ایک بزرگ کا احوال، تحفۂ خاص

حضرت شیخ خضر سندھ میں سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ ایک قبرستان میں گزارا پھر آپ سیوستان کے باہر ایک پہاڑ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ چاروں جانب گھنا جنگل تھا۔ جب رات کا اندھیرا پھیلتا تو جنگلی درندوں کی دل دہلا دینے والی آوازوں سے پورا جنگل گونجنے لگتا تھا۔ اس پُر خطر جگہ پر کسی انسان کا راتیں گزارنا قابل یقین نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ مرد خدا دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز اس پہاڑ پر یاد الٰہی میں مشغول رہتا۔ سردی ہو یا گرمی ایک تہ بند آپ کا لباس تھا۔ درختوں کے پتے کھا کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب سردی کا موسم آتا تو ایک تنور بنا لیتے جس میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلاتے اور سردیوں کی راتیں اس تنور کی تپش میں گزارتے۔

جب آپ کی شہرت حاکم سیوستان (سہون) تک پہنچی تو اسے اس مرد بزرگ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ کسی ملازم کو ساتھ لے اور اکیلا ہی پہاڑ پر پہنچ گیا۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ دھوپ آگ برسا رہی تھی۔ حضرت شیخ ایک تپتے ہوئے پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ حاکم دبے پاؤں آگے بڑھا اور آپ کے قریب پہنچ گیا لیکن انہوں نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ حاکم نے مناسب نہ سمجھا کہ آپ کو مخاطب کر کے آپ کی عبادت میں خلل انداز ہو۔ وہ اس انتظار میں خاموش کھڑا ہو گیا کہ حضرت شیخ خود آنکھیں کھولیں اور اسے دیکھیں پھر حاکم کو یہ احساس ہوا کہ سورج کی کرنیں براہ راست حضرت شیخ پر پڑ رہی ہیں۔ اس نے سوچا تھوڑی دیر کے لیے چھوٹی سی نیکی کما لے۔ کچھ دیر کے لیے حضرت کو سایہ فراہم کر دے۔ وہ آپ کے قریب گیا اور اس زاویے سے کھڑا ہو گیا کہ سورج اس کی پشت پر آ گیا اور اس کا سایہ حضرت شیخ پر پڑنے لگا۔ اس کے سائے میں آتے ہی حضرت نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں اور عالم جلال میں فرمایا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟“

”میں اس علاقے کا حاکم ہوں اور آپ کی زیارت

کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

”زیارت کر لی اب جاؤ۔ کسی دنیا دار سے مجھے کوئی غرض نہیں۔“

”میں تو یہ آرزو لے کر آیا تھا کہ آپ مجھے کسی خدمت کا موقع دیں گے۔“

”مجھ فقیر کو کیوں پریشان کرتے ہو۔ مجھے تمہاری کوئی خدمت درکار نہیں۔“

”کیا میں یہ خدمت بھی انجام نہیں دے سکتا کہ آپ کے لیے کسی سایہ دار جگہ کا انتظام کر دوں۔“

”جو لوگ خدا کے سائے میں آجاتے ہیں انہیں کسی اور سائے کی ضرورت نہیں رہتی۔“

”میرے لیے کوئی اور خدمت بتایئے۔“

”میں جو کہوں گا وہ کرو گے؟“

”میں اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔“

”تو پھر ایسا کرو کہ اپنا سایہ مجھ سے دور کر دو۔“

حاکم گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”اچھا اب اور کوئی خدمت بتا دیجیے۔“

”دوسری خدمت یہ ہوگی کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ ہمیں کسی کا انتظار ہے۔ وہ آجائے تو ہم خود اپنا ٹھکانا بدل لیں گے۔“

”آپ کو کس کا انتظار ہے۔ اس کا پتا نشان کچھ بتایئے۔ میں خود آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

”خدائی کاموں میں دخل مت دو۔ آنے والا جب اس قابل ہو جائے گا تو خود آجائے گا۔“

”میں آپ کے حکم کی تعمیل میں واپس چلا جاتا ہوں مگر آپ سے میری التجا ہے کہ اس خاص موقع پر جب آپ یاد حق میں مشغول ہوں تو میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔“

”خدا وہ وقت نہ لائے جب عبادت کے وقت اللہ کے سوا مجھے کسی دوسرے کا خیال آئے۔“

یہ سن کر حاکم بے دلی سے پہاڑ سے نیچے اترا اور جنگل سے باہر نکل آیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت شیخ خضر کو جس ہستی کا انتظار تھا وہ سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت میاں میر لاہوری تھے۔

حضرت میاں میرؒ کا خاندانی نام میر محمد تھا۔ آپ سندھ کے قدیم شہر سیوستان میں پیدا ہوئے۔ سیوستان اس وقت سندھ کے ضلع دادو میں واقع ہے اور سیہون کہلاتا ہے۔

آپ کی ولادت کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ شہزادہ محمد دارا شکوہ اپنی کتاب ”سکینۃ الاولیاء“ میں 938ھ کو آپ کا سال ولادت قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس ”تحفۃ الکرام“ کا مصنف آپ کی تاریخ پیدائش 957ھ بتاتا ہے۔

آپ کے والد محترم قاضی سائیں دتا اپنے علم و فضل اور تقویٰ کے لحاظ سے پورے سیوستان میں مشہور تھے۔ یہ آپ کے تقویٰ اور پاکیزگی کا صدقہ ہی تھا کہ آپ کے گھر میں میاں میر جیسی ہستی کا ظہور ہوا۔

حضرت میاں میرؒ کی والدہ محترمہ بی بی فاطمہ خود بھی نہایت عالم فاضل اور پرہیز گار خاتون تھیں۔ انہوں نے ایک بار تہجد کی نماز ادا کرنے کے بعد بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ اے اللہ! میں تجھ سے ایسا بیٹا مانگتی ہوں جو عابد و زاہد اور عارف کامل ہو۔ ابھی دعا کے الفاظ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک غیبی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”تو نے ایک بیٹا مانگا ہے، ہم تجھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی اس صفت کی عطا کریں گے جس کی تو نے تمنا کی ہے۔“

انہوں نے یہ آواز سنی تو شکر گزاری کے آنسو ان کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

اس ندائے غیبی کے بعد حضرت میاں میرؒ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

دوسرا وعدہ بھی پورا ہوا۔ آپ کی ایک بہن بی بی جمال پیدا ہوئیں جو مادرزاد ولیہ تھیں۔

حضرت میاں میرؒ کا گھرانا علم و فضل کا خزانہ تھا لہٰذا آپ کو ابتدائی تعلیم کے لیے گھر سے باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت والدین کے زیر سایہ گھر کے علمی ماحول میں ہونے لگی لیکن قانون قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بعض کے نزدیک آپ کی عمر 7 سال بعض کے نزدیک 12 سال تھی کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا لیکن خاندان میں علم و فضل کا چرچا تھا اس لیے تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ بس اتنا ہوا کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ کی والدہ ماجدہ کے کندھوں پر آن پڑی۔ اس نیک دل خاتون نے اس ذمہ داری کو بڑی خوب صورتی سے ادا کیا۔ خود بھی نہایت عالم و فاضل تھیں۔ تعلیم کا بندوبست گھر پر ہی ہونے لگا۔

والدہ کے کانوں میں ندائے غیب گونجتی رہتی تھی۔

انہیں معلوم تھا کہ وہ جس بیٹے کو تعلیم دے رہی ہیں اسے ایک دن عارف کامل ہونا ہے لہٰذا اس کی تعلیم بھی اسی شان کی ہونی چاہیے۔ آپ ذرا بڑے ہوئے تو مختلف اساتذہ کے سپرد کر دیے گئے جو آپ کو دینی تعلیم سے بہرہ یاب کرتے رہے۔

حضرت میاں میرؒ کی والدہ اپنے وقت کے نامور بزرگ قاضی قارن کی صاحب زادی تھیں۔ انہوں نے معرفت و عرفان کی منازل اپنے والد کے زیر سایہ طے کی تھیں لہٰذا اپنے بیٹے کی روحانی تربیت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ باطنی علوم سکھانا شروع کیے اور بہت تھوڑی مدت میں ان علوم کی تکمیل ہو گئی۔

باطنی علوم سے آگاہی کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ مجاہدہ و ریاضت کیا جائے اور کسی پیر کامل کی تلاش کی جائے جس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سلوک کی منازل طے کی جائیں۔ پچیس سال کی بھری جوانی تھی کہ آپ نے والدہ سے اجازت لی اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

انتظار کرنے والا انتظار کرے اور اشارہ نہ کرے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ انتظار کرنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ دل میں ایسا خیال ڈالا کہ آپؒ کے قدم جنگل کی طرف اٹھ گئے۔ آبادی بہت دور رہ گئی تھی۔ اب وہ تھے اور گھنا جنگل۔ یہاں تک کہ کوہ سیوستان میں پہنچ گئے۔ ایک پہاڑ کے دامن میں آپ کی نظر ایک تنور پر پڑی۔ آپ ٹھٹک کر رک گئے۔ تنور کے منہ پر ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا۔ آپ نے وہ پتھر اٹھایا تو تنور اندر سے گرم تھا۔ اس کا مطلب ہے یہاں میرے علاوہ بھی کوئی اور ہے جس نے سردی سے بچاؤ کے لیے یہ تنور بنایا ہے۔ یہاں کوئی عام آدمی تو رہ نہیں سکتا۔ ضرور کوئی بزرگ ہے جو یہاں مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہے مگر وہ ہے کہاں؟

آپ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آیا لیکن انتظار کرنے والے کی کشش اپنا کام دکھا رہی تھی۔ دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہاں جو کوئی بھی ہے اس سے ملاقات کی جائے۔ وہ وہیں ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور دل میں فیصلہ کر لیں کہ جب تک اس بزرگ سے ملاقات نہ کر لوں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔

دن تو جوں توں گزر گیا لیکن جب رات آئی تو جنگلی جانوروں کی آوازیں دل دہلانے لگیں لیکن شاید یہ ان بزرگ کی کرامت تھی کہ کوئی جانور قریب نہ آتا تھا۔ رات آدھی ہوئی تو سرد ہوائیں خون کو منجمد کرنے لگیں۔ دل چاہتا تھا کہ تنور میں بیٹھ جائیں۔ کئی مرتبہ تنور کے قریب گئے بھی لیکن پھر اس خیال سے لوٹ آئے کہ یہ کسی بزرگ کی جگہ ہے یہاں بیٹھنا ادب کے خلاف ہے۔

جانوروں کا خوف دل سے نکل گیا تھا لیکن برفانی ہواؤں سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اسی عالم میں تین دن گزر گئے۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا تھا کہ کیا خبر وہ بزرگ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہوں، لیکن دل کو یقین تھا کہ آنے والا ضرور آئے گا۔ اللہ کے ولیوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ آنے والا آپ کے صبر کا امتحان لے رہا تھا۔ مشتاق دید بھی مجسم صبر تھا۔ بھوک پیاس سے بے نیاز بیٹھا تھا۔ وہ کسی آباد علاقے میں جا کر اپنی بھوک پیاس مٹا سکتا تھا مگر اس خوف سے کہیں نہ جا سکا کہ اگر بزرگ آکر چلے گئے اور وہ موجود نہ ہوا تو آنکھیں محروم رہ جائیں گی۔

اس دوران نہ ایک لقمہ حلق سے نیچے اترا نہ ایک کوزہ پانی پیا۔ تین دن گزر گئے تھے۔ صبر کی طاقت جاتی رہی تھی کہ وہ مرد بزرگ تنور کی طرف آتے نظر آئے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ یہ وہی ہیں جن کا انتظار تھا۔ شیخ میاں میرؒ آگے بڑھے اور بزرگ کی خدمت میں سلام پیش کیا۔

ان بزرگ نے بھی اپنی بزرگی کا خوب ثبوت دیا۔ جواب میں فرمایا۔ ”وعلیکم السلام میر محمد۔“

حضرت میاں میرؒ کو بزرگ کی زبان سے اپنا خاندانی نام سن کر حیرت ہوئی۔

”اے میر محمد، کب آئے۔“ بزرگ نے پھر فرمایا۔

”حضور میں تین دن تین رات سے یہاں ہوں۔“

”کمال ہے! میں تو یہیں تھا۔ بس آج کچھ دیر کے لیے گیا تھا۔ میں نے تو تمہیں نہیں دیکھا۔“

”میں آپ کی تردید کس طرح کروں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔“

”نہیں میر محمد شاید تم ہی سچے ہو۔ فقیر کو اپنا ہوش نہیں، دنوں کا حساب کیسے رکھے۔“ بزرگ نے فرمایا۔ پھر فرمایا۔ ”تین دن سے یہاں ہو کچھ کھایا پیا؟“

”قرب و جوار میں نہ غذا میسر تھی نہ پانی۔ شہر میں اس لیے نہیں گیا کہ میری غیر حاضری میں آپ کہیں چلے نہ جائیں اور میں ملاقات سے محروم رہ جاؤں۔“

”واہ تم نے یہ کیسے سوچ لیا۔ جب ملاقات طے تھی تو محروم کیسے رہتے۔“ آخری الفاظ بزرگ نے اتنی آہستگی

سے ادا کیے کہ حضرت میاں میرؒ نے بہ مشکل سنے۔

بزرگ نے انہیں خاموش دیکھ کر پھر فرمایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ گھر سے کس کام کے لیے نکلے تھے۔''

''میں مرشد کامل کی تلاش میں نکلا تھا کہ راستے میں تنور دیکھ کر ٹھہر گیا کہ آپ سے ملاقات کرلوں تو آگے چلوں۔''

''ملاقات کرلی اب آگے بڑھ جاؤ۔''

''مرشد کامل کی تلاش تھی مرشد کامل تو مل گیا، اب آگے کہاں جاؤں گا۔''

''میں نہ مرشد ہوں نہ کامل لیکن مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ تم آؤ گے۔ تمہاری منزل یہی ہے۔ میری زندگی کا کچھ ٹھیک نہیں، میرے جانشین تم ہی بنو گے لیکن تمہارا ٹھکانا یہ جنگل نہیں ہوگا کوئی اور جگہ ہوگی جو تم خود پسند کرو گے۔''

تھوڑی دیر کی گفت و شنید کے بعد حضرت میاں میرؒ نے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت خضر سیوستانی نے یہ درخواست قبول کرلی اور اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرلیا۔

بیعت ہونے کے بعد حضرت میاں میرؒ نے خود کو ذکر الٰہی میں مشغول کرلیا۔ ریاضتیں اور مجاہدے کرتے رہے۔

یہ بابرکت شب و روز کتنے عرصے پر محیط رہے تاریخ سے اس کا کچھ سراغ نہیں ملتا بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ درجہ کمال پر پہنچ گئے اور جتنا فیض حاصل کرنا تھا کرلیا تو حضرت شیخ خضر نے فرمایا۔ ''تم نے اپنا کام مکمل کرلیا۔ حکم ہوا ہے کہ تمہیں یہاں رہنے کی ضرورت نہیں جہاں چاہو جا کر رہو اور مخلوق خدا کی خدمت کرو۔''

یہ سن کر حضرت میاں میرؒ آبدیدہ ہوگئے۔ ''میں تو قید ہونے آیا تھا آپ رہائی دے رہے ہیں۔''

''ہم تم جس منزل میں ہیں وہاں اپنی مرضی کا دخل نہیں۔ اللہ کا حکم یہی ہے۔ فراق کی آگ بھی سلوک کا حصہ ہے۔ تمہیں جانا ہی ہوگا۔''

اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ حضرت میاں میرؒ ایک جنگل سے نکلے اور کئی جنگلوں، صحراؤں اور بستیوں کی خاک چھانتے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور اس وقت صوفیائے کرام کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ علم و فضل کے چرچے تھے۔ نابغہ روزگار علما درس و تدریس میں مشغول تھے۔ آپ بھی کئی دن ایک مسجد میں گزارنے کے بعد مولانا سعد اللہ کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔

حضرت میاں میرؒ کئی سال تک مولانا کے فضل و کمال سے فیض یاب ہوئے۔

جب اس کنویں کا پانی پی چکے تو مفتی عبدالسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس شان سے اکتساب علم کہ اس شاگرد پر خود استاد کو ناز ہوتا تھا۔

آپ نے کچھ وقت مولانا سعد اللہ کے شاگرد مولانا نعمت اللہ کی شاگردی میں بھی گزارا اور ان بزرگ سے معقولات اور منقولات کا علم حاصل کیا۔ ظاہری اور باطنی علوم حاصل کیے۔

آپ کا معمول تھا کہ ہمیشہ ریاضت و عبادت میں مشغول رہتے۔ آپ اولیاء کرام کے مزارات پر حاضری دیتے اور پھر جنگلوں اور باغات میں تشریف لے جاتے۔ تنہائی اور گوشہ نشینی اختیار کرکے علائق دنیا سے لاتعلق کر کے پروردگار عالم کے ذکر میں مشغول رہتے۔ رات ہوتی تو حجرے کا دروازہ بند کرکے تنہا قبلے کی جانب منہ کیے بیٹھے رہتے اور ساری رات ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔

اس ریاضت اور مجاہدے کے باوجود عام لوگ تو کیا خاص لوگ بھی آپ کے مراتب سے ناواقف تھے۔ یہ آپ کی طرف تھا کہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ ذکر خفی کی کس منزل پر فائز ہو چکے ہیں۔

مولانا نعمت اللہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''ہم کئی سال تک شیخ محمد کو پڑھاتے رہے اور اس دوران انہوں نے ہم سے ہمارا سارا علم لے لیا مگر اس طویل عرصے میں ہمیں ان کے اصلی حالات کا علم نہیں ہوسکا۔''

وہ ہفتہ ہفتہ بھر بھوکے رہتے لیکن کسی پر اپنا حال ظاہر نہ ہونے دیتے۔ غیرت نفس اور خودداری کا عالم یہ تھا کہ امراء اور وزراء قیمتی نذریں لے کر آتے مگر آپ یہ کہہ کر انہیں لوٹا دیتے۔ ''اللہ کے بے شمار مستحق بندے ہیں یہ چیزیں ان تک پہنچا دو۔''

اور یہ وہ وقت ہوتا تھا جب آپ پر آٹھ دن کے فاقے گزر چکے ہوتے تھے۔ آپ اللہ پر توکل کیے رہتے اور بالآخر غیب سے رزق میسر آجاتا۔

شہزادہ دارا شکوہ نے تحریر کیا ہے کہ آپ کا رزق اس آیت کریمہ کے مطابق تھا۔ ''تمہارا رزق اور جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، آسمان میں ہے۔''

آپ اس آیت کریمہ پر تکیہ کیے بیٹھے رہتے اور کوئی نہ کوئی بندوبست ہوجاتا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ آپ کے بھائی سیوستان سے لاہور تشریف لائے۔ بھائی کو دیکھ کر آپ بہت متفکر ہوئے کیونکہ کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا کہ تواضع کرتے۔ اس وقت تک نہ آپ کا کوئی مرید تھا نہ معتقد جس سے کہتے کہ کھانے کا بندوبست کردے۔ آپ نے بھائی سے کہا۔ ''تم حجرے میں بیٹھو میں تمہارے لیے کھانے کا انتظام کروں۔'' یہ کہہ کر آپ ایک باغ میں چلے گئے۔ وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کی اور خالق حقیقی سے دعا کی۔

ابھی دعا کے الفاظ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک آواز غیب سے سنائی دی۔ ''جب ہمارے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے تو پھر پریشان کیوں ہوتے ہو۔ ہم نے دعا مانگنے سے پہلے ہی تمہاری خواہش پوری کردی۔''

اسی وقت ان کا بھائی باغ میں داخل ہوا اور بتایا۔ ''آپ کے جانے کے بعد ایک شخص کھانا لے کر آیا اور آپ کا پوچھنے لگا۔ وہ شخص آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

آپ اس کے ساتھ گھر پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ ایک نہایت خوب صورت نوجوان موجود ہے۔ سلام دعا کے بعد اس اجنبی شخص نے آپ سے کہا یہ نقدی اور یہ کھانا ہے اس کو قبول فرمائیں۔ حضرت میاں میرؒ نے اس شخص سے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اللہ کا ایک بندہ ہوں۔''

اس کے بعد آپ نے اور آپ کے بھائی نے کھانا شروع کیا اور اس شخص سے بھی کہا کہ آپ بھی کھائیں مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ روزے سے ہے۔

جب کھانے سے فراغت ہوئی تو اس شخص نے برتن لیے اور سلام کرکے چلا گیا۔

شیخ میاں میرؒ فرماتے ہیں کہ اس کے چلے جانے کے بعد مجھے یہ جاننے کی جستجو ہوئی کہ آخر یہ شخص کون تھا۔ بہت دن بعد مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ دراصل وہ فرشتہ تھا جو رسم میزبانی ادا کرنے آیا تھا۔

☆......☆

دہلی میں میاں حاجی محمد ایک بزرگ گزرے ہیں۔ ایک دن مغل شہزادہ دارا شکوہ نے ان سے کہا۔ ''حاجی صاحب حضرت شیخ کی کوئی کرامت سنایئے۔''

حاجی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر فرمایا۔ ''میں ایک دن حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شیخ نے اپنا نام لیے بغیر کسی درویش کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا کہ سیوستان اور بھکر کے لوگوں میں قدیم رسم تھی کہ جب تک کسی شخص کے پاس مویشیوں کا ریوڑ یا نقد مال نہ ہو اس وقت تک کسی لڑکی کے لیے کوئی شادی کا پیغام نہیں بھیجتا تھا۔ ان ہی لوگوں میں ایک عزت دار شخص تھا۔ مفلسی کے باعث اس کی جوان لڑکی کا کہیں سے رشتہ نہیں آتا تھا اسی علاقے میں ایک فقیر بھی رہتا تھا جو کبھی کبھی اس شخص کے گھر آتا اور پانی مانگتا۔ لڑکی اسے پانی پلاتی اور فقیر اسے دعائیں دے کر چلا جاتا پھر جب بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ماں باپ بہت پریشان رہنے لگے تو لڑکی نے اپنی ماں سے کہا۔ ''وہ درویش مجھے بہت دعائیں دیتے ہیں آپ اس سلسلے میں ان سے بات کیوں نہیں کرتیں۔''

اتفاق سے دوسرے دن وہ فقیر آگیا۔ لڑکی کی ماں نے درویش کو طعنہ دیا۔ ''تیری فقیری ہمارے کسی کام نہیں آئی۔ تو آتا ہے اور پانی پی کر چلا جاتا ہے۔ تیری نگاہ کی برکت سے ہمیں کوئی آسودگی حاصل نہیں ہوئی۔ ہمارے حالات ویسے ہی ہیں جیسے تیرے آنے سے پہلے تھے۔''

''آخر تم کیا چاہتی ہو؟'' درویش نے پوچھا۔

''میں اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس ایک تنکا بھی نہیں۔''

فقیر نے اس کی بپتا سن کر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک بنیے کی دکان پر پہنچ گیا اور اس عورت کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔ ''تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو اس سے لے لیا کرنا مگر اپنے لیے'' سامان کی ذخیرہ اندوزی مت کرنا۔''

اس دن کے بعد سے وہ فقیر اس عورت کے مکان پر پانی پینے نہیں آیا۔ عورت روزانہ بنیے کی دکان پر جاتی اور اپنی ضرورت کا سامان لے کر آجاتی۔ کچھ دنوں بعد اس کی لڑکی کا رشتہ آگیا۔ نہایت دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ شادی کا تمام اسباب اس نے اسی بنیے کی دکان سے حاصل کیا۔ نقد رقم اور مویشیوں کا ریوڑ بھی اسے اسی دکان سے مل گیا۔

جب لڑکی کی شادی ہوگئی تو اس عورت کے دل میں لالچ آگیا۔ وہ اس بنیے کی دکان پر گئی اور ذخیرہ کرنے کے لیے بہت سا اناج لے آئی۔

دوسرے روز وہ اس بنیے کی دکان پر پھر گئی لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں نہ وہ دکان ہے نہ دکان والا۔ ایک ویران جگہ پڑی ہوئی ہے جیسے برسوں سے یہاں کوئی نہ آیا ہو۔ اسے فقیر کا یہ کہنا یاد آیا کہ یہاں سے اپنی ضرورت کی

ہر چیز لینا مگر اپنے لیے، سامان کی ذخیرہ اندوزی مت کرنا۔ اس سے یہ جرم سرزد ہو گیا تھا مگر اب کیا کرسکتی تھی۔ روتی پیٹتی واپس چلی آگئی۔ ایک مدت بعد اس نے اس فقیر کو پھر دیکھا تو قدموں میں گر گئی اور اس سے ماجرا پوچھا۔ ''بس مجھے اتنا بتا دو کہ وہ دکان کہاں گئی یہ کیا ماجرا ہے؟''

''اگر تو اس دکان کا حال پوچھے گی تو مجھے نہیں پائے گی۔'' فقیر نے کہا۔

عورت برابر اصرار کرتی رہی۔ جب اس کا اصرار بہت بڑھا تو اس فقیر کو بتانا پڑا۔ ''وہ اناج، دکان اور دکاندار سب کچھ میں ہی تھا۔'' فقیر نے کہا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب حضرت میاں میرؒ واقعہ بیان کر چکے تو حاجی محمد نے پوچھا۔ ''وہ کوئی بھی تھا تمہیں اس سے کیا غرض۔''

حاجی محمد نے دوبارہ وہی سوال کیا تو حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''خبردار اس بات کو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔''

میاں حاجی محمد کہتے ہیں کہ میں نے بعد میں کچھ ثقہ لوگوں سے تحقیق کی تو پتا چلا کہ سیوستان اور بھکر کے وہ فقیر کوئی اور نہیں حضرت میاں میرؒ ہی تھے۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری کرامات کا چرچا ہوا تو آپ کے پاس لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ آپ چونکہ شہرت کو ناپسند کرتے تھے لہٰذا آپ نے لاہور چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک دن خاموشی سے کسی کو کچھ بتائے بغیر مشرقی پنجاب کے مشہور شہر سرہند تشریف لے گئے۔

آپ کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ گھٹنوں میں درد رہنے لگا اور دوسری کئی بیماریاں بھی لاحق ہو گئیں۔ بیماری کی حالت میں کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ خودداری کا عالم یہ تھا کہ کسی کو بلانے اور اپنا حال بتانے کی ضرورت بھی گوارا نہیں کی۔

ان کا تو ہر کام غیب سے ہی ہوتا تھا۔ سرہند کے ایک صاحب حاجی نعمت اللہ کو بشارت ہوئی کہ لاہور سے ایک درویش سرہند آئے ہوئے ہیں اور ان دنوں سخت علیل ہیں اور فلاں مقام پر ہیں۔ حاجی نعمت اللہ کسی تاخیر کے بغیر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور پھر آپ کی تیمارداری کے لیے روز آنے لگے۔ حضرت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی ان کی خاطر تکلیف اٹھائے اس لیے آپ انہیں منع کرتے رہے لیکن وہ بضد تھے۔

''میں آپ کی تیمارداری کو اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔''

حضرت میاں میرؒ کی بیماری کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اس دوران حاجی نعمت اللہ نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ طویل بیماری میں والدین کی خدمت کرتے ہوئے اولاد بھی اکتا جاتی ہے لیکن حاجی نعمت اللہ کے ماتھے پر بل تک نہیں آیا۔

جب آپ صحت یاب ہو گئے تو آپ نے حاجی نعمت اللہ سے خوش ہو کر فرمایا کہ جس طرح آپ نے میری خدمت کی ہے میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا بدلہ عطا کروں لیکن میں فقیر بے سروسامان ہوں۔ تمہیں زر و مال کی صورت میں میرے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں۔ ہاں اگر تم کہو تو اپنے پالنے والے سے تمہارے لیے کچھ روحانی نعمتیں مانگ سکتا ہوں۔''

حاجی نعمت اللہ یہ سن کر خوش ہو گئے۔ ''میں آپ کی دعاؤں میں شامل ہو جاؤں میرے لیے یہی بدلہ بہت ہے۔''

حضرت میاں میرؒ نے حاجی نعمت اللہ سرہندی کو اسی وقت اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیا اور انتہائی مختصر عرصے میں انہیں سلوک کے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ حاجی نعمت اللہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ حضرت میاں میرؒ کے پہلے مرید ہوئے۔

آپ ایک برس تک ہند میں رہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ آپ نے اپنے آپ کو لوگوں سے چھپائے رکھا اور کسی کو اپنے بارے میں خبر نہ ہونے دی پھر آپ سرہند سے لاہور واپس آ گئے اور یہیں پر مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور باغبانوں کے محلے باغبانپورہ میں قیام کیا اور پھر آخر تک اسی محلے میں سکونت پذیر رہے۔

لاہور میں رہ کر آپ نے عبادت الٰہی کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ساری عمر لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔

حضرت میاں میرؒ بہت کم لوگوں کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرماتے تھے مگر جب کوئی شخص آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو جاتا تو اس کی تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے۔

آپ خود بھی ظاہر داری سے گریز کرتے تھے۔ صاحب کرامت بزرگ تھے مگر اپنی کرامات کو چھپاتے تھے۔ اس کے باوجود بہت سی کرامات ایسی تھیں جو ظہور میں آتی بھی تھیں اور لوگوں میں مشہور بھی ہو جاتی تھیں۔ یہ کرامت اہل تصوف کی کتابوں میں درج ہو کر تاریخ کا حصہ بن گئیں۔

ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک پیر صاحب اپنے تین چار مریدوں کے ہمراہ حاضر ہوئے اور بڑے متکبرانہ انداز میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کا مقصد لوگوں پر اپنی بزرگی ظاہر کرنا تھا۔ اسی اثناء میں ایک شخص ننگے پاؤں نہایت پریشانی کی حالت میں آیا اور جوتوں کے پاس بیٹھ گیا۔ اسی وقت خادم نے حاضر ہو کر ایک تھیلی حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں پیش کی جس میں 35 روپے موجود تھے۔ آپ نے فوری طور پر وہ تھیلی قبول کر لی اور خادم کے ذریعے اس پریشان حال شخص کو بلایا جو دور پڑے جوتوں کے قریب بیٹھا تھا اور رقم کی تھیلی اس کے حوالے کر دی۔

''اس رقم سے ایک گھوڑا خرید لینا اور باقی رقم اپنے خرچ کے لیے اپنے پاس رکھ لینا۔ گھوڑا تیرے پاس ہوگا لہٰذا فوج میں نوکری کر لینا کہ یہ تیرے حق میں ٹھیک رہے گا۔''

اس شخص نے رقم کی تھیلی لی اور خوشی خوشی چلا گیا۔

وہ پیر صاحب جو اپنے مریدوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے یہ دیکھ کر سخت خفا ہوئے۔ ''اس مال پر تو فقیروں اور درویشوں کا حق ہے۔ آپ نے تھیلی اس شخص کو دے دی۔''

مطلب یہ تھا کہ یہ تھیلی تو مجھے ملنی چاہیے تھی۔ ان کا حسن طلب دیکھ کر حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔ ''اس کا حق زیادہ تھا اس لیے کہ وہ سر اور پاؤں سے ننگا تھا۔ آپ کے پاس جبہ، دستار اور عصا موجود ہے۔''

یہ پیر صاحب سن کر اتنے ناراض ہوئے کہ کھانا کھائے بغیر ہی اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حضرت میاں میرؒ نے حاضرین سے فرمایا۔ ''اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آنے والا ہے۔''

''وہ کیا واقعہ ہے جو پیش آنے والا ہے۔ کچھ ہمیں بھی تو بتایئے۔'' حاضرین نے کہا۔

''اس نے ایک سو ساڑھے بائیس روپے کمر کے ساتھ بندھی پٹی میں باندھ رکھے ہیں۔ اس کی رقم گم ہو جائے گی۔ وہ خود اس رقم کے غم میں ہلاک ہوگا اور اس کے ساتھی اسی رقم کی وجہ سے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔''

آپ کے اس فرمان کی تصدیق کے لیے کچھ لوگ اس فقیر کے تعاقب میں گئے۔

وہ فقیر دو تین روز تو ادھر اُدھر پھرتا رہا اور ایک مرتبہ پھر حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ رخصت حاصل کرے۔ آپ نے اسے کھانے کی دعوت دی۔ وہ فقیر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

''کمر بند کو ڈھیلا کر لو اور آرام سے بیٹھو۔'' حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔

فقیر نے کمر بند کو ہاتھ لگایا تو اسے پتا چلا کہ اس کی تھیلی پاس نہیں ہے۔ اب تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

آپ نے فرمایا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

کہنے لگا۔ ''میری کوئی چیز کھو گئی ہے۔ میں دیکھ کر ابھی آتا ہوں۔''

وہ پریشانی کے عالم میں اپنی رقم ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ وہ کچھ دیر پہلے غسل خانے میں گیا تھا۔ اس نے وہاں جا کر اپنی تھیلی ڈھونڈی مگر نہ ملی۔ وہ حضرت میاں میرؒ سے ناراض ہو کر گیا تھا لہٰذا اسے خیال ہوا کہ ان کی بددعا لگی ہے۔ وہ فوراً واپس آیا اور دست بستہ معافی مانگی اور درخواست گزار ہوا۔ ''حضور، میری رقم کھو گئی ہے۔ مہربانی فرما کر دعا کریں کہ میری رقم مجھے مل جائے۔''

''ہمیں کیا معلوم اور ہم کیا جانیں کہ تمہاری رقم کہاں چلی گئی۔'' حضرت میاں میرؒ نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ یہ سن کر وہ زار و قطار رونے لگا۔

''حضور اگر میری رقم مجھے نہ ملی تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ لٹ جاؤں گا۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔''

اس کے آنسو دیکھ کر حاضرین کو بھی رحم آ گیا۔ انہوں نے بھی حضرت میاں میرؒ سے درخواست کی کہ آپ اس پر مہربانی فرمائیں۔

اس پر آپ نے اس سے فرمایا کہ اچھا کل تم فلاں وقت پر دریا کے کنارے چلے جانا اور فلاں جگہ پر ایک کشتی آئے گی اس کشتی کا ملاح ایک فقیر ہوگا۔ تو اس سے اپنی پٹی مانگ لینا چنانچہ اس ارشاد کے مطابق وہ وقت مقررہ پر دریا کے کنارے پر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک کشتی کو آتے دیکھا۔ اس کشتی کا ملاح اکیلا ہی اس کشتی میں بیٹھا ہوا تھا۔ مانگنے پر اس فقیر نے تھیلی اسے دے دی۔ رقم گنی تو پوری تھی۔ وہ پیر صاحب خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہوئے اور سیدھے حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

شکریہ ادا کیا۔

ان کی رقم انہیں مل گئی تھی لیکن اتنے دن جو پریشان رہے تھے اس کا اثر تھا کہ بیمار پڑ گئے اور دو تین دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت میاں میرؒ کی ایک پیش گوئی پوری ہو گئی کہ آپ نے فرمادیا تھا کہ رقم کی گمشدگی کے غم میں اس کا انتقال ہو جائے گا۔

ان پیر صاحب کے مرنے کے بعد ان کے ایک خدمت گار نے رقم پر قبضہ کرلیا اور فرار ہو گیا۔ دوسرے خدمت گار کو معلوم ہوا تو اس نے اس کا تعاقب کیا اور راستے ہی میں اسے قتل کر ڈالا۔ راہ گیروں نے دیکھا تو اسے پکڑ لیا اور قصاص کے طور پر اسے بھی قتل کر دیا۔

حضرت میاں میرؒ کا دوسرا فرمان بھی پورا ہوا۔

☆......☆

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت میاں میرؒ ایک باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یادالٰہی میں مشغول تھے کہ ایک شکاری آیا اور اس نے ایک فاختہ کو نشانہ بنالیا۔ فاختہ جو کچھ دیر پہلے درخت پر بیٹھی سوز و گداز میں ڈوبی آواز میں بول رہی تھی۔ زمین پر گری اور مر گئی۔ شکاری نے جب دیکھا کہ وہ مر گئی ہے تو وہ اسے وہیں مرا چھوڑ کر چلا گیا۔ حضرت میاں میرؒ نے خادم سے فرمایا فاختہ کو اٹھا کر لے آؤ۔ یہ فاختہ ابھی کچھ دیر پہلے اپنے رب کی تسبیح بیان کر رہی تھی۔ ایک انسان کی غلیل نے اسے خاموش کر دیا۔ اسے پھر تسبیح بیان کرنے دو۔

خادم فاختہ اٹھا کر لے آیا۔ حضرت میاں میرؒ کچھ دیر اپنے ہاتھ میں لے کر اسے دیکھتے رہے پھر اس کے مردہ جسم پر ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ ”اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا۔“

مردہ فاختہ نے جھرجھری لی اور اڑ کر درخت پر بیٹھ گئی اور پھر اپنے رب کی تسبیح بیان کرنے لگی۔ شکاری ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا فاختہ کی آواز سن کر واپس آیا۔ آپ نے اس شکاری کو دیکھ کر اپنے خادم سے فرمایا۔ ”عبدالواحد! اس ظالم سے کہہ دو کہ اگر اس پرندے کو تو نے دوبارہ نقصان پہنچایا تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔“

خادم نے یہ پیغام شکاری تک پہنچا دیا۔ شکاری نے سن کر قہقہہ بلند کیا۔ ”میں نے ایسے فقیر بہت دیکھے ہیں۔ دیکھتا ہوں میرا کیا بگڑتا ہے۔“ شکاری نے کہا اور فاختہ کا نشانہ لے کر پوری طاقت سے غلیل کھینچی اور دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا پھر ہمت کر کے اٹھا اور پھر حضرت میاں میرؒ کے قدموں میں آ کر گر پڑا۔

”یا شیخ! میں جانتا ہوں یہ سب آپ کی بددعا سے ہوا ہے۔ مجھ پر رحم فرمایئے۔ یہ درد تو مجھے مار ڈالے گا۔“

”یہ درد وہ نہیں جو کسی دوا سے ٹھیک ہو جائے۔ یہ لاعلاج ہے اور لاعلاج ہی رہے گا۔“

”ایسا نہ کہیے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں توبہ کرتا ہوں آئندہ شکار نہیں کھیلوں گا۔ کسی پرندے کو نہیں ماروں گا۔“

”کیا میں نے تجھے منع نہیں کیا تھا؟“

”میری غلطی تھی کہ میں نے آپ کا کہا نہیں مانا۔“

”کیا تو بھوکا تھا؟“

”نہیں میں بھوکا نہیں تھا۔“

”شریعت نے صرف اس وقت شکار کی اجازت دی ہے جب کوئی بھوکا ہو، تفریح کے لیے نہیں اور وہ بھی اس پرندے کی نہیں جو تیرے ایک لقمے کے برابر بھی نہ ہو۔“

”مجھے آپ کی سب باتیں قبول ہیں۔ بس میرے ہاتھ کا درد چلا جائے پھر میں کبھی شکار نہیں کروں گا۔“

”جب تو نے پرندوں کو اذیت دینے سے توبہ کر لی ہے تو اللہ تجھے بھی اذیت نہیں دے گا۔“

الفاظ کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بالکل ٹھیک تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اس شخص نے غلیل زمین پر پھینکی۔ آپ کے قدم چومے اور باغ سے باہر نکل گیا۔ باہر جا کر یہ واقعہ لوگوں کو اس نے خود بتایا۔ ایک نے دوسرے کو بتایا اور پھر پورے لاہور میں مشہور ہو گیا۔ لوگوں میں اچھے برے سب طرح کے لوگ ہوتے ہیں بعض لوگوں نے آپ پر خدائی کا دعویٰ کرنے کی تہمت لگائی کہ انہوں نے مردہ فاختہ کو زندہ کر دیا تھا۔ بعض نے شعبدہ کہا اور یہ کہہ دیا کہ وہ شکاری حضرت میاں میرؒ کا بھیجا ہوا آدمی تھا اور وہ فاختہ مری نہیں تھی۔ صرف یہ مشہور کر دیا ہے کہ فاختہ مر گئی تھی۔

یہ باتیں آپ کے مریدوں کے ذریعے آپ تک بھی پہنچیں۔ آپ نے تبسم فرمایا۔ بعض مریدوں نے بھی دبے لفظوں میں آپ سے پوچھا کہ آپ نے مردہ فاختہ کو کیسے زندہ کر دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں تو آپ نے وضاحت ضروری سمجھی۔

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ایک پیغمبر جلیل کی سنت ادا کی ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ یہ ان کی ذاتی طاقت نہیں تھی۔ یہ خالق کائنات کی بخشی ہوئی صفت تھی۔ وہ فرماتے تھے اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا، یہ نہیں کہتے تھے کہ میرے حکم سے زندہ ہو جا۔ میں نے فاختہ کی زندگی کو اللہ سے مانگا تھا۔ یہ مجھ پر اللہ کی مہربانی تھی کہ اس نے میری دعا قبول کی اور مجھے اس سے غرض نہیں کہ کوئی اسے شعبدہ کہے یا کوئی اور نام دے۔“

حضرت میاں میرؒ کے ایک خدمت گار میر محمد خرانی فرماتے ہیں کہ حاجی علی ایک نہایت پرہیزگار انسان تھے جنہیں حضرت میاں میرؒ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنا ایک واقعہ سنایا کہ ایک بار میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایران جانے کے لیے نکلا۔ اصفہان کے قریب پہنچ کر قافلے والوں کو جب تھکن محسوس ہوئی تو یہ قافلہ خیمہ زن ہو گیا۔ شدید گرمی کے دن تھے۔ لوگ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اچانک میری نظر اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت میاں میرؒ ہمارے خیمے کی طرف آ رہے ہیں۔ یقین کرنے والی بات ہی نہیں تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ کوئی بزرگ ہیں جو پیر و مرشد سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جب وہ بزرگ کچھ اور قریب آئے تو مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ یہ حضرت میاں میرؒ ہی تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اشارے سے مجھے اپنے قریب بلا رہے ہیں۔ میں سب کام چھوڑ کر پہنچا اور دست بوسی کی اور عرض کیا۔

”حضرت آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟“

”اس کو چھوڑو۔“ آپ نے فرمایا۔ ”میں تو یہ بتانے آیا ہوں کہ تم بہت بری جگہ خیمہ زن ہو۔ یہ جگہ اہل قافلہ کے لیے جائے ہلاکت ہے۔ ایک طوفان آنے والا ہے۔ اپنا مال واسباب اٹھا کر کسی اونچی جگہ لے جاؤ۔ ہو سکے تو اس کی اطلاع قافلے کے دوسرے لوگوں کو بھی کر دو۔“

میں جب لاہور سے چلا تھا تو آپ اپنے حجرۂ مبارک میں موجود تھے اور اب یہاں دیکھ رہا تھا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ یہاں کیسے تشریف لائے۔ کچھ پوچھنے سے پہلے یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی یہاں آ تو نہیں رہا ہے۔ ذرا دیر کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر پلٹ کر دیکھا تو حضرت وہاں موجود نہیں تھے۔ اب کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ سمجھ میں آ چکا تھا۔ اولیاء اللہ کے لیے اللہ تعالیٰ زمینی فاصلہ کم کر دیتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں کتنے ہی واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں کوئی با کرامت ولی اللہ پلک جھپکتے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گیا ہے۔

میں نے جلدی جلدی اپنا مال و اسباب اٹھا کر بلندی پر پہنچانا شروع کر دیا۔ مجھے دیکھ کر اہل قافلہ میں سے بہت سے میرے پاس آئے اور مجھ سے منتقلی کا سبب پوچھا۔ میں نے پیر و مرشد کے ارشادات سے انہیں بھی آگاہ کیا اور ان پر بھی زور دیا کہ وہ بھی یہ جگہ چھوڑ دیں۔

انہوں نے میرے اندیشوں کو سن کر ہنسنا شروع کر دیا۔

”ہم بے شک نشیبی علاقے میں ہیں لیکن اس موسم میں طوفان کہاں سے آئے گا۔ کوئی کہہ گیا اور تم نے یقین کر لیا۔“

”کسی نے نہیں کہہ دیا بلکہ بتانے والا ہندوستان کا پیر روشن ضمیر ہے۔ یہ کرامت کیا کم ہے کہ میں انہیں ہندوستان میں چھوڑ کر آیا تھا اور وہ کسی سواری کے بغیر یہاں تشریف لے آئے پھر میں ان کی بات کا یقین کیسے نہ کروں۔“

اکثر لوگوں نے میری بات پھر بھی نہ مانی البتہ چند لوگوں نے بات مان لی اور میرے ساتھ وہ بھی اپنا سامان اٹھا کر بلندی پر لے گیا۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ یکایک آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا۔ جو اہل قافلہ نیچے رہ گئے تھے خوشی سے بے حال ہو کر اپنے خیموں سے باہر نکل آئے۔ میرے ساتھی بھی بے حد خوش تھے لیکن مجھے حضرت کی پیش گوئی سچ نظر آ رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی اور تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ اس ہوا نے خوفناک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ خیمے اکھڑ گئے۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ دریا بھی ابل پڑا۔ لوگوں نے محفوظ پناہ گاہ کی طرف بھاگنا شروع کیا لیکن نشیبی علاقے میں کوئی محفوظ پناہ گاہ کہاں۔ سب کے سب اس طوفان کی نذر ہو گئے۔

جب میں کئی ماہ بعد لاہور واپس آیا تو میں نے مرشد سے اس راز کی بابت دریافت کیا۔ ”میں نے کھلی آنکھوں سے آپ کو اصفہان میں دیکھا۔ آخر یہ کیا راز ہے۔“

آپ نے سرگوشی میں فرمایا۔ ”تم نے جو کچھ دیکھا سمجھو کچھ نہیں دیکھا۔ یہ راز اپنے سینے میں رکھو اور شکر ادا کرو کہ تم ہلاکت سے بچ گئے۔“

آپ نمود و نمائش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اپنی حقیقت چھپانے کے لیے لباس بھی فقیروں اور درویشوں کی طرح کا نہیں تھا۔ خرقہ اور مرقع نہیں پہنتے تھے بلکہ بہت کم قیمت کپڑے کی ایک پگڑی سر پر اور موٹے کپڑے کا کرتہ زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے مسلک میں گدڑی پہننے کا رواج نہیں تھا۔ مریدوں کو بھی یہی فرماتے تھے کہ ایسا لباس پہنو جس سے عام آدمی اور فقیر میں فرق ظاہر نہ ہو۔ اس لیے آپ ذکر خفی کو پسند فرماتے تھے۔ ذکر الٰہی اس طرح ہو کہ برابر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی معلوم نہ ہو کہ آپ ذکر الٰہی میں مشغول ہیں۔ آپ زیادہ گفتگو کو بھی اسی لیے ناپسند فرماتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ذکر الٰہی میں مشغول رہا جائے۔ اسی کا نام نفس کشی ہے اور نفس کو مارنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ آپ سرہند سے لاہور تشریف لا رہے تھے کہ ایک گاؤں میں داخل ہوئے اور ایک مسجد میں قیام کیا۔ رمضان کا مہینا تھا۔ آپ نے تین دن تک کوئی چیز نہیں کھائی۔ پانی سے روزہ افطار کرتے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ چوتھی رات نماز مغرب کے بعد آپ مسجد سے باہر نکلے اور ایک مکان پر پہنچے۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی آپ دستک دینے ہی والے تھے کہ آپ کی نظر ایک خوان پر پڑی جو مختلف کھانوں سے بھرا ہوا تھا یہ شاید اللہ کی طرف سے آپ کا امتحان تھا۔

جب بھوک کی شدت نے زور باندھا تو آپ کے نفس نے آپ سے کہا۔ تم نے سوال کرنا تو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے۔ اب پیٹ بھرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ تم خیانت کرو اور کھانا اٹھالو۔ آپ کے اندر ایک کشمکش جاری ہو گئی۔ نفس کہتا تھا بھوک میں سب کچھ جائز ہے۔ آپ کہتے تھے خیانت سے سوال بہتر ہے اور سوال میں کر نہیں سکتا۔ کچھ دیر یہ جنگ جاری رہی اور بالآخر آپ نے نفس کو شکست دے دی۔ نہ سوال کیا نہ خیانت کی اور واپس آکر مسجد میں بیٹھ گئے۔ اب ایک دوسرا امتحان درپیش ہوا۔ ابھی مسجد میں آئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک لونڈی سر پر دسترخوان رکھے مسجد میں داخل ہوئی۔

"مجھے میرے مالک نے بھیجا ہے کہ مسجد میں ایک بھوکا آدمی بیٹھا ہے۔ یہ کھانا اسے دے آؤ۔ کیا تم ہی وہ بھوکے ہو؟"

"وہ بھوکا شخص میں ہی ہوں لیکن مجھے اس کھانے کی ضرورت نہیں۔"

لونڈی کھانا لے کر واپس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس کا مالک مسجد میں داخل ہوا۔ "آپ نے کھانا کیوں واپس کر دیا۔"

حضرت میاں میرؒ نے اسے تمام واقعہ سنایا اور کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میرے نفس نے مجھے ورغلایا تھا۔ اللہ کے فضل سے اسے شکست ہوئی۔ میں نے سوال بھی نہیں کیا خیانت بھی نہیں کی اور نفس کو مارنے کے لیے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

یہ ماجرا سن کر وہ شخص تو چلا گیا لیکن یہ بات پورے گاؤں میں مشہور ہو گئی۔ لوگ جھاڑ پھونک کرانے۔ دعائیں کرانے، قطار در قطار آنے لگے۔

نام و نمود سے بے زاری آپ کی صفت خاص تھی لہٰذا جب آپ نے یہ گرم بازاری دیکھی تو ایک رات خاموشی سے گاؤں چھوڑ دیا۔

جب نفس کشی کا یہ حال ہوا تو آپ اہل ثروت سے میل جول کیسے رکھتے۔ ان کی محفلوں میں جانا پسند نہ فرماتے۔ آپ کی زندگی میں صرف ایک واقعہ ملتا ہے جب آپ مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں اس کے بلانے پر تشریف لے گئے تھے اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی بعض غلط فہمیوں کو دور کرنا مقصود تھا۔

شہزادہ داراشکوہ نے لکھا ہے۔ "شہنشاہ جہانگیر اولیائے کرام اور درویشوں سے لگاؤ نہ رکھتا تھا بلکہ اس جماعت کے لوگوں کو بے دریغ اذیتیں پہنچاتا تھا۔ اس نے جب حضرت میاں میرؒ کے زہد و تقویٰ کے بارے میں سنا تو اسے آپ کو آزمانے کا خیال آیا۔ اس نے اپنے ایک مصاحب کو آپ کے پاس بھیجا جس نے یہ پیغام پہنچایا کہ شہنشاہ ہند آپ سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔ وہ آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ملاقات کے لیے قصر شاہی میں تشریف لائیں۔ حضرت میاں میرؒ نے یہ کہہ کر معذرت کرلی۔ "میں اپنی عدیم الفرصتی کے باعث شاہی حکم کی تکمیل سے معذور رہوں۔"

یہ پیغام جہانگیر تک پہنچا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی دنیادار درویش نہیں ہو سکتا جو بادشاہ کا پیغام ٹھکرا دے۔

یہ جواب سن کر جہانگیر نے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں لکھا۔ "میں ہرگز آپ کو آنے کی

زحمت نہ دیتا بلکہ خود آتا مگر میں نے آپ کا ذکر مبارک لاہور سے واپسی پر سنا۔ اگر لاہور میں آپ کے بارے میں سن لیا ہوتا تو حاضر خدمت ہو جاتا۔ اب فوری واپسی میرے لیے دشوار ہے۔ میں آپ کے دیدار کا متمنی ہوں۔ مجھے امید ہے آپ میری دعوت قبول فرمائیں گے اور تشریف لا کر ممنون فرمائیں گے۔"

حضرت میاں میرؒ نے اپنی عادت کے برخلاف یہ دعوت قبول کرلی اور طویل سفر طے کر کے قصر شاہی تشریف لے گئے۔

شہزادہ داراشکوہ مزید لکھتا ہے کہ جہانگیر اپنی عادت کے خلاف آپ کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ یہ بھی خلاف واقعہ بات تھی۔ یہ وہی جہانگیر تھا جس نے سجدۂ تعظیمی ادا نہ کرنے پر حضرت مجدد الف ثانی کو حوالہ زنداں کر دیا تھا اور اب وہ خدمت میاں میرؒ میں خود کھڑا تھا۔

یہ تھی شان حضرت میاں میر کی۔

دونوں کے درمیان بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آپ نے وعظ و تلقین فرماتے ہوئے بہت سی باتوں کی تلقین فرمائی۔ ان باتوں میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ بادشاہ کا دل پگھل گیا۔ اس کے دل کی کیفیت ہی بدل گئی۔ اس کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا تو وہ کوئی دوسرا ہی جہانگیر نظر آتا تھا۔ اب اس کی زبان پر یہ کلمات تھے۔

"آپ نے تو میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ جاہ و منصب کی اب میرے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رہی۔ جو سلطنت ہند کے خزانے میں جتنے زر و جواہر ہیں اب میرے نزدیک پتھر کا ڈھیر ہیں۔ اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ بادشاہت کو لات مار کر صوفی بن جاؤں۔"

"اے بادشاہ صوفی ہوتا ہی وہ ہے جس کی نظر میں پتھر اور جواہرات برابر ہوں۔ تم کہتے ہو تمہارے نزدیک پتھر اور جواہرات یکساں ہیں لہٰذا تم صوفی ہو۔ اصل بادشاہ تو وہی ہے جو تم ہو۔"

"آپ تو ایسی دلیلیں دے کر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"تمہارا وجود خلق خدا کی نگہبانی کے لیے ضروری ہے۔ یہ آپ کا عدل و انصاف ہی تو ہے کہ یہ فقیر بھی اپنے حجرے میں خوش ہے اور اپنا کام انجام دے رہا ہے۔"

اب جہانگیر کا اصرار تھا۔ "آپ مجھ پر توجہ دیجیے۔ مجھے اپنا جیسا بنا دیجیے۔"

باسط عظیم (1944-1999)

محمد عبدالباسط کو شعر و ادب کی دنیا میں باسط عظیم کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ گورنمنٹ بوائز اسکول سوسائٹی میں شاہ خلیل اللہ ندیم جنیدی ان کے استاد اور جناح کالج کے طالب علم و محقق خواجہ رضی حیدر کلاس فیلو رہے۔ باسط عظیم خاصے عرصے کورنگی میں مقیم رہے۔ حلقہ سلیم احمد میں جاذب قریشی اور ان کا آنا جانا خاصی مدت تک رہا۔ 1944 میں فیض آباد (یوپی انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ 1950 میں ان کے والدین انہیں کراچی لے آئے۔ ان کا مجموعہ کلام "حروف" 1998 میں شائع ہوا تھا۔ 17 جولائی 1999 کو باسط عظیم حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ مقامی انشورنس کمپنی کے اس ملازم معروف شاعر کو سخی حسن قبرستان میں آخری ٹھکانا ملا۔

آپ نے فرمایا۔ "پہلے تم مخلوق خدا کی خدمت کے لیے اپنے جیسا نگہبان مہیا کردو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر مشغول حق کر دوں گا۔"

بادشاہ نے عرض کیا۔ "مجھے کسی خدمت کا موقع دیں۔"

"تم مجھے کیا دے سکتے ہو۔"

"آپ قبول کرنے کا وعدہ تو فرمائیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

"دیکھو بادشاہ اپنے وعدے سے منحرف نہ ہو جانا۔"

"آپ مجھے ہر حال میں وعدے کا پابند پائیں گے۔"

"تو پھر میری خواہش یہ ہے کہ مجھے جانے کی اجازت دیں اور آئندہ زحمت نہ دینے کا وعدہ فرمائیں۔"

اس جواب پر شہنشاہ جہانگیر ایک مرتبہ پھر حیران رہ گیا پھر اس نے ہرن کی کھال کا بنا ہوا ایک مصلیٰ آپ کی خدمت میں پیش کیا جو آپ نے قبول کرلیا۔

داراشکوہ اس تاریخ ساز واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جس مرد آزاد نے جہانگیر سے شہنشاہ کے عطیات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو اس کے دل میں متاع دنیا کے حوالے سے کوئی خطرہ کس طرح پیدا ہو سکتا

ہے۔

انہی واقعات کے پیشِ نظر دارا شکوہ نے حضرت میاں میر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

"میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا جس کی نگاہ میں دنیا اس قدر حقیر ہو جتنی حضرت میاں میر کی نظر میں تھی۔"

پروردگارِ عالم پر توکل کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ آپ کا ایک مرید خاص آپ کے لیے لکڑی کا بنا ہوا نہایت خوب صورت عصا بنا کر لایا اور اسے بڑی محبت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ وہ عصا اپنے ہاتھ میں لے کر اٹھے اور ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ وہ عصا زمین پر پھینک دیا اور ارشاد فرمایا کہ لاٹھی پر تو اس کو بھروسا کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ پر بھروسا نہ کرتا ہو۔

آپ نے کبھی اپنے ہاتھ میں لاٹھی یا عصا لیا ہو۔

اگر کوئی شخص آپ کے پاس متواتر کھانا پکا کر لاتا تو آپ اسے منع کر دیتے۔ ایک دن خادم نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا۔

"اگر کوئی شخص پے در پے نذر بھیجے تو انسانی دل میں ایک امید سی پیدا ہو جاتی ہے پھر توکل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

☆......☆

نورالدین جہانگیر کشمیر میں سکونت پذیر تھا۔ موقع دیکھ کر بادشاہ کے مصاحبوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور مرزا حسام الدین کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے۔ بادشاہوں کے کان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس نے کسی تحقیق کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور حکم جاری کر دیا کہ دونوں بزرگ کشمیر میں حاضر ہوں۔ یہ دونوں بزرگ بلا تاخیر کشمیر پہنچ گئے۔

بادشاہ نے ان پر لگائے گئے الزامات سے انہیں آگاہ کیا۔ دونوں نے اپنی صفائی پیش کی لیکن بادشاہ کے دل میں برائی آ چکی تھی۔ اس نے دونوں کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا اور پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "مرزا حسام الدین، تمہاری سزا یہ ہے کہ دہلی سے دور کشمیر میں میری نظروں کے سامنے رہو۔"

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اور تمہارا بیٹا کابل چلے جاؤ اور پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا۔"

دونوں جانتے تھے کہ وہ بے قصور ہیں لیکن بادشاہ کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

مرزا حسام الدین تو کشمیر ہی میں رک گئے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کابل کے لیے روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچے تو انہیں حضرت میاں میرؒ کا خیال آیا۔ آپ کی کچھ ڈھارس بندھی۔ انہیں معلوم تھا کہ جہانگیر، حضرت میاں میرؒ پر بہت مہربان ہے۔ شاید وہ کوئی سفارش کر سکیں اگر سفارش نہ بھی کی تو میں ان کی زیارت کر لوں گا۔ آپ حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

محدث دہلوی کو دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا کہ محدث دہلوی سخت پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔ آخر آپ سے نہ رہا گیا اور پریشانی کا سبب پوچھا۔

"یا شیخ، کیا بات ہے۔ آپ پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔"

"کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔"

"حضور کیا عرض کروں۔ عتابِ شاہی کا شکار ہو گیا ہوں۔ ایک غلط تہمت پر سزا سنا دی گئی ہے کہ میں اور میرا بیٹا ہندوستان چھوڑ کر دہلی چلے جائیں۔ وہیں کے لیے نکلا تھا، سوچا آپ کی زیارت کرتا چلوں۔"

"شیخ آپ بھی دہلی میں رہیں گے اور آپ کا بیٹا بھی۔"

"مجھے معلوم تھا کہ بادشاہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالیں گے۔"

"مجھے بادشاہ سے کیا مطلب، مجھے تو جس سے کہنا ہے اس سے کہوں گا۔ آپ مطمئن ہو جائیں اب یہ میری ذمہ داری ہے۔"

شیخ محدث مطمئن ہو کر خانقاہ سے رخصت ہو گئے لیکن لاہور نہیں چھوڑا کہ دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔

ابھی شیخ محدث دہلوی لاہور ہی میں مقیم تھے کہ چوتھے دن جہانگیر کے انتقال کی خبر آ گئی۔ گلیوں میں ماتم ہو رہا تھا اور شیخ محدث دہلوی کے دل میں چراغاں تھا۔

وہ اپنے بیٹے کے ساتھ دہلی روانہ ہو گئے۔

☆......☆

ہندوستان کا تاریخی سفر دورِ جہانگیری سے گزر کر دورِ شاہ جہانی میں داخل ہو گیا تھا۔ شاہ جہاں کی درست انتظامی

نے دورِ جہانگیری کے انتشار پر قابو پالیا تھا کہ اچانک اس کی اپنی زندگی انتشار سے دوچار ہوگئی۔ اس کا بڑا بیٹا داراشکوہ کسی انجانی بیماری کا شکار ہوکر بستر پر آگیا۔ دربار شاہ جہانی تھا، دارالخلافہ تھا۔ نہ دواؤں کی کمی تھی، نہ وسائل ناپید تھے نہ اطباء کی کمی تھی۔ اطباء تھے کہ شہزادے کے سرہانے سے ہٹتے نہیں تھے لیکن ہر علاج ناکارہ اور ہر دوا بے اثر ہورہی تھی۔ جیسے جیسے علاج ہوتا جارہا تھا، مرض میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

ابتداء میں سب پُرامید تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اطباء بھی تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ معاملہ شہزادے کا تھا اس لیے ہندوستان بھر کے حکیم جمع تو تھے لیکن یہ کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ مرض لاعلاج ہے۔ وہ نہ کہیں لیکن شہنشاہ اور ملکہ ممتاز محل سمجھ چکے تھے کہ شہزادہ روز بروز ڈھلتا جارہا ہے۔

بادشاہ مختارِ کل ہوتا ہے۔ اسے کوئی مشورہ بھی نہیں دیا جاسکتا لیکن بعض درباری علماء نے ہمت کرکے اس سے شہزادے کی بیماری کے بارے میں بات کی۔

''حضور تمام حکیم اپنی اپنی دواؤں کو آزما چکے لیکن کوئی دوا اثر انداز نہیں ہورہی ہے۔''

''ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اب بادشاہ کو کسی روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ کوئی مردِ فقیر ہو جس کی دعائیں دوا بن جائیں۔''

''ہم آج ہی بڑے بڑے روحانی درباروں میں قاصد دوڑائے دیتے ہیں۔ دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں خزانہ شاہی کو صدقات میں لٹادیں گے۔ ہمیں داراشکوہ کی صحت سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔''

''جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔'' ایک مصاحب نے دست بستہ عرض کیا۔

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''حضرت نورالدین جہانگیر عالی قدر نے ایک مردِ فقیر سے ملاقات کی تھی۔ یہ اس فقیر کی روحانی جلالت تھی کہ ظلِ الٰہی تاج و تخت چھوڑ کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنے پر بضد ہوگئے تھے۔ اگر اس فقیر سے رجوع کیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ شہزادہ حضور صحت یاب ہوجائیں گے۔''

''ہم شہزادے کی صحت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ ہم اپنی سلطنت اسے بخش دیں گے۔ تم اس فقیر کو ہمارے حضور پیش کرنے کا بندوبست تو کرو۔''

''وہ فقیر امراء کی مجالس اور بادشاہوں کے حضور پیش ہونے کا روادار نہیں۔ لاہور کے ایک سنسان علاقے میں خلوت نشیں رہتا ہے۔''

''وہ ہماری رعایا میں ہے۔ ہمارے حکم سے سرتابی کیسے کرسکتا ہے۔''

''حضور جلال میں نہ آئیں میں سب انتظام کرلوں گا۔'' مصاحب نے کہا اور اسی روز قاصد کو لاہور کی طرف دوڑا دیا کہ جس طرح بھی ہو حضرت میاں میر کو دہلی تک پہنچانے کا بندوبست کرے۔

قاصد محلہ باغبانپورہ میں پہنچا اور حضرت میاں میرؒ کی خانقاہ کے باہر پہنچ کر رک گیا کیونکہ دروازے پر موجود ایک خادم نے اسے روک لیا تھا۔ اس خانقاہ کے دروازے کسی پر بند نہیں تھے لیکن خادموں کو ہدایت تھی کہ کوئی امیر آدمی یا اس کا ملازم داخلے کی اجازت مانگے تو پہلے حضرت میاں میرؒ سے پوچھ لیا جائے۔ خادم کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ شاہ جہاں کا قاصد دروازے پر ہے تو آپ نے اپنے خادم سے فرمایا۔

''اسے وہیں رہنے دو اور آنے کا سبب معلوم کرو۔''

خادم گیا اور واپس آگیا۔ ''قاصد کہتا ہے، وہ بادشاہ کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔''

''اس سے پیغام پوچھ لو اور اسے جانے دو۔''

''حضور وہ کہتا ہے، پیغام صرف آپ کو پہنچائے گا۔''

''اچھا اسے آنے دو۔''

قاصد اندر آیا۔ خانقاہ کے ماحول اور حضرت میاں میر کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اسے تو یہ معلوم ہورہا تھا جیسے وہ بولنا بھول گیا ہو۔ آخر حضرت میاں میر کو خود پوچھنا پڑا۔

''جلدی کہو، کیا پیغام لے کر آئے ہو۔''

''ولی عہد سلطنت بیمار ہے۔'' قاصد بہ مشکل صرف اتنا کہہ سکا۔

''تم غلط جگہ آگئے ہو۔ بادشاہ کو مشورہ دو کہ وہ کسی حاذق طبیب کو دکھائیں۔''

''تمام انسانی کوششیں کرکے دیکھی جاچکی ہیں۔ طبیبوں نے لاعلاج قرار دے دیا ہے۔''

''مجھ فقیر سے وہ کیا چاہتے ہیں؟''

''بس اتنا کہ آپ ایک نظر شہزادے کو دیکھ لیں۔''

''اگر اتنا ہی تھا تو شہزادے کو ساتھ لے آتے۔''

''شہزادے کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ دور دراز کا سفر کرسکے۔''

''فقیر کو اتنی فرصت نہیں کہ خانقاہ سے نکلے۔''

شاہی قاصد نے بہت خوشامد کی لیکن حضرت میاں میرؒ کے انکار کو اقرار میں نہ بدل سکا۔ البتہ اس قدر آمادہ ضرور ہوگئے۔ ''بادشاہ سے کہو شہزادے کو یہاں لے آئے۔ راستے کی صعوبتوں کو اللہ تعالیٰ اس پر آسان کردے گا۔''

بادشاہ، شہزادے کی طرف اب بھی تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ شہزادے کے لیے اتنی دور کا سفر کرنا مناسب نہیں لیکن اسے حضرت میاں میرؒ کی دعا پر یقین تھا۔ انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ راستے کی صعوبتوں کو اللہ تعالیٰ اس پر آسان کردے گا۔

طبیب اب بھی سفر کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن شاہ جہاں اپنے دو مصاحبوں کے ہمراہ شہزادے کو لے کر لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔

شہزادے نے اپنی تصنیف ''سکینۃ الاولیا'' میں تحریر فرمایا ہے۔ ''جب ہم لوگ حضرت میاں میرؒ کے حجرۂ مبارک میں داخل ہوئے تو بادشاہ سمیت چار اشخاص تھے۔ آپ کے ساتھ بڑی مفید گفتگو ہوئی۔ آپ نے سلام دعا کے بعد سب سے پہلے جو بات فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ عادل بادشاہ کا فرض یہ ہے کہ وہ رعایا کے حالات سے آگاہ رہے۔ اپنی سلطنت کو ہر طرح کے دشمنوں سے بچائے اور سرحدوں کی نگرانی رکھے۔ اپنی تمام کوششیں رعایا کی بھلائی اور ملک کو آباد کرنے میں لگا دے۔''

کچھ دیر دین و معرفت کی باتیں ہوتی رہیں۔

داراشکوہ ہی نے اپنی تصنیف میں آگے چل کر لکھا۔

میرے والد محترم مجھے اس وقت حضرت شیخ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے جب ہندوستان کے تمام حاذق اطباء میرے علاج سے عاجز آگئے تھے اور بظاہر میری سانسوں کا شمار ختم نظر آتا تھا مگر حضرت شیخ نے مجھے مٹی کے اس پیالے سے پانی پلایا جسے آپ خود استعمال کیا کرتے تھے پھر قدرتِ خداوندی کا کرشمہ اس طرح ظاہر ہوا کہ میں ایک ہفتے کے اندر اس طرح صحت یاب ہوگیا جیسے کبھی بیمار ہوا ہی نہیں تھا۔

شاہ جہاں نے حضرت کی یہ کرامت دیکھی تو چاہا کہ فقیر کے قدموں میں زر و سیم کے انبار لگا دے لیکن حضرت میاں میرؒ نے یہ کہہ کر بے نیازی کی شان دکھا دی کہ اگر آپ مجھے کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو بس اتنا کرم کریں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔

شاہ جہاں سوچ رہا تھا کوئی انسان ایسا بے نیاز بھی ہو سکتا ہے۔

وہ حضرت شیخ کے حکم کی پابندی کرتا ہوا دہلی کی طرف لوٹ گیا۔

وہ دہلی لوٹ آیا تھا لیکن دل اب بھی لاہور میں اٹکا ہوا تھا۔ سلطنت کے کاموں سے دل اچاٹ ہوتا جارہا تھا بالآخر تھوڑے دنوں بعد اس نے لاہور جانے اور حضرت میاں میرؒ سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔ اس ملاقات میں محبوب بیٹے داراشکوہ کی صحت یابی کا جذبہ شکر گزاری بھی شامل تھا۔

اس مرتبہ داراشکوہ پورا صحت مند تھا۔ کوئی پریشانی بھی نہیں تھی لہٰذا شاہانہ کروفر کے ساتھ دہلی سے لاہور کی طرف روانگی ہوئی اور اس شان کے ساتھ کہ ہر ہر قدم پر روپے نچھاور کیے جارہے تھے۔ اس مرتبہ وہ کسی جنگ پر نہیں جارہا تھا بلکہ اس فقیر سے ملنے جارہا تھا جس سے اس کی شاہی شکست کھا گئی تھی۔

اس نے دہلی سے لاہور تک کا سفر بادشاہوں کی طرح ضرور کیا تھا لیکن جب وہ حضرت میاں میرؒ سے ملاقات کے لیے جانے لگا تو بادشاہت کا کروفر باہر ہی چھوڑ دیا۔

اس ملاقات میں بھی بادشاہ اور داراشکوہ کے علاوہ وہی لوگ تھے جو پہلی ملاقات میں بادشاہ کے ساتھ آئے تھے۔

بادشاہ نے آپ کی خدمت میں ایک تسبیح اور ایک دستار مبارک پیش کی۔

''آپ دنیا کا مال و دولت تو قبول نہیں فرماتے اس لیے یہ کھجور کی تسبیح اور اون کی دستار ہے امید ہے قبولیت کا شرف بخشیں گے۔''

حضرت میاں میرؒ نے تسبیح قبول کرلی مگر دستار واپس کردی۔

یہ تسبیح آپ نے لے تو لی لیکن کچھ دیر توقف کے بعد تسبیح بھی داراشکوہ کو عنایت فرمادی۔

شہزادہ داراشکوہ اپنی تصنیف میں لکھتا ہے۔

''حضرت میاں میرؒ سے بادشاہ نے گفتگو کا آغاز کیا تو اس وقت آپ لونگ چبا رہے تھے اور تھوڑی دیر تک چبانے کے بعد انہیں پھینک دیتے تھے۔ مجھے حضرت میاں میرؒ کے چبائے ہوئے لونگ بہت پسند آرہے تھے اور میں ان کو عقیدت و محبت کے ساتھ اٹھا کر کھاتا جاتا تھا۔ ان لونگوں کے چبانے سے میری عقیدت و اخلاص بڑھتی جارہی تھی۔

میرے دل میں انتہا کی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی آپ کے مریدوں میں شامل ہو جاؤں چنانچہ میں نے اسی مجلس میں آپ سے بیعت ہونے کا ارادہ کیا۔ میں نے ان لوگوں کے کھانے سے اس قدر عظیم فوائد ملاحظہ کیے کہ میں بتا نہیں سکتا کہ میں نے کیا کچھ حاصل کیا۔ ان لوگوں کے کھانے سے میری زبان کو قوت بیان حاصل ہوئی اور طبیعت کو کلام میں موزونیت حاصل ہوگئی اور مجھے امید ہے کہ میں قیامت کے دن حضرت میاں میرؒ کی بارگاہ اقدس کے گداگروں میں اٹھایا جاؤں گا۔"

اس کے بعد بادشاہ نے اجازت چاہی۔ حضرت میاں میرؒ نے اجازت مرحمت فرما دی پھر میں اکیلا ہی حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سر آپ کے مبارک قدموں پر رکھ دیا۔ آپ نے بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھا اور مجھے رخصت فرمایا۔

☆......☆

سکنتہ الاولیا میں دارا شکوہ لکھتا ہے۔

آپ کا رنگ گندمی تھا جس میں ملاحت موجود تھی۔ پیشانی بلند تھی جس سے کرامت و سعادت کے آثار نمایاں تھے۔ آپ کی ریش مبارک مٹھی بھر تھی جو آخری عمر میں سفید ہوگئی تھی۔ آپ کا قد درمیانہ تھا اور آپ کثرت ریاضت کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔

کرامات ظاہر کر کے داد و تحسین وصول کرنا اور فخر میں مبتلا ہونا آپ کا شیوہ نہیں تھا لیکن بعض اوقات کسی کرامت کا اظہار وقت کی ضرورت بن جاتا تھا۔

ایک مرتبہ دارا شکوہ کے استاد حضرت اخوند میرک حضرت میاں میرؒ سے ملاقات کے لیے آپ کی خانقاہ میں پہنچے۔ دارا شکوہ نے چلتے وقت ایک رقعہ لکھ کر اپنے استاد کو دے دیا تھا کہ اسے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر دینا لیکن جب ملاقات ہوئی اور گفتگو کا سلسلہ چلا تو ان کے ذہن سے اتر گیا کہ کوئی رقعہ بھی انہیں دیا گیا تھا۔

گفتگو کے دوران اچانک انہیں یہ خیال آیا کہ انہوں نے آج تک حضرت شیخ کی کوئی کرامت نہیں دیکھی۔ حضرت میاں میرؒ روشن ضمیر تھے۔ ان پر فوراً منکشف ہو گیا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ اب وقت کی ضرورت یہ تھی کہ ان کی اس خواہش کو پورا کیا جائے۔ حضرت میاں میرؒ نے ہاتھ بڑھایا اور وہ رقعہ نکال لیا جو انہوں نے دارا شکوہ سے لے کر اپنی دستار میں رکھ لیا تھا اور اوّل سے آخر تک پڑھ کر سنا دیا جب کہ یہ دور وہ تھا جب آپ کی بینائی کمزور ہو گئی تھی اور کوئی کتاب یا خط پڑھنے سے قاصر تھے۔

اخوند میرک صاحب کے لیے یہ کرامت ہی تو تھی کہ حضرت میاں میرؒ نے ان کے دل کا حال جان لیا اور یہ بھی جان لیا کہ خط دستار میں رکھا ہوا ہے۔

☆......☆

حضرت میاں میرؒ کے ایک مرید خاص تھے جن کا نام شیخ عبدالواحد تھا۔ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا کرتے تھے اور شب و روز آپ کی خدمت میں بسر کرتے تھے۔

ایک دن حضرت میاں میرؒ کامران کے باغ کے سامنے دریا کے کنارے لیٹے ہوئے تھے۔ شیخ عبدالواحد آپ کے پاؤں داب رہے تھے۔ ذرا آرام ملا تو آپ نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو شیخ عبدالواحد کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھے۔

"عبدالواحد! کیا بات ہے، میں تمہیں خوف زدہ دیکھ رہا ہوں۔"

"حضرت ایک سانپ ہماری طرف آرہا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً ہٹ جانا چاہیے۔" شیخ عبدالواحد کی یہ حالت تھی کہ بولا نہیں جا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ اسے آنے دو۔ ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔"

شیخ عبدالواحد پر اب بھی خوف طاری تھا لیکن حضرت میاں میرؒ اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے پھر جب وہ سانپ بالکل قریب آگیا تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

دریا کا پانی بہہ رہا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا اور ایک ہیبت ناک سانپ بالکل نزدیک آچکا تھا۔ خوف کا عجیب عالم تھا۔ شیخ عبدالواحد نے دیکھا کہ سانپ نے نہ تو اپنا راستہ بدلا نہ کوئی نقصان پہنچایا بلکہ اپنا پھن حضرت میاں میرؒ کے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

"بس اب جاؤ۔" حضرت میاں میرؒ نے فرمایا۔

سانپ نے اپنا پھن زمین سے اٹھایا اور سیدھا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ حضرت میاں میرؒ ان آوازوں کو غور سے سن رہے تھے۔ جب یہ آوازیں نکلنا بند ہو گئیں تو حضرت نے فرمایا۔

"چلو ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔"

سانپ نے رینگنا شروع کیا اور آپ کے گرد تین چکر

لگا کر خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔

شیخ عبدالواحد ذرا دور دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ جب سانپ چلا گیا تو انہوں نے حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں عرض کیا۔

"حضرت اگر مناسب ہو تو مجھے بتائیے۔ یہ سب کیا تھا جو میں نے دیکھا۔"

"کچھ نہیں تھا۔ اس سانپ نے قسم کھائی تھی کہ وہ جب بھی مجھے دیکھے گا میرے گرد تین چکر لگائے گا۔ وہ اپنی قسم پوری کرنے آیا تھا۔"

شیخ عبدالواحد کی آگے ہمت نہیں تھی کہ کچھ پوچھتے۔

حضرت میاں میرؒ بذریعہ کشف آنے والے واقعات کے بارے میں معلوم کرلیا کرتے تھے۔ اس میں بھی کسی نمائش کا دخل نہیں تھا بلکہ بعض مخلصین کو نقصان سے آگاہ کرنا ہوتا تھا۔

حضرت میاں میرؒ کے ایک عقیدت مند صوفی ملا مسکین بدخشاں کے رہنے والے تھے۔ عرصہ دراز سے لاہور میں مقیم تھے اور کئی برسوں سے اپنے گھر نہیں گئے تھے۔

ایک روز حضرت میاں میرؒ نے عالم کشف میں کوئی ایسی بات دیکھی کہ انہیں ان کے وطن جانے کا مشورہ دیا۔

"صوفی مسکین! تم اپنے وطن جاؤ اور اپنے گھر والوں سے ملو۔"

"حضور میں اتنی استطاعت نہیں رکھتا۔" ملا مسکین نے کہا۔

حضرت میاں میرؒ نے دوبارہ حکم دیا۔ "کچھ بھی ہو، اپنے وطن جاؤ اور اپنے گھر والوں کی خبر لو۔"

آپ کا اتنا اصرار دیکھ کر ملا مسکین کو شک ہوا کہ کوئی بات ضرور ہے ورنہ حضرت وطن واپسی پر اتنا زور نہ دیتے۔ انہوں نے فوراً بندوبست کیا اور بدخشاں کی طرف روانہ ہوئے۔

سفر کی صعوبتیں گزار کر بدخشاں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ جب گھر کے نزدیک پہنچے تو گھر کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ روشنی کا انتظام بھی خوب کیا گیا تھا جیسے کوئی تقریب ہو۔ گھر کے باہر کھانے کی دیگیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

"بھائی یہ ملا مسکین کا گھر ہے جو مدت ہوئی ہندوستان کی طرف گئے تھے پھر ان کے انتقال کی خبر یہاں آئی۔ اس خبر کو بھی بہت دن ہو گئے۔ ان کی بیوہ کا آج نکاح ہے۔ کچھ ہی دیر میں نکاح ہونے والا ہے۔

اب ملا مسکین کو حضرت میاں میرؒ کا خیال آیا کہ وہ وطن واپسی پر اتنا زور کیوں دے رہے تھے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے ہوش ہو گئے۔ انہیں گرتے ہوئے دیکھ کر لوگ بھاگے ہوئے آئے۔ ان کے عزیز و اقارب بھی آگئے جنہوں نے ان کو پہچان لیا۔ ہر طرف شور مچ گیا کہ ملا مسکین زندہ ہیں۔

جو لوگ دولہا کے ساتھ برات کی شکل میں آئے تھے۔ یہ خبر سن کر سخت پریشان ہوئے اور خاموشی سے واپس چلے گئے۔

ملا مسکین چند دن اپنے گھر میں رہے اور پھر گھر میں اخراجات دینے کے بعد لاہور کی راہ لی اور سیدھے حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت میاں میرؒ نے انہیں دیکھا تو تبسم ریز ہوئے اور فرمایا۔ "اگر تم وہاں پہنچنے میں تھوڑی سی دیر کر دیتے تو بڑی مصیبت ہو جاتی۔"

یہ آپ کی دوسری کرامت تھی کہ ملا مسکین نے ابھی کچھ نہیں بتایا تھا مگر حضرت میاں میرؒ کو معلوم ہو گیا کہ وہاں کیا گزری ہے۔

☆......☆

دارا شکوہ نے اپنی تصنیف "سفینۃ الاولیاء" میں تحریر کیا ہے۔ "آپ کے ایک خادم بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت میاں میرؒ بہت ضعیف ہو گئے تو آپ نے باغوں میں جانا چھوڑ دیا۔ اکثر اوقات اپنے حجرۂ مبارک کے اندر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور باہر نہ جاتے۔ گرمی کی راتوں میں آپ حجرۂ مبارک کی چھت پر عبادت میں مصروف رہتے۔"

ایک شب آپ نے اپنے خادم سے فرمایا۔ "پانی کا آب خورہ اور پنکھا میرے پاس رکھ کر تم سو جانا۔ آپ کے حکم کے مطابق میں نے پنکھا تو رکھ دیا لیکن پانی کا آب خورہ رکھنا بھول گیا اور بالا خانے سے نیچے آگیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یاد آیا کہ میں نے آپ کے پاس پانی تو رکھا ہی نہیں چنانچہ میں اٹھا اور آب خورہ پانی سے بھر کر اوپر لے گیا۔ چھت پر آپ کو موجود نہ پایا۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا پھر سوچا ممکن ہے حجرے میں تشریف رکھتے ہوں۔ آپ وہاں بھی نہیں تھے۔ میں نے جب ہر جگہ تلاش کر لیا تو خدائی راز سمجھ کر تلاش ترک کر دی مگر جاگتا رہا۔ فجر کا وقت ہو گیا۔ آپ نے اوپر سے آواز دی کہ وضو کے لیے پانی لے کر آؤ۔ میں فوراً وضو کے لیے پانی لے کر پہنچا اور دریافت کیا کہ آپ کہاں تشریف

لے گئے تھے۔ میں آپ کو پانی دینے اوپر آیا تھا لیکن آپ نہیں تھے۔ آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں تو یہیں تھا اس لیے کہ جھوٹ میں شمار ہوتا۔ آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ خادم نے کہا۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا اور میری حیرانی اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ آپ سے اصل حقیقت دریافت نہ کرلوں۔ میں نے آپ کو ہر جگہ تلاش کیا آپ یہاں نہیں تھے۔ خادم کے پُرزور اصرار پر آپ نے حقیقت سے پردہ اٹھایا۔

”بتاتا ہوں لیکن عام لوگوں کو نہ بتانا۔ آج کی رات میں غارِ حرا میں گیا ہوا تھا۔ جو روحانی کشائش اور انشراح دوسرے مقام پر چالیس سال میں حاصل ہوتی ہے وہ غارِ حرا میں صرف ایک رات کی عبادت کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے اور سینہ کشادہ ہو جاتا ہے۔“

☆......☆

اب آپ کی ظاہری حیاتِ طیبہ کے اختتام کے چند دن باقی رہ گئے تھے۔ آپ اسہال کے مرض میں مبتلا ہوئے تو خادمین کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر ہے کیونکہ اکثر بزرگانِ دین کا انتقال اسی مرض میں مبتلا ہو کر ہوا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ پیٹ کے عارضے میں ہلاک ہونے والا شہید ہے۔

خانقاہ کی فضا بوجھل تھی، ہر آنکھ اشکبار اور ہر چہرہ اداس تھا۔ آنے جانے والوں کے ذریعے یہ خبر پہنچی تو معتقدین نے خانقاہ کا رخ کیا کہ آخری مرتبہ زیارت نصیب ہو جائے پھر نہ جانے کیا ہو۔ لاہور شہر کا حاکم وزیر خان بھی آپ کی عیادت کو پہنچا۔ وہ کسی عام آدمی کی طرح خانقاہ کے باہر کھڑا تھا اور التجا کر رہا تھا کہ اسے حضرت میاں میر تک پہنچا دو۔ خادموں نے اس کی آمد کی اطلاع حضرت میاں میرؒ کو پہنچائی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اسے واپس بھیج دو۔ وزیر خاں کو آپ کے ارشاد کے بارے میں بتایا گیا تو اسے مایوسی ضرور ہوئی لیکن اسی طرح کھڑا رہا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو اس نے خادم کو پھر مجبور کیا کہ وہ اندر جا کر اس کی موجودگی کی اطلاع کرے۔ اس مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اندر بلا لو مگر بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اتنی ہی عیادت کافی ہے۔

وزیر خاں آپ کے حجرے میں گیا اور حکم کے مطابق بیٹھنے کی جسارت نہ کر سکا۔ کھڑے کھڑے عرض کیا۔ ”حضور! حاذق طبیب ساتھ لایا ہوں تاکہ آپ کا علاج ہو سکے۔“

آپ نے اس کی طرف دیکھے بغیر فرمایا۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے حکیم مطلق اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔“

اس کے بعد وزیر خاں کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اجازت لی اور سر جھکا کے خانقاہ سے باہر نکل آیا۔

یہ دن خیریت سے گزر گیا لیکن دوسرے دن چہرے پر اضطراب کے آثار نظر آنے لگے۔ آپ کے ایک مریدِ خاص میاں شیخ لاہور میں آخری وقت میں آپ کے پاس تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے حضرت شیخ کو حالتِ نزع میں دیکھا۔ آپ کے لبوں کو آہستہ آہستہ جنبش ہو رہی تھی جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ میں نے قریب پہنچ کر سننے کی کوشش کی آپ کی زبان پر اللہ اللہ کا ورد تھا۔ اچانک اضطراب ختم ہو گیا اور چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ شاید دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اٹھانے ہی لگے تھے کہ آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ (17 ربیع الاول 1045ھ)۔

حضرت نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ مجھے میرے دوستوں کے درمیان دفن کرنا۔ یہ وہ مقام تھا جسے اس وقت ہاشم پور کہتے تھے۔ آج کل یہ آبادی حضرت میاں میرؒ کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں آپ کا مزارِ مبارک ہے۔

شہزادہ دارا شکوہ اس وقت اکبر آباد میں تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ میں حضرت میاں میرؒ کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوں۔ آپ مجھ سے ارشاد فرما رہے ہیں، تو ہماری نماز جنازہ ادا کر۔ یہ خواب دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔ سخت بے قرار ہوا کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے۔

چند دنوں بعد مجھے اکبر آباد میں اطلاع ملی کہ فلاں دن اور فلاں وقت حضرت میاں میرؒ کا وصال ہو گیا۔

اب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ آپ کا شاندار مقبرہ تعمیر کرائے۔ اس نے تعمیر کا کام عقیدت و احترام سے شروع کیا مگر ابھی تعمیر کا کام جاری تھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس کے بعد عالمگیر خود مزارِ مبارک پر حاضر ہوا اور اس کے ہاتھوں مزارِ مبارک کی تعمیر کا کام مکمل ہوا۔

ماخذات

سکنۃ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ، تحفۃ الکرام (ترجمہ)، اللہ کے ولی، خان آصف، ولی اللہ، محمد الیاس عاد

باغیچہ کا ماحول بہت خوشگوار تھا۔

بہار نے ہر سو اپنے ڈیرے جما رکھے تھے۔ فضا میں بشاشیت کی خوشگوار لہریں سرسراتی ہوا کے ساتھ مدغم ہو کر بدن میں سرایت کرتیں تو ایک جاں فزا سی پھریری دوڑ جاتی۔ کھلے ہوئے پھولوں اور نباتات کی مہک کے ساتھ نرم چمکیلی دھوپ نے باغیچہ کو ارضی جنت کا سا روپ دے رکھا تھا۔

وہ کسی خوش رنگ تتلی ہی کی طرح ادھر اُدھر منڈلاتی پھر رہی تھی۔

تلاش

زویا اعجاز

وہ تمام عمر سچی محبت کی تلاش میں پھرتی رہی۔ ایک کے بعد ایک ہاتھوں کو تھامتی رہی، دھوکا کھاتی رہی، اپنے دکھ کو نظم کرتی رہی۔ لوگ اس کی شاعری کو اس کا تخیل سمجھتے رہے اور وہ مشہور ہوتی رہی لیکن جب دکھ کا سمندر پایاب نہ رہا تو اس نے خودکشی کا راستہ چُن لیا

ایک معروف شاعرہ کا زندگی نامہ جس کی زندگی غم و الم کی تصویر تھی

"دھیان سے قدم اٹھاؤ بیٹا! کہیں گر نہ جانا۔" ایک جانب بیٹھے مرد نے اسے شفقت سے مخاطب کیا تو وہ ٹھٹک گئی۔

اسی پل اس کی نظر پھول پر بیٹھے ایک بھنورے پر پڑی۔ یہ اس کے لیے بہت انوکھی چیز تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" مرد سے اس کا انہماک پوشیدہ نہ رہ سکا۔

"یہ کیا ہے ڈیڈی؟" اس نے پھول کی طرف اشارہ کیا۔

باپ چند قدم اٹھ کر اس کی جانب آیا اور اس کی نگاہوں کا مرکز دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"یہ تو پھول ہے۔"

"اس کے اوپر کیا ہے؟" وہ ایک متجسس روح تھی اس لیے مطمئن نہ ہو پانے تک یونہی سوال کیا کرتی تھی۔

"وہ ایک بھنورا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے ڈیڈی؟" اس نے معصومیت سے ایک اور سوال کیا۔

"یہ پھولوں کا رس چوستا ہے۔"

"اس سے پھول کو تکلیف ہوتی ہو گی ناں؟"

"یہ کیسے سوچا بھلا تم نے؟"

"مجھے کچھ روز پہلے انجکشن لگا تھا' سوئی چبھی تھی' درد بھی ہوا تھا تو اسے بھی ایسے ہی درد ہو رہا ہو گا۔"

"نہیں میری جان! اسے درد نہیں ہو گا۔"

بچی سوچ میں پڑ گئی۔ اگر کوئی اور فرد یہ بات کہتا تو وہ کبھی تسلیم نہ کرتی لیکن اپنے والد کا کہا ہر لفظ اس کے لیے حرف آخر تھا۔

اب وہ چہل قدمی کرنے لگے تھے۔ تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ درخت پر شہد کی مکھیوں کا ایک چھتا نظر آیا۔ وہ ایک بار پھر وہیں رک گئی اور پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے تالیاں بجانے لگی۔ باپ نے اس کا مدعا بھانپ لیا اور مسکراتے ہوئے اپنے پاس منڈلاتی ایک مکھی کو مٹھی میں دبوچ لیا۔

"یہ کاٹ لے گی ڈیڈی!"

"نہیں! یہ آپ کے ڈیڈی کو کبھی نہیں کاٹ سکتی۔" وہ اعتماد سے بولا۔

بچی کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔ یہ ہمیشہ ہی اس کا پسندیدہ مشغلہ ہوتا تھا۔ وہ بھی چونکہ بیٹی کی پسند سے خوب آگاہ تھا اس لیے ہر بار ایک نئے سرے سے یہ کھیل کھیلنے کے لیے تیار رہتا۔

"کیا میں اسے ہاتھ میں پکڑ کر دیکھ لوں؟" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"ہاں! ضرور دیکھو!" اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں وہ مکھی اس طرح تھام رکھی تھی کہ اڑ نا ناممکن امر تھا۔

بچی نے جوش اور سنسنی سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور لمس محسوس کرتے ہی بے اختیار ڈر کر فوری پیچھے کر لیا۔

"ارے! ڈر تی کیوں ہو؟ یہ بالکل نہیں کاٹے گی۔"

"اگر کاٹ لیا تو؟"

باپ نے مسکراتے ہوئے اس مکھی کے ننھے سے جسم پر اپنی انگلی پھیری اور پھر بیٹی سے مخاطب ہوا۔

"لو بھئی! ڈیڈی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اب یہ تمہیں بالکل نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

بچی نے والہانہ نظروں سے باپ کو دیکھا اور اعتماد سے اس مکھی کو اسی کی طرح اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اسے بالکل بھی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ وہ انہماک اور اشتیاق سے اس کے پروں اور جسمانی ساخت پر غور کرنے لگی۔ اس وقت وہ اپنی تمام تر ذہانت' سمجھ بوجھ اور سوالات کے باوجود ایک باریک سا نکتہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کے والد نے ہمیشہ کی طرح 'نر مکھی' پکڑی تھی جس میں ڈنک مارنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔

اس سہ پہر ایک بار پھر 'اوٹو پلیتھ' کا بت اس کی ننھی سی بیٹی 'سلویا' کے دل میں بہت بلند ہو گیا تھا۔ سلویا نے چپکے سے اپنے اونچے لمبے' وجیہہ' خوش رو' خوش پوش' شفیق باپ کی جانب دیکھا اور فخریہ انداز میں سوچا۔ "میرے ڈیڈی دنیا کے بہترین ڈیڈی ہیں۔ انہیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور مکھی کو اپنی مٹھی میں کر سکتے ہیں۔"

"اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔" اوٹو نے بیٹی سے کہا۔

سلویا نے بخوشی اثبات میں سر ہلایا اور اس کی انگلی تھامے واپسی کے سفر پر گامزن ہو گئی۔

☆......☆

تین سالہ سلویا اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا تھی۔

اس کی والدہ 'اوریلیا پلیتھ' کا تعلق آسٹریائی نسب سے تھا اور والد 'اوٹو ایمل پلیتھ' کا جرمن قوم سے تھا تاہم ان کی رہائش امریکا کے علاقہ بوسٹن میں تھی۔ چالیس سالہ اوٹو اپنی بیٹی کے لیے ایک مثالی باپ تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جوڑا تھا۔ اوٹو 'ماہر علم الحشرات' تھا۔ حیاتیات کا ایک قابل پروفیسر ہونے کے باعث اپنے

مضمون پر اسے مکمل دسترس حاصل تھی۔ بوسٹن یونیورسٹی کا ہر دلعزیز معلم اپنی زندگی میں بے حد کامیاب تھا۔ شہد کی مکھیاں اس کی دلچسپی کا خصوصی مرکز تھیں اور ایک سال قبل ہی 1934 میں اس نے "Bumblebess and Their Ways" نامی ایک کتاب لکھی تھی۔

سلویا کی پیدائش 27 اکتوبر 1932 میں 'ییلا چوسٹس میموریل اسپتال' میں ہوئی تھی۔ وہ پہلوٹھی کی اولاد تھی اس لیے والدین نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا۔ وہ سبک نقوش اور چمکتی آنکھوں والی ایک من موہنی بچی تھی جس نے کم عمری ہی سے اپنے اردگرد موجود چیزوں کو ذہانت بھرے سوالوں سے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اڑھائی سال تک اس نے اکلوتی اولاد کی بھرپور زندگی گزاری اور پھر 27 اپریل 1935 کو 'وارن' کی آمد نے ان سب کی زندگی مکمل کر دی۔

سلویا کو اپنا یہ چھوٹا بھائی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ حیرانی اور خوشی سے اس کے ننھے منے ہاتھوں' انگلیوں اور گالوں پر ہاتھ پھیرتی تو محبت اور خوشی کا ایک انوکھا احساس اس کے تن بدن میں سرایت کر جاتا۔ بوسٹن کے مضافاتی علاقہ 'جمائیکا پلین' میں 24 Prince Street پر واقع یہ گھر اس کے لیے خوشیوں' مسرتوں اور سکون کا گہوارا تھا۔ وہ فکر' پریشانی اور غم کے مفہوم ہی سے ناآشنا تھی لیکن زندگی نے بھی ہر ذی نفس کو اپنے مکمل رنگوں کی جھلک دکھانی ہوتی ہے۔ پھر مقابل بھلا کم عمر سلویا جیسی بچی ہی کیوں نہ ہو؟ زندگی اور تقدیر کے وار سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

سلویا پلیتھ کی زندگی میں بھی ہلچل پیدا ہونے کا وقت دبے پاؤں چلا آیا تھا۔

☆......☆

کچھ دنوں سے گھر میں عجیب ہلچل برپا تھی۔

اوریلیا کے چہرے پر کبھی پریشانی جھلکنے لگتی تو کبھی عزم کی چمک اپنا عکس دکھاتی۔ اوٹو کی کشادہ پیشانی بھی قبل ازیں کبھی شکن آلود دکھائی نہ دی تھی۔ سلویا کو کسی نامعلوم تبدیلی کا احساس ہونے لگا تو حسبِ عادت وہ والد سے سوال کیے بنا نہ رہ سکی۔

"ڈیڈی! کیا آپ پریشان ہیں؟"

"نہیں میری گڑیا! ایسا کیوں سوچا بھلا؟"

"آپ کچھ خاموش رہتے ہیں۔ مجھے سیر بھی کرانے نہیں لے جاتے۔ کہیں آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟" اس نے ایک اور خدشہ بیان کیا۔

"ہرگز نہیں! میں اپنی پیاری بیٹی سے کیونکر ناراض ہو سکتا ہوں؟" اوٹو نے محبت سے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ "ہم کل ہی سیر کے لیے جائیں گے اور خوب مزہ کریں گے۔"

سلویا مطمئن ہو کر اپنے کھیل میں لگ گئی۔ اوٹو اب بھی گہری سوچ میں تھا۔ وہ اپنی اس فطین اولاد سے بے حد محبت کرتا تھا لیکن اسے اپنے طبی اور پیشہ وارانہ مسائل سے کس طرح آگاہ کر سکتا تھا؟

وارن کی پیدائش کے بعد اس کی طبیعت بہت گری گری رہنے لگی تھی۔ صحت کمزور ہونے لگی اور مزاج میں بھی واضح سستی' بیزاری اور چڑچڑا پن پیدا ہوا۔ یہ مسائل تو رہے ایک طرف انہیں کچھ وجوہات کی بناء پر اپنی رہائش گاہ بھی بہر صورت تبدیل کرنی تھی۔ مسائل ایک انبار کی صورت میں سامنے کھڑے نظر آنے لگے تو اعصاب بھی بوجھل سے ہونے لگے۔

"پریشان مت ہوں! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اوریلیا نے اسے دلاسہ دیا۔

اپنی جاں نثار بیوی اور انمول خزانہ جیسی اولاد کے تصور نے اس کے اندر قوت ارادی کی ایک لہر پیدا کر دی اور اپنی منفی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے اس نے بیوی کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔ "ہاں! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

☆......☆

سلویا کے سامنے بیکراں سمندر پھیلا تھا۔ وہ ایک ہموار پتھر پر بیٹھی اس لامتناہی سمندر کی وسعتوں کو کھنگال رہی تھی۔ اس کے پاس ہی اوٹو بھی موجود تھا۔

"اس سمندر کا دوسرا کنارہ کہاں ہے ڈیڈی؟"

"دور...... بہت دور۔" اس نے جواب دیا۔

"کتنی دور؟" سلویا مچلی۔

"وہاں اس جانب سورج نظر آ رہا ہے کیا؟" اوٹو نے مغربی سمت میں جھکتے ہوئے نارنجی گولے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں! آ رہا ہے۔"

"وہاں ایک اور دنیا آباد ہے۔ ایک نیا جہان بستا ہے۔ وہیں اس سمندر کا دوسرا کنارہ بھی ہے۔" اس کے جواب نے سلویا کو جانے مطمئن کیا کہ نہیں لیکن اب وہ خاموش ہو گئی تھی اور گہری سوچتی ہوئی نظروں سے سمندر کی لہروں کو دیکھنے میں مگن تھی۔

اوٹو کے لیے اس کی یہ خاموشی بہت غنیمت تھی۔ وہ اس وقت بہت افسردہ اور مضمحل تھا۔ مزاج کے یہ داخلی عوامل کسی بھی

خارجی خوبصورتی سے بہلنے کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھے۔ وہ کچھ عرصہ قبل پرنس اسٹریٹ سے 92 Johnson Avenue منتقل ہو گئے تھے۔ Winthrop بوسٹن کا مشرقی علاقہ تھا۔ رہائش کی یہ تبدیلی بھی اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی تھی۔

سلویا کے لیے بھی ابتدا میں اپنے گھر سے دوری بہت مشکل ثابت ہوئی۔ پہلا گھر، پہلی محبت، پہلا حادثہ، پہلا غم اور پہلی محرومی تو یوں بھی ناقابلِ فراموش ہوتی ہے لیکن ان کے خدشات کے برعکس وہ کچھ ہی عرصہ میں بہل گئی کیونکہ یہاں اس کی شناسائی 'سمندر' سے ہوئی تھی۔

وہ چھ سال کی عمر میں ہی وہ سمندر کی خوبصورتی اور طاقت پہچاننے لگی تھی۔ بلند و بالا لہریں جب مچلتی دکھائی دیتیں تو اس کے سینے میں بھی ایک طوفان برپا ہونے لگتا۔ دھیما دھیما شور اسے ایک مانوسیت کا احساس دلاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہی شور اور اضطراب اس کے اپنے وجود میں بھی موجزن ہے لیکن فی الوقت وہ اس احساس کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے یا مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر تھی۔

"ڈیڈی!" اس نے ایک فوری خیال کے تحت اپنی خاموشی توڑی۔

"یس سلویا!"

"میں بھی سمندر کی طرح بنوں گی۔ طاقتور، بہت بڑی اور خوبصورت۔"

"بننے کی کیا ضرورت ہے بھئی؟ میری بیٹی تو اب بھی بہت اچھی اور سب سے خوبصورت ہے۔" اوٹو اس کی بات سن کر بے اختیار کھلکھلا اٹھا تھا۔ اسے اپنی پریشانی اور تفکرات بھی ایک لمحہ کے لیے بھول گئے۔

سلویا کی ذہانت اور قابلیت کا تو وہ ایک عرصہ سے معترف تھا۔ وہ بلاشبہ ایک غیر معمولی بچی تھی۔ اس کا آئی کیو لیول 160 تھا۔ عالمی آبادی میں ایسے افراد انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ..... ہیں۔ اعلیٰ .... ذہانت، حساسیت، گہری سوچ، اضطراب، جذباتیت اور تخلیقی توتیں ان کی اضافی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اوٹو بذاتِ خود شعبہ تدریس سے منسلک تھا اس لیے باعلم تھا کہ ان بچوں کو ذہنی طور پر مطمئن کرنا اور صلاحیتوں کو مثبت راہوں پر متعین کرنا بالکل آسان نہیں ہوتا۔ ان کا ذخیرہ الفاظ ہم عمر بچوں کے برعکس دوگنا ہوتا ہے اور ذہانت ہی ان کی معاشرتی زندگی میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ وہ الگ تھلگ رہنا پسند کرتے ہیں اور بالآخر اپنی ذات ہی کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔

ذہین بچوں کو ایک نارمل زندگی فراہم کرنے کے لیے والدین اور اساتذہ کو ہمیشہ ہی بہت مسائل کا سامنا رہتا ہے اور حیاتیات کے قابل پروفیسر اوٹو پلیتھ کو اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی میں مسائل و مشکلات کا ایک انبار نظر آیا تو وہ ایک بار پھر افسردہ ہو گیا۔

"کاش! میں اس مسئلہ سے دوچار نہ ہوتا اور اپنی اولاد کو ایک صحت مند، بامقصد زندگی فراہم کر سکتا۔" اس کے ذہن میں ایک مایوس سوچ ابھری۔

سورج سمندر کی آغوش میں چھپ گیا تھا۔ وہ دونوں مختلف کیفیات میں گھر سے گھر لوٹ آئے۔

☆......☆

سلویا سے اپنے باپ کی پریشانی پوشیدہ نہ تھی۔ وہ اوٹو سے والہانہ محبت کرتی تھی اور یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس کی زندگی اور خوشی کا مدار اوٹو ہی کی ذات تھی۔ سلویا کی اس سے عقیدت غیر فطری حد تک بڑھ چکی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات نقش تھی کہ اوٹو ایک سپر ہیرو ہے جس کی خوبیاں اور ذات ناقابلِ تسخیر ہے۔ وہ اپنے والد کو معبودیت کی سطح پر فائز کر چکی تھی جس کے بعد کسی اور رشتہ یا انسان سے اس کا تعلق ایک بے معنی سی شے تھا۔

اوٹو دراصل وارن کی پیدائش کے بعد ہی بہت سے طبی مسائل کا شکار تھا اور یہی وہ وقت تھا جب اس کا ایک قریبی دوست پھیپھڑوں کے سرطان میں مبتلا ہو کر زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ دوست کی بیماری اور ابدی جدائی نے اس کے مزاج پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے اور اسے وہم میں مبتلا کر گیا کہ وہ بھی اسی سرطان میں مبتلا ہو گیا ہے۔

سرطان کا خوف ایک عفریت کی طرح اس کے وجود سے لپٹ گیا اور اس نے اپنے ہر جسمانی مسئلہ کو اسی سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مسائل ناقابلِ حل ہوتے چلے گئے۔

سلویا اپنی زندگی کے آٹھ پڑاؤ مکمل کر چکی تھی۔ اس کی سالگرہ ہمیشہ ایک خوشگوار مرحلہ ہوا کرتی تھی۔ اس وقت اسے مرکزِ نگاہ بننے کا بہت شوق ہوتا تھا اور ستائیس اکتوبر کا دن یادگار بنانے کے لیے تو وہ ہمہ وقت کوشش کیا کرتی تھی لیکن آٹھویں سالگرہ پر ہر خوشی گہنائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اوٹو کی طبیعت بہت خراب تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کے پاؤں پر ایک زخم ہوا تھا جو علاج اور توجہ کے باوجود بگڑتا چلا گیا۔ ڈاکٹرز نے قطع عضو کا

حتمی فیصلہ سنایا تو اسے اپنے پاؤں سے محروم ہونا پڑ گیا۔

آٹھ سالہ سلویا کے ذہنی تصورات اور عقیدت کے بلند و بالا بت کے لیے یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس کا خوبصورت، پرکشش، چاق و چوبند، ہمہ وقت مسکرانے اور محبت کی خوش رنگ تتلیاں اس پر نچھاور کرنے والا باپ بے حد کمزور، لاغر اور لاچار بن چکا تھا۔ ان حقائق کو تسلیم کرنا بہت مشکل تھا اور سلویا کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس مشکل سے نجات کے لیے اس کے پاس کوئی دوست تھا اور نہ ہی کوئی رشتہ۔ اوریلیا سے اس کے تعلقات بھی بہت واجبی تھے۔ اس نے ساری زندگی اوٹو کی ذات کے گرد پروانوں کی طرح رقص کیا تھا اور اس محبت میں کسی دوسرے فرد کی کبھی گنجائش ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سلویا پلیتھ دھیرے دھیرے اپنی ذات کا اعتماد کھو رہی تھی اور دوسری جانب اوٹو پلیتھ اپنی بیماری سے لڑتا موت کی سرحد کے قریب پہنچ چکا تھا۔

آٹھویں سالگرہ کے ایک ہفتہ بعد 5 نومبر 1940 کے ایک بے رحم دن میں سلویا اپنی پہلی محبت سے دائمی محروم ہو گئی۔ اوٹو کی تمام تر قابلیت، ذہانت، چستی اور علم بروقت یہ جان ہی نہ پائے کہ وہ پھیپھڑوں کے سرطان میں نہیں بلکہ شکر کی بیماری (ذیابیطس) میں مبتلا ہے جو ایک قابلِ علاج مرض تھا۔

☆......☆

گھر کا ماحول بہت سوگوار تھا۔

سلویا کو ہر جگہ اپنے باپ کی شبیہ دکھائی دیا کرتی۔ وہ ذہنی طور پر اس موت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ اس نے ہمیشہ والد کے لیے معبودیت کے جذبات محسوس کیے تھے اور اس کے خود ساختہ نظریات و عقائد کے تحت اوٹو کو موت سے استثنیٰ حاصل تھا۔

کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ سلویا کو دانستہ طور پر تنگ کرنے کے لیے کہیں روپوش ہو گیا ہے اور جلد ہی سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے گا لیکن جب اس کی تدفین کے مراحل یاد آتے تو دل پر ایک زوردار گھونسا لگتا اور یقین کی کرچیاں سنبھالنی مشکل ہو جاتیں۔

اس ناگہانی موت کے نتیجہ میں صرف ماہر علم الحشرات اور حیاتیات کا پروفیسر ہی زندگی کی بازی نہیں ہارا تھا بلکہ سلویا کے وجود میں بھی ایک اعتماد اور یقین کی موت ہو گئی تھی۔

مذہب اور خدا پر بھروسا بہت بری طرح مجروح ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں یتیمی نے ایک نہیں، بے شمار خلا پیدا کر دیے تھے جو مستقبل قریب میں اس کی زندگی کو کسی آکٹوپس کی طرح اپنے شکنجہ میں جکڑنے والے تھے۔

☆......☆

"مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ زندگی سے بھرپور انسان تھا۔ ابھی تو اس نے ایک طویل زندگی بسر کرنی تھی۔" اوریلیا کے سامنے بیٹھے شخص نے حقیقی تاسف سے سر ہلایا۔

"یقین تو اب تک ہمیں بھی نہیں آ سکا۔ وہ ایک بہترین شوہر اور مثالی باپ تھا۔" اوریلیا کے الفاظ نے سلویا کے دلی جذبات کی ترجمانی کی۔

اوٹو کا ایک سابقہ دوست ان سے تعزیت کے لیے ملنے آیا تھا اور ایسے کسی بھی موقع پر وہ ان کے آس پاس رہنا ہی پسند کرتی تھی۔ والد کا ذکر اور گفتگو اب بھی اس کی کمزوری تھی۔

"ذیابیطس ایک قابلِ علاج مرض ہے۔ اس نے اپنے معالجہ پر توجہ کیوں نہ دی؟" نووارد بے حد حیران تھا۔

"وہ سمجھتے کہ انہیں پھیپھڑوں کا سرطان لاحق ہو گیا ہے۔ اس کا ایک دوست بھی اسی مرض کی وجہ سے موت کی وادی میں چلا گیا۔ اوٹو کو اپنی بیماری کی ساری علامات بھی ویسی ہی محسوس ہوتیں۔"

"حیران کن...... قطعی حیران کن۔ یہ منطق اور نقطہ نظر ہی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور انسان تھا۔ اس نے اپنا باقاعدہ ٹیسٹ کیوں نہ کروایا؟ مجھے یقین نہیں ہوتا کہ اتنا ذہین شخص ایسی احمقانہ حرکت بھی کر سکتا ہے جس کا خمیازہ اسے اپنی زندگی کی قیمت پر ادا کرنا پڑے۔" اس شخص نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

اوریلیا کے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ صرف یہی سوچ سکتی تھی کہ قدرت ہی نے شاید اس کے شوہر کا فہم سلب کر لیا تھا اور اسے ایسی ہی کسی عبرتناک موت سے دوچار ہونا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

دوسری جانب سلویا کے دل میں اپنے اردگرد لوگوں کے لیے تنفر کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اس کی زندگی میں اوٹو کی کمی پوری ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہر سو باپ کی خوشبو محسوس کرتی، اس کے ساتھ گزرا وقت یاد کرتی اور اپنے قریب اس جیسا ایک بھی ذی نفس نہ پا کر اپنی ذات کے خول میں مزید سمٹ جاتی۔

اسی کشمکش میں دو سال گزر گئے۔

☆......☆

زندگی اپنے معمولات پر آ چکی تھی۔

وہ تینوں نفوس اوٹو کے بغیر جینے کا سلیقہ سیکھنے لگے۔ سلویا

پڑھائی میں بہت ہوشیار تھی۔ اس نے اپنے نصابی معاملات میں اور یلیا کو کبھی کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ وہ تا حال بوسٹن میں ہی رہائش پذیر تھے تاہم لب اور یلیا اپنے بچوں کے ساتھ یہ رہائش گاہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ غالباً اس کے پیشِ نظر بیٹی کی افسردگی اور پژمردگی بھی تھی۔

1942 میں وہ سب 'ویلزلی' میں 26 Elmwood Road منتقل ہو گئے۔ سلویا اس وقت فضتھ گریڈ کی طالبہ تھی لیکن نئے اسکول میں اس نے ماں کی ہدایت کے پیشِ نظر ایک سال دہرانے کا فیصلہ کیا۔ پڑھائی میں غیر معمولی ذہانت کے باعث وہ سابقہ ادارے میں ہم عمر بچوں سے آگے تھی۔ وہاں پر اساتذہ اور منتظمین اس کی صلاحیتوں سے واقف تھے لیکن نئی جگہ اور نئے ماحول میں ہم عمروں سے معاشرتی تعامل بہرحال آسان نہیں تھا۔

سلویا نے ایک بار پھر اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ جلد ہی اسے 'اسٹار چائلڈ' کا خطاب دے دیا گیا۔ اساتذہ اس کی قابلیت سے بہت متاثر تھے۔ مدح و ستائش سلویا کو بھی بہت بھاتے۔ وہ اس نئے ماحول میں مدغم... ہونے لگی۔ ہائی اسکول تک وہ A گریڈ ہی حاصل کرتی رہی۔ انگریزی مضمون میں اسے بہت برتری حاصل تھی۔ تخلیقی لکھائی میں بھی اسے مات دینا آسان نہیں تھا۔

برسوں پہلے اوٹو کے ساتھ سمندر کنارے بیٹھ کر ساحل پر سر پٹختی اور اپنی ترنگ میں دھیمے دھیمے شور مچاتی لہروں نے اپنے بھید ظاہر کرنے شروع کر دیئے۔ اسے اپنے وجود میں موجزن اضطراب کی لہروں اور ذہن میں پنپتے خیالات بھی اسی سمندر سے مشابہ محسوس ہونے لگے۔ خیالات نے کب الفاظ کا روپ دھارا اور الفاظ کب صفحۂ قرطاس پر رقص کرنے کے لیے مچلنے سلویا کو خود بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ چشمِ فلک نے یہ منظر دیکھا کہ نو سالہ اس لڑکی کی پہلی ہی نظم 'بوسٹن ہیرالڈ' میں شائع ہو گئی۔

اس کے دل میں کروٹیں لیتی بے سکونی کو بہاؤ کا رستہ ملا تو پڑھائی سمیت دیگر معمولاتِ زندگی میں بھی ٹھہراؤ پیدا ہونے لگا لیکن ایک عادت اب بھی برقرار تھی۔ وہ کسی کو بھی دوست بنانے سے قاصر تھی۔ الگ تھلگ رہنا فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی لیکن معاشرتی تعامل جیسے فطری تقاضوں کو کب تک نظر انداز کیے رکھتی؟ اسے اپنی زندگی میں ایک دوست کی کمی بے طرح محسوس ہوتی تھی۔

سلویا اب بارہ برس کی ہو چکی تھی۔ امریکا جیسے آزاد خیال ملک میں اس عمر کی لڑکیاں اپنے ہم عمر افراد کے ساتھ زندگی سے مکمل طور پر لطف کشید کرتی ہیں لیکن ایک وہ تھی کہ کسی کی بھی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں بھی بہت ہچکچاہٹ محسوس کیا کرتی۔ اس کی ذہانت' معاملہ فہمی اور زیرک سوچ نے بھانپ لیا تھا کہ اسے ان دنیاوی رشتوں میں اپنا مطلوبہ 'معیار' ملنا بہت مشکل ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی دوست بنایا تھا اور اوٹو پلیتھ نامی اس بہترین دوست کو قضا کے بے رحم ہاتھ اس سفاکی سے اچک لے گئے کہ سلویا کا وجود بھی بنجر ہو گیا۔

وہ عمر کے ایسے حصہ میں آ چکی تھی جب دل کی بات کہہ دینے میں ہی قلب و روح کو سکون ملتا ہے۔ اس کی بھرپور خواہش تھی کہ اس کا دوست صد فیصد مخلص' وفادار اور منفرد ہو۔ وہ اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکے۔ اس کے اعتبار کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے اور جب وہ اس کے کندھے پر سر رکھے اپنے تمام مسائل اسے بیان کرے تو یہ راز و نیاز کسی دوسرے شخص تک پہنچنے کا احتمال بھی نہ رہ سکے لیکن ایسا عجوبہ روزگار ملتا بھی تو کہاں؟

اور اوٹو پلیتھ کی اس منفرد ذہین بیٹی نے بالآخر اس کا بھی ایک حل تلاش کر لیا۔ اس نے اپنے پاس ایک 'جرنل' رکھا جو بظاہر ایک بے جان شے تھی لیکن سلویا کے لیے اس کی موجودگی لمس اور احساس بہت باعث تقویت ہوتا۔ دوسراہٹ اور اعتماد کے جذبات اسے انوکھی سرشاری دینے لگے۔ وہ ان پر بہت انحصار کرنے لگی۔ اس کی ذاتی تحریک اور ذاتی تجاریر بھی اسی روزنامچے میں درج ہونے لگیں۔ وہ بہت عقابی نگاہ کی حامل تھی۔ جزئیات نوٹ کرنا اسے خوب آتا تھا۔ اسی خوبی کی بناء پر وہ ایسی باتیں بھی محسوس کر لیتی جسے دوسرے لوگ معمولی یا سرے سے ہی بے کار سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

سلویا کا یہ بہترین دوست اس کی زندگی کو حقیقی معنوں میں ایک نئی جہت فراہم کرنے میں کامیاب ہوتا نظر آنے لگا تھا۔

☆......☆

اسکول کی زندگی ختم ہوئی تو کالج کی رنگ برنگی دنیا بانہیں کھولے تسخیر کے لیے اس کی منتظر تھی۔

اسے 'اسمتھ کالج' میں داخلہ کے لیے وظیفہ ملا۔ اس وظیفہ کی فراہمی 'اولیو ہیگنز پراؤٹی' نامی بروکلین کی رہائشی مخیر نے کی تھی۔ نارتھمپٹن میساچوسٹس کا وہ کالج نہایت اہمیت کا حامل تھا اور اٹھارہ سالہ سلویا 'اسمتھ گرل' کا اعزاز حاصل

ہونے پر بہت خوش تھی۔ کالج کی دنیا اسکول سے بالکل مختلف تھی۔ مضامین' معمولات' نظام الاوقات کی تبدیلی بھی اس کی مخصوص فطرت کو قدرے پریشان کرنے لگی۔ وہ ذہنی تناؤ اور ایک ناقابلِ فہم دباؤ محسوس کرتی لیکن اپنے احساسات کسی ذی نفس سے بانٹ بھی نہ سکتی۔

اسکول میں تو کئی برسوں کی شناسائی کی بدولت احباب اس کی عادات' فطرت اور سوچ سے واقف تھے اور اسے حتی الامکان کسی بھی منفی صورتِ حال سے دوچار نہ کرتے لیکن کالج میں اس کا سامنا ایک بے رحم دنیا سے تھا۔ وہ زیادہ گہرائی میں سوچنے کی زحمت کم ہی کرتے۔ ان کے لیے سلویا پلیتھ ایک منفرد اور ناقابلِ فہم لڑکی تھی جو اپنے عجیب و غریب رویئے کے باعث کبھی بہت کند دماغ' بیزار اور بے حد معمولی لگتی تو کبھی اس کی انتہائی صاف گوئی' ذہانت اور بے باک طبیعت انہیں چونکا دیتی۔ وہ ہر قدم پر اپنے ساتھیوں کو حیران کر رہی تھی۔ وہ اس کی ذات کو کھوج کر اسرار کی دھند کے پار دیکھنا چاہتے تھے لیکن سلویا کو خلوص اور وفاداری درکار تھی۔ وہ ہر رشتہ میں اوٹو پلیتھ کو تلاشتی تھی اور ہر بار ناکامی ہی اس کا مقدر ٹھہرتی۔

ذاتی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں سے قطع نظر وہ اپنے مزاج کو دوستانہ رکھنے میں کافی حد تک کامیاب ہونے لگی۔ اس کی ذہانت نے ایک اہم نکتہ بہت ہی اہم وقت پر سکھا دیا کہ منفرد اور الگ تھلگ رہنے سے اس کی ذات کو مزید گھو جائے گا۔ ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس کی سوچ اور کردار کے متعلق اندازے لگا کر اسی کی اذیت اور دکھ میں اضافہ کرے گا لہٰذا اس نے اپنے وجود پر دوستانہ خلوص کی پرت چڑھا لی اور اس سلسلہ میں پہلی تبدیلی اولیو کے حوالے سے پیدا ہوئی۔ وہ فطری طور پر بہت احسان شناس تھی۔ اولیو کے اس مربیانہ فعل کی دلی طور پر قدردان تھی۔ اس نے اپنی محسن سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا جو تادمِ حیات جاری رہا۔

اس فیصلہ نے زندگی قدرے آسان کر دی تھی۔

☆......☆

سلویا کے وجود میں موجزن سمندر دھیرے دھیرے قوت پکڑنے لگا۔ خیالات کا ہجوم قلم کی نوک پر مچلنے کے لیے تیار رہتا لیکن ابھی کہیں کچھ تشنگی محسوس ہوا کرتی' عدم اطمینان کا احساس بے کل رکھتا۔ ناتجربہ کاری اس مسئلہ کا مناسب حل تلاش کرنے میں بھی قاصر تھی۔

کالج کے ابتدائی عرصہ میں اس نے بہت نپا تلا اور مختصر پیمانے پر لکھنے کا آغاز کیا۔ خیالات کی تند و تیز لہریں اسے بے تاب رکھتیں لیکن وہ شاعری کی حدود و قیود سے آگاہ تھی۔

شاعری تو دریا کو کوزے میں بند کر دینے کا نام ہے۔ اس کی یہ مشکل بھی ایک معلم نے حل کر دی۔

"پریشانی اور عدم اطمینان کے احساسات لیے اچھی تخلیق ناممکن ہے۔"

"میرے اندر خیالات کی لہریں زور و شور سے سر پٹختی ہیں۔ ساحل سے بہہ جانے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔" سلویا نے کہا۔

"یہی بے تابی تو تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ یہ ایک آغاز ہے۔"

"میں اپنا مطلوبہ معیار حاصل نہ کر پاؤں تو پریشانی اور مایوسی ذہن و دل پر دھند کی طرح چھا جاتی ہے۔"

"اپنی بے تابی کو قوت بنانا سیکھو۔ اگر مایوسی حاوی رہی تو تمہاری ہر تخلیق بے موت مر جائے گی۔"

"میں اپنی اصل قوت کیسے پہچانوں؟" وہ الجھی۔

"شاعری ایک آرٹ ہے۔ سب سے پہلے اس کی بنیادی تکنیک سمجھو۔ اشعار کے بندوں (Stanza) کی لمبائی کا مناسب استعمال سیکھو۔"

"لیکن شاعری تو جذبات کا بے ساختہ اظہار اور بہاؤ ہے۔ پھر یہ حدود کیسے سیکھی جا سکتی ہیں۔"

"تمہاری بات جزوی طور پر درست ہے۔ شاعری

سلویا پلیتھ کے کلام سے کچھ اقتباسات و سطور

☆ کسی سے بھی توقعات نہ رکھنا مایوسی سے بچاؤ کی ضمانت کامیابی ہے۔

☆ دروں بینی ہی میرا سب سے بڑا مرض ہے۔

☆ تلاش بہت کربناک عمل ہے اور اگر یہ تلاش کسی ایسے شخص کی ہو جس سے انسان روح کی گہرائیوں سے محبت کا طالب ہو تو یہ روح کے ریشے ادھیڑ دیتی ہے۔

☆ محبت ایک ایسا سفر ہے جس میں زادِ راہ حماقتیں اور مزید حماقتیں ہوتی ہیں۔

☆ ہر عورت کو زندگی میں ایک بار ایسے شخص سے ضرور محبت ہوتی ہے جو آمرِ مطلق کی طرح اس پر جابرانہ حکمرانی کا خواہشمند ہوتا ہے۔

☆☆☆

حقیقتاً جذبات اور اچھوتے احساسات کا بے ساختہ اظہار اور بلا رکاوٹ بہاؤ ہے لیکن کیا تم نے ایسی ندی دیکھی ہے جس میں شفاف پانی بہت روانی اور قوت سے بہہ رہا ہو۔ اس ندی کے کناروں پر کوئی باڑ نہ ہو تو تصور کرو کیا صورت حال پیدا ہو سکتی ہے؟"

"پانی اپنی اصل ڈگر سے ہٹ کر اِدھر اُدھر بہنے لگے گا اور ہر کوئی اس سے گریز کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"بالکل درست! اسی طرح اگر تم نے اپنا مدعا مناسب پیرائے میں بیان نہ کیا تو قاری کے دل میں گھر کرنے کی بجائے اس میں بیزاری اور گریز کی کیفیت پیدا کرے گا۔"

"میں سمجھ گئی۔" اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"اب ایک اور بہت ضروری بات بھی اپنے ذہن میں بٹھالو۔ تخلیق کے لیے تحریک ایک بہت اہم جزو ہے۔ یہ تحریک ہمیں کہیں سے بھی مل سکتی ہے۔ اپنا مشاہدہ بڑھاؤ، مطالعہ وسیع کرو۔ ہمیشہ وہی تخلیق سب سے زیادہ کامیابی حاصل کرتی ہے جس کا ماخذ حقیقی زندگی سے لیا گیا ہو۔ ہم بیسویں صدی میں جی رہے ہیں اور اب مافوق الفطرت کرداروں کو کوئی نہیں پڑھنا چاہتا۔ اس کے علاوہ اپنے ہم عصر ادباء کے فن پارے بھی نظر انداز مت کرنا۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"ماضی میں لکھی گئی کتابوں اور تخلیقات سے انسانی تخیل وسیع ہوتا ہے لیکن ہم عصر افراد کو پڑھنے سے حقیقی زندگی کے مسائل سمجھنے میں آسانی رہتی ہے۔ وہ بھی تمہاری طرح اسی دور کے پروردہ ہیں اور انہی مسائل سے دوچار ہیں۔ یہی مشترکہ پہلو تمہارے خیالات میں بھی نکھار پیدا کرے گا۔ یاد رکھنا!! وہ لوگ کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے جو اپنے ہم عصر فنکاروں سے برتری یا کمتری کے احساس میں مبتلا ہو جائیں۔ درحقیقت وہ سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہوتے ہیں جن کے سفر کی کامیابی باہمی شناسائی اور ربط میں پوشیدہ ہے۔"

سلویا کے ذہن میں یہ بھی نکات محفوظ ہو گئے۔ اس کی محنت و لگن دوچند ہو گئی۔ ان گنت دیگر شعراء کے کلام نے اس کی بے تابی اور تشنگی میں بھی خاطر خواہ کمی پیدا کی۔ بحیثیت نوآموز اس کی محنت اور خلوص بہت متاثر کن تھے۔ علم کے موتی چننے کے لیے اس نے ہر ممکن سیپ کھنگال ڈالی۔ وہ مختلف تھی، کاملیت پسند تھی اور اب اپنی اصل قوت بھی پہچاننے لگی تھی۔ اپنے جرنلز میں لکھے گئے روزمرہ کے واقعات اور مشاہدات کو از سرِ نو پڑھا تو کہانیوں اور نظموں کی تخلیق کے لیے خیالات کی آمد کا آغاز ہوتے دیر نہ لگی۔

اسے اپنی لغت و فرہنگ پر بھی مکمل بھروسا تھا اور اسی بھروسے کو پتوار بنا کر اپنے خیالات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ مطالعہ اب بھی اس کا ساتھی تھا۔ اسے Dylon Thomas' Wallace Stevens' W.H.Auden جیسے ادیبوں کی ہمسری کا سامنا تھا اور ان کی موجودگی میں اپنی شناخت پیدا کرنا کوہ ہمالیہ سر کرنے کے ہی مترادف تھا۔

سلویا نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے Richard Wilbur' John Crowe Ransome ' اور Marjanne Moore کو خوب پڑھا اور پھر بالآخر اس کا اعتماد ایسے مقام پر آ پہنچا کہ اپنی ذاتی تخلیقات بلا جھجک مقامی اور قومی جرائد میں بھیج سکے۔

اس کے ارادے بہت بلند تھے۔ ذاتی تشخص منوانے کے لیے وہ سر توڑ محنت کرنے کے لیے بھی تیار تھی اور اس مقصد کے لیے صرف شاعری نہیں، مختصر کہانیوں پر بھی طبع آزمائی چاہتی تھی۔ ارادے بلند اور نیت بھرپور ہو تو انسان کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر ہی لیا کرتا ہے۔ سلویا کی نظریں Ladies Home Journal اور چند دوسرے بااثر جرائد پر تھیں۔ اس نے اپنی کہانیاں اور نظمیں ایسے ہی جرائد میں بھیج دیں۔ اس کے بعد زندگی میں ایک ہی موسم ٹھہر گیا۔ انتظار کا ان چاہا اور طویل موسم۔

سلویا نے ہمیشہ زندگی میں بہت سی کامیابیاں سمیٹی تھیں۔ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ہر میدان تسخیر کیا تھا لیکن اس اہم ترین موڑ پر قسمت کو ابھی بہت سے امتحان اور حوصلہ کی آزمائش درکار تھی۔ اس کی اکثر تحریریں مسترد کر دی گئیں۔ صدمہ سا صدمہ تھا۔

کسی بھی تخلیق کار کے لیے اس کی تخلیق خونِ جگر سے سینچی گئی کونپل ہوتی ہے جس کے لیے وہ مادرانہ جذبات رکھتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر اس شہ پارے کو کسی خرابی یا تخیلاتی زرخیزی میں تشنگی کے باعث ٹھکرا دیا جائے تو حساس سوچیں مجروح اور تخیل لہولہان ہو جاتا ہے۔ سلویا بھی اسی اذیت سے گزر رہی تھی اور حسبِ سابق اس کٹھن وقت میں اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی نہ تھا۔ اپنی مایوسی، افسردگی اور اضطراب بانٹنے کا واحد ذریعہ اس کے روزنامچے تھے جو ایک خاموش سامع کی طرح اس کے سارے دکھ درد اپنے اندر سمیٹ لیتے۔ ان روزنامچوں کی ہر سطر میں اس کے دکھ بولتے

تھے اور تنہائی بلکتی دکھائی دیتی تھی۔

☆......☆

کوشش پیہم ازل ہی سے کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ سلویا کی محنت اور ارادے بالآخر رنگ لے آئے۔ جرائد کے مالکان کو اس کی تحریروں نے متاثر کیا اور 1950 کے آغاز میں اس کا نام ایک قومی مجلہ کی زینت بن گیا۔ سولہ مارچ اس کے لیے ایک یادگار دن تھا جب Youth's Appeal for World Peace نامی آرٹیکل Christian Science Monitor میں شائع ہوا۔

سلویا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اس روز وہ پنکھ لگائے اڑنا چاہتی تھی تاکہ اپنی کامیابی خوشبو کی طرح کائنات میں ہر جگہ بکھیر دے اور پکھیرو بن کے اُفق کے پار اس جہان میں چلی جائے جہاں ایک وجیہہ، خوش لباس اور مثالی شخص کئی سال پہلے جا کر چھپ گیا تھا۔ وہی شخص جس کے ساتھ اس کا رشتہ معبودیت کی حدوں کو چھوتا تھا اور جس کے بغیر اس کی ہر خوشی ادھوری تھی۔

تنہائی، احساسِ محرومی اور جذبات سے مغلوب سلویا کی زندگی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ اپنے والد سے ابدی جدائی اس کی نفسیات اور روح کے لیے ایک گہرا روگ بن چکی تھی۔ یہ ایسے کانٹے تھے جو جسم میں مدتوں سے پیوست تھے۔ وہ اپنی چبھن سے اسے بے حال رکھتے لیکن یہ زہریلی کسک اس قدر گہرائی میں پیوست تھی کہ وہ خواہش کے باوجود انہیں نکال ہی نہ پائی۔ وہ عمر کے اس حصہ میں تھی جب صنفِ مخالف کی کشش ایک جبلی جذبہ کے تحت برسوں سے ایک سمت میں گامزن زندگی کی کشتی کا رخ طوفانی دھاروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ سلویا کی زندگی میں یہ موڑ آتا بھی تو کیسے؟ وہ ہمیشہ ہی سے باپ کی محبت کی اسیر تھی اور اب بھی ہر شخص میں اسی کا وجود تلاشتی۔ ادھیڑ عمر مرد اس کی توجہ کا خصوصی اور اولین مرکز تھے اور اٹھارہ سالہ سلویا اگر چھتیس سالہ ویلش شاعر و مصنف 'ڈائلن تھامس' کی تحریروں اور ذات کے سحر میں گرفتار ہوئی تو اس سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی؟

تھامس گول، بھرے بھرے چہرے کا مالک تھا اور اس کے لیے سلویا کے جذبات دیوانگی کی حدود سے بھی آگے تھے۔ چیلسیا ہوٹل میں تھامس کی آمد نے اسے ماہی بے آب بنا دیا اور وہ دو روز تک اسی ہوٹل کے پاس منڈلاتی رہی۔ اسے ایک آس اور سنسنی نے مضطرب کر رکھا تھا لیکن ملاقات میں ناکامی کے بعد غم و غصے نے ہوش و حواس ہی سلب کر لیے۔ ایسا

پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ماضی میں بھی ایک دفعہ کسی رسالے کے مدیر نے سلویا کی خواہش کے مطابق تھامس سے ایک مختصر ملاقات کا بندوبست کیا تھا لیکن قسمت کی نادیدہ ڈوریوں نے یہ ملاقات ہونے ہی نہ دی۔

دوسری بار ناکامی کے بعد وہ اپنے حواس اور جذباتیت پر قابو نہ رکھ سکی۔ خود ترسی اور غصہ کے عالم میں اس نے بہت اہتمام سے اپنی ٹانگوں کو نوکیلے اوزار سے چیرنا شروع کر دیا۔ جسمانی اذیت، بہتا لہو، خراشیں اور تکلیف اس کے تنے ہوئے اعصاب کو سکون دے رہی تھی۔

"ہر بار میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میں اتنی ہی بری ہوں کہ کسی کا ساتھ نہیں پا سکتی، کسی کی چاہت کی حقدار نہیں ہو سکتی۔ میں جسے بھی چاہتی ہوں، وہ مجھ سے دور چلا جاتا ہے۔ میری تنہائی اور جذبات شاید ایک بوجھ ہیں اور یہ بوجھ کوئی بھی اٹھانا ہی نہیں چاہتا۔" مایوسی اور منفی سوچیں اس کے وجود میں نقب لگا کر دیمک کی طرح کھا رہی تھیں۔

مایوسی اور افسردگی اپنی جگہ لیکن سلویا نے تخلیقی سفر جاری رکھا ہوا تھا۔ اگلے تین سال اس کے لیے بہت اہم تھے۔ اس دوران مقامی اخبارات میں اس کے آرٹیکلز شائع ہوئے اور ایک مختصر کہانی Subday at the Mintons نے تحریری مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ یہ کامیابی اس کے لیے بہت اہم تھی۔ اس مقابلے میں فتح کے بعد بطور انعام جون 1953 میں اسے 'میڈموائزیل' نامی جریدہ میں اعزازی مدیرہ کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اس پیشکش کے بعد وہ کچھ عرصہ نیویارک کے Barbizon Hotel میں قیام پذیر رہی۔ مذکورہ ہوٹل محض خواتین ہی کے لیے تھا۔ سلویا نے اس دوران انسانی نفسیات، خامیوں، خوبیوں کے علاوہ ایسے پہلو بھی دیکھے جو انسانیت کی سطح سے بہت کمتر تھے۔

☆......☆

اپنے ذہن میں بے شمار الجھنیں لیے وہ نیویارک سے لوٹی تو تھکاوٹ اور پژمردگی کا آسیب اسے اپنے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ وہ ذہنی، جسمانی اور جذباتی لحاظ سے مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ وجہ آج بھی وہی تھی جو آٹھ سال کی عمر سے اس کا ان مٹ روگ تھی۔ اس کے پاس وہ اسفنج ہی نہ تھا جو اس کے وجود کا سارا زہر اور منفی جذبات بہت نرمی سے جذب کر لیتا۔ وہ اس کی معمولی سی کامیابی پر خوشی سے جھوم جاتا تھا تو اسے محنت کی مزید تحریک ملا کرتی۔ اس کی دائمی عدم موجودگی میں تو ہر چیز اور ہر کامیابی ہی بے معنی محسوس ہوتی تھی اور معمولی سی ناکامی

بھی کوہ گراں بن جاتی۔
قسمت کی دیوی بھی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ ہر جانب سے مشکلات اور مصائب کا سامنا تھا۔ گرما میں وہ ’ہارورڈ‘ کی ’رائٹنگ کلاسز‘ میں داخلہ لینا چاہتی تھی لیکن اسے مسترد کردیا گیا۔ وہ وقت اس کے لیے بہت کٹھن تھا۔ اعصاب چٹختے محسوس ہوتے اور ذہنی دباؤ ناقابل برداشت تھا۔ نیند روٹھ چکی تھی اور پڑھنے لکھنے سے بھی دل اُچاٹ ہوچکا تھا۔ ان دنوں اس کا معمول بہت تبدیل تھا۔ روزنامچوں میں اپنی دلی کیفیات درج کرنے میں بھی بے ربطگی آگئی۔ فرائیڈ کی ایب نارمل نفسیاتی تھیوریز کا مطالعہ اس کا واحد ساتھی رہ گیا۔ وہ ان تھیوریز میں اپنی ذات کو تلاشتی‘ مسائل کو پرکھتی اور حل پاکر ایک بار پھر الجھ جاتی کیونکہ وہ تنہائی کی عادی ہوچکی تھی۔
اس کی ذات ایک قلعہ میں محصور تھی جس میں کوئی دوست داخل ہو پاتا‘ نہ ہی اور یلیا کی قربت و محبت اثر انداز ہوتی۔ والدہ سے اس کا رشتہ بہت پیچیدہ تھا۔ ان کیفیات میں گھری سلویا نے اپنے مسائل کے حل کے لیے جو قدم اٹھایا وہ کسی کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا۔

☆......☆

اگست کا تیسرا عشرہ اختتامی مراحل میں تھا۔
سلویا کی ذہنی حالت میں تلاطم خیزی تھی۔ خودترسی نے دماغ پر ایک دھند طاری کردی تھی۔ چوبیس اگست کو اس نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور یلیا کے لیے ایک کاغذ پر چند حروف گھسیٹ دیے۔
”میں ایک طویل سیر کے لیے جارہی ہوں۔ کل لوٹ آؤں گی۔“
اس کے بعد دل شکستگی اور مایوسی کے عالم میں اس نے ایک کمبل‘ نیند کی گولیوں سے بھری بوتل اور پانی کا گلاس لیا اور زینوں سے نیچے کوٹھری نما تہ خانہ میں چلی گئی۔ یہ جگہ بہت تنگ تھی۔ وہ رینگتے ہوئے وہاں پہنچی اور ڈھیر ساری گولیاں پھانک لیں۔ ڈوبتا ذہن اور ہلکے پھلکے اعصاب اسے ہواؤں میں اڑانے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں وہ بے سدھ ہوگئی۔ بیرونی دنیا سے اس کا ہر رابطہ منقطع ہوگیا جہاں ایک ڈھنڈیا مچ چکی تھی۔

☆......☆

اور یلیا نے کچھ ہی وقت کے بعد سلویا کا اطلاعی نوٹ دیکھ لیا۔
اپنی اس ذہین و فطین بیٹی کا دھوپ چھاؤں جیسا مزاج اس کے لیے کوئی نئی بات تو نہ تھی لیکن گزشتہ چند روز سے اس کی پژمردگی میں جس حیرت انگیز رفتار سے اضافہ ہوا‘ یہ سب کچھ اس کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ اس کا وجدان کسی انہونی کی گواہی دیتا تھا۔
اور یلیا کچھ گھنٹے ہی بمشکل انتظار کرسکی اور اپنی اسی وجدانی قوت کے زیراثر اس نے پولیس کو اطلاع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی تشویش بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ پولیس نے اطلاع ملتے ہی پیشہ ورانہ سنجیدگی اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا اور بوسٹن کے وسیع علاقہ میں سلویا کی تلاش کا کام نہایت منظم طریقے سے شروع ہوگیا۔
بوائے اسکاؤٹس‘ مقامی پولیس اہلکاروں اور قریبی ہمسایوں نے بھی ’ویلزلی‘ کے سبھی چھوٹے بڑے پارکس کھنگال ڈالے لیکن سلویا کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ پچیس اگست 1953 کے اخبارات کی شہ سرخیوں میں بھی اسی گمشدگی کا ذکر غالب تھا۔ ان سرخیوں نے اس کے لاعلم دوستوں کو بھی اس حادثہ سے باخبر کردیا۔ ہر گزرتا لمحہ اس کی تلاش میں سرگرداں افراد کی تعداد میں اضافہ کررہا تھا لیکن وہ سبھی ایک غلط منزل کی سمت دوڑ رہے تھے۔ سلویا وہاں ہوتی تو ملتی۔
اس دن کے اختتام تک پولیس اہلکار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی تمام تر پیشہ ورانہ صلاحیتیں آزمالی تھیں اور وہ سبھی اس بات پر حیران تھے کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ تمام ممکنات پر غور کرتے انہوں نے اپنی اس تلاش کا رُخ اور یلیا کے گھر کی جانب موڑ دیا۔ نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔
چھبیس اگست کو دوپہر کے بعد ہی سلویا انہیں پہلی منزل کے باتھ روم کے نیچے ایک خلاء میں پڑی مل گئی۔
اس کے پاس موجود بوتل میں نیند کی صرف آٹھ گولیاں باقی تھیں۔ اور یلیا اس کی حالت دیکھ کر دم بخود تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ سلویا ایسا انتہائی قدم کیونکر اٹھا سکتی ہے؟ اسے فوری طور پر ’بیلمونٹ‘ میں واقع ’میکلین اسپتال‘ میں منتقل کردیا گیا جہاں وہ نفسیاتی معالج ’ڈاکٹر روتھ بارن ہاؤس‘ کے زیرعلاج رہی۔ اس معالجہ کے اخراجات بھی ’اولیو‘ ہی نے اپنے ذمہ لے لیے۔
ڈاکٹر روتھ نے سلویا پر ان تھک محنت کی۔ اس کی ذہنی الجھنیں اس قدر شدید تھیں کہ روتھ کی شفقت اور پیشہ ورانہ مہارت کو بھی اسے نارمل زندگی کی طرف واپس لانے میں چھ ماہ تک سخت جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا۔

☆......☆

ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا تو سلویا کے معمولات میں

کافی تبدیلیاں آنے لگیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سوچ اور طرز فکر اب مثبت رجحان کی طرف مائل ہونے لگی ہے۔ اگلے موسم بہار میں اسے واپس ’اسمتھ کالج‘ بھیج دیا گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے بحیثیت شاعرہ اپنی زندگی کا آغاز کیا اور یہی وہ دن تھے جب اس کی زندگی میں رومانوی جذبات دستک دے رہے تھے۔
سلویا بلاشبہ بہت رومانوی خیالات و جذبات کی مالک تھی۔ چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا ایک کسک بن کر اس کے دل میں سمائی تھی۔ ’رچرڈ سیسن‘ کی صورت میں اسے اپنی زندگی مکمل ہوتی نظر آنے لگی لیکن دل میں گڑا اتلاش کا کانٹا اسے بہتر سے بہترین کی جانب مائل رکھتا۔ رچرڈ کے علاوہ ’گورڈن لامیئر‘ اور ایک مدیر ’پیٹر ڈیوی سن‘ بھی اس فہرست میں شامل ہوگئے۔
سلویا نے دانستہ طور پر اپنی ذات صنف مخالف اور ان سے میل ملاقاتوں میں الجھادی۔ وہ اپنی تمام تلخیاں فراموش کرنے کے لیے آنکھیں بند کیے ان رستوں کی مسافر بن گئی جن کی کوئی منزل تھی‘ نہ ہی سمت۔
یہ سلسلہ کچھ عرصہ یونہی چلتا رہا اور مزید بھی یونہی جاری رہتا لیکن اس کی قسمت نے ایک نیا موڑ لیا۔ سمتھ کالج میں پڑھائی مکمل ہوتے ہی اسے سرکاری طور پر انگلستان کے نامور ادارے ’کیمبرج‘ میں فل برائٹ اسکالرشپ مل گئی۔ یہ اس کے لیے خوابوں کی تکمیل کرنے کا ایک بہترین موقع تھا۔ سلویا نے اپنے نفع و نقصان کی جمع تفریق کرنے کے بعد رچرڈ کے علاوہ سبھی روابط ختم کردیے اور ایک نئے جذبہ و توانائی سے بحری سفر کی تیاری شروع کردی۔
روانگی سے قبل اس نے تمام سلسلے ختم کردیے۔ کیمبرج میں داخلے کے لیے وہ بہت پرجوش تھی۔ اس کی ایک وجہ تو وہاں کا مسلمہ نظام تعلیم تھا اور دوسری وجہ یہ اُمید تھی کہ وہاں اسے شادی کے لیے بہترین ساتھی مل سکتا ہے۔ اس دور میں کیمبرج کے طلبہ میں مردوں کی تعداد خواتین کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ مرد و خواتین کا تناسب 10:1 تھا۔
ستمبر کے وسط میں ... انگلستان آمد کے ساتھ ہی اس نے اپنا سابقہ مشغلہ ایک بار پھر شروع کردیا۔ عشق و محبت اور فلرٹ کا یہ کھیل اب نیا نہیں تھا۔ وہ نہایت اعتماد اور یقین کے ساتھ ان راہوں کی مسافر بننے لگی۔ آمد کے بعد ابتدائی دس دن اس نے لندن میں گزارے۔ اردگرد کے ماحول کا مشاہدہ کرتے اور خریداری کرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اس نئے ماحول و ثقافت میں رچنے بسنے کی کوشش کرنے لگی۔ آزمائش و امتحانات آغاز سفر میں ہی اس کے سامنے ایک عفریت بن کر کھڑے ہوگئے۔

☆......☆

سلویا کی رہائش 4 Barton Road پر تھی جو کیمبرج کی عقبی سمت تھی۔ پہلے پہل تو اسے مایوسی نے اپنے نرغے میں لیے رکھا لیکن کیمبرج کے سحر نے اس طرح جکڑا کہ وہ جلد ہی یہاں کی قدیم گلیوں اور رسم و رواج سے بھی مانوس ہوگئی۔
اس مشکل کا خاتمہ ہوا تو پیشہ ورانہ مسائل کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ امریکی اور برطانوی نظام تعلیم اور طریقہ کار یکسر مختلف تھا۔ سلویا کے سامنے بہت سے چیلنجز تھے۔ اسے دوسالہ نصاب کا انتخاب کرنا پڑا۔ دوسرے سال کے اختتام پر امتحانات ہوتے تھے اور اس کا سیدھا مطلب یہی تھا کہ اس سخت ترین پڑھائی کا سامنا تھا۔ مختلف عنوانات پر ہفتہ وار تخلیقی مضامین کی لکھائی ایک علیحدہ معمول تھے۔ لیکچرز لینے اور ٹیوٹرز سے ہفتہ وارانہ ملاقاتوں کا وقت نکالنا بھی آسان کام نہیں تھا۔
ان مشکلات کے ساتھ آسانیاں بھی بہرحال موجود تھیں۔
اس کی ٹیوٹر ’ڈورتھیا کروک‘ بہت منفرد اور ہمہ جہت شخصیت کی مالک تھی۔ وہ اس کے تمام مسائل تحمل سے سنتی‘ مایوس اور الجھی سوچوں کو مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے سلجھا کر اسے مثبت توانائی فراہم کرتی۔ یہ مرحلہ ڈورتھیا کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔ سلویا مشکل نفسیات کی حامل تھی لیکن اس کی پیشہ ورانہ مہارت نے یہ کٹھن کام بھی سرانجام دے دیا۔ نصابی معاملات کی جانب سے آسانی میسر آئی تو سلویا تفریحی معمولات کی جانب راغب ہونے لگی اور اس وقت اس کی واحد تفریح رچرڈ تھا۔
رچرڈ ان دنوں پیرس میں مقیم تھا۔ ان کا رابطہ اب بھی برقرار تھا۔ سرما کی آمد ہوئی تو سلویا نے اپنی تعطیلات اسی کے ساتھ پیرس اور یورپ کی تفریح میں صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں نے ایک ساتھ بہت رومانوی وقت گزارا۔ سلویا کو محسوس ہونے لگا کہ اس کی زندگی کے معاملات اب مستحکم ہونے لگے ہیں۔ اعصاب جیسے ہی پُرسکون ہوئے رچرڈ کی جانب سے ملنے والے ایک خط نے اسے یکدم ساتویں آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔
”ہم دونوں نے ایک ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔ فضائیں رومان سے بوجھل تھیں اور مسکراہٹ ہماری

دائی ساتھی۔ تم ایک اچھی پارٹنر ہو لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس رشتے کو مزید تھوڑا وقت دینا چاہیے۔ میرے ذہن میں کچھ گرداب ہیں جنہیں میں تنہا نمٹانا چاہتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم بھی اس موقع پر سمجھداری کا مظاہرہ کرو گی اور میری ذہنی آمادگی تک دوبارہ مجھ سے رابطہ نہیں کرو گی۔ مناسب وقت اور اپنی ذہنی الجھنوں سے نمٹتے ہی میں از خود رابطہ کروں گا۔''

یہ خط نہیں آتش فشاں تھا جو پوری قوت سے سلویا کے وجود میں پھٹا اور اس کی ہستی کا غرور راکھ کر گیا۔ ایک ایسا شخص جو اسے رگِ جاں سے بھی زیادہ نزدیک محسوس ہوتا تھا اور جسے دیگر افراد پر ترجیح دیتے ہوئے اس نے اپنی نئی اور مشکل تر زندگی میں اہم مقام دیا تھا' سلویا کی بابت فیصلہ کرنے کے لیے اسے وقت درکار تھا۔ یہ توہین اور اپنے جذبات کی تذلیل اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ برداشت ممکن تھی نہ ہی پہل۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہی اور اہانت کا دھواں اس کی رگوں میں لہو کی طرح گردش کرتا دل و دماغ میں گھٹن پیدا کرنے لگا۔ وہ رچرڈ کے ساتھ گذرا وقت بار بار یاد کرتی۔ یہ عمل اسے اذیت تو دیتا تھا لیکن اپنی غلطی اور کوتاہی کی تلاش کے لیے یہ سب ضروری تھا۔

داخلی عوامل تو رہے ایک طرف۔ اس دوران سلویا کو موسم کی سختی کا بھی سامنا تھا۔ وہ فطری طور پر ہی سرما میں آرام دہ محسوس نہیں کرتی تھی۔ یہ ایسا موسم تھا جو اس کی چستی اور توانائی کہیں غائب کر دیتا اور پژمردگی' بوجھل پن' سستی و بیزاری اس کے وجود پر آسیب کی طرح طاری کر دیتا۔ وہ ایک بار پھر یاسیت کے دوروں میں مبتلا ہونے لگی۔

سرما اس کے لیے ایک قہر ثابت ہو رہا تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں تکلیف ہوئی اور اس کے بعد زکام' سردی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ صورتِ حال اس قدر ابتر ہوئی کہ منفی سوچوں نے اس کے ذہن میں ایک ہی بات نقش کر دی کہ وہ کیمبرج کبھی تسخیر نہیں کر پائے گی۔

سفر ایک بار پھر نکتہ آغاز پر پہنچ گیا تھا۔

☆......☆

ٹھٹھرے ہوئے دن بیتتے چلے گئے۔

رچرڈ کے لیے اس کا غصہ کسی صورت کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ سلویا کا لاشعور اب بھی اس کی جانب سے پہل کا منتظر تھا لیکن نتیجہ صفر۔ اس کی نفسیاتی الجھنیں اور واہموں کے بھوت دن رات اس کے سامنے رقص کرتے۔ تھک ہار کر فروری کے اختتام پر اسے ایک بار پھر نفسیاتی معالج سے رجوع کرنا پڑا۔ ڈاکٹر ڈیوی کو بھی روتھ کی طرح اس پر بہت محنت کرنی پڑی۔

اس معالجہ سے اتنا فائدہ بہرحال ضرور ہوا کہ اس نے وقتی طور پر اپنا دھیان بٹانا سیکھ لیا۔ رچرڈ کی اس بے رخی پر دکھ و افسوس اپنی جگہ' لیکن ایک حقیقت تو یہ بھی تھی کہ معاشرتی دباؤ کا شکار بھی ہونے لگی تھی۔ سلویا کی عمر ۲۳ سال ہو چکی تھی اور مقامی ثقافت اور رواج کی رو سے اس عمر میں کسی بھی لڑکی کا تنہا' غیر منگنی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونا بہت معیوب سمجھا جاتا۔ عمر کی اس سرحد میں مردانی سائبان کا نہ ہونے کا مطلب یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ لڑکی عنفوانِ شب سے گذر کر ادھیڑ عمری کی وادی میں داخل ہو گئی ہے۔ سلویا جیسی رومان پسند' خواب پرست اور کسی حد تک اپنی ذات سے محبت میں مبتلا لڑکی کے لیے یہ پہلو ناقابلِ بیان اذیت تھی۔ دوست احباب' آس پڑوس اور شناسا جب ایسا کوئی بھی سوال پوچھتے تو اس کا نسوانی وقار اور پندار کرچی کرچی ہو جاتا۔

اسی کشمکش میں اس کی زندگی ایک اور طوفان کی زد میں آ گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ طوفان اس کے بہت سے ارمان پورے کر کے اس کی ہستی کو ایک نئے روپ سے روشناس کرنے آیا تھا۔

☆......☆

اس سہ پہر وہ ڈاکٹر ڈیوی سے ملاقات کے بعد واپس آئی تو مطالعہ کے لیے Saint Botolph's Review کی ایک کاپی خرید لائی جس میں E Lucas Myers کے علاوہ نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر Ted Hughes کی نظمیں بھی شامل تھیں۔

ہیڈ کی نظمیں پڑھ کر وہ خود کو سحر زدہ محسوس کرنے لگی۔ وہ اس کا ہم عصر شاعر تھا لیکن اس کے تخیل کی پختگی سلویا کے لیے بہت متاثر کن تھی۔ اس کی تخلیقات میں مرکزی خیال اور تانے بانے تباہی' وحشت' بربریت' موت اور تشدد کے گرد گھومتے۔ اس انوکھی اور دلفریب شاعری نے دور کسی گوشے میں سلویا کے دل میں ایک نقب لگا دی۔

''اس شخص کے الفاظ ورپن ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی شاعری کی طرح وہ خود بھی بہت منفرد ہو گا۔ کاش کہ میں اس سے ملاقات کر پاؤں۔'' کتاب ہاتھ میں تھامے وہ ایک ہی سوچ میں گم تھی اور اس وقت بالکل نہیں جانتی تھی کہ اس کی سوچوں پر حاوی ہونے والے اس شخص سے ملاقات میں محض چند گھڑیاں باقی ہیں۔

اس شام سلویا کو ایک پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر تنہا شرکت کر کے وہ اپنی ذات پر مزید سوال اٹھتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ہیمیش نامی نوجوان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ پارٹی میں پہنچنے کے بعد اسے علم ہوا کہ کچھ گھنٹے قبل کی جانے والی تمنا مجسم پوری ہو چکی ہے۔ ہیڈ بھی وہیں موجود تھا۔ سنسنی اور خوشی کی لہریں اس کے وجود کو بے حال کرنے لگیں۔

سلویا کے لیے ہیمیش کی موجودگی اب بالکل بے معنی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے دیگر احباب سے ہیڈ کے کوائف معلوم کرنے لگی اور اسی لمحہ کسی نے ان دونوں کو بالمشافہ متعارف کروا دیا۔ سلویا کو اپنے دل کی دھڑکنیں ایک پل کے لیے ساکت ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

اس کے سامنے چھ فٹ سے متجاوز ایک شخص موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی۔ کاٹھی مضبوط اور اعتماد قابلِ رشک تھا۔

''ہیلو!! میں سلویا پلیتھ ہوں۔ کیمبرج کی امریکی طالبہ۔''

''ہیلو لیڈی!! میں ہیڈ ہوں۔'' اس کا لہجہ اور تلفظ سلویا کا دل بے قابو کرنے لگا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

''مجھے بھی۔ امریکا میں کہاں رہائش پذیر ہیں؟''

''بوسٹن......اور آپ برطانیہ میں کہاں رہتے ہیں؟''

''یارک شائر، ویسے امید کرتا ہوں کہ برطانیہ میں آپ کا قیام بہت خوشگوار ہو گا۔''

''ابھی تک تو بالکل نہیں، یہاں کے موسم اور رسم و رواج بہت اجنبی اور کسی حد تک تکلیف دہ بھی ہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''آپ بہت جلد عادی ہو جائیں گی۔ شاعری پر کب سے طبع آزمائی کر رہی ہیں؟'' وہ بھی اس کی ذات میں دلچسپی لے رہا تھا۔

''آٹھ سال کی عمر سے۔''

''کیا کہنے!! میں چودہ برس کی عمر سے اس میدان کا کھلاڑی ہوں۔''

اس کے بعد ان دونوں میں باہمی گفتگو کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ سلویا کی سبھی حسیات اس کی جانب متوجہ تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں کے پار جھانک رہی تھی۔ ہیڈ اس سے دو سال بڑا تھا۔ وہ ایک گہرا انسان تھا۔ بات چیت میں صاف گوئی جھلکتی۔ اس کا یارک شائر سے تعلق ہی سلویا کے لیے بے حد پُرکشش تھا۔

یارک شائر شمالی انگلستان کے ایک وسیع رقبے پر محیط ہے۔ ہیڈ مغربی علاقہ میں پیدا ہوا تھا جہاں دلدلی اور پہاڑی مقامات کی بھرمار تھی۔ گرما میں وہاں بارشوں کے سبب کافی ٹھنڈک رہتی اور سرما تاریک' ویران' برفباری سے لبریز ہوتا ہے۔ اس علاقہ کے رہائشی دیگر برطانوی عوام سے کافی مختلف ہوتے ہیں۔ سخت کوشی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کا پس منظر برطانیہ کی ایک قدیم قوم' قبیلہ گال' سے ملتا ہے۔ یہ علاقہ اس قدر دشوار گزار ہوا کرتا تھا کہ رہزن اور قزاقوں کے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک ارضی جنت تھا۔

ہیڈ کی شخصیت بھی اپنی علاقائی خوبیوں کا بھرپور عکس تھی۔ اس کے اندازِ تخاطب' لہجہ اور آواز پہاڑوں کی سی بلندی تھی۔ یارک شائر کا مخصوص لب و لہجہ سلویا کو اپنی گرفت میں

سلویا پلیتھ کے کلام سے کچھ اقتباسات و سطور

☆ موت ایک فن ہے۔ میں اس فن میں طاق ہوں۔ میں ہر روز ایک نئی موت مرتی ہوں اور بعد از موت جہنم بھی سہتی ہوں۔

☆ تلاش کا سفر ہمیشہ تشنہ رہنا ہی مقسوم قرار پایا ہے۔

☆ باپ انسانی زندگی کی عمارت کی وہ چھت ہوتا ہے جس کی عدم موجودگی میں ہر موسم عذاب بن کر اترتا ہے۔ تحفظ کی جو لہریں باپ کے وجود سے مشروط ہوتی ہیں' کبھی دوبارہ نصیب نہیں ہو سکتیں۔ بے فکری' سکون' خود اعتمادی اور خوابوں پر دسترس صرف اسی سے عبارت ہے اس کے بعد تو زندگی تلاش در تلاش کا نام رہ جاتی ہے۔

☆ دنیا میں سب سے بھیانک چہرہ اس بیوہ کا ہوتا ہے جو اپنے بچوں کو شوہر کے بعد جینے کی راہیں سکھانے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ اس کے آنسو اور تفکرات بچوں کی زندگی میں تیزابی جلن پیدا کر دیتے ہیں۔

☆ محبت ایک ایسی بددعا ہے جو کائنات کے دیگر ہر جذبے سے بھی نفرت پیدا کر سکتی ہے۔

☆☆☆

لے چکا تھا۔ وہ گردو مافیہا سے لاتعلق اپنی گفتگو میں ہی مگن تھے۔ ان کی پسند، ناپسند اور سرگرمیاں بہت حد تک یکساں ثابت ہو رہی تھیں۔

"ڈیوڈ ہربرٹ لارنس اور ڈاکن تھامس مجھے بے حد پسند ہیں۔" ہیڈ نے اسے بتایا تو سلویا کو ایک پل کے لیے تھامس کی ذات سے وابستہ اپنی دیوانگی یاد آ گئی۔

"پھر تو تمہیں چوسر، ولیم بلیک، ولیم بٹلر ییٹس اور ہوپ کنز بھی بہت پسند ہوں گے۔" سلویا نے بے تکلفی سے کہا۔

"بالکل! تمہیں یہ اندازہ کیونکر ہوا؟" وہ متجسس تھا۔

"اس لیے کہ تمہاری پسند میرا انتخاب بھی ہے اور اسی حساب سے میری پسند یقیناً تمہارا بھی انتخاب ہو گی۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔

"شیکسپیئر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ایک بے مثال اور لاجواب فنکار۔ ایسے مصنف اور شاعر صدیوں بعد ہی جنم لیتے ہیں۔"

"زبردست! مجھے بھی اس کی تخلیقات بہت پسند ہیں۔" ہیڈ نے سر ہلایا۔

"یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اس کے کردار، ہر کوئی اپنی باری پر اس اسٹیج پر آتا ہے اور اپنا کردار ادا کر کے روانہ ہو جاتا ہے۔" سلویا نے شیکسپیئر کی مشہور زمانہ نظم کا حوالہ دیا۔

"اس کے اسٹیج پلے بھی لازوال ہیں۔"

"ہاں!! اور آفاقی بھی۔ آج بھی ہر شوہر اوتھیلو کی طرح شکوک میں مبتلا رہتا ہے اور ہر ڈیسڈیمونا اپنی سادگی میں مات کھا جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو!! آج بھی لیڈی میک بیتھ جیسے کردار ہمیں اپنے اردگرد بکھرے نظر آئیں گے۔ وہ رلانے کا فن بھی جانتا تھا اور ہنسانے کا بھی۔" ہیڈ سلویا کی شخصیت سے مرعوب ہو رہا تھا۔

یہ گفتگو یونہی جاری رہی۔ ہیڈ کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ موسیقی، بین الاقوامی مذاہب، جادو، علم نجوم اور لسانیات جیسے موضوعات پر بھی اس کی گرفت کمال تھی۔ سلویا کا دل چاہ رہا تھا کہ وقت تھم جائے، کائنات کی گردش رک جائے اور وہ ہیڈ سے باتیں کرتی، اسے دیکھتی رہے۔ یہ ایک انوکھی کیفیت تھی۔ دھند میں لپٹی، دل و دماغ کو بے قابو کرتی اور اس کے تھکے ماندے، شکستگی میں گھرے وجود کو ہوا کں میں اڑاتی اسے ایک انوکھی لذت سے سرشار کر رہی تھی۔

سلویا کے حواس نشے کی سی کیفیت میں تھے۔ وہ بن پیے ہی مدہوش ہو رہی تھی۔ ماضی کی محرومیاں، حال کی تلخیاں اور مستقبل کے خدشات سب فراموش ہو گئے۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ وہ ہیڈ کے ساتھ محو رقص تھی، بہت خوش تھی اور دل سے قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ اس کے حواس پر غالب آ چکا تھا۔

پارٹی کے اختتام تک وہ دونوں ایک دوسرے کی ذات کے مکمل اسیر ہو چکے تھے۔

☆......☆

ہیڈ کے ساتھ گزرا وقت سلویا کے لیے سرمایۂ حیات بن گیا۔

وہ بے انتہا خوش تھی لیکن پھر رقصاں مور کی طرح اسے اپنی زندگی سے وابستہ کچھ بدصورت حقائق یاد آئے تو ایک بار پھر بجھ کر رہ گئی۔ رچرڈ اس کی موجودہ زندگی کا گرہن بن چکا تھا۔ اس نے تاحال سلویا سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اخلاقیات کی قائل سلویا ہیڈ کے ساتھ کسی نئے رشتے کی طرف پیش قدمی کرنے سے پہلے بے یقینی اور گرداب میں پھنسی رچرڈ سے رشتے کی ناؤ کسی کنارے تک لگانا چاہتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے پیرس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

پیرس روانگی سے قبل اس نے لندن میں ہیڈ کے فلیٹ پر شب بسری کی۔ وہ اس کے جانے پر کچھ افسردہ سا دکھائی دیتا تھا۔ سلویا نے رچرڈ سے بات چیت کرنے کے لیے جارحانہ حکمت عملی تیار کر رکھی تھی۔ وہ اس سے اپنی اذیت اور توہین کی جواب طلبی چاہتی تھی لیکن رچرڈ اپنی رہائش گاہ پر موجود ہی نہیں تھا۔ غصہ اور طیش کے عالم میں اس نے رچرڈ کے دوستوں سے بات چیت کا فیصلہ کیا۔

"ارے!! تمہیں علم نہیں کیا؟ وہ تو کافی عرصہ سے پیرس میں موجود ہی نہیں۔" ایک مشترکہ دوست نے انکشاف کیا۔

"وہ مجھ سے رابطہ میں نہیں لیکن کچھ تو بتاؤ کہ وہ کہاں ملے گا؟" سلویا نے اپنے جذبات پر قابو پایا۔

"غالباً وہ منظرعام پر نہیں آنا چاہتا۔ تم سے اس کا رابطہ نہیں تھا لیکن اس دوران ہم سبھی نے اسے دو مزید خواتین کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"کیا؟ سچ کہہ رہے ہو تم یہ؟" سلویا کا وجود اور وقار پارہ پارہ ہوا۔

"ہاں بھئی!! سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے معاشقوں کی داستان تو سبھی جانتے ہیں۔" اس انکشاف نے اسے مزید دکھی کیا۔ ایک لامتناہی انتظار پر مصلوب کر کے وہ کس قدر آسانی سے نئے تعلقات بنائے بیٹھا تھا۔

سلویا نے اس کی رہائش گاہ پر کسی طرح پہنچ کر سامان کی تلاشی لینی شروع کر دی اور وہیں اسے اپنے تحریر کردہ چند ایسے خطوط بھی ملے جنہیں کھولنے کی بھی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس قدر تذلیل نے اس کے اعصاب برگشتہ کر دیے۔ ذات کا اعتماد اور خودداری بہت بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ اسے رچرڈ کا اصل فیصلہ بن کہے ہی سمجھ آ گیا۔ اب وہاں ایک پل بھی رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ پیرس کی تمام تر خوبصورتی اور کشش بھیانک بدصورتی میں ڈھل گئی۔

وہ بحری جہاز پر براستہ اٹلی واپس چلی آئی۔ واپسی کا یہ سفر بہت اذیت ناک سوچوں سے گھرا تھا۔ رچرڈ کی صورت میں تلاش کا سفر بہت بری طرح ناکام ہوا تھا۔

☆......☆

بحری سفر بہت بے کیف اور بوجھل تھا۔

سمندر سے اس کی محبت اور کشش بے حد پرانی تھی۔ اسے اپنی ذات بھی ایک بحر ہی محسوس ہوا کرتی۔ اس سفر میں ایک دیرینہ دوست "گورڈن لامیئر" بھی اس کے ساتھ تھا لیکن اس کا دل بہت بجھا ہوا تھا۔ جذباتی استحصال نے اسے بہت دکھی کر رکھا تھا۔

یہ کیفیت شاید یونہی اس کے وجود میں کائی کی طرح جمی رہتی لیکن اس کی نظر اس سفر سے قبل ہیڈ کی جانب سے ملنے والے ایک محبت نامہ پر پڑی۔ وہ خط نہیں ایک جادوئی بوٹی تھی جس نے پل بھر میں ہی اس کے وجود کی ساری تھکن دور کر دی اور ذات کا سمان بھی کسی حد تک بحال کر دیا۔

ہیڈ نے اپنے مخصوص انداز میں سلویا کی غیر موجودگی میں افسردہ جذبات کا ذکر کیا تھا۔ اپنی زندگی میں اس کی اہمیت عیاں کی اور ڈھکے چھپے لفظوں میں دائمی ہمسفر بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلویا کی ساری تلاش گویا اس ایک خط نے ختم کر دی۔ ہیڈ سے ملاقات کے بعد اپنی لذت آمیز سنسنی، خوشی اور جوش کی اصل وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اسے کہیں نہ کہیں ایسے ہی شریک حیات کی تو تلاش تھی جو اڈو پلیتھ کی طرح دوٹوک اور واضح رائے رکھتا ہو، شخصیت کی مضبوطی اس کا خاصہ ہو، ذہنی پختگی بے مثال ہو اور اپنے جذبات میں کسی قسم کے ابہام کا شکار نہ ہو۔

اس نے اپنا سارا وجود پل بھر میں ہی اس محبت نامہ پر قربان کر دیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم، وسیع مطالعہ اور لفظوں سے کھیلنے کے تمام تر ہنر کے باوجود اپنی جبلت سے مغلوب تھی۔ محبت کا برملا اظہار اور اہمیت کا اقرار کسی بھی عورت کی طرح اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

☆......☆

لندن واپسی کے بعد سلویا کی تلاش ختم ہو گئی۔

ہیڈ اور اس کے جذبات کی شدت خود ان کے لیے بھی حیران کن تھی۔ محبت کسی طوفانی بارش کی طرح انہیں شرابور کر چکی تھی۔ اس محبت اور اپنی زندگی کی تکمیل کے لیے انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

سلویا بہت خوش اور پرجوش تھی۔ اسے اپنے اس انتخاب پر بہت فخر تھا۔ زندگی کے اس موڑ پر اوریلیا اس کے ساتھ موجود نہیں تھی۔ سلویا نے اسے ایک خط لکھ بھیجا۔

"یہ میری زندگی کا بہترین دور ہے۔ ایسی خوشی اور سرشاری تو میں نے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کی۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میں دل سے ہنستی ہوں، الفاظ اب میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ میری تخلیقات کی مہک خود مجھے مدہوش کیے دیتی ہے۔ یہ توانائی اور جذبہ ہر گزرتے لمحہ مزید شدت اختیار کر رہا ہے۔ میں اس کی روح کی گہرائی محسوس کرنے لگی ہوں۔ بہت انوکھا رشتہ ہے یہ۔ بہت خاص جذبات ہیں۔ شاید آپ بھی کبھی ڈیڈی کے لیے یہی سب محسوس کرتی ہوں گی اور ہم نے بھی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

16 جون 1956 کو وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ یہ نوبیاہتا جوڑا گرما گزارنے کے لیے اسپین روانہ ہو گئے۔ انہیں پیرس اور نواحی علاقوں میں بھی کچھ وقت گزارنا تھا۔ سیر و تفریح کے علاوہ یہ باہمی ذہنی ہم آہنگی کے لیے بہترین وقت تھا۔ ان کے اس ہنی مون کا یہ دورانیہ بہت شاندار اور یادگار تھا۔ محبت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

اس بہترین وقت گزاری کے بعد سلویا کے سامنے ایک آزمائش اور کٹھنائی موجود تھی۔ انہیں یارک شائر کا سفر درپیش تھا جہاں ہیڈ کے والدین کے سامنے اپنی شادی کا اعلان کرتے ہوئے اس رشتے کے لیے راضی کرنا تھا۔ اس موقع پر سلویا بہت سے خدشات اور تحفظات میں بھی مبتلا تھی تاہم شوہر کے اعتماد اور محبت کے سہارے اس نے یہ مشکل بھی کسی طرح عبور کر لی۔

☆......☆

گرما کے اختتام پر واپسی ہوئی تو عملی زندگی ان کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

سلویا کی پڑھائی ابھی نامکمل تھی۔ شادی شدہ زندگی کی نئی ذمہ داریوں میں اب اسے نصابی معاملات بھی سنبھالنا سیکھنے

تھے۔اپنی سابقہ رہائش ترک کر کے وہ ہیوڈ کے ساتھ 56 Eltisley Avenue کے ایک فلیٹ میں منتقل ہوگئی۔قسمت کی ستم ظریفی تو دیکھیے اس عمارت کی بالائی منزل پر رچرڈ کے بھی کچھ رشتہ دار قیام پذیر تھے۔خوشگوار حال کی ان گھڑیوں میں ماضی کی یہ کڑوی یادامیوں سی تلخی بھی کبھار اسے پریشانی میں مبتلا تو کر دیتی لیکن پھر وہ سنبھل جایا کرتی تھی۔

ان دونوں کی زندگی بہرحال بہت اچھی گزر رہی تھی۔وہ اکٹھے مطالعہ کرتے' کھانا پکاتے' کھاتے پیتے' طویل چہل قدمی کرتے ہوئے جذبات بھری سرگوشیاں کرتے اور ایک دوسرے کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتے۔

محبت اور جذبات زندگی کی بہت بڑی حقیقت سہی لیکن سب سے بڑی سچائی تو یہ ہے کہ معاش سے زیادہ طاقتور عنصر اور کچھ بھی نہیں۔ہیوڈ نے اپنی زندگی کو تلخیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک مقامی اسکول میں درس وتدریس کا پیشہ اختیار کرلیا۔اس نے اب تک بہت سی نوکریاں اختیار کی تھیں لیکن تدریسی ذمہ داریوں سے وہ حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہورہا تھا۔

اگلے سال گرما میں انہوں نے امریکا روانگی کا منصوبہ بنایا۔سلویا اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ بھی کچھ عرصہ گزارنا چاہتی تھی۔اس کی ذاتی زندگی میں ٹھہراؤ کے بعد پیشہ وارانہ تبدیلیاں بھی رونما ہورہی تھیں۔سلویا کا قلم نکھرنے لگا۔اسے اپنی کامیابی کے علاوہ ہیوڈ کی بھی بہت پرواہ تھی۔وہ جانتی تھی کہ نئی نوکری کے بعد وہ شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے پائے گا۔شوہر سے محبت اور وفا کا تقاضا یہی تھا کہ وہ از خود اس کی مدد کیا کرے۔

سلویا نے ہیوڈ کی نظموں کو اکٹھا کر کے ٹائپ شدہ حالت میں مرتب کرنے کے بعد انگلستان اور امریکا کے ناشرین کو بھیج دیا۔اس کی ان تھک محنت کے بعد ہیوڈ کو نیویارک میں ہونے والے شاعری کے ایک اعلیٰ سطحی مقابلہ میں شرکت کی دعوت ملی اور ہیوڈ نے جیت لیا حیران کن بات تو یہ تھی کہ اسے مقابلے میں اپنی شرکت کا علم ہی نہیں تھا۔

گھریلو ذمہ داریاں' پڑھائی اور تخلیقی سفر سے نبرد آزما ہوتے سلویا وقت کی حدود وقیود سے بے نیاز ہونے لگی۔سرما ختم ہوتے ہی بہار سخت ترین محنت کا مطالبہ لیے طلوع ہوا۔کیمبرج میں امتحانات کا آسیب آزاد ہو چکا تھا اور اب کسی بھی قسم کی بے پروائی دو سالہ محنت پر پانی پھیرنے کے مترادف تھی۔سلویا کو دن رات ایک کرتے ہی بنی۔

امتحانات ختم ہوئے تو ہیوڈ نے یارک شائر میں اپنے خاندان کے ساتھ وقت گزارنے کا فیصلہ کیا۔اس دوران سلویا شوہر کے ساتھ آنے والی ایک کتاب Hawk in the Rain کی پروف ریڈنگ کرتی رہی۔وہ دلجمعی سے سسرالی رشتہ داروں کے لیے کھانا بناتی اور انہیں خوش رکھنے کی حتی الامکان کوششیں کیا کرتی۔

بیس جون کو وہ دونوں ساؤتھمپٹن روانہ ہوگئے اور ایک ہفتہ بعد نیویارک پہنچ گئے۔29 جون ان کے لیے ایک یادگار دن تھا۔اوریلیا نے بیٹی اور داماد کے لیے بہت پُروقار تقریب کا اہتمام کر رکھا تھا۔اس نئے شادی شدہ جوڑے سے ملنے اور استقبال کے لیے ساٹھ سے زائد لوگ موجود تھے۔ہیوڈ سب مہمانوں کے لیے خصوصی مرکز نگاہ تھا۔اوریلیا اس دوران بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتی رہی۔سلویا بھی یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اس کی والدہ کچھ مضطرب ہے۔انہیں دوران تقریب لمحاتی تنہائی ملی تو وہ اپنے دل کی بات زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکی۔

''مام!ہیوڈ آپ کو کیسا لگا؟''

''بہت منفرد شخص ہے یہ۔''اوریلیا نے سنبھل کر کہا۔

''کیا آپ کو پسند نہیں آیا وہ؟''

''وہ تمہیں پسند ہے۔میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔''

''پسندیدگی بہت چھوٹا لفظ ہے مام!میں اس سے محبت کرتی ہوں۔شدید محبت۔''

اوریلیا اس کے جذبات محسوس کر کے کچھ پریشان سی دکھائی دینے لگی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔''سلویا!! مائی ڈارلنگ!!زندگی میں سب کچھ پرفیکٹ نہیں مل سکتا۔ہیوز یقیناً بہت اچھا ہے لیکن وہ ان مردوں میں سے ہے جن کی کشش عورتوں کو دیوانہ کر دیتی ہے۔اس پہ مستزاد وہ شاعر بھی ہے۔عورتیں شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد منڈلایا کریں گی۔تمہیں آیندہ زندگی میں بہت برداشت اور تحمل مزاجی سے وقت گزارنا ہوگا۔''

''ہیوڈ ایسا نہیں مام!!وہ صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ ہی سے شادی کیوں کرتا؟''سلویا نے پُرزور لہجہ میں کہا۔

''میری نیک تمنائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔''اوریلیا گہری سانس لیتی باہر مہمانوں کے پاس چلی گئی۔

پارٹی بہرحال بہت شاندار تھی اور اس کے بعد آنے والا

وقت اس سے بھی زیادہ بے مثال۔

اگلے سات ہفتے وہ گویا کسی ارضی جنت میں تھے۔سن باتھ' شاعری اور فشنگ ان کے معمول بن گئے۔ہیوڈ کا ستارہ ان دنوں عروج پر تھا لیکن سلویا گردش زوال میں مبتلا تھی۔اس کی سبھی نظمیں اور مختصر کہانیاں یکے بعد دیگرے مسترد ہوتی گئیں۔

وہ ہر بار ایک نئی امید استوار کرتی مگر ناکامی نے اس کے ساتھ کوئی بیر ہی باندھ لیا تھا۔

☆......☆

سلویا کی ذہانت اور بہترین تعلیمی ریکارڈ کے باعث 'اسمتھ کالج' نے نوکری کی پیشکش کی۔یہ لمحہ اس کے لیے بے حد باعث فخر تھا۔اس نے معاشی جدوجہد میں عملی تعاون کے لیے یہ پیشکش قبول کرلی۔ہیوڈ نے بھی تخلیقی لکھائی کی کلاسز کو پڑھانا شروع کر دیا۔

آغاز میں تو سبھی معاملات بہت ہموار تھے لیکن دھیرے دھیرے ذمہ داریاں زیادہ ہوئیں تو وہ الجھنوں میں مبتلا ہو کر ہراساں ہونے لگی۔تدریس اس کے اندازے اور تصورات سے کہیں زیادہ تھکا دینے والا عمل تھا۔اس مایوسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان ذمہ داریوں میں الجھ کر وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے دور ہونے لگی تھی۔روزنامچے' نظمیں' کہانیاں' خطوط پس پشت ہورہے تھے مگر اس سے بھی زیادہ دل شکن امر تو یہ تھا کہ ساتھی اساتذہ اور فیکلٹی ممبران کا رویہ بہت منفی تھا۔اب تک تو وہ ان سے بحیثیت طالبہ ہی ملتی رہی تھی۔وہ اس کی ذہانت کے بہت بڑے مداح بھی تھے لیکن ایک کولیگ کی حیثیت سے وہ سلویا کو اس کا جائز مقام دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ایک سابق طالبہ کو اپنے متوازی دیکھ کر پیشہ وارانہ رقابت دہری شدت سے ان پر حاوی ہوئی تھی۔ان الجھنوں اور ناکامیوں نے اس کے خوابیدہ آسیب ایک بار پھر بیدار کر دیے اور مایوسی و دل شکستگی اس کی قوت مدافعت اور مثبت توانائی نگلنے لگیں۔

یہ صورتِ حال چند ماہ تو یونہی قائم رہی۔تلخیاں اب مزاج پر بھی غالب آنے لگی تھیں۔

''ہمارے رشتہ میں ایسی ناخوشگوریت پہلے تو کبھی نہ تھی۔''سلویا نے ایک روز افسردگی سے شوہر کو کہا۔

''تم بھی تو پہلے اس طرح الجھی' بکھری ہوئی نہیں رہتی تھیں۔''

''میں ایسا دانستہ تو نہیں کرتی۔پیشہ وارانہ مسائل الجھا دیتے ہیں۔''

''میں ان مسائل کو بخوبی سمجھتا ہوں اور خائف بھی ہوں کہ کہیں یہ دوریاں بڑھا نہ دیں۔''

''اس کا کیا حل نکالیں......میں اس رشتے کو کسی بھی بدصورتی سے محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔''

''اس ٹرم کے مکمل ہونے پر یہ جاب چھوڑ دو۔ساتھی اساتذہ یونہی مسائل کھڑے کرتے رہیں گے اور تم مایوسی کا شکار ہوتی رہوگی۔''

''ٹھیک کہتے ہو!یہاں رہ کر بہت سے معزز چہروں کو بےنقاب ہوتے دیکھا ہے۔یہ عمل ہر بار مجھے ایک نئے سرے سے اذیت میں مبتلا کرتا ہے۔''

''میں اپنی رائے تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔خوب سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا۔تم اپنے ہر فیصلے میں مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی۔''ہیوڈ نے اسے دلاسہ دیا۔

سلویا نے ٹھنڈے دل ودماغ سے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد اپنی نوکری سے دستبرداری کا حتمی فیصلہ کرلیا۔اس سال سرمائی چھٹیاں اس کے لیے بہت سخت ثابت ہوئیں۔وہ ایک بار پھر شدید بیمار ہو کر بستر نشین ہوگئی۔

یہ سب گفتگو اور سوچ تو رہی ایک طرف۔حقیقت تو یہ بھی تھی کہ ہیوڈ کی محبت اور خلوص کے باوجود وہ اس کی چند عادات کے بارے میں بہت جلد غصہ میں آجاتی۔شادی کے اوّلین دنوں کا خمار اترنے کے بعد سلویا کو زندگی کے اصل حقائق کا علم ہونا شروع ہوا تو اس کی حساس طبیعت بوجھل رہنے لگی۔

خواتین کی جذبے لٹاتی نظروں اور ناز وانداز دیکھ کر سلویا کا تن من جھلس جاتا۔اذیت در اذیت تو یہ تھی کہ ہیوڈ بھی ان سے بے تکلفی سے پیش تو آتا ہی تھا دوسری جانب اس عمل کو معیوب بھی نہ سمجھتا۔اکثر ایسا ہوتا کہ کسی تقریب میں وہ دونوں ایک ساتھ شرکت کرتے اور سلویا کے لیے آزمائش کی گھڑیاں شروع ہو جاتیں۔

''ان سے ملیے۔یہ ہیوڈ ہیوز ہیں۔''میزبان بہت خوشی سے تعارفی سلسلہ کا آغاز کرتے۔

''مائی گڈنیس......وہی ہیوڈ ہیوز جو شاعر ہیں۔''خواتین کا جوش سنبھالے نہ سنبھلتا۔

''بالکل ٹھیک پہچانا۔اور یہ مسز ہیوز ہیں۔''تعارف کا رخ سلویا کی طرف مڑتا۔

''اوہ اچھا تو یہ مسز ہیوز ہیں!!''خواتین رشک وحسد کے جذبات سے اسے ناقدانہ دیکھنے لگتیں گویا بزبان خاموشی ہیوڈ کو

اس کا انتخاب غلط ثابت کرنا چاہتی ہو۔

''جی ہاں!! میں سلویا پلیتھ ہوں۔ مسز ہیوز!!'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنا مکمل تعارف کرواتی۔

''یہ نام تو کہیں سنا سنا لگتا ہے۔'' مقابل ایک توقف کے بعد سلسلہ کلام بحال کرتی۔ ''کہیں آپ بھی شاعرہ تو نہیں؟''

''بالکل درست شناخت کیا۔'' وہ طنزیہ جواب دیتی۔

یہ فقرات اور ردِعمل ایک معمول بن چکے تھے۔ سلویا کا دل بجھ جاتا۔ ہیوز کی محبت' گرم جوشی' باہمی سیر و تفریح کچھ بھی اس زخم کو مندمل نہ کر پاتا تھا جو اسے خواتین کے ساتھ مسکرا کر باتیں کرتے دیکھتے ہوئے دل پر لگتا۔

''ہیوز!! تم ان عورتوں سے یوں برتاؤ مت کیا کرو!''

''کیا مطلب؟ کیسا برتاؤ؟'' وہ الجھتا۔

''تم ان سے بہت بے تکلف ہو جاتے ہو!!''

''پہل وہی کرتی ہیں سلویا! میں نہیں۔'' وہ اطمینان سے کہتا۔

''تو تم جوابی طور پر سرد مہری اپنا لیا کرو۔''

''لیکن آخر کیوں؟ وہ مجھ سے محض شاعری کی بابت ہی تو بات چیت کرتی ہیں۔''

''وہ بات چیت ہی تو نہیں کرتیں۔ وہ تمہیں اپنی طرف مائل کرتی ہیں' اپنی خوبصورتی سے رجھاتی ہیں۔ تمہاری شادی اور انتخاب کا مذاق اڑاتی ہیں۔'' سلویا جھنجلا کر جواب دیتی۔

''بچوں جیسی باتیں مت کرو!! تمہاری یہ فضول منطق سن کر کون کہے گا کہ کیمبرج اور اسمتھ کا روشن ستارہ اور انسانی جذبات و احساسات کی ترجمان شاعرہ ہو۔''

''مجھے کسی کے کہے سننے کی پروا نہیں...... میں ایک عورت ہوں جو اپنے شوہر کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتی۔ میرا شوہر جب میرے علاوہ کسی اور کو دیکھتا ہے تو برداشت نہیں ہوتا مجھ سے۔''

''دیکھو سلویا!! سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ میری فین ہیں۔ ان سے خوش اخلاقی سے پیش نہ آؤں تو پیشہ ورانہ اخلاقیات کے بھی منافی ہوگا۔ اس سے میری 'ریڈر شپ' متاثر ہو سکتی ہے۔ میں تمہارا شوہر ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ یہ مقام و مرتبہ کوئی اور نہیں لے سکتی۔ یہ بات تم جتنی جلد سمجھ لو اتنا ہی بہتر ہے۔''

سلویا سمجھ رہی تھی۔ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ عورت جب بیوی بنتی ہے تو اس کے حواس بہت تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے شوہر کی سوچ کسی نوشتہ دیوار کی طرح پڑھ لیتی ہے بلکہ ہر وہ تبدیلی بھی بھانپ لیتی ہے جو ابھی خود اس پر بھی آشکار نہیں ہوئی ہوتی۔ اس صورت میں سلویا کیسے نہ سمجھ پاتی کہ ہیوز حسن پرست ہے۔ خواتین سے مبینہ برتاؤ' بات چیت اور فلرٹ اسے تسکین فراہم کرتے ہیں۔

اس صورت حال میں مزید خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب پرستاروں کی گھر آمد شروع ہو گئی۔

☆......☆

شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔

ہیوز ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ سلویا کے لیے اکیلے گھر میں وقت گزاری بہت مشکل ہو رہی تھی۔ دل و دماغ بہت بوجھل تھے۔ وہ کئی بار اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بھی جا کر بیٹھی تا کہ اپنے اندر مچلتے لاوے کو اخراج کا رستہ دے کر کاغذوں کا شکم بھر سکے۔ کافی دیر کوشش کرتے رہنے سے اس پر ایک ہولناک انکشاف ہوا کہ الفاظ بھی اس سے روٹھ چکے تھے۔ وہ چند سطور گھسیٹتی لیکن پھر غیر مطمئن سی کیفیت میں وہ کاغذ پھاڑ کر ایک جانب پھینک دیتی۔

اسی اثناء میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ ایک لمحہ کے لیے یوں لگا کہ ہیوز لوٹ آیا ہے لیکن نامانوس انداز نے مایوسی میں اضافہ کر دیا۔ وہ اس وقت کسی بھی مہمان کو بھگتنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھی۔

دروازے پر ایک کم عمر لڑکی بہت اعتماد سے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذات تھے۔ لباس اور میک اپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خصوصی تیاری سے یہاں آئی ہے۔

''کیا مسٹر ہیوز گھر میں موجود ہیں۔'' اس نے دریافت کیا۔

''نہیں!!'' سلویا نے رکھائی سے جواب دیا۔

''انہوں نے میری شاعری پڑھنے اور اس کی اصلاح کا وعدہ کیا تھا۔ میں اسی سلسلہ میں ان سے ملنے آئی ہوں۔'' اس کے الفاظ سلویا کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہ تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذات تھام لیے۔ سلویا کے چہرے کے تاثرات نہایت درشت ہو چکے تھے۔

''اگر میری آمد آپ کی مصروفیات میں مخل ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں۔'' لڑکی اس کی ناگواری اور غصہ فوری بھانپ گئی تھی۔

سلویا نے جواب دینے کی بجائے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔ ہیوز کا انتظار اب شدید تر ہو گیا تھا۔ کچھ وقت کے بعد وہ گھر لوٹا تو اس کے ناقابل فہم تاثرات دیکھ کر قدرے محتاط ہو گیا۔

''سماجی خدمت گار کب سے بن گئے ہو ہیوز؟'' اس نے تند لہجہ میں پوچھا۔

''میں ایسے کسی بھی کام میں دلچسپی نہیں رکھتا!'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''تمہاری اس بات کو میں سچ تسلیم کر لیتی لیکن سچائی کو مجھ سے اتنی محبت ہے کہ وہ مجھے کسی بھرم میں رہنے ہی نہیں دینا چاہتی اور مجسم میرے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔'' اس نے کاغذات کا پلندہ اٹھا کر ہیوز کے منہ پر دے مارا۔

''اتنی سی بات کو لے کر ہنگامہ کیوں کھڑا کر رہی ہو؟'' ہیوز نے کاغذات دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ صرف میری ایک طالبہ ہے۔ تخلیقی لکھائی کی کلاس میں مجھے اس کا کام اچھا لگا اس لیے مدد کا فیصلہ کر لیا۔''

''تمہارا اس سے کوئی معاشقہ تو نہیں؟'' سلویا کے خدشات زبان پر آ گئے۔

''خدا کا واسطہ ہے سلویا!! وہ ایک کم عمر طالبہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مرد کو مختلف عورتوں میں کشش محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنا تخیل مہمیز کرنے کے لیے ایسے تعلقات بھی بنا لیتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ طالبہ سے معاشقہ قائم ہو جائے۔'' وہ اپنا ضبط کھو بیٹھا۔

سلویا کے لیے اس کے آخری فقرات بہت جان لیوا تھے۔ اس نے کسی حد تک اعتراف کر لیا تھا کہ دوسری عورتیں اس کے لیے پُرکشش ہیں۔ روح پر لگنے والا یہ چرکہ بہت شدید تھا۔

وہ اذیت سے بے حال ہونے لگی۔

☆......☆

1958 کا آغاز بہت تناؤ زدہ تھا۔

زندگی یونہی باہمی کشمکش میں بیت رہی تھی۔ اسی دوران بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب سلویا نے اپنی نوکری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا تھا۔ اس روز ہیوز نے سلویا سے آخری کلاس کے فوری بعد ملاقات کرنی تھی لیکن وہ کہیں بھی موجود نہ تھا۔

سلویا اسے لائبریری' مطالعاتی کمروں اور مختلف جماعتوں میں جھانکتے اب تشویش میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ ایسی غیر ذمہ دارانہ روش تو اس نے پہلے کبھی بھی اختیار نہیں کی تھی۔ وہ اسے تلاش کرتی عمارت کے ایسے حصے میں آ گئی جہاں ایک تالاب موجود تھا۔ یہ قدرے سنسان جگہ تھی۔

''یہاں بھلا کیوں ہوگا ہیوز؟'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ سامنے ایک نو عمر طالبہ کے ساتھ اسے دیکھ کر حیرت و غم سے منجمد ہو گئی۔

ہیوز کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور ان دونوں کی باہمی کیمسٹری، بے تکلفانہ انداز اس کا دل دہلانے لگا۔ یہ وہ شخص تو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی مرد تھا۔ نفس کا پجاری اور دوغلے جذبات کا مالک۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی چمک اور چہرے کے تاثرات کوئی بھی بیوی ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ سلویا کی نظر میں زمین و آسمان گھومنے لگے۔ اس کے بدترین خدشات بھیانک روپ اختیار کر چکے تھے۔ لڑکی نے سلویا کو دیکھ کر فوری رستہ بدل لیا اور از چھو ہو گئی۔ اس وقت تو وہ بمشکل ضبط کر پائی لیکن گھر آتے ہی ہیوز کے درپے ہو گئی۔

''کون تھی وہ؟''

''کوئی اجنبی تھی۔'' اس نے ٹالا۔

''ایک اجنبی تمہارے ساتھ اس ویران جگہ پر کس حق سے تمہارے ساتھ موجود تھی؟'' وہ سرد مہری سے بولی۔

''تم پر شک کرنے کا دورہ پھر سے پڑ گیا ہے شاید!! میرا وقت برباد مت کرو۔'' وہ ہر لفظ چبا کر بولا۔

''اوہ! تو کیا وہ وقت کی بربادی نہیں تھی؟'' سلویا کو طیش آ گئی۔

''تم نہایت شکی مزاج عورت ہو۔'' اس نے چلا کر کہا۔

''اور تم نہایت جھوٹے مرد۔'' وہ دوبدو بولی۔

''تم چاہتی کیا ہو سلویا؟'' وہ زچ ہوا۔

''میں اپنے شوہر کو صرف اپنا وفادار دیکھنا چاہتی ہوں۔ آخر کیا کمی ہے مجھ میں جو تمہیں رستہ بھٹکا دیتی ہے۔'' سلویا بے بسی سے رونے لگی۔

ان کے رشتے میں واضح بداعتمادی اور دراڑ پیدا ہو گئی۔ خاموشی ایک خلیج بن گئی تھی۔ ہر جھگڑے کے بعد ہیوز اس سے معافی تلافی کرتا' اپنے رویے کا ازالہ بھی کرتا لیکن اس کے باوجود دیگر خواتین میں دلچسپی لینے کی عادت سے نجات حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ گرما میں وہ بیکن ہل بوسٹن کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ اب تخلیقی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہیں بہرصورت نظمیں' کہانیاں اور دیگر ادبی اصناف لکھنی اور شائع کروانی تھی۔ سلویا کی تصانیف کی اشاعت کا تناسب بہرحال کم تھا۔ اس نے 'میسا چوسٹس جنرل اسپتال' میں جز وقتی ملازمت اختیار کر لی اور یہیں اسے

Johnny Panic' Bible of

The Daughter's of Dreams اور Blossom Street جیسی مختصر کہانیاں لکھنے کی تحریک ملی۔ مؤخرالذکر لندن میگزین میں This Earth Our Hospital کے ابتدائی نام سے شائع ہوئی۔ دھیرے دھیرے اس کے لکھنے میں روانی اور مزید گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی اور جرائد میں اس کی پہچان بننے لگی۔

☆......☆

اگلے سال گرما میں انہوں نے اور یلیا کی کار میں مغربی علاقوں کا سفر بھی کیا۔

نیشنل پارکس اور بڑے بڑے شہروں سے گزرتے وہ اپنے تخیل کو مزید تحریک دینے لگے۔ ان کا باہمی رشتہ تا حال اسی خاموشی اور گھٹن کا شکار تھا لیکن اس گھٹن میں خوشگواریت اس وقت پیدا ہوئی جب انہیں والدین بننے کی نوید ملی۔ وہ دونوں ہی بے حد خوش تھے۔

"سلویا!! میں اب امریکا میں نہیں رہنا چاہتا۔" کچھ ماہ بعد اس نے بیوی سے کہا۔

"لیکن کیوں؟" وہ حیران تھی۔

"یہی مناسب وقت ہے کہ واپس لندن منتقل ہوجائیں۔ میں اپنی اولاد کی پیدائش آبائی سرزمین پر ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری جڑیں وہاں پیوست ہیں۔ میری اولاد بھی اسی زمین کا شجر ہوگی۔"

سلویا نے اس کا فیصلہ تسلیم کرلیا۔ وہ خود بھی گھٹن زدہ ماحول اور ہمہ وقت طاری رہنے والے اس خوف سے آزادی چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ماحول کی تبدیلی اور اولاد کی پیدائش ہیوز کی فطرت و عادات بھی بدل جائیں گی لیکن مشکلات اب بھی اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

☆......☆

اسی برس دسمبر میں بحری سفر کے ذریعہ وہ انگلینڈ واپس آگئے۔

کرسمس کا تہوار ہیوز کے خاندان نے ایک ساتھ منایا اور یہیں سلویا پلیتھ پر ایک اور بھیانک حقیقت آشکار ہوئی کہ مرد کو اپنے دام میں الجھائے رکھنے اور اس کی بیوی کے خلاف ہرزہ سرائی کے لیے غیرعورتیں ہی ذمہ دار نہیں ہوتیں، کبھی کبھی یہ کام محرم اور سگے رشتے بھی نہایت اہتمام سے کرتے ہیں۔ Heptonstall میں یہ کام ہیوز کی بہن 'اولوین' سرانجام دینے لگی۔ ان دونوں خواتین میں بہت تناؤ رہتا تھا اور سلویا کو محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں پھنس گئی ہے۔

جنوری 1960 میں وہ 'پرم روز ہل' منتقل ہوگئے۔ اسی برس اپریل میں 'فرائیڈا ربیکا' کی پیدائش نے اسے کائنات کے عظیم ترین رتبے پر فائز کردیا۔ ہیوز نے جب بیٹی کو اپنی گود میں لیا تو خوشی اور فخر کے احساس نے آنکھیں بھگودیں۔

فرائیڈا کی آمد نے زندگی مزید مصروف کردی۔ اسے لکھنے کے لیے اب کم وقت ملتا تھا۔ اس برس وہ صرف درجن بھر نظمیں ہی لکھ پائی لیکن اسی سال اس کی پہلی کتاب "The Colossus" منظر عام پر آئی۔ چالیس نظموں پر مشتمل اس کتاب نے سنجیدہ اور باذوق قارئین کو بہت متاثر کیا۔

یہ کتاب محض شاعری کا مجموعہ نہیں' ایک نوحہ تھی۔ ایک ایسا نوحہ جس میں باپ کی شفقت سے محروم لڑکی اپنی زندگی میں اس کی واپسی کے لیے بلکتی دکھائی دیتی تھی تو کہیں محبت کی متلاشی عورت کے جذبات کی ناقدری نظر آتی۔ مردوں کے معاشرے میں عورت کی بقاء کے لیے جدوجہد نے بھی بہت سے قارئین کو متاثر کیا تو دوسری جانب ناقدین بھی اس کی لفظی پختگی' تخیل اور جذبات نگاری کے فن کے قائل ہوگئے۔

☆......☆

اس سال کے اختتام پر اسے ایک بار پھر اولاد کی نوید ملی۔ یہ خبر یقیناً بہت خوشی کا باعث تھی لیکن سلویا اپنے دل کا کیا کرتی جو شوہر کی بھنورا صفت طبیعت کے باعث بجھ کر رہ گیا تھا۔

فروری کی ایک سہانی صبح وہ حسب معمول اپنے کام کاج نمٹانے میں مشغول تھی۔ ہیوز کسی نئی نظم کی تخلیق میں مصروف تھا۔ فون کی گھنٹی نے دونوں ہی کا ارتکاز ختم کردیا۔ ہیوز نے رکھی سے انداز میں فون اٹھایا اور پھر یکدم اس کا لہجہ و انداز تبدیل ہوگئے۔

"مجھے خوشی ہوگی۔ میں پہنچ جاؤں گا، بے فکر رہو۔" اس کا لہجہ کھنکنے لگا۔

سلویا سے اس کی یہ تبدیلی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ کچھ لمحوں بعد وہ بہترین لباس میں موجود کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔

"بی بی سی کے ایک شعبہ کی ڈائریکٹر 'موئرہ ڈلون' مجھ سے مل کر میری کتاب کے بارے میں انٹرویو کرنا چاہتی ہے۔ میں نے کافی عرصہ پہلے اسے اپنی نظمیں بھیجی تھیں۔" وہ حتی الامکان بے نیازی جتا رہا تھا لیکن اس کے لباس سے پھوٹتی خوشبو اور آنکھوں کی مخصوص چمک ببانگ دہل اعلان کررہی تھیں کہ معاملہ محض انٹرویو کا نہیں ہے۔

"اتنے شارٹ نوٹس پر انٹرویو؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تکنیکی کام متعلقہ افراد ہی بہتر جان سکتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر روانہ ہوگیا۔

وہ سارا دن سلویا نے جیسے جلتے انگاروں پر گزارا۔ شام کے بعد اس کی برداشت بالکل ختم ہوگئی۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی اور بی بی سی کے متعلقہ شعبہ کا نمبر نکال کر فون ملالیا۔ جواب حسب توقع موصول ہوا۔

"آپ کی مطلوبہ خاتون آج دوپہر کو سیٹ سے اٹھ گئی تھیں۔ کل کسی وقت فون کریں۔"

"کیا آپ مجھے بتاسکتے ہیں وہ کس کے ساتھ گئی تھی؟" سلویا نے پوچھا۔

"معاف کیجیے۔ ہم یہ بتانے کے پابند نہیں۔" دوسری جانب سے نہایت درشت لہجہ میں کہا گیا۔

"اپنی زبان سنبھال کر بات کرو...... میں سلویا پلیتھ ہوں......" وہ یکدم آپے سے باہر ہوئی لیکن فون بند ہوچکا تھا۔

سلویا کا پارہ آسمان چھونے لگا۔ ہیوز کا جھوٹ اور دھوکا دہی آج مکمل کر سامنے آگئے تھے۔ وہ اپنی شخصیت اور ہنر کو کیش کروا رہا تھا۔ اس کے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی اور پل بھر میں ہی دل و دماغ پر قابض ہوگئی۔ وہ تنتناتی ہوئی اس کی رائٹنگ ٹیبل پر گئی اور وہاں موجود بھی کاغذات پرزے پرزے کردیئے۔

ہیوز رات گئے واپس آیا اور فرش پر بکھرے اپنے کاغذات .... دیکھ کر طیش میں مبتلا ہوگیا۔

"یہ کیا کیا پاگل عورت؟" وہ حلق کے بل چلایا۔

"کوئی بھی بیوی جب مسلسل بارہ گھنٹے سے شوہر کا انتظار کررہی ہو اور شوہر کسی دوسری عورت کے ساتھ داد عیش دینے میں مصروف ہو تو اس کیفیت میں وہ پاگل ہی ہوگی ہیوز!!" اس نے بھی چلا کر جواب دیا۔

"میں انٹرویو کے سلسلے میں مصروف تھا۔"

سلویا سے یہ جھوٹ برداشت نہ ہوا اور اس نے غضب ناک ہوکر اس کا چہرہ نوچ لیا۔

"جھوٹے!! مکار!! دغاباز ہو تم" وہ غرائی۔ "میں بی بی سی فون کرکے پوچھ چکی ہوں۔ تم دوپہر ہی سے اس کے ساتھ غائب تھے۔"

"ہاں!! ہم ڈنر کرنے گئے تھے۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تم مان کیوں نہیں لیتے ہیوز کہ تم ایک بے وفا شوہر ہو!!" سلویا نے اسے طمانچہ رسید کیا۔

"پاگل عورت!! وہ مجھ سے کئی سال بڑی ہے.... تم ہر ایک کو میرے ساتھ نتھی کیوں کردیتی ہو؟" ہیوز بھی انتہائی غصہ میں آیا۔ اس نے سلویا پر بے دریغ تشدد شروع کردیا۔ اسی مار پیٹ اور تشدد کے نتیجہ میں وہ اپنی اولاد کے دنیا میں آنے سے قبل ہی اس سے محروم ہوگئے۔

سلویا کی ذہنی کیفیت ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید دگرگوں ہونے لگی تھی۔ جسمانی زخم تو مندمل ہوجاتے لیکن دل اور روح پر لگے گھاؤ اب ناسور بنتے جارہے تھے۔ کوئی شفا ملتی بھی تو کیسے؟ مسیحا ہی قاتل تھا۔

☆......☆

مصیبت کبھی بھی تنہا نہیں آتی۔ اس کے ہمراہ ہمیشہ کئی چھوٹے بڑے مسائل بھی سنگت نبھانے چلے آیا کرتے ہیں۔

مس کیرج کے بعد سلویا کو اپنڈکس کا مسئلہ لاحق ہوگیا۔ اسے کئی ہفتوں کے لیے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

مایوس بیزار اور افسردہ سوچوں نے زندگی کی چاہت تو پہلے ہی بہت کم کردی تھی۔ سرجری اس کے لیے بہت اذیت ناک تجربہ ثابت ہوئی۔ خوش آئند بات بہرحال یہ تھی کہ اس دوران اس کا تخیل بہت متحرک رہا۔

"Tulip" ' "In Plaster" جیسی نظمیں تخلیق کرنے کے بعد اس نے ایک ناول لکھنے کا فیصلہ کیا۔ تخیل میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ درپیش ہونے پر وہ اپنے آپ کو ایک ہی بات کی یاددہانی کرواتی کہ اگر وہ فرائیڈا کی صورت میں ایک زندگی کو جنم دے سکتی ہے تو الفاظ کو نئے روپ میں پیش کرنا تو بہت آسان ہے۔

ناول لکھنے کی تمنا نے اس کی توانائی میں کئی گنا اضافہ کردیا۔ اسے پلاٹ اور کرداروں کے لیے کسی محنت یا تحقیق کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کی اپنی زندگی کا ہر اک دن ہی ایک نئی کہانی تھی۔ درد' اذیت' کرب اور تشنہ لبی سے گندھی پرآشوب کہانی۔ سلویا نے شب و روز اس ناول پر کام کیا اور اگلے ستر دن میں انگریزی ادب میں "The Bell Jar" جیسے یادگار شہ پارہ کا اضافہ کردیا۔

اسپتال میں قیام کے دوران ہی اسے 'دی نیویارکر' کی جانب سے پہلا ریڈنگ کا نٹریکٹ بھی ملا۔ سو ڈالرز کے اس کی چیک کی وصولی کا واضح مطلب یہی تھا کہ 'دی نیویارکر' اب نہ صرف اس کی تمام نظمیں پڑھیں گے بلکہ اشاعت کے لیے بھی

ان کی پہلی ترجیح وہی ہوں گی۔

اس سال سلویا نے 'بائیس' نئی نظمیں لکھیں۔ قدرت اس پر بہت مہربان تھی۔ سترہ جنوری 1962 میں نکولس کی پیدائش نے خاندان مکمل کردیا۔ اسے امید ہونے لگی تھی کہ اب اس کی زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہوجائے گا لیکن ایک بار پھر وہ غلط ثابت ہوئی۔ اس مرتبہ تقدیر کا وار بہت کاری تھا۔

☆......☆

سلویا اور ہیوڈ اپنا فلیٹ کرائے پر دینے کے خواہشمند تھے۔

اخبار میں اشتہار دینے کے بعد ایک شادی شدہ جوڑا انہیں بہت موزوں لگا۔ 'ڈیوڈ ویول' کینیڈا کا شاعر تھا۔ اس کی بیوی کا نام 'اسیا' تھا جو بظاہر سلویا کو قدرے معقول لگی تاہم اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہیوڈ کی طرف مائل ہونے لگی۔ معاملہ پہلے چوری چوری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے تک محدود رہا۔ پھر ڈنرز اور آؤٹنگ کی باہمی منصوبہ بندی بننے لگی۔ ڈیوڈ اور سلویا بھی اس موقع پر ساتھ ہی ہوتے تھے لیکن ان دونوں کی بڑھتی قربت کم از کم سلویا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی شوہر کی ہر سوچ اور تبدیلی ایک لمحہ میں پرکھ لیا کرتی تھی۔ اب تو فریق ثانی اس کے سامنے موجود تھا۔

اسیا کا ماضی بھی بہت حیران کن تھا۔ ڈیوڈ اس کا تیسرا شوہر تھا اور اب ہیوڈ بھی اس متوقع فہرست میں شامل ہوتا نظر آرہا تھا۔ جون کے اختتام تک معاملات مزید ابتر ہوگئے۔ سلویا کی ذات بری طرح نظرانداز ہورہی تھی۔ ہیوڈ کی نظریں پروانہ وار اسیا کا طواف کرتیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے گھر سے بھی غائب رہتا۔ سلویا کے دریافت کرنے پر اس کے پاس ایک نہیں بے شمار تاویلیں پہلے ہی سے موجود ہوا کرتیں۔

"ہیوڈ! یہ سب کچھ کب تک جاری رہے گا؟"

"تمہارا وہم لاعلاج ہے سلویا!!"

"تم کب تک مجھ سے جھوٹ بولتے رہو گے؟ میں تھک چکی ہوں۔ گھر' بچے' پیشہ ورانہ مسائل سب کچھ سنبھل جاتا ہے لیکن تمہاری یہ روش مجھے ہر پل ایک نئی موت دیتی ہے۔ میں آج تک تمہیں کسی سے بانٹنا نہیں سیکھ سکی۔" وہ چیخ کر بولی۔

ہیوڈ اسے نظرانداز کیے اپنے کام میں مشغول رہا۔ اسی لمحہ فون کی گھنٹی بجی۔ سلویا نے لپک کر فون اٹھالیا لیکن دوسری جانب اس کی آواز سن کر خاموشی طاری ہوگئی۔

"میں جانتی ہوں کہ تم اسیا ہو۔" وہ کاٹ دار لہجہ میں بولی۔

ہیوڈ نے آگے بڑھ کر اس سے ریسیور چھین لیا اور بات چیت میں مشغول ہوگیا۔ سلویا نے فون سیٹ اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ ان کا جھگڑا اس قدر شدت اختیار کرگیا کہ اس روز سلویا نے دونوں بچوں کے ساتھ گھر چھوڑ دیا۔ وہ ہیوڈ سے حقیقتاً بہت محبت کرتی تھی۔ علیحدگی کا یہ فیصلہ بہت اذیت ناک تھا لیکن اب برداشت کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

☆......☆

نئے فلیٹ میں زندگی بہت کٹھن تھی۔

وہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہیں تھی۔ بجلی کا نظام بھی اکثر دغا دے جاتا۔ ہیٹر جیسے آلات بھی ناپید تھے۔ وہ ایک پُر تپش جہنم سے نکل کر سرد جہنم میں آگئی تھی لیکن واپسی بھی بہرحال آسان نہیں تھی۔ اس کے احباب اگر ملنے کے لیے آتے تو شدید سردی کے باعث زیادہ دیر ٹھہر ہی نہ پاتے۔

سلویا دہری اذیت میں مبتلا تھی۔ اس دوران لکھی جانے والی نظمیں مسترد ہونے لگی تھیں حالانکہ اس کے نقطہ نظر سے وہ شاندار تخیل پرمبنی تخلیقات تھیں۔ تھکاوٹ اس کے اعصاب پر مکمل حاوی ہونے لگی۔ اپنی اندرونی تپش سرد کرنے کے لیے اس نے سگریٹ نوشی کا آغاز کردیا۔ اسی دوران ہیوڈ اور اس کا مشترکہ پبلشر دوست 'الوارز' مصالحت کی کوشش کرنے چلا آیا۔ وہ اس کی تبدیلیاں دیکھ کر بہت حیران تھا۔ تھکن آلود چہرہ' آنکھوں کے گرد حلقے اور تلخی میں لتھڑے فقرے اسے بہت دکھ دینے لگے۔ اس کا بیس پاؤنڈ وزن کم ہوچکا تھا۔ میز پر پڑے نسخوں اور چند ادویات سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ شدید بےخوابی کا شکار ہے اور نفسیاتی معالج کے زیر علاج ہے۔

"تم ایسی تو نہیں تھیں سلویا!! یہ تبدیلیاں کیونکر؟"

"زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تبدیلی کا یہ سفر جاری رکھوں گی۔" اس نے سگریٹ کا کش لیا۔

"اب مزید کیا کرنا ہے تم نے؟" وہ ہول گیا۔

"میں سنجیدگی سے ایک معاشقہ استوار کرنے کی بابت سوچ رہی ہوں۔" سلویا بےحد سنجیدہ تھی۔

"خود کو یوں برباد مت کرو!!"

"برباد تو میں ہوچکی۔" وہ ہنسی۔

"سلویا!! تم بہت خوبصورت ہو' ذہانت سے مالا مال ہو۔ تمہاری شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے۔ سنجیدہ طبقہ تمہیں پڑھنا چاہتا ہے۔ ان نعمتوں کی بےقدری کیوں کررہی

ہو؟" اس نے خلوص سے کہا۔ "تم دونوں کا جوڑا مثالی ہے۔ اپنے رشتہ کو ایک اور موقع دو۔"

"میرا وجود کھوکھلا ہوچکا ہے۔ محبت کی تلاش نے میری ہر صلاحیت ختم کردی۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتی ہوں۔" اس کی ہنسی میں ہزاروں دکھ تڑپ رہے تھے۔

زندگی کا مطلب اگر صرف سانس لینا تھا تو سلویا ایسی ہی زندگی جی رہی تھی۔ بےمطلب' بےمقصد' بےروح اور بےکیف۔ وہ سرما ملکی تاریخ کا سردترین موسم تھا۔ پائپ منجمد ہوچکے تھے۔ زمین نے منوں وزنی برف اوڑھ رکھی تھی۔ ایسا موسم تو یوں بھی اس کی قوت مدافعت صفر کردیا کرتا تھا۔ دو ننھے بچوں کو سنبھالتی اور بیرونی کام میں بھی مصروف دکھائی دیتی سلویا زندگی کی چاہت سے بےنیاز ہوتی جارہی تھی۔

☆......☆

ہیوڈ ہیوز اپنا غم غلط کرنے کے لیے شراب کے نشے میں ڈوبنے لگا تھا۔

سلویا اور بچوں کی غیرموجودگی اس کے وجود کا خلا بن گئی۔ فلرٹ کرنے کی عادات سے قطع نظر وہ سلویا سے واقعی محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت اس کی بیوی کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی۔ خواتین سے رومانوی معاملات ہیوڈ کی کمزوری سہی مگر وہ اپنا گھر ٹوٹنے سے بھی خائف تھا۔ اکثر وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر بچوں سے ملنے سلویا کے پاس پہنچ جاتا۔ ان ننھے پھولوں کو دیکھ کر اسے اپنی ہر تشنگی ختم ہوتی محسوس ہونے لگتی۔

ماہ فروری کی اس ملاقات میں سلویا کا رویہ کچھ مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ ہیوڈ کو قدرے امید ہونے لگی۔

"میں تم سب کو بہت یاد کرتا ہوں۔ یہ ناراضگی اب ختم کردو۔"

"ناراضگی تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اصولی موقف ہے۔" سلویا نے کہا

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں!!"

"تمہاری محبت میں وفاداری کا عنصر ہی نہیں ہیوڈ!! یہ کیسی محبت ہے؟"

وہ بہت منتشر دکھائی دے رہا تھا اور سلویا کی چھٹی حس مسلسل پکار رہی تھی کہ یہ انتشار محض بچوں سے دوری نہیں ہے۔ وہ کسی اور الجھن میں بھی مبتلا ہے۔

"میں تم سب کے بغیر بہت تنہا ہوں!"

"اچھا!! کیا واقعی؟؟" ایک درد بھری مسکراہٹ لبوں پر ٹھہری۔

"گھر لوٹ آؤ!!"

"اسیا کو چھوڑ دو...... ہمیشہ کے لیے۔" اس کے متوقع مطالبہ پر ہیوڈ مضطرب سا ہوا۔ وہ ہمیشہ اس کی ہر بات جھٹلا دیتی تھی۔ سچائی سننے کے لیے بضد رہتی تھی اور اس اہم ترین لمحہ میں ہیوڈ ہیوز نے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا۔

"ایسا ممکن نہیں رہا اب!"

"کیوں؟ اب ایسا کیا ہے؟"

"ہمارے اس رشتہ کی نشانی وجود میں آنے والی ہے۔" اس نے دل کڑا کرکے کہہ دیا۔

سلویا پلیتھ کا وجود پل بھر میں ہی پارہ پارہ ہوگیا۔ اپنی تنہا زندگی اور مصائب سے ٹوٹ پھوٹ کی شکار اس بدقسمت عورت نے ملاقات سے قبل ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ اس رشتے کو ایک اور موقع دیتے ہوئے شوہر کے ساتھ اپنے گھر لوٹ جائے گی۔ ہیوڈ کے اس اعتراف نے اسے اندھیروں کے حوالے کردیا۔ عزت ووقار اپنی بےقدری پر زاروقطار روتے دکھائی دینے لگے۔ اس نے گھر بچانے کے لیے اپنی خودداری کو کچل کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ باپ کے سائے سے محروم زندگی کے آزار عمر بھر برداشت کیے تھے اور فرائیڈا' نکولس کو انہی نفسیاتی الجھنوں سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ ہیوڈ کے ایک ہی فقرے نے سب کچھ ختم کردیا۔

ایک فیصلہ پل بھر میں آسان ہوگیا۔

☆......☆

سلویا اپنے فلیٹ کی نچلی منزل کے زینوں پر کھڑی گہری سوچ میں کھوئی تھی۔

اسی دوران سامنے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک مہربان' شفیق' جھریوں بھرا چہرہ نظر آیا۔ تھامس نامی یہ شخص اس فلیٹ میں تنہا رہتا تھا اور گزشتہ چھ ماہ میں سلویا کی کئی معاملات میں بہت مدد کی تھی۔ وہ اس سے کافی مانوس ہوچکی تھی۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟" تھامس کی آواز پر وہ چونک گئی۔ ذہن پر بہت زور ڈالنے کے باوجود اسے یاد نہ آیا کہ وہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔

"تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے۔" تھامس ایک بار پھر تشویش زدہ ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"تمہیں اپنی مدد کے لیے جز وقتی ملازمہ رکھ لینی چاہیے سلویا!! سب کچھ تنہا کب تک سنبھالو گی؟"

"کل صبح سے ایک نرس آیا کرے گی۔ بچوں کو سنبھالنے کے لیے مقرر کی ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اچھا فیصلہ ہے!! اگر میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک چلی آنا۔" تھامس اس کے حالات و مشکلات سے واقف تھا۔ غریب الوطن عورت شوہر سے علیحدگی کے بعد مسائل میں گھری تنہا ہی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اسے تمیں سالہ اس شاعرہ کی حالت دیکھ کر بہت تاسف ہوتا۔

سلویا بوجھل قدموں سے اپنے فلیٹ میں چلی گئی۔ اس کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔ وہ ڈپریشن کی مریضہ تو بہت عرصے سے تھی ہیوز کے انکشاف کے بعد اپنی آخری امید بھی کھو بیٹھی۔ بچوں کے سو جانے کے بعد وہ بے مقصد کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔ ماضی کے عکس بار بار نظروں کے سامنے گردش کر رہے تھے۔ ایک ذہین و فطین طالبہ، پچاس سے زائد مختصر کہانیوں اور سینکڑوں نظموں کی خالق، دو کتابوں کی مصنفہ، گلاسکو پرائز سمیت کئی انعامات کی فاتح سلویا پلیتھ محبت کی تلاش میں اپنی ہر صلاحیت کے بارے بے یقین ہو چکی تھی۔ یہ جذبات اسے زندگی میں ایک ہی شخص سے ملے تھے۔ باپ کی موت نے سلویا کو راہوں کی دھول بنا دیا۔ خالص، بے ریا اور وفادار محبت کے ساتھ تحفظ کی متلاشی اس عورت کے لیے زندگی میں اب کوئی کشش نہیں رہی تھی۔

وہ خالی الذہنی کے عالم میں اٹھی۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازے کی جھریوں کو ٹیپ لگا کر بند کیا۔ تولیے اور مختلف کپڑوں سے ہر رخنہ بند کر دینے کے بعد اس نے اپنا سر گیس اوون میں رکھ کر گیس کھلی چھوڑ دی۔

گیارہ فروری کی اس صبح سلویا نے موت کو گلے لیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔

سلویا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ بچوں کے لیے مقرر کردہ نرس دروازے پر دستک دیتی رہی۔ نچلی منزل پر موجود تھامس کو اپنے فلیٹ میں بھی گیس کی ہلکی سی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس فلیٹ کی چھت میں کوئی معمولی سا رخنہ موجود تھا جو اوپر سلویا کے کمرے میں بھرنے والی گیس اب نیچے خارج کر رہا تھا۔ جلد ہی سلویا کی موت کی خبر ہر سُو پھیل گئی۔

ہیوز کے لیے وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ سلویا کی خودکشی کا یہ عمل اس کی سوچ اور تصور سے بھی بالاتر تھا۔ اسے اپنی زندگی ایک بھونچال کی زد میں آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ہوا بھی یہی۔ سلویا کی آخری نظموں میں اس کی ذہنی کیفیت، کرب اور شوہر سے تلخ تعلقات بہت واضح بیان کردہ تھے۔ اس کی زندگی میں تو شاید ان نظموں کو اتنی پذیرائی نہ ملتی لیکن اس جواں مرگ کے بعد اس کی تخلیقات کی شہرت راتوں رات کئی گنا بڑھ گئی۔ سنجیدہ قارئین ادب کے اس نقصان پر بہت دلگرفتہ تھے تو کئی دیگر افراد اس کی خودکشی کا ذمہ دار 'ہیوز ہیوز' کو قرار دینے لگے۔ عوامی مقامات، جرائد اور تقاریب میں اسے کھل عام تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ کچھ ہی عرصے میں نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ایک مشاعرہ نما تقریب میں جب وہ اسٹیج پر اپنا کلام پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا تو حاضرین کی جانب سے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو گیا۔

"یہ قاتل ہے۔"

"سلویا کا قاتل ناقابل معافی شخص ہے۔"

"اسے یہاں سے بھیج دیا جائے...... سلویا کی خودکشی کا ذمہ دار صرف یہی ہے۔ یہ ادیب کہلانے کے لائق نہیں۔"

زہریلے الفاظ کی یہ بازگشت ہیوز کے اعصاب پر اس بری طرح سوار ہوئی کہ وہ اگلے تین سال قلم سے تعلق برقرار نہ رکھ سکا۔ پریشانی، مایوسی، ملال اور پچھتاوے اسے ہر لمحہ ڈستے تھے۔ اس کیفیت کے زیر اثر اس نے سلویا کے روزنامچوں سے کئی اہم اوراق پھاڑ کر غائب کر دیے۔ ان تلخ حقائق کے منظر عام پر آنے کا تصور ہی بہت بھیانک تھا۔ معاشرتی دباؤ سے قطع نظر اگر یہ حقائق و واقعات بچوں کے علم میں بھی آتے تو ان کی ذہنی کیفیت بہت الجھ جاتی۔

عوامی ردعمل شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ ہیوز ہر جانب سے الزامات اور دباؤ کی زد میں تھا۔ سلویا کی قبر کے کتبے پر کندہ نام سے اس کا نام کھرچ کر مٹا دیا گیا۔ اس خودکشی میں ہیوز کے کردار اور ماضی کے واقعات کی گرد کبھی نہ بیٹھ سکی۔

ہیوز کی زندگی بھی متوازن نہ رہ سکی۔ اسیا سے شادی کے بعد بھی وہ سلویا کی موت کے حصار میں رہا اور صرف وہی نہیں اسیا بھی بہت ذہنی دباؤ میں جیتی رہی اور بالآخر اسی کشمکش میں کچھ سال بعد ہی اس نے بھی خودکشی کر لی۔

محبت کی یہ تکون ہمیشہ کے لیے بکھر گئی کیونکہ کچھ غلطیاں ناقابل تلافی، کچھ سفر ادھورے اور کچھ محبتیں وصل کے بعد بھی سدا تشنہ رہتی ہیں۔

▲▲

مرگِ تنہا

اے آر راجپوت

اینانکول بالی ووڈ کی ایک کامیاب ماڈل گرل، اس کی شہرت آسمان کو چھو رہی تھی. اس کا بڑا بیٹا اس سے چھن گیا، موت کی گود میں جا سویا یعنی اس نے خودکشی کرلی. پولیس ابھی اس خودکشی کی وجہ تلاش ہی کررہی تھی کہ اس کے کمرے سے اس کے بیٹے کی طرح اس کی بھی لاش پولیس کو ملی. آخر ان خودکشیوں کی وجہ کیا تھی؟

ہالی ووڈ سے درآمد ایک عجیب سی روداد

"نکی...... نکی...... کم آن...... چھوڑو ان گندے لڑکوں کو...... یہ تمہیں چوٹ لگا دیں گے۔"

گیارہ سالہ نکی کی ماں بیلا نے اسے پکارا۔ بیلا ایک تمیں بتیس سالہ قبول صورت اور مناسب خدوخال کی خاتون تھی۔ اس نے لمبا سا اسکرٹ پہن رکھا تھا، جو خاصا میلا ہو رہا تھا۔ سر پہ بندھے سفید اسکارف سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس وقت کچن میں مصروف تھی اور اسی دوران اسے اپنی سات سالہ بیٹی کا خیال آ گیا تھا جو بیک یارڈ میں کھیل رہی تھی۔ تب تک وہ اس سے مطمئن تھی، لیکن جب اس نے مسٹر جارج ہروبن اور مسز کیتھرین...... کے لڑکوں کی آوازیں سنی تو کام چھوڑ کر اسے باہر آنا پڑا۔

"ممی! پلیز! تھوڑا سا اور کھیل لینے دو ناں، ابھی تو جنگل (اسٹاپو ٹائپ کی گیم) شروع ہوئی ہے۔"

گیارہ سالہ گول مٹول سی گڑیا جیسی شکل و صورت کی بچی نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جوڈی اور پال جونکی سے ایک دو برس ہی بڑے تھے۔ انہوں نے نکی کو دبوچ رکھا تھا۔ پال نے اس کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں اور جوڈی

نے اس کے جسم کے اُوپری حصے کو تھام رکھا تھا۔ ڈنڈا ڈولی کیے ہوئے تھے۔ نکی کی ماں کو دیکھتے ہی انہوں نے اسے فوراً چھوڑ دیا۔

"یہ کیسا گندا کھیل، کھیل رہے ہو تم...... مجھے بالکل پسند نہیں۔" بیلہ اپنے ہاتھ اسکرٹ سے پونچھتی ہوئی چوبی تھڑے سے اُتر کر بیک یارڈ میں اُتری اور جوڈی اور پال کی طرف بپھرے ہوئے انداز میں بڑھی۔ وہ دونوں بچے سہم گئے۔ باقی لڑکے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

"تمہیں شرم نہیں آتی...... اس طرح ایک معصوم سی بچی کو اُٹھاتے ہیں؟"

"مم...... میڈم! اس نے خود کہا تھا کہ مجھے ایسے اُٹھاؤ۔" جوڈی نے ہمت کر کے کہا۔

"یس مما! ان کا کوئی قصور نہیں ہے، میں نے ہی کہا تھا ایسا کرنے کو۔" نکی نے اپنے ہم عمر دوستوں کی حمایت کی مگر وہ سب اس کی ماں کا غصہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے نکی رو پڑی۔ بیلہ کے دل پر اس کے رونے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے بازو سے کھینچ کر اندر لے آئی۔

بیلہ کے مزاج میں یہ سختی دراصل ان پیش آمدہ حالات کے سبب تھی کہ نکی کے باپ گرے اسکپ کے اس ناروا سلوک کا نتیجہ تھی جو اسے چھوڑ کر نجانے کہاں جا چکا تھا، اس بات کو اب دس سال بیت چکے تھے۔

بیلہ فطرتاً رومان پسند تھی۔ اگر اس کا کوئی پرانا ساتھی اس کے آج والے مزاج کو دیکھ لیتا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہتا بلکہ اس چڑچڑے پن کو دیکھتے ہوئے بے اختیار کہہ اُٹھتا کہ "کیا یہ وہی دس سال پہلے والی بیلہ ہے، جو نرم گفتار تھی، محبت بھرا دل اور موہ لینے والی مسکراہٹ کی حامل ہوا کرتی تھی؟"

بیلہ نے نکی کے باپ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی مگر گرے اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ بیلہ کو پہلے پہل گرے کے اس طرح چھوڑ کر چلے جانے کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اس نے اسے بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ پولیس میں بھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا چکی تھی، کیونکہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ممکن ہے گرے کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔

یہ قلعی بھی دس پندرہ دن بعد کھل گئی جب گرے کا اسے فون موصول ہوا۔ وہ کسی دوسرے شہر کے پبلک بوتھ سے بول رہا تھا۔

"بے وقوف! میرے پیچھے پولیس کیوں لگا دی ہے؟ میں کوئی کھویا تھوڑی ہوں، بس تم سے بیزار ہو گیا تھا۔ ہمارے راستے جدا ہیں۔ لہٰذا پولیس کو بتا دو کہ ایسی کوئی بات نہیں وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

اس کی بات سن کر بیلہ کا دل اس قدر ٹوٹ گیا کہ اس نے گرے کو لعن طعن...... کی اور خاموشی سے فون رکھ دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے چپ سادھ لی اور گیارہ ماہ کی نکی کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔

نکی گیارہ برس کی ہو چکی تھی مگر اسے اپنی ماں بالکل پسند نہ تھی، اسے اپنے دوست عزیز تھے، وہ بھی صرف لڑکے۔ لڑکیوں سے اس کی کبھی دوستی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اپنے گروپ میں لڑکوں کو ہی رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ کوئی لڑکا بھی دیکھ لیتی تو اسے اپنی طرف کھینچ لیا کرتی تھی۔

ماں کی پابندیاں اور ڈانٹ پھٹکار نے نکی کی نفسیات پر منفی اثر ڈالا تھا۔ وہ اس سے ناراض رہنے لگی۔ سولہ سال کی عمر میں اس کی ماں کا اچانک انتقال ہو گیا۔

نکی کو دکھ بھی تھا مگر اب وہ خود کو ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر کے خوش اور مطمئن تھی۔ یہاں تک کہ اسے پُرسے کے لیے آئے ہوئے لوگوں سے بھی اُلجھن ہونے لگی۔ وہ اکیلے گھر میں آزادی سے دوڑتی اور خوش ہوتی پھر رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ ماں کے بعد اس کے لیے آئندہ کے حالات کس قدر سخت آنے والے تھے۔ ابھی اس کا ذہن کچا تھا۔

تیسرے دن لینڈ لارڈ کی طرف سے اسے مکان خالی کرنے کا نوٹس مل گیا کیونکہ نکی اب کرایہ ادا کرنے کے قابل تھی نا ہی گھر سنبھالنے کے۔ جو کچھ جمع جتھا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔

نکی کو وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ بچا تھا اور وہ کسی چوہیا کی طرح کچن میں گھٹنوں ...اور کہنیوں کے بل رینگ رینگ کر کچھ کھانے کو تلاش کر رہی تھی۔

یہاں اس کی زندگی نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ اسے رشتوں سے زیادہ دولت کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا۔ مکان ابھی اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ سوشل سیکیورٹی سے اسے تھوڑے بہت پیسے ملنے لگے تھے۔ لینڈ لارڈ کو اس نے کسی طرح بے دخل کرنے سے روک دیا تھا مگر اسے کرایہ ملتے رہنے کی تسلی کرانا ضروری تھا، صرف سوشل سیکیورٹی کے ہر ماہ ملنے والے چیک سے بات نہیں بن سکتی تھی، چیک کی رقم بس اتنی ہی ہوتی کہ نکی دو وقت کی روٹی کھا سکتی تھی اور کسی بار یا پب میں آدھا پیگ یا ایک کافی پی سکتی تھی۔

خود نکی کو سوشل سیکیورٹی والوں سے ملنے والے یہ چیک ہزیمت کا باعث محسوس ہوتے تھے جنہیں وہ عجیب و غریب انسانوں کے درمیان میں گھنٹوں لائن لگا کر کھڑی ہو کر حاصل کرتی تھی۔

وہ صورت سے ہی شہزادی لگتی تھی لیکن حقیقت ایک یہ بھی تھی کہ ذلت کی کھائی میں ہی انسان کو اپنے بارے میں صحیح پتا لگتا ہے۔ جب وہ اس "خیرات" کی لائن میں کھڑی ہوتی تو کئی لوگوں کے جملے سننے کو ملتے۔ "اوہو...... کیسی حسین شہزادی ہے۔ دولت تو خود اس کے قدموں میں ہونی چاہیے، یہ بھلا یہاں کیوں آ گئی؟"

"ہائے! اس پری وش کو تو کسی محل میں ہونا چاہیے تھا، قسمت بھی کیسے کیسے لوگوں کو کہاں لے آتی ہے۔"

"اسے تو ہالی ووڈ کی ایکٹریس ہونا چاہیے تھا۔"

نکی کو اپنے بارے میں سننے والے یہ جملے ہرگز برے نہیں لگتے تھے۔ تب اُس نے ایک دن آئینے میں اپنا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی، نہ ہی اس میں حسینوں والی کوئی کشش تھی۔ آنکھوں میں بھی کوئی دلکشی نہیں تھی۔ بہت بے کشش سی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ قد البتہ دراز تھا، یہ کوئی بڑی خوبی نہ تھی۔ بال گولڈن تھے۔ رنگ گورا تھا۔ ان خوبیوں کو بھی حسن کے پہلے درجے میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"پھر وہ لوگ جو لائن پر لگے تھے، کیا بکواس کر رہے تھے۔"

نکی جھلا کر بڑبڑائی۔

صرف سترہ برس کی عمر میں وہ ایک لوکل فرائیڈ چکن ریسٹورنٹ میں نوکری کرنے لگی۔ زندگی کی گاڑی کو کچھ دھکا لگ گیا تھا۔ مگر وہ خود کو لوگوں کی نظروں سے کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی جن کا خیال تھا کہ نکی ایک شہزادی ہے اور یہ ہالی ووڈ پر راج کر سکتی ہے۔

سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بالآخر یہ بھید اس کے بچپن کے پڑوسی اور دوست جوڈی نے ہی کھولا۔ "نکی! تم بہت حسین ہو...... بہت زیادہ......"

وہ دونوں اس وقت نکی بے گھر کے بیک یارڈ میں ایک چوبی بینچ پر بیٹھے تھے۔ شام ڈھلنے لگی تھی اور نیلا آسمان سیاہ ہونے لگا تھا۔

"بکواس کرتے ہو تم سب۔" وہ چڑ کر کہتی اور دوسروں کی باتیں بھی بتاتی جو اس کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔

"لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں، ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے اس لیے اب یہ بتانا مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔" دوسری غلط فہمی اس طرح رفع کی ہے۔ "لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں یہ طولیٰ رکھتے ہیں۔"
(اقتباس: پطرس کے مضامین)

"میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں، کیا میں بھی بکواس کر رہا ہوں۔" جوڈی بولا۔

"میں نے تو آئینے میں خود کو ہزار بار دیکھا ہے، ایسی تو خاص خوبی نہیں ہے مجھ میں۔" وہ منہ بسور کر بولی۔ "عمر میری سترہ سال ہے اور ابھی سے میرا وزن۔"

"یہی تو تمہاری غلطی ہے کہ تم اپنا حسن آئینے میں تلاش کرتی ہو۔" جوڈی نے اس کی بات کاٹی۔

"کیا مطلب؟" نکی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ اگر تم خود کو آئینے میں دیکھو گی تو بے کشش لگو گی۔"

"تو پھر تم ہی مجھے ایسا کوئی آئینہ لا دو جس میں، میں حسین نظر آؤں۔" نکی نے ہنس کر کہا۔

"تم ایک مخصوص مزاج کے لوگوں کے لیے واقعی حسین ہو مگر اب تم اپنا حسن آئینے میں مت دیکھنا۔"

"تو کہاں دیکھوں پھر؟"

"باتھ روم میں......" جوڈی نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور نکی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے ہنستے ہوئے

معنوی غصے کے اظہار میں جوزی کی پشت پر ایک عدد گھونسا رسید کردیا پھر دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگے۔

☆……☆

کی… یعنی اینا نکول اسمتھ 28 نومبر 1967 میں میکسیا میں پیدا ہوئی۔ اس کی مشکل حل کرنے والا اس کے بچپن کا دوست جوزی ہی تھا۔ اینا نکول کو وہ کبھی نہیں بھولا تھا۔ نکول نے اس کے مشورے پر عمل کیا تو وہ خود ہی حیران ہوگئی۔ وہ واقعی ایک مخصوص مزاج کے لوگوں کے لیے شہزادی ہی تھی۔ اس کے خدوخال بہت قیامت خیز تھے۔

وہ سستے سے ریستوران کی گھٹیا نوکری کرتے کرتے اُکتا گئی تھی۔ ملکی سیاسی حالات خراب ہونے کے باعث اسے سوشل سیکیورٹی کی طرف سے چیک ملنا بھی بند ہوگئے تھے۔ گزارا مشکل ہونے لگا تھا۔ لینڈ لارڈ نے ایک بار پھر اسے مکان خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا کیونکہ اینا نکول دیر دیر سے کرایہ دے پاتی تھی۔

مجبوراً اس نے بلے اسمتھ نامی شخص سے صرف سترہ برس کی عمر میں شادی کرلی۔ جو صرف ایک سال ہی چل سکی۔ اینا نکول نے بھی اپنی ماں جیسی ہی قسمت پائی تھی کہ اس کا شوہر بھی ایک بچہ اس کی گود میں تھما کر کہیں چلتا بنا۔ اینا کو مردوں سے نفرت ہونے لگی اور اس نے سوچا کہ وہ انہیں صرف پوزٹو کے سوا، کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں دے گی۔ اسی سوچ کے متوازی اس نے آگے چل کر بڑی تہلکہ خیز حرکت کی تھی اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنے فن (ماڈلنگ) کے نقطۂ عروج پر تھی۔

ڈینئل Daniel کی پیدائش 1984 میں ہوئی تھی۔ اس کی پرورش اب اینا نکول کے ہی ذمے تھی مگر اسے اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ اس نے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی خود سے جدا نہ کیا تھا لیکن اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کی بے وفائی نے اس کا دل اندر سے بھیر کرڈالا تھا۔ وہ اپنے حوالے سے ہی نہیں اپنے ننھے منے بیٹے ڈینئل کے حوالے سے بھی یہ سوچ سوچ کر گھٹ جاتی تھی کہ کاش اس کا باپ (شوہر) اسے چھوڑ کر نہ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ڈینئل بھی ماں کے ساتھ اپنے باپ کی شفقت و محبت کے زیرِ سایہ رہتا۔ ادھر ہی پہلی بار اس نے سگریٹ نوشی شروع کردی۔

اس نے ایک دن اپنی کچھ تصاویر ”پلے بوائے“ نامی ایک مشہور میگزین کو بھیج دیں۔ بس! وہ دن تھا اس کی کایا پلٹ گئی۔ اسے ماڈلنگ کی آفرز آگئیں۔

وہ ”ملٹی سائز لیڈیز فیشن میگ“ کے زیرِ جامہ کی ماڈلنگ کے لیے چن لی گئی تھی۔

وہیں سے اس کی تقدیر بدلنے لگی۔ اس نے ماڈلنگ کے بعد اپنی آنکھوں میں مستقبل کی ”مارلن منرو“ Marilyn Monroe بننے کے خواب سجائے تھے مگر وہ جوزی کی بات بھول گئی تھی کہ وہ صرف ایک مخصوص مزاج کے حامل لوگوں کے ہی دلوں کی رانی بن سکتی تھی۔

اینا نکول جسم کی بھاری تھی۔ تاہم اسمارٹ تھی۔ ماڈلنگ میں اس نے بہت نام کمایا۔ اپنے عروج کے دور میں اسے جب فلموں میں کام کرنے کی آفرز ملیں تو وہ خوشی سے نہال ہوگئی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر چند گام کے فاصلے پر ہی نظر آنے لگی۔

اس کی چند مشہور فلمیں قابلِ ذکر ہیں، جن میں، اسکائی اسکریپر، ایک ایکشن موویٰ تھی۔ نیکڈ گن، ایک کامیڈی ایکشن فلم، تو ڈی لسٹ، ایکشن فلم۔

نکول اسمتھ ترقی کی شاہراہ اوجِ پر ابھی گامزن ہی تھی کہ نجانے اسے کیسے اندازہ ہونے لگا کہ اس کی شہرت اور کام کا چراغ ڈوبنے والا ہے۔ دولت کمانے کا جو خواب اس نے لڑکپن سے دیکھا تھا وہ پورا ہوتے ہوتے اُدھورا رہ جانے والا تھا۔ بعض لوگوں میں یہ صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے اطراف میں اور خود پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں اندازہ ہونے لگتا ہے کہ یہ سب زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نکول اسمتھ میں کوئی فنی کمال نہ تھا، جو کچھ اسے حاصل ہو رہا تھا وہ صرف اور صرف اس کی جسمانی حشر سامانی کا ہی مرہونِ منت تھا۔

یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جس کے کارتوس ایک حد تک ہی چلا کرتے تھے کیونکہ اس نے ماڈلنگ یا فلموں میں کلی طور پر عریانیت پر ہی انحصار کیا تھا اور مغربی معاشرے میں یہ چیزیں بہت سستی کہلاتی تھیں لیکن ناقدین کے خیال کے مطابق جب نکول اسمتھ کو ”مارلن منرو“ سے مماثلت کا خطاب ملا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ عریانیت کو چھوڑ کر خالصتاً فن پر توجہ دیتی تو بہت آگے جاتی۔

اینا نکول نے ایک دھماکا کر ڈالا۔ یہ وہی دھماکا تھا جس کا ذکر ہم مندرجہ بالا سطور میں کرچکے ہیں، اینا نکول نے محض چھبیس سال کی عمر میں ایک اناسی سالہ (89) بوڑھے اور ضعیف شخص سے شادی کرلی۔ اس کے شوہر کا نام مارشل تھا۔ وہ

ایک نہایت دولت مند اور ایک بڑا بزنس ٹائکون تھا۔ یہ بے جوڑ شادی 1994 میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ ایناٹکول نے اپنی حق وراثت کے لیے کورٹ میں دعویٰ کردیا کیونکہ مارشل کا جوان شادی شدہ بیٹا، روبرٹ اور بیٹی شین ایناٹکول کو اپنے باپ کی بیوی سمجھتے ہی نہیں تھے۔ ایناٹکول نے اپنا سارا زور اس مقدمے کو لڑنے میں لگا دیا۔ اس کا مرحوم اور عمر رسیدہ شوہر ایک بڑے اسٹیٹ کا مالک تھا، ایناٹکول اس میں حصہ چاہتی تھی۔ تاکہ باقی زندگی سکون سے اپنے بیٹے ڈینئل کے ساتھ سکون اور عیش سے گزار سکے۔ مگر وائے تقدیر اور ہائے نصیب کہ اسے تھوڑی سی دولت کے سوائے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

ایناٹکول سخت دل برداشتہ ہوگئی۔ اس نے دوبارہ ماڈلنگ کا رخ کیا، مگر اس کے شائقین، اس کی ایک بڈھے سے شادی کے بعد وہ پہلے والا رسپانس نہ دے سکے۔ وہ ان کے دل سے اُتر چکی تھی۔ ابھی نکول اس ''نقصان'' سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا بیٹا جو عنفوان شباب کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ ایک دن اچانک ایناٹکول پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا ڈینئل ''ڈرگ ایڈیکٹو'' ہے۔ وہ اینٹی ڈیپریسنٹ کے ساتھ ساتھ ماری جوانا اور دیگر نشہ آور اشیاء کا عادی ہوگیا تھا۔

یہ بارہ نومبر کی شام کا ذکر تھا۔ ڈینئل اوورڈوز کا شکار ہوا تو ایناٹکول پر یہ تھرا دینے والا انکشاف ہوا۔ جب اس نے بیٹے کے کمرے سے عجیب وغریب آوازیں آتی ہوئی سنیں۔ وہ اسی طرح اُٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بھاگی، کمرا خالی اور اندر اندھیرا تھا۔ باتھ روم میں روشنی ہورہی تھی۔ ایناٹکول ہراساں دوڑتی اور بیٹے کو پکارتی ہوئی باتھ روم کی طرف لپکی۔

''ڈینئل... ڈینی... ڈینی....'' اس نے زور سے دروازے کو ٹھوکر مارا دروازہ کھل گیا اندر کا منظر اس کے لیے ایک ماں کے لیے دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

اس کا جواں سال بیٹا ڈینئل جو اس وقت بیس سال کا تھا۔ باتھ روم کے فرش پر بے سدھ گرا لیٹا پڑا تھا۔

ڈینئل جانبر نہ ہوسکا تھا۔ ڈرگ اوورڈوز اس کے جواں سال بیٹے کی موت کا سبب بنی تھی۔

ڈینئل کے دوستوں سے ایناٹکول نے شکایت کی کہ انہوں نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ اس کا بیٹا پہلے سے ڈرگ ایڈیکٹو تھا، اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شرمندہ تھے۔ چند ایک نے کہا کہ ڈینئل نے سختی سے منع کررکھا تھا۔ البتہ ڈینئل کی گرل فرینڈ لی نے ایناکو رُندھے ہوئے لہجے میں حقیقت بتائی کہ ڈینئل کو لڑکوں کا ایک شرارتی ٹولہ اس کی ماں کے حوالے سے ذہنی کچوکے لگایا کرتا تھا۔

مگر ایناٹکول نے اپنے مرحوم بیٹے کی اس گرل فرینڈ لی کی بات کو من گھڑت قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈینئل نے آج تک اس سے اس موضوع پر کوئی بات تک نہ کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ خوش تھا۔ بہت خوش اور مطمئن۔

ایناٹکول نے ہمت نہیں ہاری...... اس نے پھر ایک سے گنتی اسٹارٹ کی اور ایک بار پھر ماڈلنگ کے بامِ عروج پر جا پہنچی۔ دوسری بار کامیابی حاصل کرنا معمولی بات نہ تھی، یا پھر شاید ایناٹکول کو زندگی نے اتنے جھٹکے دیے تھے کہ وہ بھی اس کی ایک طرح سے ''شہرت'' کا ہی سبب بنے تھے۔ تاہم اس میں کیمرا مین اور ماہر فوٹو گرافر شیون پال کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ بنا۔ اسی نے ہی ایناٹکول کو نئے سرے سے ڈھال کر ایک بار پھر فیشن اور ماڈلنگ کی دنیا میں مقبول کروایا۔ اس سے ایناٹکول کی بیٹی بھی تھی۔ بعد میں اینا نے اسی فوٹو گرافر سے شادی کرلی تھی۔

سب کچھ اب معمول پر آگیا تھا۔ ایناٹکول اپنے فوٹو گرافر شوہر اور بیٹی، کوبی کے ساتھ ہنسی خوشی اور گھریلو زندگی گزار رہی تھی مگر لوگ دبے دبے لفظوں میں یہ کہتے پائے گئے تھے کہ اینا کے اندر اپنے جوان بیٹے ڈینئل کی موت کا دکھ ہے مگر اس سے زیادہ دکھ اینا کو اس بات پر تھا کہ اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ اس کا جواں سال بیٹا ڈینئل ڈرگ ایڈیکٹو (منشیات کا عادی) تھا اور اسے پتا ہی نہ چلا۔ کاش! معلوم ہوجاتا تو وہ اپنے بیٹے کا بروقت علاج کروالیتی۔

کہتے ہیں یہ ایک پھانس تھی جو نکول کو اندر سے تڑپائے ہوئے تھی۔

8 فروری 2007 کو صرف 39 برس کی عمر میں ماڈلنگ اور فیشن میگزین کی دنیا میں چمکنے والا یہ ستارہ اچانک غروب ہوگیا۔

ایناٹکول اپنے بیڈ روم میں اسی طرح مردہ حالت میں پائی گئی تھی جس طرح اس کا بیٹا کچھ عرصہ پہلے باتھ روم میں مردہ پایا گیا تھا۔ اینا کے جواں سال بیٹے کی اچانک موت اور اب ایناٹکول کی بھی بالکل اسی طرح مرگِ ناگہاں پر ایک عرصے تک اس کے شائقین کو یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ ایناٹکول کی موت بھی اپنے بیٹے ڈینئل کی طرح تنہائی میں منشیات کی زیادہ مقدار لینے پر واقع ہوئی تھی۔

مزارِ بیکسی

زین مہدی

دامن ادب اردو میں ایسے گوہر بے بہا ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی لیکن اس بات سے بھی انکار ناممکن ہے کہ اکثر شعرا نے جو کچھ کہا وہ تخیل کی حشر سامانی ہے لیکن ایسے بھی کچھ شعرا نظر آتے ہیں جو صرف اپنے درد کو بیان کرتے ہیں. انہی میں سے ایک یہ شاعر دلگیر بھی ہے جسے حبِ اہل وطن اور سازشوں نے کربِ ناتمام کا شکار بنا دیا.

تاریخ کے دریچے سے ایک روداد درد

والیٔ ہند 90 سالہ اورنگ زیب مغلیہ حکومت کے نامور شہنشاہ، بستر مرگ پر تھا کہ اس نے تمام امراء وزراء کو بلا کر سلطنت کو بیٹوں میں تقسیم کردی مگر بیٹے مطمئن نہ تھے۔ 1707ء جس سن میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا اسی سال خانہ جنگی کی نوبت آگئی۔ بیٹے ایک دوسرے کے خلاف تلوار بکف ہوگئے۔ فوجیں تقسیم ہوگئیں۔ جنگ کا میدان سج اٹھا۔

بہادر شاہ اوّل نے قریباً پانچ سال حکومت کی (1707ء تا 1712ء) اس نے باغی راجپوتوں اور سکھوں سے جنگ کی

اور راجپوتوں کو پوری طرح کچل دیا لیکن سکھوں کا فتنہ باقی رہا جسے فرخ سیر نے کچلا۔ فرخ سیر نے چھ سال حکومت کی۔ (1712ء تا 1719ء) وہ ایک سمجھدار حکمران تھا پھر بھی وہ مسلمان امراء کے درمیان پیدا ہونے والے مسلکی اختلافات کو ختم نہ کرسکا جس کا اثر براہ راست سلطنت پر پڑا۔

بہادر شاہ اوّل کی وفات (1712ء) سے مغلیہ سلطنت کے آخری دور تک تاریخ سیاسی افراتفری، خانہ جنگی و لوٹ کھسوٹ کے ہولناک واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس مدت میں جتنے بادشاہ برسرِ حکومت آئے وہ نفس کے غلام تھے۔ مے عشرت میں سرشار، لہو و لعب میں مبتلا، رنگ رلیاں منانے والے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ 1724ء میں آصف جاہ نے دکن میں نظام سلطنت کی بنیاد ڈالی، سعادت خاں نے اودھ میں خود مختاری کا اعلان کردیا 1734ء میں علی احمد خاں نے روہیل کھنڈ کے علاقے پر خود مختار حکومت قائم کرلی۔ اس طرح عالمگیر کی سلطنت کے چند ہی برس میں حصے بخرے ہوگئے۔

1775ء میں جب ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی پیدائش ہوئی، اس وقت تک 24 صوبوں میں حکومت کرنے والے بادشاہوں کا وارث انگریزوں کا پینشن خوار ہوچکا تھا پھر اس جرم میں کہ وہ الہ آباد چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا اس کی پینشن بھی بند کردی گئی تھی اور دوآبہ کا علاقہ بھی چھین لیا گیا تھا۔ اس بے بسی میں بہادر شاہ ظفر کی وہ تعلیم و تربیت نہیں ہوسکی تھی جو مراد و دانیال کی ہوئی تھیں۔

اس بے چارگی نے تیمور کے جانشینوں کو، اپنے شاہ زادوں کو امورِ حکمرانی سکھانے کے بجائے دوسرے علوم کی جانب راغب کردیا۔ ان علوم میں ادب و انشا، تصوف و اخلاق، فقہ و حدیث و تفسیر شامل تھے۔

شاہ عالم کی بے بسی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے دور میں جب کسی قصبے کے لوگ سرکشی کرتے اور لگان ادا نہیں کرتے تو یہ اپنے ملازموں کو سرکوبی کے لیے روانہ کرتے لیکن وہ ملازم بھی ناکام ہوجاتے کیونکہ سرکش قوت بھاری پڑتی اور بادشاہ کا مورخ درباریوں لکھ دیتا کہ فلاں کو نمک کی نمک حرامی کی وجہ سے یہ مہم کامیاب نہیں ہوئی۔

شاہ عالم کی جو ساکھ باقی تھی وہ لارڈ لیک نے 1803ء میں دہلی پر قبضہ کرکے ختم کردی اور 1807ء میں دل شکستہ ہوکر وہ اس دارِ فانی سے کوچ کرگیا۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے اختیارات اور حدودِ سلطنت اپنے باپ سے بھی کم تھے 1837ء میں اکبر شاہ ثانی کی وفات ہوئی تب بہادر شاہ ظفر کو تخت نشین کرایا گیا۔ شہنشاہ دہلی کے احکامات پہلے ہی قلعے تک محدود کردیے گئے تھے۔ آدابِ شاہانہ تو بسلسلہ کے جانشین نے 1828ء میں ہی ترک کردیے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا اسی جانب اشارہ ہے۔

بے تمیزی ہے یہاں تک کہ زمانے میں ظفر
نہ وہ تعظیم کی شے ہے نہ وہ آداب کی چیز

1835ء میں جو سکے جاری ہوئے تھے ان پر مغلیہ حکومت کی مہر نہ تھی۔ ان پر شاہ انگلستان کی مورت نقش تھی۔

1837ء میں ایلن برا نے یہ تجویز پیش کی کہ بہادر شاہ ظفر کو قلعہ بدر کردیا جائے اور خطابات سے بھی وہ دستبردار ہوجائیں۔ لارڈ ڈلہوزی نے بھی بعد کے دنوں میں ایلن برا کی تجویز پر صاد کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد بادشاہت کا خاتمہ کردیا جائے۔

انہی دنوں 1849ء میں شہزادہ دارا بخت (ولی عہد) نے وفات پائی اور ولی عہدی کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں۔ ڈلہوزی کو اچھا موقع ہاتھ آیا اور اس نے شہزادہ فخرالدین سے بات چیت پکی کرلی کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد اس کا خطاب شہزادگی قائم رہے گا مگر اسے قلعہ چھوڑ کر قطب میں بود و باش اختیار کرنا پڑے گا۔

سلطنت تو تھی نہیں جس کے لیے ہتھیار اٹھانا ضروری تھا۔ اب تو صرف شہزادے کے طور پر پہچان بنانا تھی۔ خطاب حاصل کرنا تھا تاکہ پینشن کی رقم بڑھ جائے اسی لیے اس نے شاہ کا لقب ترک کرنے اور شاہی محل سے دستبردار ہونے کا معاہدہ کرلیا لیکن 1856ء میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

محل میں سازشوں کا بازار گرم تھا لیکن بہادر شاہ نے آنکھیں بند کررکھی تھیں۔ وہ خود کو شعر و ادب میں ڈبو کر سینے کے زخموں کو بھلا رہے تھے۔ قلعہ معلیٰ اردو کا ریسرچ سینٹر بنا ہوا تھا۔ ایسے الفاظ رائج کیے جارہے تھے جو سنسکرت سے ٹوٹ کر آئے تھے اور ان میں صوتی حسن نہ تھا۔ ایسے الفاظ ہزاروں میں ہیں جن میں سے کچھ بطور نمونہ دیے جارہے ہیں چاند (چند) دوا (دارو) دوسرے (دوجے) معشوق (ساجن) سورج (سرج) دنیا (سنسار) سوں (سے) کبھی (کدھی) ان کے سوا (اون سوا) آگے (اگے) اپنے (اپن) فراق (برہا) پوچھنا (بوجھنا) تمہاری (تمنا) دیکھا (دکھا) گوشت (ماس) پگھلنا (گلنا) کرتہ (کہا) منہ (مکھ) دل (من)

ہمیشہ (نس دن) طرح (غن) ہمیں (ہمن) تک (لگ)

حالانکہ اصلاح زبان کا کام شاہ عالم کے زمانے ہی میں شروع ہوگیا تھا مگر اس کام کو ترقی بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہوئی۔ سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اردو نے روساء اور امراء کے درباروں میں اعتبار حاصل کرنا شروع کردیا تھا چنانچہ سودا، میر، سوز وغیرہ کسی نہ کسی دربار سے منسلک رہے۔ ظفر کے دور میں آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی، شاہ نصیر، ذوق، غالب، شیفتہ، نواب ضیاء الدین خاں نیر اور حکیم مومن خاں مومن جیسے سخنوران باکمال موجود تھے۔

جب شمشیر و سناں سے رشتہ ٹوٹ جائے تو چنگ و رباب عام ہوجاتے ہیں۔ شعر و شاعری کا پلہ بھاری ہوجاتا ہے۔ اس دور میں بھی یہی ہورہا تھا اور امراء گروہ میں بٹ کر ایک دوسرے کے مقابل آرہے تھے۔

اس دور میں دو گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ تو ان شعرا کا تھا جو معنی آفرینی پر جان دیتا تھا، دوسرا لفظی صنعت، روزمرہ اور محاورے پر۔ پہلے گروہ کے حامیوں میں مومن، غالب اور شیفتہ وغیرہ تھے جبکہ دوسرے گروہ کے زمرے میں نصیر، ذوق اور ان کے متبعین۔ یہاں پر یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ اس دور کے اکثر شعرا لکھنوی شاعری سے متاثر نظر آتے تھے جس کے علمبردار ناسخ و آتش تھے۔ ظفر نے بھی انہی کی پیروی کی۔ مومن اور غالب بھی شروع شروع میں لکھنو کے رنگ سے متاثر ہوئے لیکن جلد ہی ان پر اس کا بے اثر ہونا ظاہر ہوگیا اور وہ اپنے اصل رنگ میں اشعار کہنے لگے۔

ظفر نے شاہ عالم کے دور میں شاعری کی شروعات کی۔ شہنشاہ شاہ عالم خود بھی ایک باکمال شاعر تھے۔ آفتاب تخلص تھا۔ سودا، میر، نصیر، انشا، ممنون، احسان، قاسم اور فراق اسی کے دربار سے متعلق تھے۔

بہادر شاہ ظفر نے ابتدا میں نصیر سے اصلاح لی۔ شاہ نصیر نے فن شعر گوئی میں شاہ محمدی مائل سے تلمذ کیا تھا۔ ان دنوں نصیر کی شہرت آگرہ و لکھنو تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ اس کا اثر ظفر کی شاعری پر بھی پڑا لیکن جب انگریزی عمل داری ہوئی تو شاہ نصیر نے 1803ء میں دہلی کو خیرباد کہہ دیا اور دکن چلے گئے۔ تب ظفر نے اصلاح کے لیے میر کاظم حسین بے قرار سے رجوع کیا لیکن وہ بھی 180[illegible]ء میں الفنسٹن کے ہمراہ میر منشی ہوکر دہلی سے چلے گئے۔ ظفر نے اصلاح کے لیے ذوق کو منتخب کیا۔ اس دوران میں انہوں نے میر عزت اللہ عشق کو بھی کئی بار اپنا کلام دکھا کر اصلاح لی تھی۔

ذوق کے بعد ظفر کے کلام پر غالب نے نظرِ ثانی شروع کی۔ لال قلعہ میں غالب کا باقاعدہ دخل 1850ء سے ہوا۔ اس سال ظفر نے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز پر غالب کو شاہانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا اور مرزا کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے عزت بخشی۔ غالب نے صرف تین سال ظفر کی اصلاح سخن کی خدمت انجام دی۔

بہادر شاہ ظفر نہ صرف شاعری کرتے تھے بلکہ مصوری اور خوش نویسی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک بادشاہ کا ان چیزوں میں دلچسپی لینا تعجب خیز بات ہے۔ اس کی وجہ خود ظفر بیان کرتے ہیں۔

جوشِ جنگ و جدل پہنیں تو کس کے واسطے
ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلح کل اوڑھے ہوئے

مغل خاندان کے آخری چشم و چراغ کی شاعری میں پناہ لینے کی سب سے بڑی وجہ نفسیاتی دباؤ ہے۔

ذہنِ انسانی پر مسلسل محرومی و ناکامی اور شدید رنج و الم نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں۔ ان کی شدت بعض اوقات انسان کو پاگل کردیتی ہے یا پھر دنیا سے ایسا بے نیاز کردیتی ہے کہ وہ تصوف کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے حالات اور ماحول نے ان کے دل و دماغ پر جو کاری ضربیں لگائیں شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ اسی کا ردعمل ہے۔

جانو اپنی ظفر کہانی کہے ہے اوروں کی داستاں میں
سنو اگر اس اسیرِ غم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا

بہادر شاہ ظفر نے اتنی زیادہ تعداد میں اشعار کہے جو حیرت کی جا ہے۔ 1859ء کے ہنگاموں کے بعد جتنی شاعری سامنے آئی اس میں سے بھی بہت تھوڑی تعداد میں طبع ہوئی وہ بھی کلیات کی صورت میں، کلیاتِ ظفر کے چار حصے ہیں۔ ان میں تقریباً 1857ء تک کا کلام شامل ہے۔ چاروں حصے حمد سے شروع ہوتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو پوری کلیات حزن و ملال، درماندگی اور شکستگی کے احساس کی آئینہ دار ہے۔ اس کی واحد وجہ مرثیہ جاہ و حشم ہے۔

خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی

یہی وجہ ہے کہ ظفر حزنیہ شاعری میں ید طولیٰ کا باعث بنے حالانکہ انہوں نے جتنے تجربات کیے اتنے تجربات اس دور کے کسی شاعر نے نہیں کیے۔ سودا اور نظیر کے علاوہ کسی اور شاعر

نے ان الفاظ کا استعمال اس کثرت سے نہیں کیا جس کثرت سے ظفر نے اپنے کلام میں کرتے رہے، وہ بھاکا' پنجابی' پوربی اور پشتو زبانوں کے الفاظ بڑی خوب صورتی سے نظم کیے ہیں۔ ان کے کلام میں خاصی تعداد میں مفرد الفاظ اور مرکب مصادر بھی ملتے ہیں۔ سابقے اور لاحقے کا استعمال بھی بہ کثرت کیا۔ انہوں نے نئی بحور بھی ایجاد کیں، ظفر کی یہ غزل جس کا مطلع ہے۔

زلف بھی بل اور کاکل پر خم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
وہ ہوئی سرکش یہ ہوئی برہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

یہ پوری غزل فاع فعولن فاع فعولن فاع فعولن فاع فعل کے وزن پر ہے۔ فاع فعولن میں "ف" کی حرکت ہر جگہ ساکن ہوکر فعلن فعلن ہوجاتی ہے۔ ایسی بحر اردو میں ایک بھی نہیں ہے۔ ہاں ہندی میں اس سے ملتی جلتی چھند (بحر) "منجری" ہے۔ منجری سے ایک "گرُو" کم کردیا گیا ہے۔ ورنہ یہی وزن اس کا بھی ہے۔ یہ تیس ماترے کا وزن ہے۔

اگر شہنشاہ معظم بہادر شاہ ظفر کو وقت دھوکا نہ دیتا تو یقیناً وہ اردو کے لیے بہت کچھ کرجاتے کیونکہ ابھی وہ اردو کے گیسو سنوار ہی رہے تھے کہ میرٹھ چھاؤنی میں آزادی کے متوالوں نے جہاد کا علم بلند کردیا۔ یہ بغاوت ایک دن میں نہیں پھیلی تھی۔ دبی دبی سی آگ کافی عرصے سے سلگ رہی تھی۔ اہل ہند دیکھ رہے تھے کہ انگریزوں مشنریز کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ وہ لوگ غرباء کو، نچلی ذات کے ہندوؤں کو ورغلا کر کرسچن بنا رہے تھے۔ انگریزوں سے قبل مسلمان یہاں کے حاکم تھے۔ ان سے ایسی شکایت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی کیونکہ مسلمان حکمراں حکمرانی سے مطلب رکھتے تھے۔ مذہب کی تبلیغ صوفی حضرات کرتے تھے جن کو حکام سے مراعات نہیں ملتی تھی بلکہ راستہ روکا بھی جاتا تھا پھر اعلیٰ عہدوں پر مسلمان حکمراں بخوشی ہندو کو رکھ لیتے تھے لیکن یہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہت زیادہ تعصب دکھا رہی تھی۔ اہل ہند کو کسی بھی بڑے عہدے پر نہیں رکھتے تھے۔ در پردہ وہ ہندو اور مسلمان کے درمیان نا اتفاقی پیدا کر کے اپنا کام نکالتے تھے۔ اسی درمیان کارتوس کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ انگریزوں نے فوجیوں کو ایسے کارتوس فراہم کیے جنہیں چلانے سے پہلے دانتوں سے اس کا خول پھاڑنا پڑتا تھا۔ خول کے اندر جو گولی ہوتی تھی اس پر ایک لیس دار مادہ لگا ہوتا تھا۔ اس لیس دار مادے کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گردش کررہی تھیں۔ کہا یہ جارہا تھا کہ وہ مادہ سور اور گائے کی چربی کا آمیزہ ہے۔ سور مسلمانوں کے نزدیک نجس العین جانور ہے اور گائے ہندوؤں کے لیے مقدس ترین جانور۔ دونوں فریقین سمجھ گئے تھے کہ ان کے مذہب میں دخل اندازی ہورہی ہے۔ انہیں لامذہب بنانے کی سازش ہے اور انہوں نے ایسے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا۔ انگریزوں کے لیے یہ حکم عدولی ناقابل قبول تھی۔ انہوں نے سختی سے کام لیا اور ایک دستے کو چاند ماری کی شروعات کرنے کا حکم دیا۔ کلکتہ جو کچھ دنوں پہلے تک علی پور کہلاتا اس شہر کے نزدیک انگریز فوجیوں نے جو چھاؤنی بنائی تھی وہ بیرک پور کہلاتی تھی۔ وہاں 34 بنگال انفنٹری تعینات تھی۔ وہ 19 مارچ 1857ء کا دن تھا۔ اس دن زبردستی اس انفنٹری کے تمام سپاہیوں کو میدان میں جمع ہونے کا حکم صادر ہوا۔ انہیں چاند ماری کے لیے بلایا گیا تھا۔ ان سپاہیوں میں منگل پانڈے بھی تھا۔ اس نے حکم ماننے سے انکار کردیا۔ انگریز کمانڈر کو یہ بات بری لگی اس نے پوچھا۔

"منگل تم نے بندوق کیوں پھینک دی۔"

"ہم یہ کارتوس نہیں چلائیں گے۔" سپاہی منگل پانڈے نے چیخ کر کہا۔

منگل پانڈے ذات کا برہمن تھا۔ اس کا تعلق ایک دھارمک (مذہبی) گھرانے سے تھا۔ وہ صوبہ بنگالہ کے شہر اجودھیا (اب یہ شہر صوبہ اتر پردیش کے زیر انتظام ہے اور اسی شہر میں بابری مسجد ہے) کا رہنے والا تھا اور کافی جوشیلا تھا۔ اس نے اپنے افسر لیفٹیننٹ باؤ کو پہلے سمجھانے کی کوشش کی لیکن افسر بضد رہا کہ تمہیں گولی چلانی پڑے گی۔ اس نے اس نئے کارتوس کی جگہ توڑے دار بندوق سے لیفٹیننٹ باؤ کو گولی مار دی پھر اپنے دوسرے ساتھیوں کو للکارا اور سب مل کر انگریز افسر پر پل پڑے۔ کئی انگریز افسران کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے بعد وہ انگریز سپاہیوں میں گھر گیا۔ اسے گرفتار کر کے 8 اپریل کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ خبر خطوط کے ذریعے پورے ہند میں پھیل گئی۔

خفیہ انداز میں یہ خبر پھیلائی جاتی رہی جس کا نتیجہ 10 مئی 1857ء کو سامنے آگیا۔ اس دن میرٹھ چھاؤنی کے سپاہیوں نے آزادی کا پرچم بلند کردیا اور تمام انگریز افسران کو قتل کر کے دہلی کا رخ کرلیا۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے بہت سے سپاہی جمع ہوگئے اور وہ سب انگریزوں کا قلع قمع کرتے ہوئے طوفانی رفتار سے دہلی کی سمت بڑھنے لگے۔

یہ طوفان جب دہلی پہنچا تو وہاں والے حیران رہ گئے۔

خود شہنشاہ معظم بھی پریشان ہوا ٹھے۔ انہیں مطلق امید نہ تھی کہ انگریزوں سے بھی کوئی ٹکرا سکتا ہے۔ وہ حیران پریشان سے چوبارے میں کھڑے تھے اور میدان میں جمع ہونے والے سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایسی بدانتظامی اور شورہ پشتی انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سب کے سب ایک ساتھ چیخ رہے تھے' شہنشاہ سے استدعا کررہے تھے مگر کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"تم سب کیا چاہتے ہو؟" ضعیف العمر شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"مذہب میں دخل اندازی ہمیں برداشت نہیں' ہم مذہب کا سودا نہیں کریں گے۔" کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

"تم لوگ صبر و تحمل سے کام لو میں انگریز بہادر سے بات کروں گا۔"

"ہم انگریزوں کو ختم کردیں گے وہ ہمیں غلام بنا کر رکھ نہیں سکتے۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ آپ ہمیں سہارا دیں ہم ان گورے بندروں کو اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے۔ ہمیں آزادی چاہیے۔"

"بادشاہ وہ ہوتا ہے جس کے پاس خزانہ ہوتا ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔" بہادر شاہ نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

"ہمیں کچھ نہیں چاہیے صرف آپ کا ساتھ چاہیے۔ ہم آپ کی تاج پوشی کریں گے۔ آج سے آپ ہی ہمارے بادشاہ ہوں گے۔"

یہ خواب شہنشاہ کا بھی تھا کہ بابر و ہمایوں کا دبدبہ پھر سے قائم ہوجائے' سلطنت مغلیہ کو پھر سے عروج مل جائے' کھوئی ہوئی سلطنت کا وقار بحال ہوجائے لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ ان سپاہیوں پر ابھی جوش غالب ہے اور عقل کہتی ہے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ ہوش مندی سے شہنشاہ نے پھر جواب دیا "مجھے بادشاہ بنا کر آپ کو کیا ملے گا یقین کیجیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہمیں صرف آزادی چاہیے۔" مجمع بپھر رہا تھا۔

"ہمارے دین دھرم کے یہ دشمن ہمیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ ہم مرسکتے ہیں مگر مذہب نہیں چھوڑیں گے۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں' ہمارے سروں پر ہاتھ رکھیں۔"

"میں بادشاہ نہیں فقیر ہوں' گوشہ گیر ہوں۔ انہی انگریزوں کی امداد پر اپنے بچوں کو سینے سے لگائے ایک گوشے میں بیٹھا ہوں۔ بادشاہ میرے اجداد تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ مجھے مت ستاؤ۔ میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرے پاس خزانہ نہیں ہے کہ تمہیں تنخواہ دوں گا' ملک نہیں ہے کہ تمہیں نوکر رکھوں گا' فوج نہیں ہے کہ امداد کروں گا۔" بادشاہ سلامت کی آواز میں حسرت و یاس کا عنصر کچھ زیادہ ہی تھا۔

"ہم آپ کی فوج ہیں۔ ہماری محنت آپ کا خزانہ ہے اور یہ ملک صرف اور صرف آپ کا ہے۔"

ان کا اصرار بڑھ رہا تھا اور شہنشاہ کا انکار! وہ سب مایوس ہوگئے اور کچھ دیر آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے' پھر راج گھاٹ کی جانب چل دیے۔

ان کے جاتے ہی حاکم دہلی سر ڈگلس پہنچ گیا۔ اس کا رنگ فق ہورہا تھا مگر زعم باقی تھا۔ اس نے بادشاہ کو ڈھارس دی "آپ مطلق نہ گھبرائیں، میں ابھی جاکر سپاہیوں سے بات کرتا ہوں' باہر سے تازہ کمک پہنچنے ہی والی ہے۔"

"ان کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کے درمیان نہ جائیں۔" بادشاہ نے مشورہ دیا۔

"بغیر ان کے پاس گئے میں کیسے ان سے بات کروں گا۔" ڈگلس نے جاتے جاتے کہا۔

طاقت کے زعم میں وہ نکل تو گیا مگر ان فوجیوں تک پہنچ نہ سکا۔ اسے راستے ہی میں ایک دوسرے دستے نے گھیر لیا اور اینٹوں' پتھروں' لاٹھی' ڈنڈوں سے اتنا مارا کہ وہ وہیں پر مر گیا۔

قلعے تک یہ خبر پہنچ رہی تھی کہ آزادی کا نعرہ لگانے والوں میں بہت زیادہ اشتعال ہے۔ وہ سب چن چن کر انگریزوں کو قتل کررہے ہیں' ان کے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔

اس لاقانونیت اور غنڈہ گردی کا سدباب ضروری تھا لیکن شہنشاہ کے پاس نہ سپاہ تھی اور نہ رعب و دبدبہ! زبردستی انہیں بادشاہ بنانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ضعیف العمر بادشاہ عجیب مخمصے میں پھنس گئے تھے۔ انکار کرتے بنتی تھی یا نہ اقرار! اگر اقرار کرلیتے تو انگریزوں کی جانب سے ملنے والی پینشن بند ہوجاتی' یہ ایک لاکھ روپے کا وظیفہ ہی ان کے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ اگر وہ آزادی کے متوالوں کا ساتھ دے دیتے تو وہ بھی بند ہوجاتا۔ ایسے وقت میں جب خود ان کا ذہن کام نہیں کررہا تھا' ان کے مقرب خاص حکیم احسن اللہ خان انہیں ورغلانے کے لیے پہنچ گئے۔

"ظل سبحانی' یہ کھلی بغاوت ہے اور ان لٹیروں کا ساتھ دینے کا مطلب ہے انگریز بہادر کے عذاب کو دعوت دینا' ہمیں ان مٹھی بھر لوگوں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔"

''احسن اللہ خان! تمہاری باتیں درست ہیں۔ یہ مٹھی بھر سرفروش حکومت انگلشیہ سے ٹکرا تو سکتے ہیں مگر فتح نہیں حاصل کرسکتے۔'' بادشاہ نے دریچے سے پار دور افق کو گھورتے ہوئے کہا ''مگر میں کیا کروں، جنہیں تم لٹیرے کہہ رہے ہو یہ میری اولادیں ہیں، مجھ ناتواں پر بھروسا کرکے آئے ہیں۔ میں انہیں کیسے خالی ہاتھ لوٹا دوں؟''

''ظل الٰہی! آپ کا خیال درست ہے مگر یہ بھی سوچیے اس کا انجام کیا ہوگا؟ دلی کی تباہی، خاندان مغلیہ کی بربادی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر سے مدد طلب کی جائے۔ ان لٹیروں کا سدباب ضروری ہے۔''

''لیکن ہم اپنی اولادوں کو کیسے قتل کرا دیں۔ لیفٹیننٹ گورنر کی کمک انہیں گولیوں سے بھون دے گی۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ میری مدد طلب کررہے ہیں۔ ایک ایسے شخص سے جس کی حکومت ہے اور نہ جسم میں طاقت۔ گھور اندھیرے میں روشنی کی ننھی سی کرن بھی سورج لگتی ہے۔ انہوں نے بھی مجھ جیسے بے بس و مجبور کو سورج سمجھ رکھا ہے۔ میں ان کی استطاعت بھر مدد کروں گا۔''

''اور اس کا نتیجہ ہم سب کی تباہی ہے جہاں پناہ! میں پھر استدعا کروں گا کہ آگرہ سے مدد طلب کی جائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اجازت طلب کی اور کورنش بجاتے ہوئے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی شہنشاہ معظم سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ دل کہتا تھا کہ ان سرفروشوں کی حوصلہ افزائی کریں اور دماغ کہتا تھا کہ انگریزوں کی مدد طلب کریں۔ وہ اپنی تیرہ بختی سے تنگ تھے اور قسمت کے آگے سپر ڈال چکے تھے۔

جب انہیں کوئی راستہ سمجھ نہ آیا تو دربار طلب کرلیا۔ دربار میں شہر بھر کے امرا و وزراء جمع تھے۔ جس طرح یہ دربار مجبور تھا اسی طرح امراء بھی لاچار تھے پھر بھی بہادر شاہ ظفر نے درباریوں سے مشورہ طلب کرنے کی ٹھان لی تھی اور دربار خاص کا حکم صادر کردیا تھا۔

''تمام اہل کار، شہزادے، امراء و عمائدین شہر دربار میں حاضر ہوگئے۔ شہنشاہ معظم نے تاریخی تخت پر جلوہ فرمایا۔ اس دربار نے کئی شہنشاہوں کا جلال دیکھا تھا مگر اس شہنشاہ کے چہرے پر جلال کی ہلکی سی بھی رمق نہ تھی۔ جلال کے بجائے پدرانہ شفقت کی جھلک تھی۔ چہرے سے تفکر عیاں تھا۔ وہ سر جھکائے سوچ میں غلطاں تھے اور درباری منصب کے مطابق اپنی اپنی قطار میں بیٹھے شہنشاہ کے بولنے کے منتظر تھے۔ کافی دیر بعد شہنشاہ نے سر اٹھایا۔ دربار کا جائزہ لیا اور بولے ''اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے اسی سلسلے میں ہم نے آپ کو طلب کیا ہے۔''

''ان داتا، شو سراٹ!'' ایک ہندو تاجر نے کھڑے ہوکر دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر کہا ''شہر میں ہر طرف لوٹ مار مچی ہے۔ چھاؤنی خالی ہوچکی ہے۔ فرنگی سپاہی اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ زیادہ تر سپاہیوں کو باغیوں نے قتل کرڈالا ہے۔ کچھ فرنگیوں کو شہر کے لوگوں نے پناہ دی تھی، پناہ دینے والوں کے گھروں کو بھی لوٹ لیا گیا ہے۔ کسی بھی شخص کی عزت محفوظ نہیں ہے جگت سراٹ!''

''ہنہ!'' شہنشاہ نے ہنکارا بھرا اور ایک دوسرے درباری کی جانب دیکھا جو اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ تمام درباریوں کی نظریں اسی جانب اٹھ گئیں۔ اس نے ادب سے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھا اور سر جھکا کر کہا:

''ظل سبحانی! یہ سچ ہے کہ میرٹھ سے آنے والے سپاہیوں میں بے ترتیبی ہے۔ وہ لوٹ مار کررہے ہیں اور ایسا ہونا عین فطرت ہے۔ انہیں سربراہی کی ضرورت ہے۔ جب تک ان پر افسر مقرر نہیں ہوگا یہ ایسی حرکتیں کرتے رہیں گے۔ یہ سب ہماری نصرت کے لیے آئے ہیں، ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے۔ انگریزوں کی دھتکار کھاتے کھاتے ہم نالاں ہیں۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے میں یہ افرادی قوت ہمارے لیے خدا کی رحمت ہے۔'' پھر وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

حکیم احسن اللہ خاں نے کھڑے ہوکر کہا ''ظلم سبحانی جذباتی باتیں کچھ دیر کے لیے بہت اچھی لگتی ہیں مگر سوچیے اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہم انگریزوں کا ساتھ دیں اور ان لٹیروں کو مار بھگائیں۔''

''وہ لٹیرے نہیں ہیں۔'' عمائدین میں سے کوئی گرجا۔

''ہاں ہاں، وہ لٹیرے نہیں ہیں، جہاد کی خاطر مر کٹنے آئے ہیں، ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔'' کئی امراء نے یک زبان کہا۔

کچھ ہی دیر میں دربار مچھلی بازار بن گیا۔ درباری ادب آداب کو پس پشت ڈال کر شہزادے اور امراء بحث ومباحثے میں جت گئے۔

ہر شخص خود کو زیادہ عقل مند سمجھ رہا تھا اور دوسرے کو بے وقوف! درباری دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک کا کہنا تھا کہ مجاہدین کا ساتھ دیا جائے لیکن دوسرا گروپ اس کی مخالفت

کررہا تھا۔ شہنشاہ معظم کے گرد ان لوگوں کا حصار تھا جو انگریزوں کے بہی خواہ تھے۔ ایسے لوگوں نے شہنشاہ معظم کو مجبور کردیا اور انہوں نے شاہی محرر کو حکم دیا کہ آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر کے نام شاہی عرضی تیار کی جائے۔

محرر نے امداد کی خاطر تازہ کمک کی استدعا کرتے ہوئے لکھا ''شہنشاہ معظم کو مجبور کیا جارہا ہے، انہیں ورغلانے والے باغیوں کی مدد کے لیے اکسا رہے ہیں لیکن شہنشاہ ہند سراج الدین ابوظفر انگریزوں کے دوستدار ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ان باغیوں کا سر کچلنے کے لیے انگریز بہادر اپنی سپاہ لے کر آئیں۔''

اس امداد نامہ کا مضمون خود حکیم احسن اللہ خاں نے تیار کیا تھا۔ اسی وقت اس نے ایک سانڈنی سوار کو آگرہ کی جانب دوڑا دیا۔ محب وطن درباریوں کے چہرے اتر گئے۔

ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ قلعہ کے دروازے پر پھر شور بلند ہوا۔ آوازیں دم بہ دم تیز ہوتی جارہی تھیں۔ قلعہ کے دروازے پر شاید انبوہ کثیر تھا جو اندر آنا چاہتا تھا۔ درباریوں کے چہروں پر پریشانی پھیل گئی۔ وہ جانتے تھے قلعہ داروں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ انہیں روکنے میں ناکام رہیں گے۔ سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور دیوان خاص سے دیوان عام میں آکر دروازے کی سمت دیکھنے لگے۔ ابھی بہ مشکل چند ساعت گزری تھیں کہ چیونٹیوں کی طرح سپاہیوں کا انبوہ صحن میں آگیا۔ قلعہ کا وسیع وعریض صحن بھر گیا۔ سیکڑوں کی تعداد میں آنے والے سپاہی پرجوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔

''مغلیہ سلطنت، تاقیامت! مغل سراج کی جے! سفید بندر کو دیش نکالا دو۔ ہمارا دیش سوادھین۔ ہمارا سراٹ شاہ ظفر! ہند کو آزاد کرائیں گے، مغلیہ سلطنت قائم کریں گے۔''

طرح طرح کے نعرے گونج رہے تھے۔ کوئی کسی کی سننے کو تیار نہ تھا۔ سب اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔

شہنشاہ معظم نے درباریوں کو ہٹنے کا اشارہ کیا اور اپنے نحیف وجود کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھے اور اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر انہیں خاموش ہوجانے کا اشارہ دیا۔ وہ اشارہ گویا جادو کی چھڑی تھا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اتنی گہری خاموشی چھا گئی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو آواز صاف سنائی دیتی۔ وہ سپاہی جو کچھ دیر پہلے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اب ایسے خاموش کھڑے تھے جیسے وہ سب پتھر کے بت ہوں۔

''میرے بیٹو! تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ میں تو خود مجبور ہوں۔ میری حکومت قلعے تک محدود ہے۔ میرے پاس دولت ہے نہ طاقت! میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' شہنشاہ معظم نے کہا۔

''ہمیں نہ دولت چاہیے اور نہ کسی قسم کا لالچ ہے۔ ہمیں آپ کا ساتھ چاہیے۔ ابھی ہم بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے ساتھ دے دیا تو ہم ایک جھنڈے تلے جمع ہوجائیں گے۔ ہمیں تو لڑنا ہی ہے اگر آپ نے ساتھ نہ دیا تو بھی ہم لڑیں گے مگر وہ لڑائی بکھری ہوئی ہوگی۔ ہم آپ کے پاس صرف اس امید پر آئے ہیں کہ یہ ملک مغلیہ پرچم تلے آزاد تھا، ہم اسی پرچم کو بلند کرنے آئے ہیں۔ ابھی ہمارے اور ساتھی بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ملک کے ہر گوشے میں سپاہیوں نے آزادی کا جھنڈا بلند کردیا ہے۔ ابھی وہ سب اِدھر اُدھر مقابلہ کررہے ہیں۔ آپ کا نام سنتے ہی سب کا رخ دلی کی جانب ہوجائے گا۔'' سب سے آگے کھڑے ہوئے سپاہی نے تقریر کے انداز میں اپنی بات کہہ دی۔

شہنشاہ معظم سوچ میں پڑ گئے، پھر وہ کافی دیر بعد بولے ''میرے بیٹو! اگر تمہاری منشا یہی ہے تو میں تیار ہوں لیکن سوچ لو انگریز منظم ہیں ان سے ٹکرانا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اگر کہو تو میں مصالحت کرانے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''عالی جاہ! ابھی تک آپ نے انگریزوں کو پہچانا نہیں ہے۔ یہ فرنگی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اب تو ہم نے ہتھیار اٹھا ہی لیے ہیں، اب جو بھی قسمت میں ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس شخص نے کہا پھر وہ آگے بڑھا، سلطان الہند سراج الدین ظفر کے ہاتھ کو بوسہ دے کر پلٹا اور زوردار نعرہ بلند کیا ''اللہ اکبر!''

جواب میں مسلمان سپاہیوں نے بھی نعرہ تکبیر بلند کیا اور ہندو سپاہیوں نے بہادر شاہ کی جے کا نعرہ لگایا۔

اور تاریخ میں سراج الدین ظفر کے لیے ایک نیا خطاب ''بہادر شاہ'' رقم ہوگیا۔

اسی پرجوش سپاہی نے سلطان المعظم کو مشورہ دیا کہ اپنے کسی شہزادے کو فوج کا سپاہ سالار مقرر کردیں تاکہ شہر کا نظم ونسق سنبھالا جاسکے۔ سلطان المعظم نے اس کے مشورے کو پسند کیا اور شہزادہ مرزا مغل اور مرزا عبداللہ کی سربراہی میں دو دستے ترتیب دیے۔ ان دونوں دستوں کی ذمے داری تھی کہ وہ شہر کے بگڑے ہوئے حالات اور نظم ونسق پر قابو پائیں اس کے علاوہ شہر کی دیواروں پر جلی حروف میں اعلان چسپاں کیا گیا جس کا متن یہ تھا۔

"چونکہ حضرت ظل سبحانی فلک بارگاہ نے انگریزوں کا قلع قمع کرنے کے بعد تخت طاؤس پر جو موروثی جلوہ گاہ سلاطین گورگانیہ کی ہے، جلوس فرمایا لہٰذا حکم شاہی صادر ہوا کہ اب انگریزوں کے اموال ونفوس کا قتل وغارت موقوف رکھا جائے۔ اب احکام امن وامان جاری ہوں گے اور عدل وانصاف سے کام لیا جائے گا۔"

اسی دن شہنشاہ معظم شہر میں امن وامان قائم کرنے کے لیے خود ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے۔ وہ سپاہی جو کسی بھی طرح قابو میں نہیں آرہے تھے، شہنشاہ کے اس اقدام سے لوٹ مار موقوف کر کے شہر پناہ کی جانب چل دیے۔ وہی فوج جو بے ترتیب تھی، اب منظم ہو چکی تھی۔ ان کے سپاہ سالار بھی مقرر کردیے گئے تھے۔ ایک دس رکنی کمیٹی بھی بنائی گئی تھی جس میں چھ فوجی نظم ونسق کے اور چار شہری امور کے نمائندے تھے۔ متفقہ فیصلوں سے حکومت کا نظام چل رہا تھا۔ ہر روز ایک نیا حکم جاری ہوتا مگر اسے نافذ کرنا خاصا دشوار تھا۔ انگریزوں کے خلاف سرفروشوں میں انتقام وغصہ تھا کہ وہ کسی کی بھی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ بادشاہ کے احکام بھی انہوں نے ٹھکرا دیے۔ ایک بار سپاہیوں کے ایک جتھے نے کچھ عورتوں اور بچوں کو شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔ وہ سب انگریز تھے۔ سپاہیوں کا کہنا تھا کہ ان کے مردوں نے ہم پر گولیاں چلائی تھیں۔ بادشاہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جرم ان کے مردوں نے کیا ہے، اب جب تم انہیں لے آئے ہو تو انصاف کریں گے۔ اگر یہ واقعی سزا کے مستحق ہوئے تو انہیں سزا بھی ملے گی مگر وہ سب تو جوش انتقام میں اندھے ہو رہے تھے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ انہیں فوراً سزا دی جائے۔ بادشاہ نے معصوم عورتوں کو سزا دینا مناسب نہ سمجھا اور ان عورتوں کو سزائے موت دینے کے بجائے حفاظت کے خیال سے قید خانے میں ڈال دیا۔ یہ بات ان سپاہیوں کو ناگوار گزری اور اسی رات انہوں نے قید خانے سے ان عورتوں اور بچوں کو نکالا پھر گولیوں سے چھلنی کردیا۔ اس حادثے نے شہنشاہ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ سپاہیوں میں ابھی تک تنظیم نہیں ہو پائی ہے اور خودسری باقی ہے۔ ان کی خودسری کو لگام دینا ضروری تھا۔ اسی دوران روہیل کھنڈ کے توپ خانے کا معتمد، سپاہ سالار بخت خان اپنے توپ خانے کے ساتھ بہادر شاہ کی نصرت کے لیے یکم جولائی 1857ء کو دہلی پہنچ گیا۔ وہ روہیلا پٹھان تھا۔ اس کے والد نے افغانستان سے آکر بہادری کے بل پر عہدہ حاصل کیا تھا۔ خود بخت خان ہند میں پیدا ہوا تھا۔ شہر بجنور روہیل کھنڈ (یو پی) میں لیکن رگوں میں خالص پٹھان خون تھا۔ جوش وجذبے سے بھرا اس نے دہلی میں داخل ہوتے ہی انتظامی امور میں بہتری لاکر ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔ شہر بھر میں بیک وقت کئی کوتوال اور عدالتوں کی منصفی کے لیے مفتیوں کو مقرر کیا۔ اس طرح شہنشاہ نے بگڑتے ہوئے حالات پر بہت حد تک قابو پالیا۔ دلی میں آزاد مغلیہ حکومت بحسن وخوبی کام کرنے لگی لیکن یہ بات انگریزوں کو کب پسند آتی۔

ان کے لیے تو دلی گلے میں ہڈی بن گئی تھی۔ اگر وہ اس کی جانب سے نظریں چرا لیتے تو بقول ان کے یہ بغاوت پورے ہند میں پھیل جاتی اور پھیل چکی تھی۔ کان پور میں نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے نے، لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے، جھانسی میں رانی لکشمی بائی نے، الہ آباد میں لیاقت علی نے جگدیش پور میں کنور سنگھ نے، بریلی میں خان بہادر خان نے فیض آباد میں مولوی احمد اللہ نے فتح پور میں عظیم اللہ نے، بھاگلپور میں تلکا مانجھی نے بغاوت بگل بجا دیا تھا۔ دوسرے علاقوں سے بھی ایسی خبریں آرہی تھیں کہ انگریزوں نے دلی پر قبضے کے لیے جنرل این سن کو مقرر کیا وہ سپاہ کثیر کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ خبر چھوٹی موٹی نہ تھی۔ جنگل کی آگ کی طرح ہند کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

این سن نے سمجھا تھا کہ دلی میں مٹھی بھر سپاہی ہیں۔ انہیں ایک ہی حملے میں روند دے گا۔ شاید اسے یاد نہیں تھا کہ یہ وہی ملک ہے جہاں ٹیپو سلطان نے ٹوٹی ہوئی تلوار سے بھی جنگ کی تھی۔ نواب سراج الدولہ کا وطن بھی یہی ہے۔ اسی سرزمین پر جیسور بھی ہے جہاں کے ایک معمولی سے زمیندار تیتو میر نے بانسوں کا قلعہ بنا کر لاٹھی ڈنڈوں سے انگریزوں کی سپاہ کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کا وطن ہے، یہاں بہادروں کی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنی سپاہ کثیر کے زعم میں آگے بڑھ رہا تھا تو حب وطن سے سرشار جوان بھی دہلی کی جانب چھوٹے چھوٹے دستوں میں بڑھ رہے تھے۔

انگریز سپاہ تنخواہ کے لالچ میں لڑنے جارہی تھی اور یہ چھوٹے چھوٹے دستے جذبہ جہاد کے تحت بڑھ رہے تھے۔ وہ سب بہادر شاہ ظفر کی نصرت کے لیے آرہے تھے۔ شہنشاہ معظم نے بخت خان کو سپاہ سالار اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ پہلے یہ منصب شہزادہ مرزا مغل کے پاس تھا۔ بخت خان نے یہ منصب لینے سے پہلے ہی شہنشاہ معظم سے کئی قول وقرار لے لیے تھے۔ وہ بہادر ہی نہیں منہ پھٹ بھی تھا۔ اس نے صاف

لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر اوٹ مار کرتے ہوئے میں نے کسی شہزادے کو بھی دیکھا تو اسے گولی ماردوں گا۔ اس کی یہ بے خوفی شہنشاہ معظم کو بھا گئی تھی۔ انہوں نے کلی اختیار اسے دے دیا تھا۔ اس نے اپنے حسن کارکردگی سے نظم و نسق تو سنبھالا ہی بہادری سے انگریزوں کے دانت بھی کھٹے کرنا شروع کردیے۔ جنرل ین سن کے لیے وہ لوہے کا چنا ثابت ہوئے تھے۔ کسی پہاڑ کی طرح وہ ان کے آگے ڈٹ گئے تھے۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے انگریزوں نے آپس میں صلاح مشورے تیز کردیے۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے اسی حکمت عملی کو کام میں لانے کی ٹھانی جسے ہسپانیہ میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ جس حکمت عملی کو سرزمین ہند پر انہوں نے نواب سراج الدولہ کے خلاف استعمال کیا تھا' جس کے ذریعے انہوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دی تھی۔ یعنی مفاد پرستوں کو تلاش کرکے اپنے مفاد کے لیے آمادہ کرنا۔ ایسے غداروں کی ہر دور میں بہتات ہوتی ہے۔ انہیں بھی دلی میں اس قسم کے لوگ مل گئے۔ کچھ تو پہلے ہی سے انگریزوں کے پالتو کتے تھے اور کچھ کو انہوں نے بعد میں خرید لیا۔ ایسے لوگوں نے بہ یک وقت کئی محاذ کھول دیے۔ انہوں نے شہزادوں کو بخت خاں کے خلاف ابھارنا شروع کردیا۔ شہزادے پہلے ہی بخت خاں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ اب انہوں نے کھلے عام اس کی مخالفت شروع کردی۔ بخت خاں جنگی حکمت عملی تیار کرتا اور شہزادے اسے نامنظور کردیتے یا ناکام بنانے کی سازش شروع کردیتے۔ اس صورت حال سے بخت خاں کا دل چھوٹا ہوگیا اور اس نے شہنشاہ معظم سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب وہ صرف اپنی فوج کی کمان سنبھالے گا۔

یہ غداروں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ انہوں نے گویا آدھی جنگ جیت لی تھی۔ اب انہوں نے سپاہیوں کے درمیان کام شروع کردیا۔ وہ انہیں تنخواہ کی طلب پر اکسا رہے تھے۔ ہر روز کی ایک ہی بات ان کے ذہنوں پر چھا گئی اور انہوں نے ایک دن خاص محل کو گھیر لیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں تنخواہیں دی جائیں۔ یہ خبر شہنشاہ معظم تک پہنچی تو شہنشاہ معظم ان سے مذاکرات کرنے خود تشریف لے آئے۔

انہوں نے بہ آواز بلند کہا ''کیا میں نے پہلے ہی دن تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ میرے پاس دولت ہے اور نہ ملک...... میں تمہیں تنخواہ کہاں سے دوں؟''

''آپ قرض لے کر تو دے سکتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں زوال [illegible] رہے ہیں۔''

''قرض کس سے لوں؟ تمام مہاجنوں' سوداگروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی لوٹ لیا ہے پھر قرض کے لیے میری ضمانت کون لے گا؟''

''ہم کچھ نہیں جانتے' ہمیں تنخواہ چاہیے۔'' یہ مطالبہ اب شور کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔ پھر انہی میں سے کسی نے کہا ''ہمیں تنخواہ نہیں ملی تو ہم شہر لوٹ لیں گے' چلو بھائیو! شہر کو لوٹنے چلتے ہیں۔''

''نہیں' تم لوگ شہر کو نہیں لوٹو گے' میں اپنا تمام مال و اسباب بیچ کر تمہاری تنخواہیں ادا کروں گا۔ تم سب تنخواہیں لے کر خاموشی سے چلے جاؤ گے۔ میں نے تمہیں بلایا نہیں تھا' تم خود آئے تھے۔'' شہنشاہ معظم نے آبدیدہ ہوکر کہا اور جانے کے لیے مڑ گئے۔ غداروں کی دوسری چال بھی کامیاب ہوگئی تھی۔

ادھر انگریز فوجیوں کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ انہیں روکنے والے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ زیادہ تر باغی سپاہی شہر سے بھاگ گئے تھے۔ بچے کھچے سپاہیوں میں بھی سرفروشوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ وہی انگریزوں کا مقابلہ کررہے تھے۔ انگریز شہر میں داخل ہوچکے تھے اور قلعہ معلیٰ کے بہت نزدیک پہنچ گئے تھے۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی کہ بادشاہ نے منادی کرادی ''یہ وقت جہاد ہے تمام شہری گھروں سے نکل پڑیں۔ خود جہاں پناہ بھی مقابلے کے لیے ساتھ ہوں گے۔''

''اعلان ہوتے ہی تقریباً دس بارہ ہزار افراد قلعے میں جمع ہوگئے۔ انگریزوں کے پاس بھاری توپ خانہ تھا' بندوقیں تھیں اور ادھر لاٹھی' بلم اور تلواریں تھیں مگر دل میں جوش جہاد تھا۔ شہنشاہ معظم ہاتھی پر سوار ہوکر قلعے سے باہر آئے۔ ان کے ساتھ وہ بے ترتیب لشکر بھی تھا۔ انگریز سپاہ دلی کی جامع مسجد تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی چلائی ہوئی گولیاں قلعے کے نزدیکی میدان لال ڈگی تک پہنچ رہی تھیں۔ باغی فوجیوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی مگر بخت خاں کی فوجیں بے جگری سے لڑ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی دوسرے علاقوں کی فوجیں جن میں جذبہ جہاد باقی تھا سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھیں۔ انہوں نے ہی شہنشاہ معظم سے استدعا کی کہ آپ قلعہ میں لوٹ جائیں۔ بادشاہ نے ان کی بات مان لی اور لوٹ کر قلعہ میں چلے گئے۔

بخت خاں دور رس نگاہ رکھتا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب شکست مقدر ہے۔ وہ شہنشاہ معظم کے پاس آیا اور استدعا کی ''عالی جاہ' جنگ میں فتح و شکست عجوبہ نہیں ہے۔ ہمیں بہرحال

میں شکست ہوگی لیکن ہمیں ہمت نہیں ہارنا ہے۔ فرنگیوں کے خلاف ہم نیا محاذ بنائیں گے۔ ابھی پورا ہندوستان باقی ہے ہم کسی دوسری جگہ سے پھر جنگ کا آغاز کریں گے۔ آپ ہمارے ساتھ نکل چلیں۔''

انگریزوں نے اس پہلو پر پہلے سے ہی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے اگر شہنشاہ معظم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تو یہ فتح بے معنی ہوجائے گی اس لیے انہوں نے پہلے ہی شہنشاہ کے سمدھی الٰہی بخش کو ملا رکھا تھا کہ وہ بادشاہ کو بھاگنے نہ دے۔

بخت خاں کا موقف غلط نہ تھا۔ بادشاہ اس کی دکھائی راہ پر چل پڑتے کہ مرزا الٰہی بخش نے کہا ''حضور! مجھے بخت خاں کی باتوں سے اختلاف نہیں ہے مگر سوچیے' یہ جنگ آپ پر مسلط کردہ ہے' باغیوں کی شرارت ہے اور جب باغی ہی نہ رہیں گے تو جنگ خود بخود ختم ہوجائے گی۔''

''اور انگریز انہیں کیا معاف کردیں گے؟'' بخت خاں نے کہا۔

''اور کیا' انگریز اندھے نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ بادشاہ سلامت کو یرغمال بناکر باغیوں نے اپنا کام نکالا ہے پھر وہ اس استدعا نامہ کو بھولے نہیں ہوں گے جو حضور نے آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر کو بھیجا تھا۔''

پتا نہیں شہنشاہ معظم نے کیا سوچا کہ انہوں نے بخت خاں کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔

انہوں نے رنجیدہ لہجے میں کہا ''بخت خاں! ہم کل تم سے مقبرہ ہمایوں میں ملاقات کریں گے۔''

''تو کیا آپ قلعہ خالی کررہے ہیں؟'' بخت خاں کی آواز میں لرزہ تھا۔

''ہاں! اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''تو آپ میرے ساتھ ہی کیوں نہیں نکل لیتے؟''

''ابھی مجھے سوچنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔ رات بھر میں کوئی فیصلہ کرلوں گا۔''

بخت خاں مایوس ہوکر لوٹ گیا۔ اسی رات اماوس کے گھپ اندھیرے میں شہنشاہ معظم بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ قلعہ کے خفیہ دروازے سے باہر نکلے اور چھپتے چھپاتے مقبرہ ہمایوں کی جانب چل پڑے۔ جس لال قلعہ نے مغلیہ سلطنت کا عروج دیکھا تھا اسی لال قلعہ نے تاریخ کا سب سے بدترین فرار بھی دیکھا۔ شہزادے پاپیادہ بھاگ رہے تھے۔ بیگمات کی ڈولیاں جاں فدا کرنے والے خواجہ سرا کندھوں پہ

مارچ 2018ء کے

شمارے کی دلربا جھلک

قفس شکن

سازش اور سودخوری کے دائرے سے نکل کے عالمی پس منظر میں بپا ہونے والے فتنوں کی ہوش رُبا داستان ... **زویا اعجاز** کے قلم سے

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتی **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت...... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

زمین و جائداد کے اسیر جو سزا کے مستحق قرار پائے...... سرورق کے خونی رنگ میں ڈوبی کہانی

رشتے ناتے انتہائی نازک ہوتے ہیں...... ٹوٹتے ہیں تو صرف کرچیاں رہ جاتی ہیں جو صرف زخمی کرتی ہیں...... سرورق کی نزاکت میں لپٹی کہانی

چھنی نکتہ چینی

اٹھائے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

☆......☆

میجر ہڈسن قلعہ سے کافی دور ایک مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس گھر کو وہ بطور ہیڈ کوارٹر استعمال کر رہا تھا۔ اسے صبح کا انتظار تھا تاکہ قلعہ پر پوری طاقت سے حملہ کرے۔ وہ اسی سلسلے میں دوسرے افسروں سے صلاح مشورہ کر رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی' ایک شخص ملاقات کے لیے آیا ہے۔ اس نے بلانے کو کہا۔ بادشاہ کا سمدھی الٰہی بخش ہاتھ باندھے آ کھڑا ہوا۔

''ویل فوجر کا بادشاہ تم کیسے آیا؟'' میجر ہڈسن نے اسے بادشاہ بنانے کا لالچ دے رکھا تھا۔

''ظفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ قلعہ خالی کر گیا۔'' الٰہی بخش کے چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

''کتنا آدمی غدار کے ساتھ گیا اور کس طرف گیا؟''

''حضور کا اقبال بلند ہو! اس کے ساتھ باغی سپاہی نہیں ہیں۔ بیگمات اور شہزادے ہیں۔ وہ سب چھپنے کے لیے مقبرہ ہمایوں گئے ہیں۔ ایک روز بعد اس سے کسی اور طرف چلے جائیں گے۔''

''ہم نے سنا ہے اس کے ساتھ بخت خان بھی ہے؟''

''اس نمک خوار نے بخت خاں کی چال کو ناکام بنا دیا۔ ظفر کو اس کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ آپ کے پاس پوری رات ہے۔ آپ جلد سے جلد اپنے سپاہیوں کے ساتھ جا کر اسے گھیر لیجیے۔ وہ کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا۔''

''ہم اس کو موقع دے گا۔ وہ خود ہمارے پاس معافی مانگنے آئے گا۔ تم اس کا نگرانی کرو۔ وہ بھاگنے نہ پائے۔ ہم تم کو بہت جاگیر دے گا۔ بادشاہ کا خطاب بھی دے گا۔''

الٰہی بخش لالچ میں آ گیا اور شہنشاہ معظم کو ورغلانے مقبرہ ہمایوں پہنچ گیا۔ آتے وقت اس نے ہڈسن کو بتا دیا تھا کہ بخت خاں شہنشاہ معظم کو لینے آئے گا۔ اس طرح دونوں کو ایک ساتھ گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

الٰہی بخش نے بادشاہ کے علاوہ ان کی سب سے چہیتی بیگم زینت محل کو بھی ورغلانہ شروع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریز بادشاہ حضور کو بے قصور سمجھ رہے ہیں۔ ان کی لڑائی باغیوں سے تھی جواب سب کے سب فرار ہو چکے ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیں تو یقیناً وہ انہیں عزت و احترام سے دہلی میں رہنے کی اجازت دے دیں گے۔

بیگم زینت محل نے بھی بادشاہ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ضعیف العمر بادشاہ کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ ہر طرف دشمن تھے' ایسی حالت میں کدھر جائیں یہ خود ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

الٰہی بخش لگاتار زور ڈال رہا تھا کہ بخت خاں کے ساتھ نہ جائیں۔ برسات کا موسم سر پہ کھڑا ہے ایسے وقت میں شہزادیوں کو ساتھ لیے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں گے۔

یہ بات بادشاہ کے دل میں گھر کر گئی اور جب بخت خاں آیا تو انہوں نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔

یہ ساری باتیں ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا ہڈسن دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی بخت خاں مقبرے کے مشرقی دروازے سے باہر نکلا' ہڈسن نے رجب علی نامی ایک غدار کو بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے جا کر عرض کیا ''شہنشاہ عالم! صاحب بہادر ہڈسن تشریف لا رہے ہیں' وہ آپ سے کچھ باتیں کریں گے۔''

''اب وہ کیا لینے آ رہے ہیں۔ انہیں قلعہ چاہیے تھا وہ میں خالی کر آیا ہوں۔'' بادشاہ نے نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ خود کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ وہ آپ کے تمام لواحقین کو گولی سے اڑا دیں گے۔'' بادشاہ نے حسرت بھری نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا پھر رجب علی سے بولے ''جاؤ' ان سے کہو کہ اگر وہ جاں بخشی کا اقرار کرتے ہیں تو میں خود کو ان کے حوالے کر دوں گا۔''

رجب علی نے جا کر ہڈسن کو بتایا۔ اس نے نخوت بھرے انداز میں کہا ''اب بادشاہ کوئی بھی شرط منوانے کی حالت میں نہیں ہے۔ ویسے تو میں نے پہلے ہی جاں بخشی کا وعدہ کر لیا ہے۔''

رجب علی نے یہ بات بادشاہ تک پہنچا دی۔ شہنشاہ معظم نے لاچاری سے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا اور باہر نکلنے لگے۔ زینت محل تڑپ کر آگے بڑھیں۔ ''نہیں عالم پناہ! پہلے میں باہر نکلوں گی تاکہ اگر انگریز گولیاں چلائیں تو میں مروں اور آپ زندہ رہ جائیں۔''

زینت محل کے اصرار پر شہنشاہ معظم نے اجازت دے دی۔ سب سے آگے زینت محل کی پالکی تھی۔ اس کے پیچھے مرزا جواں بخت کی سواری' سب سے آخر میں شہنشاہ ہند تھے غم والم کی زندہ تصویر بنے۔ ان کے پیچھے وہ نمک خوار تھے جنہوں نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں عام شہری بھی تھے اور امراء بھی۔ یہ سب بعد میں آ کر جمع

ہوئے تھے۔

ہڈسن نے بادشاہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر کہا ''ہتھیار میرے حوالے کر دو۔''

وہ معمولی سی تلوار جو کئی پشتوں سے اس خاندان کی نگراں تھی' کئی بادشاہوں کے ہاتھوں میں جا کر اس کا وقار بڑھا چکی تھی مگر اب تو کند ہو چکی تھی' صیقل بھی کرانے کی کسی نے ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر خاندانی وقار کی نشانی سمجھ کر سب نے اسے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ بادشاہ نے تلوار اس کے حوالے کر دی۔

ہتھیار لینے کے بعد ہڈسن نے بادشاہ کی تذلیل کرانے کو ان راستوں سے گزارا جن پر عوام کثیر تعداد میں جمع رہتے تھے۔ ایسے ہی راستوں سے گزار کر انہیں لال قلعہ پہنچایا گیا۔ اسی لال قلعہ میں جہاں کبھی ان کا حکم چلتا تھا مگر اب وہ قیدی تھے اور قیدی کی تذلیل فاتح کا پرانا حق ہے۔ انگریز افسران بادشاہ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ یہ بات بادشاہ کے ایک غلام کو بہت زیادہ گراں گزری اور وہ حق نمک ادا کرنے کے لیے تڑپ کر آگے بڑھا اور اس بدتمیز افسر کو اٹھا کر پٹخ دیا۔

بعد میں اس حبشی غلام کو بھی سزائے موت دے دی گئی مگر تاریخ نے اسے امر بنا دیا اور یہ سب شہنشاہ معظم کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ جگر سوختہ شہنشاہ معظم کو یہ سب کچھ دیکھنے میں مجبور کیا جاتا رہا۔

کمشنر دہلی مسٹر سنڈرس کا تقرر ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً بادشاہ کو اپنے حضور طلب کیا۔ وہ بادشاہ جس کے حضور ایک عالم سر جھکائے کھڑا رہتا تھا' آج وہ خود سنڈرس کے آگے سرنگوں تھا۔

سنڈرس نے بادشاہ کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر اپنا ظالمانہ حکم جاری کر دیا ''اس باغی کو ناظر حسین مرزا کے خالی پڑے گھر میں قید کر دیا جائے اور اس کی بیوی بچوں کو الگ الگ قید تنہائی میں رکھا جائے۔''

شہنشاہ معظم نے غمناک نگاہوں سے سنڈرس کو دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے۔'' سنڈرس نے سوال کیا۔

بادشاہ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ ان کی حالت تو پہلے ہی بہت کچھ بول رہی تھی۔

بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں لایا گیا۔ تنگ و تاریک گلیوں کے درمیان وہ ایک خستہ حال مکان تھا۔ مکین نے اسے بہت پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے کمرے دن میں بھی ایسے تاریک رہتے تھے کہ ان پر رات کا گمان ہوتا تھا۔

بادشاہ کو اس مکان کے کمرے میں دھکیلتے ہوئے انگریز افسر نے وہاں موجود پہرے دار کو حکم دیا ''قیدی اگر فرار ہونے کی کوشش کرے تو بلا تامل گولی مار دینا۔''

اسّی برس کا ضعیف' جس پر حالات کا کوہ ستم وہ فرار کی کوشش کیسے کرتا؟ یہ حکم بادشاہ کی تذلیل کے لیے صادر کیا گیا تھا۔ بادشاہ نے سن کر بھی ان سنی کر دی۔ ان پر تو سکتہ سا طاری تھا۔ وہ خالی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

شہنشاہ معظم کو مطلق خبر نہ تھی کہ بیگم زینت محل کو کہاں قید کیا گیا ہے اور شہزادے جواں بخت کو کس حال میں رکھا گیا ہے۔ جواں بخت ولی عہد تھا اس لیے بھی وہ انہیں زیادہ عزیز تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

☆......☆

''حضور' ایک نئی خبر لے کر آیا ہوں۔'' الٰہی بخش نے نمک حرامی کی آخری حد پار کرتے ہوئے کہا۔

''ویل مسٹر الٰہی بخش! بولو کیا بولنا ہے۔ کیسی خبر لایا ہے۔'' ہڈسن نے نخوت سے پوچھا۔

''حضور کا اقبال بلند ہو۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ باغی شہزادے مرزا مغل' مرزا ابوبکر اور مرزا سلطان کہاں چھپے ہوئے ہیں۔''

''وہ غدار کہاں ہے' جلدی بولو!'' ہڈسن نے کہا۔

''وہ سب مقبرہ ہمایوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو انہیں گرفتار کر لیں اگر وہ فرار ہو گئے تو باغیوں کو حیات نو مل جائے گی۔'' نمک حرام الٰہی بخش کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ جاگیر کی لالچ نے اسے اندھا بنا دیا تھا۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ ملک کی شہ رگ پر چھری چلا چکا تھا اور اب خاندان مغلیہ کا گلا کاٹ رہا تھا۔

ہڈسن نے اسی وقت سپاہیوں کو ساتھ لیا اور مقبرہ کا محاصرہ کرنے چل پڑا۔ ابھی بھی وطن پرست زندہ تھے۔ ایسے ہی کسی نمک حلال نے شہزادوں کو خبر دے دی۔ تینوں شہزادے گھبرا اٹھے' اس آفت سے بچنے کی ترکیب سوچنے لگے۔

''ہمارے خاندان کی تاریخ رہی ہے کہ ہم نے میدان جنگ کو پسند کیا ہے۔ عزت کی موت افضل ہے ذلت کی زندگی سے' آؤ ہم مقابلہ کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیں۔'' مرزا ابوبکر نے مشورہ دیا۔

''لیکن بھائی! ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں؟''

''دارا شکوہ جب اورنگ زیب کی قید میں تھا تو اس نے

قاتل کا مقابلہ پھلوں کو کاٹنے والی چھری سے کیا تھا۔ ہمارے پاس تو پھر بھی تلواریں ہیں۔ مرنا یوں بھی ہے تو ہم بزدلی کی موت کیوں مریں؟"

وہ سب مقابلے پر تیار تھے کہ الٰہی بخش پہنچ گیا۔ اس نے کورنش بجالاتے ہوئے کہا "شہزادو! میں نے حق نمک ادا کرتے ہوئے آپ کی جاں بخشی کرالی ہے۔ انگریز بہادر کے دربار سے آپ کے لیے معافی نامہ لے آیا ہوں۔" خاندان مغلیہ کی تاریخ گواہ ہے وہ خطروں کو دور سے بھانپ لیتے تھے مگر یہ تب کی بات تھی جب شمشیر وسناں اول تھی اور اب طاؤس ورباب کا دور تھا۔ ان شہزادوں نے جہانبانی کا طریقہ سیکھا نہیں تھا۔ الٰہی بخش کے دام کو پہچان نہ سکے اور اس کے بہکاوے میں آکر مقبرے سے نکل آئے۔ ہڈسن پہلے سے ہی تیار تھا اس نے انہیں رتھوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ ہڈسن کی خونخوار آنکھیں بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔ شہزادے سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے لیکن اب کوئی چارہ نہ تھا۔

ہڈسن انہیں لے کر جانب دہلی چلا۔ جب دہلی ایک کوس کے فاصلے پر رہ گئی تو اس نے شہزادوں کو تذلیل کے لیے حکم دیا "ستر پوش اتاردو!"

قسمت کے ماروں نے پیرہن اتاردیا۔ ہڈسن نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "یہ ہے ہندوستان کی عزت! او ننگے شہزادو جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟"

شہزادے جواب کیا دیتے انہیں انگریزی آتی نہیں تھی' وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے رہے۔ ہڈسن نے نزدیک کھڑے سنتری سے بندوق لی اور اسے اچھال کر شہزادوں کی جانب دیکھا۔ بقول ڈاکٹر فرحت اللہ دہلوی "اس وقت احساس ہوا شہزادوں کو وہ اسیر دام فرنگ ہو چکے ہیں اور ممکن نہیں اُمید رہائی سو انہوں نے مرنے کا قصد کیا اور تھاما ایک دوسرے کا ہاتھ اور دیکھا جانب نابکار۔ اس بدکار نے داغی ایسی گولی جو پار ہوگئی شہزادوں کے سینے سے۔"

ہر طرف آگ اور خون کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ شہر بھر میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا ایسے وقت میں شہنشاہ ہند ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ایک تنگ و تاریک کمرے میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پے در پے حادثات نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ جوان بیٹوں کے قتل اور خواتین کی بے حرمتی نے ان کی کمر کو خمیدہ کر دیا تھا۔ اسی سال اس سن رسیدہ بادشاہ کی نظروں میں دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے ظالموں نے انہیں ایک ایسا منظر دکھایا تھا جس نے ان پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔

ان کے سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ہندی بھی تھے اور انگریز بھی! وہ سب ان کی اس کیفیت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ سب سے آگے میجر ہڈسن کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی کی نوک کو شہنشاہ معظم کی ٹھوڑی کے نیچے لگایا اور چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا "تم کالا آدمی کیا سمجھا تھا! ہم سے گدّاری کر کے حکومت چھین لے گا؟"

وہاں کھڑے حقیقی غداروں نے قہقہہ لگایا۔ مادر وطن کا سودا کرنے والے خوش تھے' ہر بات پر قہقہہ لگا رہے تھے' اپنے ہی آقا کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ شہنشاہ معظم کا سر کچھ اور جھک گیا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا مگر چہرے کے جلال نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے ہی دانتوں سے اپنا ہونٹ چبا رہے تھے۔

"اے بڈھے اوپر دیکھ۔" ایک غدار نے آوازا کسا۔ شہنشاہ معظم نے سر اٹھا کر غداروں کی جماعت کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

ان کے پُرجلال چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے میجر ہڈسن بولا "ہم تمہارا واسطے تحفہ لایا ہے۔" پھر اس نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس شخص نے اپنے سر پر ایک سینی اٹھا رکھی تھی جو خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس شخص نے سینی کو سر سے اتارا اور ضعیف العمر بادشاہ کے آگے رکھ دیا۔ میجر ہڈسن نے چھڑی سے خوان پوش ہٹا دیا۔ خوان پوش ہٹتے ہی شہنشاہ معظم کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس تشت میں شہزادوں کے سر تھے۔

بادشاہ نے حسرت بھری نگاہوں سے شہزادوں کے کٹے ہوئے سروں کو دیکھا اور پھر زیر لب بولے "کاش! تم نے دانائی کا دامن نہ چھوڑا ہوتا اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی غلطی نہ کرتے۔ بخت خاں کی پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتے تو آج نہ تم اس حالت میں ہوتے اور نہ میں۔"

"بے چارہ پاگل ہو گیا ہے۔" غداروں میں سے کسی نے کہا۔

بادشاہ نے اپنی غم ناک نظروں سے انہیں ایسے دیکھا کہ اگر ان کے سینوں میں دل ہوتا تو کٹ کر رہ جاتا۔

غداروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کے دل تو سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ ہنستے رہے' ضعیف العمر بادشاہ کا مذاق اڑاتے رہے۔

اب شہنشاہ معظم کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ بخت خاں کی

بات نہ مان کر وہ بہت بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ سانپ ہر حال میں ڈستا ہے' یہ اس کی فطرت ہے پھر بھی انہوں نے اس پر بھروسا کر لیا تھا۔ جانتے بوجھتے' ہر چہرے کو پہچانتے ہوئے بھی غلطی کر بیٹھے تھے۔ اس کی ایک وجہ ان کی تربیت تھی۔

یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی تاریخ میں صرف ایک مثال ہے۔ یزیدی افواج کی یہ پیروی تھی شہنشاہ معظم کا دل پارہ پارہ ہو گیا۔

مسلسل صدمے' غم و آلام' بے عزتی کا احساس اور تنگ و تاریک کوٹھری' اس پر کبیر سنی شہنشاہ معظم بیمار ہو گئے۔ چار ماہ کی اس قید تنہائی نے انہیں آدھا کر دیا تھا۔

اتنے دنوں میں انگریزوں نے اپنے پاؤں پوری طرح جما لیے تھے۔ اب وہ جب چاہتے بادشاہ کو شہزادوں کی طرح گولیوں سے اڑا دیتے مگر وہ خود ساختہ مہذب قوم تھے۔ انہوں نے ایک نیا ڈراما شروع کر دیا۔ لال قلعہ کے اسی دیوان عام میں جہاں کبھی مغلیہ شہنشاہوں کا دربار سجتا تھا' انگریزوں نے کچہری سجائی اور مقدمہ چلانے کی تیاری ہونے لگی۔ شہنشاہ معظم کو عام قیدیوں کی طرح عدالت میں طلب کیا گیا۔

شہنشاہ معظم سر جھکائے اپنے ہی دیوان عام میں کھڑے تھے۔ ایک اردلی سے افسر تک سب ہی انہیں قیدی کے نام سے پکار رہے تھے۔ جس دیوان عام میں وہ خود دوسروں کے فیصلے کیا کرتے تھے' آج ان کے خلاف فیصلہ ہو رہا تھا۔ منصف کی کرسی پر انصاف کا خون کرنے بیٹھے ہوئے انگریز نے ان کے خلاف عائد الزامات کی فہرست سنائی "تم حکومت انگلشیہ کے پنشن خوار تھے پھر بھی تم نے 10 مئی تا یکم اکتوبر 1857ء کے درمیان تاج کی کمشنڈ افسران کو ورغلایا' انہیں حکومت انگلشیہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا مشورہ دیا۔"

اس سفید جھوٹ پر شہنشاہ معظم نے چونک کر سر اٹھایا' جج کی جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر سر جھکا لیا۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہ تو وہی ہیں جنہوں نے نواب علی وردی خان کے پیر پکڑ کر تجارت کی اجازت لی تھی اور پھر انہی کے جانشین نواب سراج الدولہ کو تاراج کر دیا۔ انہیں تو ان سپاہیوں سے بھی شکایت نہیں تھی جنہوں نے بیچ منجدھار میں لا کر چھوڑ دیا تھا۔ جب جب ان کی دغا یاد آتی تھی وہ یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

ابھی وہ پہلے الزام کا جھٹکا برداشت نہ کر سکے تھے کہ

جمال پانی پتی (1927-2005)

15 جولائی 1927 کو پیدا ہونے والے معروف شاعر و ادیب اور نقاد دانشور احمد قریشی کو جمال پانی پتی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ سنبھالکہ ضلع پانی پت میں الطاف حسین حالی کے ہم وطن جمال صاحب کا تعلق حلقہ سلیم احمد سے تھا۔ جن کے استاد پروفیسر حسن عسکری کو بھی احترام و عقیدت سے دیکھا جاتا ہے۔ ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے آپ کے متعدد مضامین کو بعد ازاں کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ "ادب و روایت (1994)، اختلاف کے پہلو (2002)، جمیل الدین عالی کا انتخاب کلام (2005)، نفی سے اثبات تک (2004)، جدیدیت اور جدیدیت کی ابلیسیت (2005) نامی کتابوں کو عصری تنقید میں اہمیت حاصل ہے۔ بعد از مرگ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع کیا گیا ہے جس میں دوہے' غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ 10 جولائی 2005 کو نگزار احمد قریشی جمال پانی پتی دنیا سے رخصت ہوئے۔ کراچی کی سرزمین ان کا مستقل ٹھکانا بنی۔

☆☆☆

خان آصف (1940-2003)

آصف شاہ خان آصف اس لحاظ سے خوش قسمت ادیب و شاعر اور افسانہ نگار ہیں کہ آپ نے تاریخ اسلام اور صوفیاء کی سیر و افکار پر اردو کے متفرق ڈائجسٹوں میں کہانیاں لکھ کر اپنے قارئین کا حلقہ پیدا کیا جو ماہ بہ ماہ ان کی کہانیوں اور افسانوں کا منتظر رہتا ہے۔ آپ ریاست رام پور میں 1940 کی دہائی میں پیدا ہوئے۔ سات آٹھ برس کی عمر میں کراچی آئے اور اردو ادب میں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم ان کا نام اور کام پاکستان اور بھارت کے علمی اور ادبی حلقوں میں پہنچ چکا تھا۔ روبی، ہما، بیسویں صدی اور شمع دہلی جیسے بھارتی رسائل میں ان کی کہانیاں نقل در نقل چھپیں۔ کراچی سے ابن صفی کے بعد انہوں نے ذاتی ڈائجسٹ بھی اجراء کیے۔ اخبار جہاں میں قسط وار کہانیاں شائع ہوتی رہیں جب کہ 16 دسمبر 2003 کو آپ کا ناظم آباد میں انتقال ہوا۔ سخی حسن قبرستان میں دفن کیے گئے۔ روزنامہ جنگ کراچی میں انور جاوید ہاشمی کا قطعہ تاریخ وفات 17 دسمبر کو شائع ہوا۔ خان آصف نے فلموں کے مکالمے بھی لکھے۔ روزنامہ جسارت اور دیگر اخبارات میں قطعہ نگاری اور موضوعاتی نظمیں لکھتے رہے۔ تاہم شاعری کا مجموعہ نہیں چھپوایا البتہ نثر میں ان کی تصانیف "اللہ کے ولی" اور "اللہ کے سفیر" شائع ہو کر مقبول عوام و خواص ہو چکی ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

منصف نے دوسرا زہریلا تیر پھینکا "مذکورہ مدت میں قیدی نے مرزا مغل کو جو حکومت برطانیہ کا شہری تھا اور دیگر باشندوں کو حکومت کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔" پھر کچھ توقف کے بعد اس نے تیسرا زخم لگایا "اس قیدی نے خود کو بادشاہ دہلی مشہور کیا جو خلاف قانون تھا اور غاصبانہ طور پر دلی شہر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔"

بادشاہ نے پھر اس کی جانب حیرت بھری نظروں سے دیکھا گویا خاموش نظروں سے وہ پوچھ رہے ہوں کہ ذرا انصافاً بتاؤ یہ شہر تمہارا ہے یا میرا؟ یہاں کا بادشاہ میں ہوں یا تم؟ مگر جواب دیتا تو کون؟

نام نہاد منصف نے چوتھا تفنگ آزمایا "شہر دہلی میں 49 انگریز جن میں عورتیں، بچے بھی تھے انہیں قتل کرانے میں حصہ لیا۔"

شہنشاہ معظم نے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے کھڑے مجسم سوال بنے رہے۔

پورے اکیس دن تک یہ ڈراما رچایا جاتا رہا۔ آخری دن بادشاہ عالی کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ انہوں نے پہلے تو کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا کیونکہ ان کے خلاف گواہوں میں وہ سب تھے جو ان کا دیا کھاتے تھے۔ ان میں سرفہرست انہی کے وزیر احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان تھا۔ پھر الٰہی بخش وغیرہ تھے، مکند لال تھا جو کبھی مقرب خاص تھا ایسی حالت میں وہ کیا کہتے؟

ہر ایک کے زور دینے پر شہنشاہ معظم بولنے پر آمادہ ہوئے اور خوب بولے۔ انہوں نے تمام الزامات کی نفی بڑے احسن طریقے پر کر دی لیکن فیصلہ تو بہت پہلے کر دیا گیا تھا، اس دن اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ جج نے بیان میں لکھا تھا۔

"ہم بادشاہ کو جو کٹہرے میں ہیں، باغیوں سے ساز باز کرتا پاتے ہیں۔ وہ پہلا نصب العین جس کی طرف باغی چلے، وہ پہلا شخص جس سے انہوں نے التجا کی یہی دہلی کے فرضی بادشاہ ہیں۔ یہ دیکھ کر معمولی عقل والا بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں ضرور پچھلا ربط ضبط تھا۔ کیا ہوا اگر بادشاہ کی شرکت بعد میں ہوئی۔"

اس فیصلے کے کچھ ہی دنوں بعد انہیں مجرم گردانتے ہوئے سزا کا موجب قرار دیا اس فیصلے کی رو سے انہیں پھانسی ہو جانی چاہیے تھی مگر وہ بادشاہ سلامت کو ہیرو بنانا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے جلاوطنی کی سزا دے دی۔ اس سلسلے میں جان لارنس کی وہ چٹھی خاصی اہمیت کی حامل ہے، جس میں اس نے سفارش کی تھی کہ معزول بادشاہ کو جلاوطن تاحیات کی سزا دی جائے۔ بیگم زینت محل اور شہزادے بخت جواں کو یہ اجازت دی جائے کہ چاہیں تو وہ بادشاہ کے ساتھ رنگون چلے جائیں۔ اگر وہ رنگون جانے پر رضامند نہیں ہوتے تو انہیں بنگال کے کسی دور افتادہ جگہ پر نظر بند رہنا ہوگا۔"

فیصلے کے تقریباً سات ماہ بعد بادشاہ ہند کو جبری طور پر رنگون روانہ کر دیا گیا۔ دلی تو اجڑ ہی چکی تھی اب مزید ویران ہوگئی۔ جس کا ذکر وہ اپنے شعر میں کرتے ہیں۔

جن گلیاں میں پہلے دیکھیں لوکن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں بن سونی پڑیں وہ گلیاں تھیں
انکھاں اسماں دی ڈھونڈے اونہاں نوں ہائے وہ کتے لوگ گئے
جن کے مکھ سوں پیاری گلاں لگدی دلنوں بھلیاں تھیں
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں

☆......☆

ہند کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ شہنشاہ ہند سراج الدین ظفر اپنی دو بیویوں اور ولی عہد بخت جواں کے ہمراہ دیدہ عبرت بنے مشرق کی جانب چلے جا رہے تھے۔

انہیں کڑے پہرے میں رکھا گیا تھا مگر تذلیل بھی منظور تھی اس لیے جلوس کو مختلف شہروں میں پھرایا جا رہا تھا۔ یہ بھی یزیدی افواج کی پیروی تھی لیکن یہ کوفہ و شام کے بازار نہیں تھے ہند کی سرزمین تھی۔ جس شہر سے بھی جلوس گزرتا وہاں ماتمی فضا چھا جاتی۔ ہر آنکھ اشکبار ہو جاتی۔ لوگوں میں جوش و جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا۔

یہ خبریں حکومت انگلشیہ کے اہلکاروں تک پہنچ رہی تھیں۔ کہیں کسی شہر کے لوگ بادشاہ کو چھین نہ لیں اس ڈر سے انہیں الہ آباد میں روک لیا گیا۔ شہنشاہ معظم کی طبیعت علیل تھی۔ حکومت نے دنیا کو دکھانے کے لیے ایک میڈیکل بورڈ بٹھایا۔ انہیں فیصلہ دینا تھا کہ بادشاہ رنگون تک کا سفر طے کرنے کے قابل ہیں بھی یا نہیں؟ ڈاکٹر بھی انگریز تھے۔ انہوں نے برق رفتاری سے معائنہ کیا اور فیصلہ دے دیا کہ قیدی کی صحت قابل رشک ہے وہ برما تک کا سفر بآسانی طے کرے گا۔

اگلے ہی دن انہیں دریائی راستے سے کلکتے کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ بادشاہ سلامت ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہ تھے کہ ان کی آمد کا شہرہ پہنچ گیا۔ اس شہر میں پہلے سے ہی ایک قسمت کا مارا اودھ کا حکمران نواب واجد علی شاہ نظر بندی کے ایام گزار رہا تھا۔ انہوں نے جو سنا کہ والئ ہند سراج الدین بہادر شاہ کی

سواری آرہی ہے تو وہ ملنے کے لیے بے چین ہو اٹھے کیونکہ وہ بھی اسی خنجر سے زخم خوردہ تھے۔

انگریزوں کی سیاست کے اس شکار کے انتظار میں وہ گھڑیاں گننے لگے۔ انہوں نے وائسرائے کی معرفت شہنشاہ کے پاس ملاقات کا دعوت نامہ بھیجا۔ انگریزوں کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ تو خود بھی چاہتے تھے کہ لوگ اپنے بادشاہ کی تذلیل کا منظر دیکھیں، وائسرائے نے فوراً اجازت دے دی۔ شہنشاہ معظم بھی واجد علی شاہ کے غم سے واقف تھے۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی۔ دریائے ہگلی میں جہاز لنگر انداز ہوا۔ واجد علی شاہ جو مٹیا برج میں ایام اسیری گزار رہے تھے۔ ان سے ملنے چلے۔ دریائے ہگلی جس نے اپنے ساحل پر انگریزوں کو بے سروسامانی کی حالت میں اترتے دیکھا تھا۔ اسی ساحل نے دل پارہ پارہ دو حکمرانوں کو بھی ملتے دیکھا۔ نحیف و ناتواں شہنشاہ معظم جہاز سے اترے، قوی الجثہ نواب واجد علی شاہ آگے بڑھے اور شاہی آداب کے تحت اپنے بھاری بدن کو جھکا جھکا کر اکیس بار کورنش بجا لایا پھر آبدیدہ لہجے میں بولا۔

"حضور، غلام کا دامن خالی ہے۔ اب جاہ ہے اور نہ حشمت۔ دیدۂ عبرت ہے۔ ہاتھوں میں یہ مرصع عصا باقی رہ گیا ہے اسے بطور نذر قبول کیجیے۔"

یہ الفاظ زخم کی طرح ٹیس دے گئے۔ شہنشاہ معظم کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہیں تخت ہما یاد آیا ہوگا، اپنے دربار کی یاد آئی ہوگی۔ نذر دینے کی رسم آنکھوں تلے ناچ اٹھی ہوگی۔ آنکھوں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے بولے "بھائی! اب نہ میں بادشاہ ہوں اور نہ یہ دہلی کا دربار ہے پھر کیوں اس روایت کو نبھا رہے ہو؟"

"میرے خلوص کا اظہار سمجھ کر قبول کر لیجیے۔" نواب نے اصرار کیا۔ شہنشاہ معظم انکار نہ کر سکے اور عصا کو تھام لیا پھر بولے "جب ہم بادشاہ تھے تو ہماری روایت تھی کہ نذر قبول کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ مرحمت کرتے تھے۔ اب تو سب کچھ خواب ہو چکا ہے۔ دلی کیا لٹی ہم بھی لٹ گئے۔ دل میں زخموں کا انبار بچا ہے یا پھر یہ تسبیح بچی ہے۔ اسے آپ قبول کر لیں۔"

نواب نے عقیدت کے ساتھ اس تسبیح کو لے لیا پھر جھک کر بادشاہ کے داہنے ہاتھ پر بوسہ ثبت کیا اور آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ان کی جانب پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔

الغرض یہ ملاقات ختم ہوئی اور بادشاہ کا جہاز پھر چل پڑا۔

☆ ☆

1858ء ختم ہو رہا تھا کہ خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ جہاز

مارچ 2018ء کے بدلتے موسم میں سسپنس کا
خوب صورت شمارہ دلنشین کہانیاں ایک نظر میں
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید
محفل شعر و سخن، خطوط،
مرزا امجد بیگ کی وکالت

حریف
نظروں سے اوجھل دل سے قریب کی تفسیر..... عقل اور جذبات کے درمیان عجب کھیل۔ آخری صفحات پر **نشور ہادی** کا تحفہ

رنگ آسماں
بدلتے آسماں کے رنگوں میں سے ایک دلکش رنگ .....
خانہ بدوشوں کا قافلہ اپنے خطرناک عزائم کے ساتھ محو سفر ہے۔ **اے۔ آر۔ راجپوت** کے قلم کا جادو

وقت
ماں جیسی ہستی سے بچھڑنے کا عذاب سہنے والے بیٹے کے غموں کا حساب..... وقت کی پڑتال میں اپنے پرائے سب حساب دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ **حسام بٹ** کے قلم کی روانی

اس کے علاوہ
تنویر ریاض۔ منظر امام۔ شاکر لطیف۔ ناہید سلطانہ اختر
نعمان اسحاق اور مظہر سلیم ہاشمی کی سحر انگیز تحریریں آپ کی منتظر

سے اس پرائی زمین پر اترا۔ بیگم تاج محل نے کلکتہ میں ہی بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور واپس چلی گئی تھیں۔ اس ضعیف و ناتواں بادشاہ کے ساتھ صرف بیگم زینت محل اور جواں بخت تھے۔ ان تینوں کو وہاں موجود انگریز سپاہیوں نے اس طرح گھیر لیا گویا وہ سب خطرناک قسم کے دہشت گرد ہیں۔ ساحل سے انہیں اپنے حلقے میں لیے سنگینوں کے پہرے میں وہ سب ریس کورس آئے۔ اس گھڑ دوڑ کے میدان میں عارضی چھاؤنی بنی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک ترپال کے فوجی خیمے نصب تھے۔ انہی خیموں میں سے ایک میں انہیں رکھا گیا۔ اس خیمے کے گرد کل بتیس سپاہی بندوقیں تانے پہرے پر موجود تھے۔ سارا دن اور ساری رات اسی طرح بدل بدل کر ڈیوٹیاں دی جاتیں۔

اسی دوران میں ریس کورس کے نزدیک ایک نیا مکان تعمیر کیا گیا۔ برما میں اینٹ گارے کے مکان خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر مکان ساگوان کی لکڑیوں سے بنتے ہیں۔ وہ مکان بھی ساگوان کے تختوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس مکان میں کل چھ کمرے تھے۔ ایک میں شہنشاہ معظم دوسرے میں بیگم زینت محل اور تیسرے میں شہزادہ جواں بخت کو ٹھہرایا گیا تھا۔ شہنشاہ معظم کی خدمت کے لیے ایک ملازم کا بھی انتظام کیا گیا تھا لیکن عام قیدیوں کی طرح پابندیاں اب بھی عائد تھیں۔ وہ شاعر تھے اور ایک شاعر جذبات کے اظہار پر پابندی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ اس پر بہت بڑا ظلم ہے۔ انگریزوں نے اس سزا کو بھی ان پر روا رکھا تھا۔ انہیں کاغذ قلم رکھنے کی ممانیت تھی۔

قید حیات و بند وغم ...
اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی
غم سے نجات پائے کیوں

سمندر پر بند باندھا جاسکتا ہے مگر خیالات پر نہیں۔ اتنی پابندیوں کے بعد بھی وہ شعر کہتے۔ بلکہ پابندیاں ہی شعر کہلواتیں' حالات کی بے رخی' غم و آلام کی نشتر زنی الفاظ کی شکل میں دیواروں پر ابھرتے' شہنشاہ معظم قلم کا کام کوئلے سے لے رہے تھے۔ انہوں نے کمرے کی دیوار پر ہندی گیت میں اپنی بپتا لکھ دی جس کے بول تھے۔

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر میں من میں اب ہراسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا ہے
کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہے

شہنشاہ معظم کے ملازم سے ان کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ وہ قلم کاغذ کا انتظام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

برما میں روہنگیا مسلمانوں کی اکثریت ہے' یہ وہ قبائلی ہیں جنہیں برسوں پہلے شاہ جلالؒ کے ساتھ بھٹک کر آنے والے صوفیوں نے راہ ہدایت دکھائی تھی۔ ان کا اپنا رسم الخط تھا لیکن اس بات سے آگاہ تھے کہ قرآنی رسم الخط سے ملتی جلتی رسم الخط میں ہندوستانی مسلمان لکھتے ہیں۔ وہ خود بھی بادشاہ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انہیں جب بادشاہ کے ملازم رجب احمد بیگ سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کو قلم کاغذ کی ضرورت ہے تو انہوں نے نہایت رازداری سے قلم کاغذ پہنچا دیا۔ یہ اسی کا طفیل ہے کہ اردو ادب میں کئی بے مثال غزلوں کا اضافہ ہوا۔ اسی دور میں شہنشاہ معظم نے معرکتہ للارا غزل۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

اس غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک نوحہ ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے۔

ایک اجنبی دیس میں' جہاں ہم مزاج لوگ تھے اور نہ ہم زبان پھر بھی پابندیوں کا سیل گراں بار تھا۔ کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسی حالت میں انہیں صرف ایک ہی کام تھا۔ دل کے پھپھولوں کو کاغذ پر منتقل کرتے رہنا یا پھر بیتے ہوئے ایام کو یاد کرنا۔

یہ جانو اپنی ظفر کہانی کہے ہے اوروں کی داستاں میں
سنو اگر اس اسیر غم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا

رفتہ رفتہ اسی غور و فکر کا نتیجہ ظاہر ہونا شروع ہوا اور پھر ایک روز بیماری کا شدید حملہ ہوگیا۔ ان پر شدید بے ہوشی کا دورہ پڑا تیمور کے وارث کو بابر و اکبر کے جانشین کو ہوش میں لانے کے لیے اس گھر میں لخلخا تو دور رہا' معمولی سی دوا بھی نہ تھی۔ مٹی کے مٹکے میں پانی تھا۔ زینت محل نے اسے ہی چلو میں لے کر چھڑکنا شروع کردیا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی۔ صبح فرنگیوں کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے ایک ڈاکٹر کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد بتایا کہ ان کے حلق پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ یہ مرض ایسا نہ تھا کہ معمولی دواؤں سے دور ہوجاتا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی گئی۔ بالآخر 7 نومبر 1862ء کو موت نے انہیں ہمیشہ کے لیے قید سے چھٹکارا دلا دیا۔

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

فرار

سید احتشام

گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ہر جانب گولہ و بارود کی بارش تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دونوں جانب کی فوجیں خندقوں سے نکل آئی تھیں اور ہر طرف کشتے کے پشتے لگ رہے تھے۔ لاشوں سے میدان اٹ گیا تھا۔ اتحادی فوج کی فتح قریب تھی کہ دشمنوں کو نئی کمک مل گئی اور نقشہ بدل گیا۔ تمام فوج گرفتار ہوگئی جس میں ایک جنرل بھی تھا مگر جنرل نے جب چال چلی تو دنیا حیران رہ گئی۔

ایام جنگ کی حیران کن یادیں

1940 کا سال یورپ میں نازی فتوحات کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ 1939ء میں شروع ہونے والی جنگ عظیم کے شعلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے مغربی یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جرمنوں نے پہلے اپنے پڑوسی ممالک پر حملہ کیا اور یکے بعد دیگرے انہیں فتح کرتا چلا گیا۔ جرمنوں کی یورش اتنی تیز اور بھرپور تھی کہ یورپی طاقتیں ششدر رہ گئیں اور اسی حیرت کے عالم میں ایک ایک کرکے جرمنی کے قدموں میں ڈھیر ہوگئیں۔ ان میں

فرانس جیسی بڑی طاقت بھی شامل تھی۔

دیکھا جائے تو نوآبادیات کی دوڑ میں برطانیہ کے بعد فرانس ہی کا نمبر آتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے نمبر پر ڈچ اور پرتگالی ہیں۔ فرانس نے خاص طور سے افریقا اور مشرق وسطیٰ میں بڑے ممالک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ مشرق بعید میں بھی فرانسیسی استعمار کے پنجے گڑ گئے تھے۔ اس کی فوج بے حد تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس تھی۔ جنگ عظیم اوّل میں فرانس، برطانیہ اور امریکا کا اتحادی تھا۔ جرمنوں کی شکست کے بعد اس پر سخت اور ذلت آمیز شرائط عائد کرنے میں فرانس پیش پیش تھا۔ بعد میں جب ان شرائط کے ردِعمل میں جرمنی نازی ازم کی طرف مائل ہوا تو سب بڑی طاقتوں نے جنگ کے خطرے کے پیشِ نظر جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ان میں فرانس بھی تھا۔ اس نے جدید اسلحے سے لیس گیارہ لاکھ تربیتی فوج کی مدد سے ایسی دفاعی لائنیں تیار کی تھیں جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ ناقابل شکست ہیں۔

مگر جب جرمنوں کے مشینی دستوں نے یلغار کی تو بے حد مضبوط مورچے دیکھتے ہی دیکھتے سرنگوں ہو گئے تھے۔ جرمنوں نے اتنی تیزی سے فتوحات حاصل کیں کہ فرانسیسیوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ان کے ناقابل شکست ہونے کا بھرم ان کے مورچوں کی طرح ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ جرمنوں نے انہیں کچل کر رکھ دیا تھا۔

10 مئی 1940ء کے گرم دن جرمن جنگل افواج نے لاکلیلیٹ کے علاقے دوداز میں فرانسیسی فارورڈ مشین گن پوسٹ پر حملہ کر دیا۔ مارٹر کے بھرپور حملوں کے بعد جرمن کمانڈر نے بچ جانے والے فرانسیسیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔

مارٹرز کے تیز، شدید اور تابڑ توڑ حملوں نے مشین گن مورچے کو تباہ کر دیا تھا اور اب وہاں ہر طرف فرانسیسی سپاہیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے اور زندہ بچ جانے والے آنے والے لمحات سے خوف زدہ تھے۔ جب جرمنوں نے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو فرانسیسی دستے نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اسے مان لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ بصورت دیگر مارٹر باری ان کا خاتمہ کر دے گی۔ فرانسیسی سپاہیوں کو اپنی نہیں بلکہ سرمئی مونچھوں والے چھ فٹ قامت کے جنرل ہنری جیراڈ کی فکر تھی۔ وہ ان کے مورچوں کا معائنہ کرنے آیا تھا اور جب جرمنوں نے حملہ کیا تو اسے بچنے کا اور مورچے سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ وہ بھی جرمنوں کے ہاتھوں فرار ہو گیا۔ قیدیوں کے معائنے کے لیے آنے والے جرمن آفیسر نے جب ایک فائیو اسٹار جنرل کو قیدیوں میں پایا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

''جنرل سر.... ! مجھے آپ سے ملاقات کر کے بے حد خوشی ہوئی۔'' اس نے فرانسیسی جنرل کو سیلیوٹ کیا۔

جیراڈ نے سیلیوٹ کا جواب دیا مگر کوئی جملہ کہنے سے گریز کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے جرمن کمانڈر کو علم نہیں تھا کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے جب کہ وہ جرمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہ موقع آیا تھا۔ جنگ عظیم اوّل میں جب وہ کیپٹن تھا، اس وقت بھی وہ گرفتار ہوا تھا اور اس نے قید کاٹی تھی۔ آج تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں فرانس کی مشہور زمانہ ''میشر ینو'' دفاعی لائن پر ایک حملے کے دوران کیپٹن جیراڈ شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کی کمپنی کے بیشتر افراد مارے جا چکے تھے اور بچے کچھے جرمنوں کے قیدی بن گئے تھے۔ ان میں کیپٹن جیراڈ بھی شامل تھا۔ اسے بیلجیم کے علاقے بنے ورپ کے نزدیک قائم کیے جانے والے جنگی کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ اس وقت جنگی قیدیوں کے حقوق کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ جرمن قیدیوں پر بہیمانہ تشدد کرتے تھے۔ انہیں فوجی عدالتوں کے ذریعے سزائیں دی جاتی تھیں اور انہیں وکیل کرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ کیپٹن جیراڈ کو معلوم تھا کہ اس کے زخم بھرتے ہی اسے کسی نام نہاد عدالت میں پیش کر دیا جائے گا اور اسے سزائے موت سنا دی جائے گی۔ گرفتاری کے وقت اس نے مزاحمت کرتے ہوئے دو جرمن سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جرمنوں کے نزدیک اس کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے اس پر خاصا تشدد کیا تھا اور جرمن پہریدار اسے آئے دن دھمکاتے رہتے تھے کہ ذرا اس کے زخم اچھے ہو جائیں پھر وہ اسے دیکھ لیں گے۔

اس کی عافیت اسی میں تھی کہ برا وقت آنے سے پہلے ہی وہ فرار ہو جائے۔

☆☆☆

جنرل ہنری جیراڈ کے خیال میں فرانس کو دفاع کے بجائے جارحانہ قدم اٹھانا چاہیے تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ ملک کے حکمراں اور فوجی افسران، ہٹلر سے بے حد خوف زدہ تھے۔ انہوں نے صرف دفاع پر زور دیا اور جرمنوں نے ان کے دفاع کو روند کر رکھ دیا۔ اس موقع پر برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے عقل مندی کی اور فرانس میں سے اپنی فوج کا بڑا حصہ نکال لیا۔ یہ تین لاکھ اسّی ہزار سپاہی بچا کر اس نے آنے والے دنوں میں اتحادیوں کی فتح کی بنیاد رکھی۔ جرمنوں سے جنگ میں آزمودہ ان سپاہیوں نے ڈنکرک کے محاذ پر حیران کن پیش قدمی کر کے اپنی ذلت اور مزید پسپائی کا ازالہ کر دیا تھا۔

فرانس پر جرمنوں کی فاتحانہ یلغار نے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔ جب جرمنوں نے آرڈینس کے جنگلات سے نکل کر پیش قدمی کی تو جنرل جیراڈ کو خود محاذ پر جانا پڑا۔ وہ حیران تھا کہ جرمن اتنے سخت مورچے کس طرح آسانی سے فتح کر رہے تھے۔ اس موقع پر اس نے خود جرمنوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ جرمنوں نے پہلے توپ خانے سے حملہ کیا، پھر مارٹروں اور ہلکے ہتھیاروں سے فائرنگ کی۔ انہوں نے فرانسیسیوں کو مورچوں سے سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ اسی دوران ان کے مشینی دستے اور ان کی آڑ میں پیدل دستے پیش قدمی کرتے رہے تھے۔ محض دو گھنٹے میں انہوں نے دس میل تک پیش قدمی کی تھی اور یہ کوئی آسان محاذ نہیں تھا۔ یہاں فرانسیسیوں نے قدم قدم پر مورچے بنا رکھے تھے، بارودی سرنگیں بچھا رکھی تھیں اور خاردار تاروں کی باڑیں لگا رکھی تھیں۔

☆......☆

جنرل جیراڈ اس وقت فارورڈ مشین گن پوسٹ کے دورے پر تھا جب جرمن اس جگہ آن پہنچے اور انہوں نے حسب معمول برق رفتار کارروائی کر کے مورچے پر قبضہ کر لیا۔ جرمن ہائی کمان کے لیے جنرل جیراڈ کی گرفتاری بہت بڑی خبر تھی۔ برلن سے فوری حکم آیا کہ جنرل کو جرمنی روانہ کر دیا جائے۔ اس سے پہلے کہ فرانسیسی فوج یا حریت پسند اسے آزاد کرانے کے لیے کوئی کارروائی کرتے، جنرل کو ایک طیارے میں جرمنی کے سرحدی علاقے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وہاں سے اسے بذریعہ سڑک جرمنی کے مشہور قلعے کونگسٹن کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اس تاریخی مقام کو اسی کے لیے جنگی قید خانہ قرار دے دیا گیا۔ وہ اس جگہ واحد جنگی قیدی کی حیثیت سے آیا تھا۔ جرمنوں کے اتحادی کمانڈرز کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ حملہ کر کے جنرل کو رہا کرانے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے قلعے کی حفاظت کے لیے سخت ترین انتظامات کر رکھے تھے۔ جرمنوں کی خاص فوج ایس ایس کا ایک دستہ قلعے کی نگرانی کر رہا تھا۔ ڈھائی سو اعلیٰ ترین تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ اندر باہر کے راستے پر دوگنے گارڈز تھے۔ قلعہ کی چھت پر دور مار طیارہ شکن توپیں نصب تھیں تاکہ حملہ کرنے والے اتحادی طیاروں کو مار بھگایا جائے۔ قلعہ بلند چٹانوں پر قائم تھا۔ جنرل کو جس حصے میں رکھا گیا تھا اس کی بالکونی سطح زمین سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ بلند تھی۔ اس جگہ بلند اور سیدھی چٹانیں تھیں جن سے اترنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

خلاف توقع جرمنوں نے جنرل سے عمدہ سلوک کیا تھا۔ اس سے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس سے معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ البتہ کئی دن تک گسٹاپو کے افسران اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ جنرل نے ان کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا جس سے اس کی شخصیت پر حرف آتا۔ جرمنوں نے اسے قلعے کے جنوبی حصے میں چٹانوں کے بالائی ٹیرس میں رکھا تھا۔ اس کے کمرے کے ساتھ ہی وسیع و عریض بالکونی تھی۔ یہاں سے نیچے کا منظر صاف نظر آتا تھا بلکہ قلعے کے نچلے حصے میں گشت کرنے والے محافظوں کو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر سخت ترین پہرہ تھا۔ جرمنوں نے اسے ایسی کوئی شے نہیں دی تھی جس کی مدد سے وہ بالکونی سے اتر کر فرار ہو جاتا۔ جنرل کے خیال میں اس کا قلعے سے فرار مشکل تھا۔ کم از کم شروع میں اس کا یہی خیال تھا۔

مگر جلد ہی جنرل کو اپنا خیال بدلنا پڑا تھا۔ جرمنوں کے رویے میں تبدیلی آ رہی تھی۔ جیسے جیسے ان کی افواج فرانس پر قابض ہوتی جا رہی تھی ویسے ویسے جنرل کے ساتھ ان کا رویہ درشت ہو رہا تھا۔ اب وہ اس پر دباؤ ڈالنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر تشدد کرتے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اسے یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔ سب سے پہلے اس نے جرمن رواں کرنے کی طرف توجہ دی۔ خوش قسمتی سے اس کی جرمن پہلے ہی بہت اچھی تھی۔ بس لب و لہجے کا فرق تھا۔ وہ اپنے پہریداروں کے ساتھ جرمن میں گفتگو کرتا تھا اور بعد میں تنہائی میں ان کے کہے جملوں اور الفاظ کو جرمن لہجے میں دہرایا کرتا تھا۔ البتہ سنتریوں سے بات کرتے ہوئے وہ اپنا لہجہ فرانسیسی ہی رکھتا تھا۔

☆......☆

وہ ایک بار پہلے بھی جرمنوں کی قید سے فرار ہو چکا تھا مگر

اس وقت وہ جوان تھا اور اس میں اتنی ہمت اور توانائی تھی کہ زخمی ہونے کے باوجود فرار کی صعوبتیں برداشت کر سکے۔ اب وہ اکسٹھ برس کا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں خفیف سی لنگڑاہٹ آ گئی تھی۔ اس کی توانائیوں میں بھی خاصی کمی واقع ہوئی تھی مگر اس کا حوصلہ بدستور جوان تھا۔ اس نے فرار کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

جنرل جیراڈ کو جرمنوں نے جو سہولتیں دے رکھی تھیں، ان میں ڈاک کی سہولت بھی تھی۔ وہ فرانس اور دنیا بھر میں اپنے پیاروں اور عزیزوں کو خط لکھ سکتا تھا اور ان کے آنے والے جواب سنسر کے بعد اس تک پہنچا دیے جاتے تھے۔ ڈاک کے ذریعے ہی فرانس اور دنیا کے دیگر حصوں سے اس کے رشتے دار، دوست، احباب اسے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ ان میں خاص طور سے کھانے پینے کی اشیاء اور عام استعمال کی دوسری اشیاء ہوا کرتی تھیں جیسے ریزر یا شیمپو۔

جنرل کی حیثیت سے اسے کریپٹوگرافی کی تربیت دی گئی تھی۔ اس نے اپنے جاننے والوں کو اور بیوی کو جو خطوط لکھنا شروع کیے ان میں اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے خفیہ الفاظ میں اپنے فرار کا منصوبہ اپنے دوستوں تک پہنچانا شروع کر دیا تھا تاکہ وہ اس کی مدد کر سکیں۔ اسے ایک رین کوٹ اور ایک ٹرانگون ہیٹ کی ضرورت تھی۔ قید میں اسے جو لباس دیا گیا تھا وہ اس کے فوجی یونیفارم سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی نیلے رنگ کا کوٹ اور سفید پتلون۔ اس لباس میں فرار ہونے کے چند گھنٹے کے اندر اندر وہ پکڑا جاتا۔ اس کے علاوہ اسے شناختی کاغذات اور جرمن کرنسی کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر وہ جرمنی کی حدود میں نقل و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆

جنگ سے پہلے ہی ہٹلر کی خفیہ پولیس گسٹاپو نے جرمنی میں نگرانی کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ کوئی جرمن باشندہ چاہے وہ کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو، اس جال سے گزرے بغیر چند کلومیٹر کا سفر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہر شخص کے پاس شناختی کارڈ کا ہونا ضروری تھا اور اگر کوئی شخص بغیر کاغذات کے پایا جاتا تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اسے کڑی پوچھ گچھ سے گزارا جاتا تھا۔ بغیر مکمل تسلی کے اسے رہا نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی جاسوسی کے لیے پورے ملک میں گسٹاپو کے کئی لاکھ ایجنٹ پھیلے ہوئے تھے جو ہر مشکوک فرد پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ جنگ کے دوران جاسوسی کے اس نظام میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ عام افراد بھی جاسوسی کے فرائض انجام دینے پر مجبور تھے۔ انتہا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے جاسوسی کا کام لیا جاتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی نگرانی کرتے تھے اور اس کی رپورٹ اسکول میں اساتذہ کو دیا کرتے تھے۔

تقریباً چھ مہینے کے عرصے میں جنرل جیراڈ کے فرار کا منصوبہ طے پا گیا۔ فرانس کی تحریک آزادی اور اتحادیوں نے اس سلسلے میں ایک مکمل منصوبہ جنرل تک پہنچا دیا کہ اسے کس طرح اپنے فرار کو کامیاب بنانا ہے۔ منصوبے کے ساتھ ہی اس کے دوستوں نے اسے سامان بھی پہنچانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اسے رین کوٹ اور اس میں ٹرانگون ہیٹ بھیجا گیا۔ اس قسم کا لباس جرمنی میں عام استعمال ہوتا تھا۔ اسے پہن کر وہ کسی جرمن سے مختلف نہ لگتا۔ اس کی شکل و صورت بھی کسی حد تک جرمنوں سے ملتی تھی۔ پھر اسے ایک کیک میں چھپا کر سب سے ممنوعہ شے بھیجی گئی، یعنی ریزر بلیڈ۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے جرمن نگرانوں نے نہ صرف اس کے خط و کتابت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے لیے جو سامان آ رہا تھا اسے بھی بغیر چیک کیے اسے دے دیا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ قلعے کا کمانڈر ایک نااہل شخص تھا۔ اسے جنرل کی جتنی سخت نگرانی کرنی چاہیے تھی اس نے نہیں کی۔

جنرل نے فرار کے لیے رات کے بجائے دن کا انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ صبح اسے ناشتا پہنچانے کے بعد مزید چار گھنٹے تک کوئی اس کی طرف نہیں آتا تھا اور اسے پوری آزادی حاصل ہوتی تھی جبکہ رات کو ہر نصف گھنٹے کے وقفے سے کوئی نہ کوئی شخص اس کے کمرے میں جھانکنے ضرور آتا تھا۔ اس کے فرار کا راز فوراً فاش ہو جاتا اور وہ اس جگہ سے زیادہ دور جانے سے پہلے ہی گرفتار ہو جاتا۔ اس لیے فرار کے لیے دن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ دن میں عام نقل و حرکت ہونے کی وجہ سے جاسوس یا پولیس والے خاص طور سے اس پر توجہ نہ دیتے لیکن رات میں وہ خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتا اور اس سے لازماً پوچھ گچھ بھی ہوتی۔

☆......☆

17 اپریل 1942ء کی صبح جنرل جیراڈ بالکونی میں کھڑا ایک سو پچاس فٹ نیچے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر قلعے کے بیرونی راستوں پر گشت کرنے والے سنتریوں کو دیکھا۔ وہ ہر چار منٹ میں ایک چکر لگاتے تھے۔ اس طرح کہ ایک منٹ تک وہ جنرل کی نظروں میں رہتے تھے۔ لازمی بات تھی کہ اس دوران جنرل بھی ان کی نظروں میں رہتا تھا۔ گویا اس کے پاس تین منٹ تھے۔ اس نے اپنی پشت پر ایک پیک باندھ رکھا تھا۔ اس میں اس کا رین کوٹ اور ٹرانگون ہیٹ تھا۔ لنچ کے لیے بسکٹ اور چاکلیٹ تھے، اس کا ریزر تھا۔

جیسے ہی وہ سنتری نگاہوں سے اوجھل ہوئے، اس نے پھرتی سے تانبے کی تار نیچے گرائی، اسے مضبوطی سے بالکونی کی ریلنگ سے باندھا اور سنتریوں کے آنے سے پہلے ہی نیچے اتر گیا۔ رگڑ سے بچنے کے لیے اس نے دستانے پہن لیے تھے۔ اس کے باوجود تار کی رگڑ نے اس کی ہتھیلیوں کو زخمی کر دیا مگر جان کے مقابلے میں یہ معمولی زخم کچھ بھی نہیں تھے۔ زمین پر اترتے ہی اس نے نزدیکی درختوں میں جا کر سب سے پہلے اپنی مونچھیں صاف کیں جو ایک طرح سے اس کا شناختی نشان تھیں۔ جلد کی سفیدی ختم کرنے کے لیے اس نے اپنے پاس موجود زیتون کا تیل مل لیا۔ پھر کپڑے بدلے۔ نیلا کوٹ اتار کر اس کی جگہ رین کوٹ پہن لیا اور سر پر ٹرانگون ہیٹ رکھ کر وہ قطعی طور پر ایک جرمن باشندہ نظر آنے لگا تھا۔ لیکن جرمن نظر آنا کافی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بھی کامیاب فرار کے لیے اسے بہت کچھ درکار تھا۔ حلیہ بدل کر اس نے مخصوص سمت میں دوڑنا شروع کر دیا۔ اس پورے علاقے کا نقشہ وہ پہلے ہی ازبر کر چکا تھا۔

پیر میں لنگ کے باوجود اس نے اگلے دو گھنٹے میں پانچ میل کا فاصلہ طے کیا اور ''بینڈ شونڈو'' کے پاس موجود پل تک جا پہنچا۔ قلعے میں قید کے دوران اس نے ورزشیں کر کے اپنی صحت کو برقرار رکھا تھا لہٰذا پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے میں اسے قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ پل کے نیچے کی دیوار کے تلے پُرسکون انداز میں ستاتے ہوئے اس نے اپنا لنچ مکمل کر لیا۔ اب اسے کسی کا انتظار تھا۔ اس کے دوستوں نے جو منصوبہ اس تک پہنچایا تھا اس کے مطابق ایک شخص کو اس کے پاس آنا تھا اور اسے ایک سوٹ کیس دینا تھا جس میں اس کے شناختی کاغذات، ایک عدد سوٹ اور کچھ کرنسی کے علاوہ صنعتی مصنوعات کے چند نمونے بھی ہوتے۔ دراصل اب اسے ایک جرمن صنعت کار کے روپ میں آگے سفر کرنا تھا۔

ایک بجے ٹھیک وقت پر اسے نیچے پگڈنڈی سے ایک نوجوان جرمن ہاتھ میں سرمئی رنگ کا لیدر سوٹ کیس لیے نظر آیا۔ نشانیاں مکمل تھیں لیکن جنرل کے دل میں خدشہ تھا کہ کہیں یہ اس کی دوبارہ گرفتاری کے لیے کوئی چال نہ ہو۔ نوجوان نزدیک آیا تو اس نے اپنا ریزر مضبوطی سے انگلیوں میں تھام رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ جرمنوں کے ہاتھ آنے کے بجائے وہ خودکشی کو ترجیح دے گا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق نوجوان کو اس سے کوئی بات کیے بغیر سوٹ کیس اس کے پاس رکھ کر چلے جانا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا جب نوجوان نے ایسا ہی کیا۔

اس نے سوٹ کیس اٹھایا اور پل پر آ کر اس نے آنے والی پہلی بس میں جگہ حاصل کی اور ریلوے اسٹیشن سے ذرا پہلے اتر گیا۔ اس نے بکنگ سے جا کر فرانس تک کا ٹکٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے ٹرین کے آنے تک کا وقت ایک نسبتاً تاریک گوشے میں اخبار پڑھتے ہوئے گزارا۔ ٹرین کے آتے ہی وہ اس میں سوار ہو گیا۔ سب سے پہلے وہ سوٹ کیس سمیت لیوٹری میں گیا۔ وہاں اس نے اپنے کاغذات نکال کر غور سے دیکھے۔ ان پر اس کی صورت سے ملتی جلتی بغیر مونچھوں کی ایک تصویر تھی۔ کاغذات ہر لحاظ سے مکمل تھے سوائے تصویر کے۔ اگر کوئی ایجنٹ بغور اس کی صورت اور تصویر کا موازنہ کر لیتا تو اس کی چالاکی پکڑ لیتا۔ اس نے کاغذات کے مطابق اپنا حلیہ درست کیا اور جب لیوٹری سے برآمد ہوا تو وہ ایک معزز عمر رسیدہ جرمن بزنس مین نظر آ رہا تھا۔

☆......☆

جنرل جیراڈ کے فرار کا راز کھلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ جرمن کے حکومتی ایوان میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ ہٹلر نے خود قلعے کے کمانڈر کو معطل اور گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ پورے ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جگہ جگہ ناکہ بندی ہونے لگی تھی اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بات جرمنی کی جگ ہنسائی کا باعث بن جاتی کہ ایک نامور جنرل ان کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔

ہنری جیراڈ جانتا تھا کہ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ مستقل سفر کرتا رہے حتیٰ کہ فرانس کی سرحد میں داخل ہو جائے۔ ٹرین نے فرانس کی سرحد کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔ جب جیراڈ ٹرین میں سوار ہوا تو اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان جرمن لیفٹیننٹ بیٹھا ہوا تھا جو افریقا کے محاذ سے چھٹی گزارنے وطن واپس آیا تھا۔ وہ جیراڈ کو دیکھ کر مسکرایا۔

’’ہیل ہٹلر۔‘‘ اس نے کہا۔
’’ہیل ہٹلر۔‘‘ جیراڈ نے دل پر جبر کر کے جواب دیا۔ حالانکہ اسے اس نعرے سے سخت نفرت تھی۔
’’میں افریقا سے آیا ہوں۔‘‘ نوجوان لیفٹیننٹ نے بتایا۔ ’’وہاں میں ایس ایس کے دستوں میں شامل تھا۔‘‘
جنرل جانتا تھا کہ جرمنی میں بلیک شرٹ کی عرفیت سے مشہور یہ خاص فوجی دستے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ ان میں چن چن کر صرف ہٹلر کے وفاداروں کو لیا جاتا تھا۔ پھر ان کو کڑی جانچ سے گزار کر فورس میں شامل کیا جاتا تھا۔ ان کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔ ان کی سیاہ وردی ہی ان کی شناخت تھی۔ اس کے بعد ان کے حکم سے سرتابی کی کسی میں مجال نہ ہوتی تھی۔ انہیں اختیار حاصل تھا کہ بغیر وجہ بتائے کسی بھی شخص کو گرفتار یا قتل کر سکتے تھے۔ ایس ایس کے اس نوجوان کی صورت میں جنرل کو ایک پناہ گاہ مل گئی تھی۔ بہ شرطیہ کہ وہ اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس نے فوراً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔
’’واہ، کیا بات ہے افریقا کی۔‘‘ وہ بولا۔ ’’میں نے وہاں کئی سال گزارے ہیں۔‘‘
’’اچھا۔‘‘ نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔
دونوں فوراً ہی بے تکلف ہو کر افریقا اور صحرا کے قصے چھیڑ بیٹھے۔ دونوں ہی کو صحرا سے محبت تھی۔ جنرل نے اپنی عمر کے کئی سال شمالی افریقا کے صحراؤں میں گزارے تھے۔ وہ ان کے چپے چپے سے واقف تھا۔ بعد میں یہی صحرا جنرل رومیل کی رزمگاہ بنتے تھے۔ اس نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ جنرل کو یہ سارے واقعات بھی معلوم تھے۔ اس نے نوجوان کو بتانا شروع کر دیا کہ کس طرح افریقا کے صحرا میں رومیل نے برطانوی افواج کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا بیان اتنا موثر تھا کہ نوجوان اس میں کھو کر رہ گیا۔ جب گستاپو والے مسافروں کے شناختی کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے اس ڈبے میں آئے تو نوجوان لیفٹیننٹ پوری طرح جنرل کے سحر انگیز اور ولولہ خیز بیان میں کھویا ہوا تھا۔ گستاپو والے باری باری ہر مسافر کے پاس اس کے شناختی کاغذات چیک کرتے تھے اور اس سے سوالات کرتے تھے۔
جنرل دیکھ رہا تھا کہ گستاپو کے ایجنٹ رفتہ رفتہ اس کے نزدیک آتے جاتے رہے تھے لیکن وہ بظاہر ان کی آمد سے بے خبر اپنی داستان سنانے میں معروف تھا۔ اس کی کہانی کے سحر میں کھوئے ہوئے نوجوان لیفٹیننٹ کا چہرہ مارے جوش کے تمتما رہا تھا اور اس کے ہاتھ سختی سے سیٹ پر جمے ہوئے تھے۔
گستاپو کے ایک ایجنٹ نے جنرل کا شانہ ہلایا۔ ’’جناب اپنے شناختی کاغذات دکھائیں۔‘‘
جنرل جیراڈ نے یوں چونک کر اس کی جانب دیکھا جیسے اس کی مداخلت پسند نہ آئی ہو۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘
’’اپنے کاغذات دکھائیں۔‘‘
اسی اثنا میں نوجوان لیفٹیننٹ کہانی کے سحر سے چونکا تھا۔ اس نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گستاپو کے اس ایجنٹ کی طرف دیکھا اور دہاڑا۔
’’دفع ہو جاؤ۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہمارے درمیان میں آنے کی۔‘‘
گستاپو کا ایجنٹ بوکھلا گیا۔ ایس ایس کے کسی آدمی سے الجھنا اپنی شامت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس نے جھک کر جلدی سے معذرت کی۔ ’’معافی چاہتا ہوں جناب۔‘‘
نوجوان لیفٹیننٹ نے اسے جاتے ہوئے روکا۔ ’’اب کوئی بھی مجھے اور ان معزز صاحب کو پریشان نہ کرے۔ ہم ضروری بات کر رہے ہیں۔‘‘ اس نے تنبیہ کرنے والے لہجے میں کہا۔
’’آپ بالکل بے فکر رہیں جناب۔ اب کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔‘‘
اس کے جانے کے بعد جنرل نے سکون کا سانس لیتے ہوئے نوجوان کو اپنی کہانی سنانا جاری رکھا مگر یہ ساتھ زیادہ دیر کا نہ تھا۔ اس سے اگلے اسٹاپ پر جنرل کو دوسری گاڑی پکڑنی تھی۔ نوجوان لیفٹیننٹ نے بادل نخواستہ اسے رخصت کیا۔ اس نے اسے اپنا پتا دیا اور وعدہ کیا کہ وہ اسے خط لکھے گا۔ شکر ہے اس نے جنرل کا پتا نہیں مانگا تھا ورنہ اس کے لیے مشکل ہو جاتی۔ جب دوسری ٹرین آئی جسے فرانس کی طرف سفر کرنا تھا تو جنرل نے دیکھا کہ اس میں سوار ہونے والے مسافروں کی کڑی جانچ پڑتال ہو رہی تھی اور ان کے کاغذات بہت باریک بینی سے چیک کیے جا رہے تھے۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔
جنرل جانتا تھا کہ گستاپو دنیا کی سفاک ترین اور مستعد ترین خفیہ پولیس تھی۔ اس کے ایجنٹ اتنی آسانی سے دھوکا نہیں کھاتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آخری لمحے میں

ماہِ فروری 2018ء کے دل کش شمارے کی حسین جھلکیاں

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
رفعت سراج اور شیریں حیدر کے مسلسل ناول کی نئی چونکا دینے والی اقساط
حیا بخاری کے سلسلے وار ناولٹ...... محبت لفظ ہے لیکن... میں دیکھیے کردار نگاری کے حسین جوہر
ناہید سلطانہ اختر کے مشاق قلم کا شاہکار افسانہ...... چاک چاک قبائے دل
فرحین اظفر...... عورت کہانی میں ایک نہایت حساس موضوع لیے حاضر ہیں
روشنی عبد القیوم کا مکمل ناول...... میرا عشق صوفیانہ
کردار سازی اور روح کی بالیدگی کا اہتمام لیے
ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت
کے ایمان افروز کالم
شائستہ زریں نے مہمان بلایا شہزاد شیخ اور ان کی وکیل ہم سفر کو
اس کے علاوہ
مایہ ناز قلم کاروں کی دل کو چھو جانے والی بہترین تحریریں جن میں عقیلہ حق، طیبہ عنصر مغل، بشریٰ سیال، ہما بیگ، ماہ وش طالب، نزہت جبیں ضیا، حرا قریشی، صدف آصف و دیگر مصنفات شامل ہیں۔
اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگا رنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ......

ٹرین پر سوار ہوگا۔ لہٰذا جب انجن نے وسل دی اور ٹرین نے حرکت شروع کی تو جنرل آخری ڈبے کی طرف بھاگا۔ بڑھاپے اور ٹانگ میں کمزوری کے باوجود اس کی رفتار حیران کن تھی۔ وہ ایک ایسا بزنس مین نظر آنے کی پوری کوشش کررہا تھا جسے اس ٹرین کے ذریعے کہیں پہنچنا لازمی تھا ورنہ اس کا بہت نقصان ہوجاتا۔ اس کی اداکاری اتنی شاندار اور بھرپور تھی کہ کسی نے اس کا راستہ روکنے یا اس کے کاغذات طلب کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ حقیقت تھی کہ گسٹاپو کے ایک ایجنٹ نے اس عمر رسیدہ بوڑھے اور معزز نظر آنے والے بزنس مین کو ٹرین میں سوار ہونے میں مدد کی تھی۔

ٹرین میں سوار ہوکر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا لیکن ابھی آگے مشکل مراحل باقی تھے۔ برلن ایکسپریس فرانس کی سرحد پر پہنچی تو جنرل نے دیکھا کہ گسٹاپو کے حکام تمام ایسے افراد کو ایک طرف کررہے تھے جن کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ جنرل کو بھی روکا جاتا اور کڑی جانچ پڑتال کے بعد اس کا راز فاش ہونے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ چنانچہ اس نے وہیں سے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ خوش قسمتی سے صرف فرانس میں داخل ہونے کے خواہش مند افراد کو تفتیش سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے واپسی کی ٹرین پکڑی اور پھر سے جرمنی کی طرف سفر شروع کردیا۔ واپسی پر گسٹاپو کے ایجنٹس نے بھی اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

اب جنرل نے فیصلہ کیا کہ اسے سوئٹزرلینڈ کی طرف جانا چاہیے۔ اسے امید تھی کہ جنگ میں غیر جانبدار ہونے کی وجہ سے جرمن سوئس سرحد کی اتنی سختی سے نگرانی نہیں ہورہی ہوگی۔ اس کی واحد امید اب یہی سرحد رہ گئی تھی۔ وہ مسلسل چوبیس گھنٹے سے سفر میں تھا اور اسی وجہ سے اب تک محفوظ تھا۔ اگر وہ راستے میں کسی اسٹیشن پر اترنے کی کوشش کرتا تو اسے لازماً کاغذات دکھانے پڑتے۔ سوئس سرحد کے پاس وہ ایک غیر معروف ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ اس نے ایک دن ہوٹل میں گزارا۔ اس علاقے میں جنگی سرگرمیاں نہ ہونے کے باعث گسٹاپو کے ایجنٹ بھی اتنے مستعد نہیں تھے۔ کسی نے اس پر شک نہیں کیا۔ اگلے روز جب اس نے سرحد کا معائنہ کیا تو اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہاں بھی جرمنوں کی سرحدی پولیس کا اتنا ہی سخت پہرا تھا جتنا دوسری سرحدوں پر تھا۔

☆......☆

سوئس سرحد پر بے شمار پہاڑی راستے تھے۔ جرمن ہر جگہ پہرا نہیں لگا سکتے تھے۔ جنرل نے اس علاقے کا نقشہ حاصل کیا اور خاصے غور و فکر کے بعد اس نے ایک راستے کا انتخاب کیا۔ یہ بے پناہ دشوار گزار تھا جو دس ہزار فٹ تک بلند راستوں سے گزرتا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے پہاڑی علاقے میں سفر کرنے کے لیے جوتے اور سامان حاصل کیا۔ ان کے بغیر اس علاقے میں سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ اس نے گرم کپڑے اور خشک گوشت بھی ساتھ لیا۔

اس مرتبہ بھی اس نے دن کے وقت کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے خود کو ہائکنگ کا شوقین ظاہر کیا تھا۔ اس نے پرائیویٹ کار میں سرحد تک سفر کیا اور وہاں سے آگے پیدل روانہ ہوگیا۔ اکسٹھ برس کی عمر اور پاؤں میں کمزوری کے باعث یہ سفر اس کے لیے آسان نہ تھا۔ بعض مقامات پر تو اسے باقاعدہ کوہ پیمائی کرنی پڑی۔ متعدد مقامات ایسے تھے کہ ذرا سا پاؤں پھسلتا اور وہ کئی ہزار فٹ نیچے جا گرتا۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر برف شروع ہوگئی۔ یہ موسم گرما کی پگھلتی ہوئی برف تھی جس پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ ایک جگہ اسے صرف سو فٹ کا فاصلہ طے کرنے میں پورے دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ لیکن رات ہونے سے پہلے ہی وہ درّے کی بلندی تک جا پہنچا تھا۔ یہاں اس نے جھاڑیاں جلا کر رات گزاری۔ مارے تھکن کے اس کا برا حال تھا مگر سفر کا خطرناک حصہ ابھی باقی تھا۔

اگلے روز سورج نکلنے کے ساتھ ہی اس نے ناشتا کرکے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ اب وہ نیچے کی طرف آرہا تھا۔ یہ سفر چڑھنے سے زیادہ دشوار تھا۔ اس کی توانائی کم ہورہی تھی۔ اگر اس میں ہمت نہ ہوتی تو وہ اب تک کسی کھائی میں گر چکا ہوتا۔ چٹانوں پر سے اترتے ہوئے اس کے پیر کانپنے لگے تھے۔ ہر چند سو گز کے بعد اسے رک کر اپنا سانس بحال کرنا پڑتا تھا۔ اس کے پاس خوراک ختم ہوگئی تھی۔ پینے کا پانی ختم ہوا تو اس نے برف چوسنا شروع کردی۔ چٹانوں پر چڑھتے ہوئے اس کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ جوتے کے تسمے نکل گئے تھے۔

اتنی مشکلات کے بعد نقشے کے مطابق وہ اب بھی جرمنی ہی میں تھا۔ سوئس سرحد اب بھی خاصے فاصلے پر تھی۔ ایک جگہ وہ کئی گز نیچے اتر کر ایسے مقام پر پہنچا جہاں مزید نیچے جانے کا راستہ ہی نہیں تھا۔ اسے واپس پلٹنا پڑا۔ اوپر جاکر اس نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ دوپہر تک اسے لگ رہا

تھا جیسے اس کے جسم میں طاقت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی ہو۔ وہ جیسے خود بہ خود سفر کررہا تھا۔ اس عالم میں وہ ایسی کئی جگہوں سے گزرا کہ اسے خود بھی بعد میں تعجب ہوا تھا۔

ایک بجے اس نے لنچ میں سوکھے گوشت کا آخری ٹکڑا کھایا اور چٹانوں سے نیچے اترنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے خود کو مسلح فوجیوں کے سامنے پایا۔ ان کی رائفلیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ”ہالٹ۔“ ایک کرخت آواز نے کہا۔ ”کون ہو تم؟“

سوئس زبان سن کر اس نے سکون کا طویل سانس لیا۔ وہ جرمن نہیں تھے بلکہ سوئس سرحدی فوج کے ارکان تھے جو گشت پر تھے۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں فرانسیسی جنرل ہنری جیراڈ ہوں اور جرمنوں کی قید سے فرار ہوکر آیا ہوں۔“

”اب آپ محفوظ ہیں۔“ سپاہیوں نے اسے تسلی دی۔

اس کے چار گھنٹے کے بعد وہ سوئس شہر میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ اس نے وہاں اپنی شناخت کرائی جس کی سوئس حکام نے جرمنی سے تصدیق کی۔ جب جرمنوں کو علم ہوا کہ ان کا مطلوبہ شخص سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا ہے تو انہوں نے فوراً سوئس حکام سے جنرل کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر سوئس حکام نے یہ مطالبہ مسترد کردیا۔ قیدیوں کے قوانین کے لحاظ سے ہر جنگی قیدی کو فرار کا حق تھا اور جنرل نے فرار ہوکر اپنے اس حق کو استعمال کیا تھا۔ ویسے بھی سوئٹزرلینڈ اس جنگ میں غیر جانبدار تھا مگر جنرل جیراڈ کا فرار ابھی نامکمل تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے چاروں طرف کے ممالک پر جرمنی کا قبضہ ہوچکا تھا اور گویا جنرل اب ایک بڑے سے قید خانے میں تھا جس سے نکلنا ضروری تھا اور اسے معلوم تھا کہ اب جرمن سوئٹزرلینڈ کی سرحد کی کڑی نگرانی کریں گے اور اسے آسانی سے جانے کا موقع نہیں دیں گے۔ خوش قسمتی سے سوئٹزرلینڈ میں اس کے ہمدردوں کی کمی نہیں تھی۔ فرانس کے بے شمار حریت پسند جرمنوں سے بچنے کے لیے بھاگ کر سوئٹزرلینڈ آگئے تھے۔ انہوں نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنرل جیراڈ کو فرانس کے آزاد علاقے تک پہنچانے کے لیے پلاننگ شروع کردی۔

سوئٹزرلینڈ سے فرانس تک کئی سڑکیں جاتی تھیں۔ انہی میں سے کسی ایک سڑک سے جنرل کو روانہ کرنا تھا۔ اس کے سوائے کوئی اور تدبیر نہیں تھی۔ غیر جانب دار ملک ہونے کی وجہ سے اتحادی فضائی کارروائی نہیں کرسکتے تھے ورنہ جرمنوں کو بھی مداخلت کا موقع مل جاتا۔ البتہ زیر زمین جوڑ توڑ دونوں طرف سے جاری تھی۔ جرمن اس فکر میں تھے کہ اوّل تو جنرل کو سوئٹزرلینڈ ہی میں اغوا کرلیا جائے ورنہ اسے فرانس جاتے ہوئے راستے میں گرفتار کیا جائے۔

جرمن ایجنٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جنرل جیراڈ کو سوئٹزرلینڈ کے امریکی سفارت خانے میں رکھا گیا تھا۔ وہاں پر حفاظتی انتظامات اتنے سخت تھے کہ جرمن ایجنٹ وہاں گھسنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ جب کہ فرانسیسی سفارت خانہ جرمنوں سے بالکل غیر محفوظ تھا۔ جنرل کے فرار کی خبر نے فرانس کی زیر زمین تحریک میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی اور فرانسیسی فوج کے حوصلے بلند ہوگئے تھے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنی سرزمین پر آکر فوج کی قیادت سنبھال لے۔ خود جنرل اپنے وطن جانے کے لیے بے چین تھا۔

☆......☆

اس وقت ہٹلر نے اپنی زندگی کی فاش غلطی کرتے ہوئے سوویت یونین پر حملہ کردیا تھا۔ جرمن افواج اپنے مخصوص برق رفتار انداز میں روس کی عظیم وسعتوں میں گھستی چلی گئی لیکن ان فتوحات کی قیمت جرمنوں کو مغربی یورپ کے محاذ پر ادا کرنی پڑی تھی۔ اس طرف سے محاذوں سے جرمن افواج میں کمی ہوتے ہی اتحادی افواج اور ان مقبوضہ ممالک کی زیر زمین تحریکوں نے جرمن کے خلاف حملے شروع کردیے تھے۔ جرمنی کی شکست کی بنیاد 1942ء کے موسم گرما میں رکھ دی گئی تھی۔ افریقا میں جنرل رومیل کی قیادت میں جرمنوں نے بڑی فتوحات حاصل کی تھیں لیکن مصر میں برطانوی افواج نے خود کو از سر نو منظم کرکے جوابی حملے میں جرمنوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کردیا تھا۔ اس محاذ پر جنرل رومیل کی واپسی نے بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ہٹلر کی روس پر حملے کی حماقت نے اتحادی ممالک میں امید کی ایک نئی کرن پیدا کردی تھی۔

بالآخر فرانس کی زیر زمین مزاحمت کی تحریک نے جنرل جیراڈ کو سڑک کے راستے فرانس واپس لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سوئس سرحد سے دس اہم سڑکیں فرانس کے مختلف علاقوں تک جاتی تھیں اور ان سب پر جرمنوں نے کڑی نگرانی کے لیے چیک پوسٹیں قائم کررکھی تھیں۔ اور اب انہیں معلوم ہوا کہ جنرل کو واپس فرانس پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے تو انہوں نے سرحد کی نگرانی اور بھی سخت کردی تھی۔ جرمنوں نے کھوج لگالیا تھا کہ جنرل جیراڈ امریکی

سفارت خانے میں روپوش تھا لہٰذا انہوں نے سفارت خانے کی نگرانی شروع کردی۔

دوسری طرف اتحادی جاسوس اور فرانسیسی حریت پسند بھی جرمنوں کی نقل و حرکت سے بے خبر نہیں تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے جنرل کو امریکی سفارت خانے سے اس خوبی سے نکالا کہ جرمنوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جنرل کو فرانس کی سرحد کے پاس ایک سوئس گاؤں میں منتقل کردیا گیا۔

جب جرمنوں کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے اپنے ایجنٹ سرحد کے آس پاس پھیلا دیے تاکہ جنرل کسی بھی صورت فرانس میں داخل نہ ہوسکے اور اگر ہونے کی کوشش کرے تو ان سے بچ نہ سکے۔ دوسری طرف حریت پسند جانتے تھے کہ جرمن ان کے جنرل کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لہٰذا انہوں نے اپنے منصوبے کو زیادہ سے زیادہ فول پروف بنانا شروع کردیا۔ انہوں نے طے کیا کہ ایک کے بجائے کم سے کم دس گاڑیاں روانہ کی جائیں گی اور ان میں سے کسی ایک میں جنرل ہوگا۔ انہوں نے اس کام کے لیے جرمن گاڑیاں حاصل کرنی شروع کردیں۔ ان کے جعلی نمبر پلیٹس اور کاغذات تیار کروائے گئے ساتھ ہی جنرل کے حلیے میں تبدیلی کردی گئی۔ انہوں نے اسے ایک عام سے جرمن سیاح کی حیثیت دے دی جو فرانس کی سیاحت کے لیے جارہا تھا۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں جنرل کو سفر پر روانہ ہونا تھا لیکن عین آخری موقع پر دو بار اس کا سفر ملتوی کردیا گیا۔ آخر 10 جولائی کی صبح جب ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا، جنرل ایک کار میں سوار ہوا۔ یہ مرسڈیز کار تھی۔ جنرل خود ہی ڈرائیونگ کررہا تھا۔ اس کے پاس سوائے کاغذات، کرنسی اور چند کپڑوں کے کچھ نہیں تھا۔ ہتھیار میں اس کے پاس صرف ایک پستول تھا جیسا کہ عام طور پر سیاح رکھتے تھے۔ گاؤں سرحد سے کچھ ہی فاصلے پر تھا اس لیے جنرل ایک گھنٹے کے اندر پہلی جرمن چوکی پر جاپہنچا تھا۔ اس نے اپنے کاغذات ملاحظے کے لیے پیش کیے اور سوالوں کے جواب ٹھیٹ جرمن لہجے میں دیے۔ اس وقت دس اور کاریں جن میں جنرل کے حلیے اور عمر سے ملتے جلتے افراد ڈرائیو کررہے تھے مختلف جگہوں سے سوئس فرانس سرحد عبور کررہی تھیں۔ جرمن بیک وقت اتنی ساری کاروں کے آنے سے پریشان ہوگئے۔ انہوں نے تین کار والوں کو روک کر باقی کو جانے دیا۔ مگر ایک گھنٹے کے اندر انہیں علم ہوگیا کہ ان کا شکار نکل چکا تھا۔

اب ایک نئی دوڑ شروع ہوگئی۔ گسٹاپو کے ایجنٹ روانہ ہونے والی کاروں کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ مزید پانچ کاریں پکڑی گئیں مگر جنرل ان میں سے کسی میں نہیں تھا۔ جرمن حیران تھے کہ جنرل کہاں غائب ہوگیا تھا۔ انہیں جرمن سیاح پر شبہ ہوا تھا مگر اس کی کار بھی آگے کہیں نہیں ملی۔

جنرل اس وقت ایک سنی پورشے میں محوِ سفر تھا۔ اس کا حلیہ اس وقت ایک فارغ البال کسان کا تھا جس کے پاس خاصی دولت آگئی تھی۔ تیسری چوکی سے گزرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر کار اور اپنا حلیہ بدلا۔ اس وقت جرمنوں نے سنی پورشے کی تلاش شروع کردی تھی۔ جنرل کامیابی سے جرمنوں کو جل دیتا اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے جس دیہاتی طرز کے ریستوران میں کھایا وہ جرمن فوجیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کے درمیان بیٹھ کر لنچ کرنا واقعی دل گردے کا کام تھا مگر جنرل اس صورت حال سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس نے ایک بے پروا فرانسیسی کا کردار ادا کرتے ہوئے جرمن افسروں کے گروپ میں بے تکلفی سے بات کی اور انہیں ٹوٹی پھوٹی جرمنی میں مقامی بے ہودہ فرانسیسی لطائف کا ترجمہ سنایا۔ جرمن دل کھول کر ہنسے تھے اور انہوں نے اسے شراب کی پیشکش بھی کی۔

''نہیں، سینورز۔ ڈاکٹروں نے مجھے شراب نوشی سے منع کیا ہے۔'' اس نے انکار کردیا۔

جرمنوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ جس شخص کو شراب پیش کررہے تھے وہ ان کا انتہائی مطلوب شخص تھا جو بے تکلفی سے ان کے ساتھ بیٹھ کر گپیں مار رہا تھا۔ تین بجے جنرل نے ان سے اجازت مانگی۔ ''اچھا معزز دوستو، اب مجھے اجازت دو۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔ اُمید ہے تم بھی مجھے یاد رکھو گے۔''

جرمن افسران نے اسے گرمجوشی سے رخصت کیا بلکہ میجر کے عہدے کے ایک افسر نے اسے اپنا نام بھی بتایا کہ اگر اسے راستے میں کوئی دشواری پیش آئے تو وہ اس کا نام لے سکتا ہے۔ ریستوران سے نکل کر جنرل سفر کے اگلے مرحلے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے گاڑی اور حلیے کے ساتھ روٹ بھی بدل لیا۔ اب وہ ہائی ویز کے بجائے ذیلی سڑکوں سے سفر کررہا تھا جو اہم شہروں سے ہٹ کر گزرتی تھیں۔ یوں اس کا سفر طویل ضرور ہوگیا تھا لیکن کسی قدر محفوظ بھی ہوگیا تھا۔ یہاں جرمن چوکیاں اور چیک پوسٹیں کم تھیں اور اس کا خطرہ بھی کم ہی تھا کہ اسے روک لیا جائے گا۔

ابھی اسے فرانس کے آزاد علاقے تک پہنچنے کے لیے دو سو میل کا سفر کرنا تھا۔ شام کو اس نے فیصلہ کیا کہ رات کو سفر کرنے میں خطرہ تھا۔ جرمن اسے روک سکتے تھے اور ایک بار وہ مشکوک ہوگیا تو اس کے لیے دشواری ہوسکتی تھی لہٰذا اس نے سورج غروب ہونے کے بعد کار ایک فارم ہاؤس میں روک دی اور وہاں کے مکینوں سے درخواست کی کہ اسے وہاں رات گزارنے کی اجازت دی جائے۔ خوش قسمتی سے فارم کا مالک اڑتیس سالہ جان لی، جنرل کا ایک پرانا ماتحت نکلا جس نے جنگ سے قبل فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اب یہ فارم ہاؤس چلا رہا تھا۔ اس نے جنرل کو پہچان لیا۔ اسے معلوم تھا کہ جرمن پاگلوں کی طرح جنرل ہنری جیراڈ کو تلاش کررہے تھے اور اگر جنرل اس کے فارم سے پکڑا گیا تو اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی خیر نہیں ہوگی۔ اس کی بیوی ماریا بڑی دلکش اور نازک سی عورت تھی جو اس کے تین بچوں کی ماں تھی۔ جان لی نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو اس باہمت اور محبِ وطن عورت نے شوہر سے کہا۔

''ہمیں فرانس کے اس نامور بیٹے کو ضرور پناہ دینی چاہیے۔''

''تم جرمنوں کو جانتی ہو۔'' جان لی نے کہا۔

''ہاں، مگر جرمن ہمیں نہیں جانتے۔'' ماریا نے جواب دیا۔

یوں اس عورت کی وجہ سے جنرل کو فارم ہاؤس میں پناہ مل گئی۔ رات کے کھانے میں ماریا نے جنرل کی دعوت کی اور اس کے لیے اپنا واحد مرغ ذبح کردیا۔ کاشت کار ہونے کے باوجود ان کے پاس خوراک کی کمی ہوگئی تھی۔ جرمن ان سے جانور اور غلہ چھین کر لے جاتے تھے یا برائے نام قیمت پر خرید لیتے تھے اور ادائیگی بھی جرمن کرنسی میں کرتے تھے جو ان کے لیے بے کار تھی۔ اس لیے وہ بہ مشکل گزر بسر کررہے تھے۔ دو دن پہلے ہی ایک جرمن فوجی دستہ ان کے فارم پر زبردستی کا مہمان بن گیا اور ان کی سب سے صحت مند گائے ذبح کرکے کھا گیا۔ جاتے جاتے وہ ان سے دو بوری مکئی بھی لے گئے۔ جرمنوں کی یہ چیرہ دستیاں اس علاقے میں عام تھیں۔

جان لی اور ماریا نے رات کو جنرل کو احتیاطاً اپنا سامان رکھنے والی دو چھتی پر سلایا اور اس کی کار پر بھوسے کے گٹھے رکھ

دُکھی پریم نگری (1917-1991)

دہاج محمد خان کو شعر و فن کی دنیا میں اہم مقام حاصل رہا۔ کراچی میں بننے والی متعدد فلموں کے نغمہ نگار، کہانی کار، صحافی، کالم نگار اور شاعر کا قلمی نام دکھی پریم نگری ہے۔ آپ معروف سیاست دان معراج محمد خان کے بڑے بھائی تھے۔ فیروز آباد (برصغیر) میں یکم مارچ 1917 کو پیدا ہونے والے دہاج محمد خان نے بھرپور علمی و فنی زندگی بسر کی۔ فلم جرنلسٹ سوسائٹی کراچی کے قیام اور اس کی ترویج و ترقی کے حوالے سے بھی انہیں ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ 2 ستمبر 1991 کو کراچی میں وفات ہوئی۔ دکھی پریم نگری ڈیفنس سوسائٹی قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ مجموعہ نہیں چھپا۔

☆☆☆

دلاور فگار (1928-1998)

کراچی میں عبداللہ ہارون کالج میں انگریزی کے استاد، مقامی روزنامے میں قطعات لکھنے والے دلاور حسین شباب بدایونی کو قیام پاکستان سے قبل بھی شاعر ہونے کے ناتے اہمیت دی جاتی تھی۔ شکیل بدایونی آل انڈیا ریڈیو کی نظامت کرتے تو دلاور حسین فگار کو شباب تخلص ترک کرنے کے بعد ضرور بلاتے۔ دہلی پاکٹ بک سیریز نے ان کا قطعات کا مجموعہ ''آداب عرض'' (1927) میں شائع کیا۔ شاکر حسین کے گھرانے میں 8 جولائی 1928 کو بدایوں میں جنم لینے والے دلاور حسین نہایت ہی شریف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ بھارت میں ان کو جیسی عزت ملی اس سے کئی گنا زیادہ 1969 میں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد تادمِ مرگ ملتی رہی۔ ''انگلیاں فگار اپنی'' (1971) میں ان کا پہلا شعری مجموعہ چھپا۔ ''آداب عرض'' کی اشاعت کراچی سے دوبارہ ہوئی۔ شامت اعمال، مطلع عرض ہے، سنچری (1986)، خدا جھوٹ نہ بلوائے (1989)، چراغ خنداں (1995) اور کہا سنا معاف کرنا (1997) میں شائع ہونے والے مجموعہ ہائے دلاور فگاری کی کلیات بھی کراچی سے شائع کی گئی۔ ان کا ایک تراجم کا مجموعہ ''خوشبو کا سفر'' امریکی و غیر ملکی نظم نگاروں کی سنجیدہ شاعری پر مبنی ہے۔ امریکا کے صدر جمی کارٹر کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بعنوان ''خوب تر کہاں'' کرنے والے دلاور فگار فرزدوں اور دکھی دلوں کو ہنساتے ہنساتے رلا گئے۔ 21 جنوری 1998 کو بورڈ آفس ناظم آباد پر سڑک پار کرتے ہوئے ایک حادثے کے سبب جانبر نہ ہوسکے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

دیے تاکہ اگر کوئی جرمن دستہ اچانک اس طرف آ نکلے تو جنرل کے بارے میں جان نہ سکے۔ صبح سویرے جنرل نے ناشتا کرتے ہی اپنے سفر کا آغاز کردیا۔ ماریا اور جان لی کی مہربانی اور میزبانی کا شکریہ ادا کرکے وہ آگے روانہ ہوگیا تھا۔ اب بھی تقریباً لوتے میل کا سفر باقی تھا اور یہ اس کے سفر کا سب سے خطرناک مرحلہ تھا۔ یہاں جابہ جا محاذ سرگرم تھے جن پر جرمن اور اتحادی فوجیں برسرپیکار تھیں۔ اس نے علاقے کا نقشہ بغور دیکھا اور جنوب کی سمت جانے کا فیصلہ کیا۔ یہاں اتحادی قبضہ مستحکم ہونے کی وجہ سے جرمن اس طرف کم حملے کرتے تھے اس کے بجائے ان کی توجہ دفاع پر تھی۔

دن کے گیارہ بجے جرمنوں کے ایک گشتی دستے نے ایک جگہ اسے روکا۔ اس نے اپنے کاغذات ان کے سامنے پیش کردیے جس کی رو سے وہ غلے کا تاجر تھا اور اس علاقے میں انگور کی فصل کا سودا کرنے نکلا تھا۔ خوش قسمتی سے جرمنوں نے اس کے چہرے پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ آخری رکاوٹ تھی جو اس کے فرار کی راہ میں پیش آئی تھی۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد وہ آزاد فرانس کی سرزمین پر حریت پسندوں کے ایک ٹھکانے پر تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بیوی جوید نا کو اپنی خیریت کا تار بھیج دیا۔

☆......☆

1914ء میں جب وہ پہلی بار جرمنوں کی قید سے فرار ہوکر واپس فرانس پہنچا تھا تو اس نے اپنی بیوی کو ان الفاظ کا تار بھیجا تھا......کاروباری دورہ کامیاب رہا۔ میں بہ خیریت واپس آگیا ہوں۔

اس کے کامیاب فرار سے تلملا کر جرمن اب بھی سکون سے نہیں بیٹھے تھے۔ جب وہ اسے فرار سے روکنے اور گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو انہوں نے اسے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ قتل کرانے کا فیصلہ کیا۔ جنرل کھلے عام اپنی فوج کی قیادت کررہا تھا مگر دو قاتلانہ حملوں کے بعد اس کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ اب جنرل کو زیرزمین رہ کر فوج کی قیادت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ فرانس کی سرزمین سے نکل جائے۔ اتحادی کمانڈرز نے جنرل کو برطانیہ بھیجنے کی پیشکش کی مگر جنرل نے انکار کردیا۔ وہ فرانس کی سرزمین پر رہ کر اس کا دفاع کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک اس طرح چھپ کر رہنا کسی نئی قسم کی قید سے کم نہیں تھا مگر اس کے ساتھیوں کا دباؤ بڑھا تو اسے ان کی بات ماننے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس دوران اکتوبر 1942ء میں افریقا میں فرانسیسی مقبوضات میں فرانسیسی دستے جوابی حملے کے لیے جمع ہورہے تھے۔ الجزائر کے ایک چھوٹے سے فارم ہاؤس میں فرانسیسی فوج کے کمانڈر انچیف مارک ڈبلیو کلارک نے اعلیٰ فوجی افسران کی ایک میٹنگ میں شمالی افریقا میں متحدہ فرانسیسی مقبوضات کی فوج کھڑی کرنے کا فیصلہ کیا اور جب اس فوج کی سربراہی کا سوال سامنے آیا تو سب جنرلوں نے متفق ہوکر ایک ہی نام لیا ''جنرل جیراڈ''۔ جنرل کلارک نے اعتراض کیا۔ ''یہ ناممکن ہے کیونکہ وہ عملاً فرانس میں قید ہے۔''

ایک جنرل نے تجویز پیش کی ''اسے وہاں سے نکالا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی سب میرین یہ کام کرسکتی ہے لیکن جنرل جیراڈ کا کام کوئی اور نہیں کرسکتا۔''

غور و فکر کے بعد جنرل کلارک نے منصوبے کی منظوری دے دی جس کے بعد جنرل جیراڈ کے فرار کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس کے تحت چند دن بعد ایک اتحادی آبدوز رات کی تاریکی میں جنوبی فرانس کے ساحل پر طے شدہ مقام پر پہنچی۔ برطانوی سیکرٹ سروس اس منصوبے پر عمل درآمد کررہی تھی۔ اس کے ایجنٹس نے پہلے ہی جنرل جیراڈ کو خبردار کردیا تھا۔ وہ تیار تھا۔ حریت پسندوں نے اسے مطلوبہ مقام پر پہنچایا۔ رات کے دو بجے آبدوز نے خاموشی سے سمندر سے سر نکالا۔ ایک کشتی اتر کر ساحل کی طرف آئی۔ طے شدہ اشاروں کی مدد سے ایک دوسرے کی شناخت کی گئی اور پھر جنرل جیراڈ کشتی میں سوار ہوکر بالآخر جرمنوں کی پہنچ سے مکمل طور پر باہر نکل گیا۔

اس وقت امریکی اور برطانوی، فرانس کو جرمنی کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے جوابی حملے کو آخری شکل دے رہے تھے جس میں جنرل نے اہم کردار ادا کیا۔ فرانس کی آزادی کے بعد وہ فرانس کے ہیرو کے طور پر ابھرا۔ اس نے جنگ کے خاتمے کے بعد فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور 1949ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی شاندار خدمات کے صلے میں حکومت فرانس نے اسے لیجن آف آنر کے اعزاز سے نوازا جو فرانس کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور اسے لیس لارز لیڈیز کے قبرستان میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ اس قبرستان میں نپولین اور دوسرے فرانسیسی جنگی ہیروز کی قبریں ہیں۔

▼▼

اللہ رب العالمین کا ہم بندے جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے۔ اس نے ہمیں جن انمول خوبیوں سے نوازا ہے۔ یہ اس کی عنایت عظیم ہے۔ ایسے بے شمار عنایات و اکرام میں ایک اچھی، خوب صورت اور سریلی آواز بھی ہے۔ جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کسی کسی کو نوازتا ہے۔ ایسی آواز جس کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔ کوئی کہتا ہے جیسے دور کہیں کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ ایسی آواز جسے سن کر چلتے ہوئے

فلم نگری

بلبلِ بنگال

نور فرحان

وہ موسیقی کی دنیا میں قدم رکھتے ہی شہرت کے اوج پر پہنچ گئی جب کہ وہ انتہائی کم عمر تھی اس کے مقابل منجھی ہوئی گلوکارائیں تھیں پھر بھی وہ اپنا مقام بناتی چلی گئی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ خداداد گلوکارہ ہے تبھی تو ملکہ ترنم نور جہاں بھی اس سے خوفزدہ تھیں کہ وہ ان سے یہ اعزاز چھین نہ لے، اسے پاکستانی گلوکاراؤں میں ایسا مقام مل رہا تھا جس کی خود اسے اُمید نہ تھی

پاکستان کی اس گلوکارہ کی داستان جواب پاکستانی نہیں ہے

راہگیروں کے قدم رک جائیں۔ ایسی آواز جو سماعت میں شہد کے قطرے ٹپکائے جسم و جان میں ایک نئی تازگی پیدا کردے۔ ایسی آواز جس کا جادو سننے والے پر اثر انداز ہو۔ ایسی ہی ایک آواز کا میں بھی عاشق ہوں۔ اس عمر کو پہنچنے کے باوجود اس طلسمی آواز کا مجھ پر سایہ ہے۔

☆ دیا رے دیا کانٹا چبھا پاؤں میں
کانٹا نکال سیاں پیپل کی چھاؤں میں
☆ آپ دل کی انجمن میں حسن بن کر آ گئے
☆ ہو جنم جنم تیرا میرا ساتھ رہے گا

آج بھی یہ آواز سنائی دے تو اپنے سارے دکھ درد بھول کر اس آواز کے سحر میں جھومنے لگتا ہوں۔ آپ نے بھی یقیناً رس میں ڈوبی یہ آواز سنی ہوگی اور آپ پر بھی کسی نہ کسی انداز میں اس کا اثر ہوا ہوگا۔ آج اسی آواز کی بات کرتے ہیں۔

17 نومبر 1952ء کو سید امداد علی کے گھر ان کی دوسری بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ سید امداد علی مشرقی پاکستان کے شہر سلہٹ کے باسی تھے۔ سلہٹ کو حضرت شاہ جلالؒ کی نگری بھی کہا جاتا ہے۔ سید امداد علی اور ان کی بیگم آمنہ لیلیٰ بھی شاہ جلالؒ کے روضے اقدس میں اکثر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے دعا مانگی تھی کہ جو وجود دنیا میں آنے والی ہے اللہ اسے ہمیشہ اپنے رحم و کرم کے سائے میں رکھے اور پیر و مرشد کی دعاؤں سے وہ سب کے لیے پسندیدہ اور مقبول شخصیت ہو۔

اس بچی سے پہلے پیدا ہونے والی بیٹی کا نام سید امداد علی اور آمنہ لیلیٰ نے دینا لیلیٰ رکھا تھا۔ اس دوسری بچی کا نام رونا لیلیٰ رکھا۔ سید امداد علی سول سرونٹ تھے۔ ان کی پوسٹنگ ڈھاکے میں ہوئی تو وہ اپنی بیوی اور بچیوں کے ساتھ سلہٹ سے ڈھاکے منتقل ہو گئے اور جب بچیاں بڑی ہوئیں اور اسکول جانے لگیں تو اس کے ساتھ ہی دونوں کا داخلہ "بلبل اکیڈمی" میں کرا دیا۔

بلبل اکیڈمی بوڑھی گنگا کے ساحل میں صدر گھاٹ کے قریب رقص و موسیقی کی تربیت دینے والا ایک ادارہ ہے۔ بنگالی ہندوؤں کی طرح بنگالی مسلمانوں میں بھی رقص و موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کا رواج تھا۔ خاص طور پر ایلیٹ طبقہ کے بنگالی خاندانوں میں لڑکیوں کو ناچ گانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ دینا اور رونا لیلیٰ کی والدہ آمنہ لیلیٰ نے اگرچہ تربیت حاصل نہیں کی تھی مگر وہ بھی شوقیہ طور پر گاتی تھیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ رونا لیلیٰ کی ایک کزن انجمن آراء بھی گاتی تھیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی انجمن آراء تھیں جنہوں نے مشرقی پاکستان کی اردو فلم "ناچ گھر" میں روبن گھوش کے ساتھ یہ ڈوئیٹ گایا تھا۔

لنگڑے گھوڑے سنبھل کے چل

یہ سرور بارہ بنکوی کا لکھا ہوا مزاحیہ گیت تھا جس کی موسیقی الطاف محمود نے کمپوز کی تھی۔ انجمن آراء نے ڈھاکے کی کئی بنگالی اور اردو فلموں کے گیت گائے ہیں۔ رونا لیلیٰ سے پہلے بھی ان کے خاندان میں گانے والے موجود تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دینا لیلیٰ اور رونا لیلیٰ نے بلبل اکیڈمی میں داخلہ لیا تو دینا لیلیٰ نے گانوں میں دلچسپی لی جب کہ رونا لیلیٰ کو رقص سے زیادہ رغبت تھی اس وجہ سے وہ اس شعبے میں زیادہ محنت کرنے لگیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مستقبل میں جس لڑکی کا کیریئر گلوکاری میں تھا، جسے آواز کا جادو جگا کر ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنانا تھا۔ اسے گانے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

سید امداد علی کی پوسٹنگ 1960ء میں کراچی ہو گئی۔ لہٰذا وہ اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آ گئے۔ یہاں دونوں بہنوں کو سینٹ لارنس اسکول میں داخل کیا گیا اور ساتھ ہی موسیقی کی ابتدائی تربیت استاد حبیب الدین اور استاد عبدالقادر پیارنگ سے دلوائی جانے لگی۔

اسی دور سے دینا لیلیٰ فنکشنوں میں بھی گانے لگی تھیں۔ ایک بار یوں ہوا کہ دینا لیلیٰ کو ایک تقریب میں گانا تھا مگر ان کی طبیعت خراب ہو گئی اور گلا گانے کے قابل نہیں رہا تو ان کی والدہ آمنہ لیلیٰ نے دینا کی چھوٹی بہن رونا لیلیٰ کو اس کی جگہ بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن تقریب کے آرگنائزر رونا کی کمسنی کی وجہ سے کہنے لگے۔ "ارے یہ کیا گائے گی؟ مہمانوں کے سامنے کیا ہمارا مذاق اڑانا چاہتی ہیں آپ؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ یہ چھوٹی ضرور ہے مگر بہت اچھا گاتی ہے آپ اس سے پرفارم کرا کے تو دیکھیں۔"

آمنہ لیلیٰ صاحبہ کی یقین دہانی کے بعد منتظمین رونا لیلیٰ کو گوانے پر آمادہ ہو گئے۔ کمسن رونا لیلیٰ نے اس موقع پر راگ بہار سنا کر حاضرین اور منتظمین کو ششدر کر دیا۔ اس خوب صورت پرفارمنس پر اس تقریب میں اسے کیش پرائز بھی ملا۔ اس پذیرائی کے بعد رونا لیلیٰ کو گانے سے دلچسپی بڑھی اور وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گلوکاری میں بھی محنت اور لگن کا مظاہرہ کرنے لگیں۔

اس محنت اور لگن کے نتیجے میں رونا لیلیٰ نے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور اس کامیابی سے پہلے ہی ان کی انٹری فلم انڈسٹری میں ہو گئی۔ 1965ء میں موسیقار ماسٹر منظور (فلم "سویرا" والے) نے ایک تقریب میں دینا اور رونا کو گاتے ہوئے دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور 1966ء میں جب اپنی فلم "جگنو" کی موسیقی ترتیب دینے لگے تو اس فلم میں دونوں بہنوں کو گلوکاری کا چانس دیا۔ رونا لیلیٰ سے ایک سولو گیت گوایا جو چائلڈ اسٹار ماسٹر کمال پر فلمایا گیا جس کے بول تھے

گڑیا سی منی میری
بھیا کی پیاری، پھولوں کی رانی

جب کہ دونوں بہنوں کی آواز میں یہ ڈوئیٹ بھی گوایا۔

ہونیا رے نیا
طوفانی لہروں سے لڑتی تو چلی جا

مگر یہ فلم "جگنو" رونا لیلیٰ کی پہلی فلم نہ کہلا سکی کیونکہ بہت تاخیر سے 1968ء میں ریلیز ہوئی جب کہ رونا لیلیٰ کی پہلی فلم ہونے کا اعزاز ہدایت کار احمد کی فلم "ہم دونوں" کو حاصل ہوا۔ یہ فلم 1966ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کے لیے موسیقار نا شاد نے رونا لیلیٰ کی آواز میں یہ لاجواب نغمہ ریکارڈ کیا جس نے راتوں رات رونا لیلیٰ کو موسیقی کے شائقین سے آشنا کیا۔

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا
دل یہ سمجھا کہ چھلکتا ہوا اک جام ملا

"جگنو" کے لیے رونا لیلیٰ نے جب اپنا پہلا فلمی گیت گایا اس وقت ان کی عمر بارہ یا تیرہ سال رہی ہوگی۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اتنی کمسنی میں پلے بیک گانے والی گلوکارہ کا ریکارڈ بھی انہی کا ہے۔

اچھے موسیقار اچھی آوازوں کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ فلموں میں رونا لیلیٰ کی آواز کو شروع میں ماسٹر منظور اور ناشاد نے اپنی فلموں میں شامل کیا لیکن سب سے زیادہ فائدہ رونا لیلیٰ کی آواز سے نثار بزمی نے اٹھایا۔ وہ اچھے کمپوزر ہی نہیں، بہت اچھے آوازوں کو پرکھنے والے بھی تھے۔ انہوں نے رونا لیلیٰ سے ایسے نغمے گوائے جنہوں نے رونا لیلیٰ اور نثار بزمی دونوں کی فنی عظمت کی مہر ثبت کر دی۔ رونا لیلیٰ خود بھی نثار بزمی کی فنی صلاحیتوں کی قائل تھیں۔ جب بھی ان سے کوئی ان کے پسندیدہ گیت کے بارے میں

زندگی نامہ

نام: رونا لیلیٰ۔
پیدائش: 17 نومبر 1952ء
مقام پیدائش: سلہٹ (سابق مشرقی پاکستان)
والد: سید امداد علی
والدہ: آمنہ لیلیٰ
بہن: دینا لیلیٰ

ابتدائی سرسنگیت کی تعلیم و تربیت: بلبل اکیڈمی ڈھاکے میں ہوئی پھر جب 1960ء میں ان کے بیورو کریٹ والد کا تبادلہ کراچی ہوا تو استاد حبیب الدین اور استاد پیارنگ سے موسیقی کی تربیت حاصل کی۔

بطور پلے بیک سنگر: ماسٹر منظور نے اپنی فلم جگنو کے لیے 1966ء میں گانے کا موقع دیا مگر ریلیز ہونے والی پہلی فلم "ہم دونوں" تھی جو 1966ء ہی میں نمائش پذیر ہوئی جب کہ جگنو 1968ء میں ریلیز ہوئی۔ جگنو کے لیے گاتے وقت رونا کی عمر تیرہ سال تھی۔

تعلیم: کراچی کے سینٹ لارنس اسکول سے میٹرک پاس کیا پھر کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔

کمال فن: سترہ زبانوں میں اس خوبی سے گاتی ہیں جیسے یہ ان کی مادری زبان ہو۔

شادی: تین مردوں سے رشتہ ازدواج قائم کیا۔ پہلا شوہر خواجہ جاوید قیصر۔ دوسرا شوہر راول دانیل۔ تیسرا عالمگیر۔

اولاد: پہلے شوہر سے ایک بیٹی تانی۔

خطابات: بلبل بنگال، میلوڈی کوئین، سرسنگیت کی رانی، سدا بہار آواز کی ملکہ۔

حال کے احوال: تیسرا شوہر عالمگیر جو بنگالی فلموں کا ہیرو ہے اب تک اس کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں لیکن ڈھاکے جاتی ہیں تو وہاں فلموں، ٹی وی اور اسٹیج کے لیے گاتی بھی ہیں۔ اپنے کیریئر کی گولڈن جوبلی مکمل کرنے کے باوجود اب بھی ان کی آواز میں پہلے جیسا ہی جادو موجود ہے اور پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت میں ان کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ گانوں کے علاوہ فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہتی ہیں۔

پوچھتا۔ وہ برملا اس گیت کا حوالہ دیتیں۔

نیناں ترس کے رہ گئے پیا آئے نہ ساری رات

جو نثار بزمی کا کمپوز کیا ہوا فلم ''آسرا'' کا نغمہ ہے۔

رونا لیلیٰ کو فلمی گلوکاری کے اسرار و رموز سے آشنا کرنے والے پہلے موسیقار ماسٹر منظور تھے لیکن ان کی آواز اور فن کو صحیح معنوں میں جلا بخشنے والوں میں نثار بزمی سرِفہرست تھے۔ اس ضمن میں دیگر موسیقاروں میں روبن گھوش اور دیبو بھٹہ چاریہ کی کوشش اور کاوش بھی قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے رونا لیلیٰ سے بہت اچھے اور اعلیٰ پائے کے گیت گوائے۔ دیبو بھٹہ چاریہ نے فلم ''جھک گیا آسمان'' کے لیے رونا لیلیٰ کی آواز میں جو سہرا ریکارڈ کیا اس کی مثال برصغیر میں بمشکل ہی ملے گی۔ رونا لیلیٰ کا گایا ہوا یہ سہرا آج بھی شائقین کے دلوں کے تار چھیڑ دیتا ہے۔

چاند کی سیج پہ تاروں سے سجا کر سہرا

پیار لایا ہے بہاروں میں بسا کر سہرا

اس گیت کے شاعر صہبا اختر تھے۔ اس گیت کے حوالے سے انہیں بھی بڑی شہرت ملی۔

رونا لیلیٰ دیکھتے ہی دیکھتے پاکستانی فلموں کی اہم گلوکارہ بن گئیں اور ہمارے سب ہی موسیقاروں نے ان سے اپنی فلموں کے گیت ریکارڈ کرائے۔ اس جگہ میں نامور موسیقاروں کے ایک ایک گیت کا حوالہ دوں گا جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی کتنی اہمیت تھی۔

☆ رشید عطرے

سنا ہے کہ دل لے کے دیتے ہیں دھوکا

مگر مہرباں ہم تو ایسے نہیں ہیں

(ہمراہ احمد رشدی۔ فلم محل)

☆ ماسٹر عنایت حسین

اگر میں بتا دوں مرے دل میں کیا ہے

تو مجھ سے نگاہیں چرا تو نہ لو گے

(فلم آنسو بن گئے موتی)

☆ ماسٹر عبداللہ

جانِ من اتنا بتا دو

محبت محبت ہے کیا؟

(فلم کمانڈر)

☆ تصدق حسین

ابھی ابھی تو تھا ڈھونڈ تو ذرا

جانے مرا دل کہاں کھو گیا

(ہمراہ احمد رشدی۔ فلم حسینہ مان جائے گی)

☆ خلیل احمد

اک بات کہوں، کہو دل کا راز کہوں

کبھی جدا نہ ہوں گے ہم

(ہمراہ احمد رشدی۔ فلم الزام)

☆ سہیل رانا

ہے میری یہ دعا

تم سلامت رہو جہاں بھی رہو

(فلم میرے ہمسفر)

☆ اے حمید

کل بھی تم سے پیار تھا مجھ کو

تم سے محبت آج بھی ہے

(ہمراہ مسعود رانا فلم خواب اور زندگی)

☆ لعل محمد اقبال

ملی گل کو خوشبو مجھے مل گیا تو

پسند اپنی اپنی نصیب اپنا

(فلم نصیب اپنا اپنا)

☆ روبن گھوش

جاؤ تمہیں پہچان لیا کیسے کہوں تم کو

اس دل نے جانِ تمنا مان لیا تم کو

(فلم شرافت)

☆ ایم اشرف

میں تو چلی ہوا کے سنگ

جیسے کوئی اڑتی پتنگ

(فلم بالو رانی)

☆ غلام علی

ہو جنم جنم تیرا میرا ساتھ رہے گا

(فلم، پروفیسر)

رونا لیلیٰ نے دیگر موسیقاروں کی کمپوزیشن میں گلوکاری کی جن میں غلام نبی عبداللطیف، منظور اشرف، رحمان ورما، بخشی وزیر، امجد بوبی، جاوید سرور، خان عط الرحمٰن، اکبر پاشا، جمیل خسرو، سبل داس، علی حسین، ڈاکٹر غلا نذر صابر، وزیر افضل، ایم جاوید، جی اے چشتی، اختر حسی اکھیاں، حلیم اقبال، طفیل فاروقی، عالم خان، غلام حسین شب وجاہت عطرے، ماسٹر رفیق علی، طافو، فیروز نظامی، کاظمی، نیرو زگل، دلشاد، نذر حسین، ظفر قریشی، علاؤ الد چوہدری، ظفر علی، نیاز احمد، صفدر حسین، آزاد رحمٰن، امیر

خان اور انور پرویز کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان موسیقاروں نے رونا لیلیٰ سے اردو، پنجابی، بنگالی اور سندھی فلموں کے گیت گوائے۔

رونا لیلیٰ نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا اس وقت پاکستان کے پہلے جدت طراز گلوکار احمد رشدی کا طوطی بول رہا تھا۔ احمد رشدی اسٹیج پر اپنے گانے خود ایک اداکار کی طرح تھرک تھرک کر پرفارم کرتے تھے۔ رونا لیلیٰ جو خود بھی رقص کی دلدادہ تھیں، انہیں احمد رشدی کا یہ انداز بہت پسند آیا اور انہوں نے بھی اسٹیج پر تھرک تھرک کر نغمہ سرائی شروع کر دی اور پاکستانی فلمی صنعت کی پہلی جدت طراز فی میل سنگر کا اعزاز حاصل کر لیا۔ رونا لیلیٰ نے اپنا یہ انداز ہمیشہ برقرار رکھا۔

25 ستمبر 2016ء میں لندن میں انہوں نے جب اپنے فنی کیریئر کی گولڈن جوبلی تقریب منائی تو اس وقت بھی اسی انداز میں پرفارم کیا۔ اس وقت ان کی عمر 64 برس تھی اس تقریب میں انہوں نے اپنے یادگار نغمات اپنے مخصوص انداز میں گائے۔ یہ لیجنڈ گلوکارہ کہتی ہیں۔ ''کسی بھی شو میں پرفارم کرنے کے لیے گانے کے بولوں کو اپنے تاثرات اور حساسات سے مزین کر کے شائقین پر اس نغمے کی خصوصیات آشکار کی جا سکتی ہیں۔''

اس تناظر میں وہ احمد رشدی کو اپنا استاد مانتی ہیں۔ واضح رہے کہ پاکستان میں رونا لیلیٰ نے سب سے زیادہ دو گانے (ڈوئیٹس) احمد رشدی کی ہمنوائی میں ہی گائے ہیں جب کہ وہ کافی سارے پلے بیک سنگرز کے ساتھ بھی نغمہ سرائی کر چکی ہیں۔ چند معروف گائیکوں کے ساتھ گائے ہوئے گیت کی مثال پیش خدمت ہے۔

☆ ہونٹوں کی کلی گالوں کے کنول زلفوں کی گھٹا بک جاتی ہے۔ (ہمراہ مالا۔ فلم بھائی بہن)

☆ جب بھی سنوں کی تیری بانسریا۔ ترے پاس چلی آؤں کی سانوریا (ہمراہ رجب علی، فلم میں بھی تو انسان ہوں)

☆ بچپن کی وادیوں سے کس نے ہمیں پکارا۔ آواز دے دوبارہ (ہمراہ مسعود رانا۔ غیر ریلیز شدہ فلم گمر دندا)

☆ ساون آئے ساون جائے۔ تجھ کو پکاریں گیت ہمارے (ہمراہ اخلاق احمد فلم چاہت)

☆ زندگی تو آپ کی رعنائیوں کا نام ہے۔ آپ ہی سے ہے سحر اور آپ ہی سے شام ہے (ہمراہ احمد رشدی، حلیم

ایوارڈز و اعزازات

رونا لیلیٰ کو ان کی بہترین گائیکی کے ایوارڈز کئی اداروں کی طرف سے ملے۔ پاکستان میں نگار ایوارڈز، گریجویٹ ایوارڈز، کرٹکس ایوارڈز اور دیگر کئی ایوارڈ ملے جب کہ بنگلہ دیش میں سرکاری طور پر چھ بار نیشنل ایوارڈز 1976ء، 1977ء، 1989ء، 1992ء، 2012ء، اور 2015ء میں دیے گئے۔

رونا لیلیٰ اور گنگا جل

1980ء میں پانی کی تقسیم کے حوالے سے جب بھارت اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کے مذاکرات ہو رہے تھے۔ ایک بھارتی سیاست داں خشونت سنگھ نے بیان دیا کہ بھارت رونا لیلیٰ کے بدلے بنگلہ دیش کو گنگا کا پانی دینے کو تیار ہے۔ ان دنوں رونا لیلیٰ بھارت میں ایک میوزک کنسرٹ میں پرفارم کر رہی تھیں۔ اس شو میں خشونت سنگھ بھی موجود تھے۔

ورلڈ ریکارڈ

رونا لیلیٰ کا ایک ریکارڈ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی درج ہے اور یہ ریکارڈ ہے کہ رونا لیلیٰ نے تین دن میں 30 گانے اپنی آواز میں صدابند کروائے۔ جب کہ کئی گانے والے تو ایک گانے کی ریکارڈنگ میں دو دو تین تین دن لگا دیتے ہیں۔ رونا لیلیٰ کا یہ کمال ہے کہ وہ ریکارڈنگ کے وقت شاید ہی ری ٹیک کرواتی ہیں۔

انفرادی خوبیاں

رونا لیلیٰ کی بہت سی باتیں بہت سی گلوکاراؤں سے بہت مختلف ہیں۔ انہوں نے بچپن ہی سے گانا شروع کر دیا تھا جب کہ صرف 13 سال کی عمر میں انہیں فلموں میں گانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے گانوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور بیچلر آف آرٹ (B.A) کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ان کی ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''ہم دونوں'' میں ان کا گایا ہوا نغمہ

ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا

دل یہ سمجھا کہ چھلکتا ہوا اک جام ملا

ہٹ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی ہٹ ہو گئیں اور اپنی انتہائی کمسنی کے باوجود جلد ہی صفِ اوّل کی پلے بیک سنگرز میں ان کا شمار ہونے لگا۔

شہزاد فلم سوغات)

☆ تنہائی میں اکثر راتوں کو ذکر تمہارا کرتے ہیں (ہمراہ آئرن پروین۔ فلم پھر چاند نکلے گا)

☆ دیا رے دیا! کانٹا چبھا ہو مورے کانٹا چبھا پاؤں میں (ہمراہ رفیق چودھری فلم پھر صبح ہوگی)

☆ صدقے تے صدقے تیکل قلندرؒ (ہمراہ سلیمان شاہ فلم شہرو فیروز)

ان کے علاوہ بھی بہت سے گانے والے اور گانے والیوں نے رونا لیلیٰ کے ساتھ فلموں کے گیت گائے ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستان فلم انڈسٹری سے وابستگی کے دوران سلیم رضا، ناہید نیازی اور میڈم نور جہاں ایسے سنگرز تھے جن کے ساتھ رونا لیلیٰ نہیں گا سکیں۔

اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ ملکہ ترنم میڈم نور جہاں جو تمام گلوکاراؤں پر ہمیشہ بھاری رہیں۔ رونا لیلیٰ کی موجودگی میں ان کا سنگھاسن ڈگمگانے لگا تھا۔ میڈم جہاں موسیقاروں کی پہلی چوائس ہوا کرتی تھیں۔ اب ان کے مدمقابل رونا لیلیٰ کو بھی اہمیت دینے لگے تھے۔ یوں بھی مادام کے بڑے ناز نخرے تھے اس لیے اکثر ملکہ ترنم کی جگہ رونا لیلیٰ کی خدمات حاصل کرلی جاتی تھیں کیونکہ رونا لیلیٰ بھی مشکل سے مشکل فارمیٹ کے گانے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں اور اب بھی ہیں۔ ان کی اسی خوبی کی وجہ سے انہیں بھارتی فلموں میں بھی پلے بیک کا موقع ملا۔ جب وہ پاکستان سے بنگلہ دیش منتقل ہوگئیں تو پاکستانی فلموں کے گانوں کی وجہ سے بنگلہ دیش ہی میں نہیں، ہندوستان میں بھی ان کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے۔

بھارتی فلم انڈسٹری میں میلوڈی کوئین رونا لیلیٰ کو سب سے پہلا چانس نامور بالی ووڈ موسیقار کلیان جی آنند جی نے 1976ء میں فلم "ایک سے بڑھ کر ایک" میں دیا۔ جس کے ستاروں میں شرمیلا ٹیگور، نوین نسچل، اشوک کمار اور راجکمار نمایاں تھے۔ بعد ازاں رونا لیلیٰ کی گلوکاری سے آراستہ فلموں میں انڈین فلم گھروندا (ستارے ذرینہ وہاب، امول پالیکر) پھر صبح ہوگی۔ جان بہار (ساریکا۔ سچن) یادگار (پونم ڈھلون کمل ہاسن، سنجیو کمار) گھر پریوار (ستارے تنوجہ، سچن، راج کرن، قادر خان) سپنوں کا مندر (ستارے جتندر، جیا پرادہ) اگنی پتھ (ستارے امیتابھ بچن، نیلم، متھن چکرورتی) جب کہ سپر پاکستانی اسٹار ندیم کی واحد انڈین فلم دور دیش کے کچھ گانے بھی رونا لیلیٰ نے گائے تھے۔ (ستارے پرابین بوبی، راج ببر، ششی کپور، شرمیلا ٹیگور، سیتا اور ندیم) رونا لیلیٰ کو عظیم گلوکار محمد رفیع کے ساتھ انڈین فلم "نشر ساگر" میں ایک ڈوئیٹ گانے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

بالی ووڈ میں جہاں مہان گلوکاراؤں کی کمی نہیں وہاں رونا لیلیٰ کی سنہری آواز کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ 1980ء میں رونا لیلیٰ کا پہلا انٹرنیشنل البم "سپر رونا" کے نام سے جاری ہوا جس کی موسیقی نامور بھارتی میوزک ڈائریکٹر بپی لہری نے ترتیب دی تھی۔ اس کے بعد رونا لیلیٰ کے کئی اور البم جاری ہوئے جن میں موسیقار اوپی نیر کی کاوشوں سے پیش کیا جانے والا البم "لورز آف رونا لیلیٰ" کو اس بنا پر فوقیت حاصل رہی کہ اس میں رونا لیلیٰ کی گائی ہوئیں کلاسیکل غزلیں اور ہلکے پھلکے گیتوں کو نہایت خوش اسلوبی سے یکجا کیا گیا تھا۔ رونا لیلیٰ کے ایک اور انڈین البم "ڈسکو ایکسپریس" نے بھی مقبولیت حاصل کی۔ جس میں یہ گیت شامل تھے۔

☆ دیدے پیار دے پیار دے

☆ سنو سنو میری یہ کہانی۔ آہا پھنس گئی میری جوانی

☆ ڈسکو ایکسپریس یہ پیار ہے

☆ تمہیں ہو نہ ہو مجھے اتنا یقین ہے۔ مجھے پیار تم سے نہیں ہے

☆ آؤ سن لو میرے دل کی پکار تم

رونا لیلیٰ جنہوں نے اپنے فنی کیریئر کا آغاز پاکستان سے کیا تھا اور پھر اسی مملکت خداداد میں رہ کر شہرت دوام حاصل کی تھی۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی یہاں گائے ہوئے اپنے مقبول نغموں کو نظر انداز نہیں کیا۔ پاکستان ہو، بنگلہ دیش ہو، انڈیا ہو یا لندن جہاں اب وہ مستقل سکونت اختیار کر چکی ہیں۔ جہاں بھی تقریبات میں انہیں پرفارم کرنے کا موقع ملا، پاکستان میں گائے ہوئے اپنے مقبول گیت ضرور سناتی ہیں۔ ان گیتوں میں سب سے زیادہ اہم جو گیت وہ پرفارم کرتی ہیں وہ ان کا مشہور دھمال ہے۔

لعل میری پت رکھیو بلا جھولے لعالن

سندھڑی دا سہون دا

سخی شہباز قلندرؒ

جس پر انہیں زبردست داد و تحسین سے نوازا جاتا ہے۔

بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ رونا لیلیٰ جن کی

مادری زبان بنگالی ہے اور جنہوں نے انگلش میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے انہیں سترہ زبانوں میں گیت گانے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ اردو، ہندی، بنگالی، پنجابی، سندھی، سرائیکی، بلوچی، پشتو، گجراتی، کشمیری، فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، جاپانی زبانوں میں اس طرح گاتی ہیں جیسے یہ ان کی مادری زبان ہے۔ ان کی یہ خوبی خداداد ہے جس کا اظہار وہ خود بھی کرتی ہیں۔

میں تو یہی کہوں گی

ایں سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

پاکستان کے دوران قیام انہوں نے پاکستان کی گجراتی زبان کی فلموں میں بھی گلوکاری کی۔ پہلی گجراتی فلم "ماں تے ماں" کے لیے موسیقار لعل محمد اقبال کی کمپوزیشن میں یہ نغمات گائے۔

☆ من پنچھی اڑے من پنچھی اڑے

☆ مارا دل میں کون۔ تارا دل ماں ہوں چھوں (ہمراہ احمد رشدی)

1970ء میں رونا لیلیٰ نے کشمیری زبان کا گیت

☆ "کنی چک نند بانی" بھی گایا تھا۔

رونا لیلیٰ چونکہ بنگالی اور انگریزی میں لکھنا پڑھنا جانتی ہیں اس لیے باقی زبانوں کے گیت کے بول رومن رسم الخط میں تحریر کراکر پہلے ریہرسل کرتی ہیں اور جب تلفظ کو بخوبی ادا کرلیتی ہیں تو گیت ریکارڈ کراتی ہیں اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ان کی ذہانت خداداد ہے اس لیے وہ ہر زبان کا نغمہ گاتے ہوئے اپنے فن کے کمال کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ خصوصاً سندھی زبان کے فلمی گیت رونا لیلیٰ نے اس مہارت سے گائے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے جیسے سندھی ان کی مادری زبان ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستانی سندھی فلموں کے سب سے زیادہ گیت رونا لیلیٰ ہی نے گائے ہیں۔

اس موقع پر یہ بات یاد آگئی کہ رونا لیلیٰ کی بڑی بہن دینا لیلیٰ نے سندھ سے تعلق رکھنے والی نامور سیاسی شخصیت مخدوم امین فہیم سے شادی کی تھی جو پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنما تھے۔ دینا لیلیٰ عالم جوانی میں 27 دسمبر 1970ء کو انتقال کرگئی تھیں۔ دینا لیلیٰ سے مخدوم امین فہیم کے ایک ہی فرزند مخدوم جمیل الزماں ہیں جو دو بار ایم پی اے اور صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔ جمیل الزماں صاحب رشتے میں رونا لیلیٰ کے بھانجے ہیں۔

بلبل بنگال کے سندھی نغمے

رونا لیلیٰ نے پاکستان کی 25 سندھی فلموں میں کم و بیش 90 گیت گائے ہیں اور اس خوبی سے گائے ہیں کہ لگتا ہے کسی سندھی گلوکارہ نے اپنی آواز کے جادو جگائے ہیں۔ ان فلموں میں سے چند کے نام پیش کر رہا ہوں۔ نوری جام تماچی، محبوب مٹھا، سورٹھ، پیار کیو سنگھار، غیرت جو سوال، رت جی رانند، دوستی جو پیار، شہرو فیروز، رنگ محل، سُھرا شال ملن، چانڈ ر وکی، منھو پیار پکارے۔

چند سندھی فلموں کے بول

☆ ساون آیو گیت گایو جھومر پایو (فلم سورٹھ)

☆ اسالوں عشق مریدا ڈھلوان۔ دل دل قتل کریندان (فلم نوری جام تماچی)

☆ کوئل گائے من کھی لبھائے (فلم سُھرا شال ملن)

رونا لیلیٰ کی چند غیر ریلیز شدہ فلمیں

چھیل چھبیلا، فریاد، سنگ تراش، چلتی کا نام گاڑی، گھروندا۔

ان فلموں میں سے چند ایک کے گانے جو فلم ریلیز نہ ہونے کے باوجود مقبول ہوئے۔

☆ آجا رے میرے من میں باجے شہنائی (فلم چھیل چھبیلا)

☆ گل مبارک ہوائیں جو گلستان تک آگئے (فلم سنگ تراش)

☆ کیسا گھروندا ٹوٹا پیار نے ہم کو لوٹا (فلم گھروندا)

بنگالی گلوکارہ کی پنجابی فلمیں

بابل، ضدی، نشان، شیراں دی جوڑی، پردیسی، سوہنا ڈاکو، دل نال سجن دے، مانگ بھرواں دا، ڈیرا سجناں دا، دور نکیلے، سکندرا دن ذرتے زمین، وارث چن چودھویں دا، سجن دشمن کنجوس، بھولے شاہ، خون پسینا، غیرت شان جواناں دی، شکنجہ، آخری حملہ، جاگ دے رہنا۔ رونا لیلیٰ نے ایک اندازے کے مطابق 55 پنجابی فلموں کے کوئی 150 گانے گائے ہیں۔ جن میں سے مندرجہ بالا چند نام ہی اس جگہ شامل کیے گئے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دینا لیلیٰ کے خسر مخدوم طالب المولیٰ سیاسی میدان کے شہسوار ہونے کے علاوہ سندھی زبان کے شاعر بھی تھے۔ رونا لیلیٰ نے ان کا کلام بھی گایا ہے۔

رونا لیلیٰ نے کمسنی سے ہی گلوکاری شروع کی تو اس دور میں کم عمری کے باعث ان کی آواز اونچے سروں پر پھٹنے لگتی تھی مگر مسلسل ریاض کر کے انہوں نے اونچے سروں پر گانے میں مہارت حاصل کر لی۔ لب و لہجے کی شائستگی نے رونا لیلیٰ کی دلنشیں آواز کے سحر کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

رونا لیلیٰ کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے نامور شعرائے کرام کے تخیلات کو اپنی آواز سے سنوارا ہے۔ چیدہ چیدہ مثالیں یہ ہیں۔

سرور بارہ بنکوی۔ ہمیں کھو کر بہت پچھتاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے (فلم احساس)

حبیب جالب۔ پیار کو پاؤں کی زنجیر بناؤں کیسے (فلم گھر پیارا گھر)

حمایت علی شاعر۔ ہوا آنچل اڑانے دو۔ گلے ہم کو لگاتی ہے لگانے دو (فلم جھک گیا آسمان)

سیف الدین سیف۔ نہ جانے کس لیے ہم پہ قیامت ڈھائی جاتی ہے (فلم امراؤ جان ادا)

قتیل شفائی۔ دی مبارک باد اس نے دل ہمارا توڑ کر۔ شکریہ اس دل لگی کا (فلم محبت)

احمد راہی۔ تیرے ملنے دی آس لے کر میں تڑپی (فلم پنوں دی سسی)

مظفر وارثی۔ مر جائے گی محبت اشکوں کا زہر پی کر (فلم امراؤ جان ادا)

آرزو اکبر آبادی۔ یہ ہے نرگسی اشکوں کا سویرا۔ ذرا سوچ لے (فلم کردار)

احمد عقیل روبی۔ زندگی چلی کہاں سے آ گئی کہاں۔ اجنبی ہر طرف ہیں یہاں (فلم تقدیر کہاں لے آئی)

تنویر نقوی۔ رہوں گی تیرے سنگ سنگ۔ بن کے تیری چھایا (فلم بے مثال)

فیاض ہاشمی۔ میں اس میں خوش ہوں۔ میری ہر خوشی لے جائیے (فلم پازیب)

ریاض الرحمٰن ساغر۔ آنکھ ملی پاٹکرایا پیمانے سے پیمانہ (فلم ٹائیگر گینگ)

خواجہ پرویز۔ جلتی جوانی غضب کر گئی۔ لٹ گیا جس کی نظر پڑ گئی۔ یار اذرا اٹک تو سہی (فلم بھول)

شباب کیرانوی۔ او میرا بابو چھیل چھبیلا میں تو ناچوں گی (فلم من کی جیت)

اختر یوسف کھنکے پائل چھنکے گھنگرو۔ ایسے میں میں کیا کروں (فلم چاہت)

دکھی پریم نگری۔ سیاں اناڑی سے دل لگا بیٹھی۔ یہ کیا کر بیٹھی (فلم نادان)

ابن صفی۔ میں کسے ڈھونڈتی میں کسے چاہتی۔ تم نہ ملتے اگر کتنی ویران ہوتی مری زندگی (فلم دھماکا)

ریاض شاہد۔ اڑتا ہوا وقت تھام لو ساتھی۔ نہ ہا جائے شام (فلم یہ امن ہمراہ مجیب عالم)

کلیم عثمانی۔ باجے جب کوئی شہنائی۔ پھر کیوں آنکھ بھر آئی (فلم ایک مسافر ایک حسینہ)

کیف رضوانی۔ ہائے اللہ میں کیا بتاؤں۔ میں کر بیٹھی پیار (فلم پرائی بیٹی)

اطہر شاہ خان۔ گزری ہوئی بہارو۔ اک بار پھر سے آؤ (فلم آج کی رات)

وحید چغتائی۔ کیسے کہوں میرے سجناں۔ تم ہی ہو میرے پیار بھرا سپنا (فلم ہمدم)

رونا لیلیٰ بنگلہ دیش جانے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً پاکستان آتی رہی ہیں۔ اپنی بڑی بہن دینا لیلیٰ کی دفنا ... کے موقع اور برسی پر پاکستان آئی تھیں۔ انہیں اپنی بہن سے بڑی محبت تھی جو کینسر کا شکار ہو کر عالم جوانی میں انتقال کر گئیں۔ رونا لیلیٰ نے ان کی یاد میں دس شوز کیے اور ان کی آمدنی سے ڈھاکے میں کینسر اسپتال کی تعمیر کی اور اس ... انتہائی نگہداشت کے یونٹ کو دینا لیلیٰ مرحومہ کے نام سے منسوب کیا۔

رونا لیلیٰ جتنی اچھی گلوکارہ ہیں اس سے کہیں زیادہ اچھی انسان ہیں۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے۔ وہ فلا... کام بڑی دلجمعی سے کرتی ہیں۔ اداکار و ہدایت کار رحمان جب ڈھاکے میں شدید بیمار ہوئے اس موقع پر رونا لیلیٰ نے ان کے لیے ایک بینیفٹ شو کیا تھا۔ اسی طرح بچوں کے اسپتال کے لیے بھی انہوں نے چھ کنسرٹس کیے۔ وہ اکثر امدادی ایسوسی ایشنز کے لیے موسیقی کے پروگرام کرتی رہتی ہیں۔

رونا لیلیٰ جن کی آواز میں گائے ہوئے گیت متعدد ہیروز پر پکچرائز ہوئے وہ بھی اپنی حقیقی زندگی میں تین مردوں کی ہیروئن بنیں۔ اس سے پہلے کہ ان کے تین شوہروں کے

بارے میں بتاؤں۔ یہ دلچسپ واقعہ سنانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں ان کی ایک شادی مگر آدھی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب بنگلہ دیش بننے کے بعد ان کے بنگالی والدین نے بنگلہ دیش جانے کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ رونا لیلیٰ کے عروج کا دور تھا۔ وہ کسی طرح بھی پاکستان سے جانے پر تیار نہیں تھیں مگر ان کے ماں باپ انہیں اپنے ساتھ لے جانے پر بضد تھے۔ رونا کے کچھ فلمی بہی خواہوں نے انہیں مشورہ دیا۔

”اگر تم یہاں شادی کر لو تو تمہارے والدین تمہیں جانے پر مجبور نہیں کر سکیں گے، اس طرح قانونی طور پر تم خود مختار ہو گی۔ جس طرح تمہاری بہن دینا لیلیٰ شادی شدہ ہے اس لیے تمہاری ممی اور تمہارے پاپا کا اپنی اس بیٹی پر کوئی اختیار نہیں۔“

”یہ مشورہ تو بہت اچھا ہے۔“ رونا لیلیٰ بولیں۔ ”مگر......“

”مگر کیا؟“

”مگر میں شادی کر کے اپنے پاؤں میں بیڑی نہیں ڈلوانا چاہتی۔“

مشورہ دینے والے بھی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ درست ہے کہ شادی کے بعد ان کا شوہر کیسا ہو۔ شوبز سے ان کو وابستہ رکھنا چاہے گا بھی یا نہیں۔ ایک ساتھی نے دور کی کوڑی لائی۔

”ارے بھئی! تم ایسی شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”کیسی شادی؟“

”شادی مگر آدھی۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں۔ یہ کیسی شادی ہے۔“

مشورہ دینے والے نے سمجھایا۔ ”تم کسی ایسے بندے سے ایگریمنٹ کرو کہ ہمارا تمہارا نکاح ضرور ہو گا مگر ازدواجی طور پر ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہیں گے۔ جب میرے والدین مجھے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ کر بنگلہ دیش چلے جائیں گے تو ہمارا یہ آدھا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ تم مجھے چھوڑ دو گے۔“

رونا لیلیٰ پہلے ہنسی، پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”ارے بابا! ایسا کوئی بندہ نہیں ملے گا۔“

ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے پھر ایسا بندہ کیسے نہ ملتا۔ وہ فلمی ساتھی جو چاہتے تھے کہ سر سنگیت کی یہ رانی یہاں سے نہ جائے۔ یہاں کی فلمیں اور فلم انڈسٹری اس انمول آواز سے محروم نہ ہو۔ انہوں نے ہی ایسے ایک بندے کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ ہدایت کار عزیز تبسم تھا۔ جس نے پہلی پشتو فلم کراچی میں بنا کر اپنی شناخت کروائی تھی۔ پہلے تو وہ نہ نہ کرتا رہا۔

”یارو! ایسی شادی سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟“

”بھولے بادشاہ! یہ فائدہ ہو گا کہ اس شادی کے بعد تمام اخباروں میں رونا لیلیٰ کے ساتھ تمہاری تصویر شائع ہو گی اور خبر چھپے گی کہ میلوڈی کوئین رونا لیلیٰ نے پشتو فلموں کے ہدایت کار عزیز تبسم سے شادی کر لی ہے۔“

”اس خبر سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟“

”ابے یار! تو راتوں رات مشہور ہو جائے گا۔ رونا لیلیٰ کوئی معمولی چیز نہیں۔ تیری قسمت کے دروازے کھل جائیں گے۔ وہ جو فیض صاحب نے کہا ہے

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

تیری تو عاقبت سنور جائے گی۔ رونا لیلیٰ کی سفارش کی وجہ سے۔“

”ٹھیک ہے۔“ عزیز تبسم رضامند ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم لوگ کہتے ہو تو......“

رونا لیلیٰ بطور جیوری

رونا 2016ء میں ایک انڈین ٹی وی چینل کے مقابلۂ گائیکی کے پروگرام ”سرگیشنز“ میں بطور جیوری پیش ہوئیں۔ جیوری کے پینل میں ان کے ساتھ پاکستانی گلوکارہ عابدہ پروین اور بھارتی گلوکارہ آشا بھوسلے شامل تھیں جنہوں نے اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کی۔

رونا لیلیٰ کی بنگالی فلمیں

پاکستان سے بنگلہ دیش جانے کے بعد رونا لیلیٰ نے ڈھاکے کی متعدد فلموں کے گانے گائے جو کامیابی سے بھی ہمکنار ہوئے۔ ان میں سے کچھ فلموں کے نام اس جگہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ راج نندنی، بہادر، گھروتی، جھومر، خوش، بدھون ہارا سر، نوجوان، راج داس، راجا صاحب، پیار بندھن، نالش۔

کراچی میں ایک اردو فلم ”لاڈلا“ بنی تھی۔ اس میں ایک بنگالی گیت شامل کیا گیا تھا جسے رونا لیلیٰ نے گایا تھا جس کے بول تھے ”ساتھی رے او ساتھی رے“۔

مگر افسوس صد افسوس کہ یہ شادی مگر آدھی بھی پروگرام کے مطابق نہ ہوسکی۔ اگرچہ اس کی ساری تیاری مکمل کرلی گئی تھی مگر جانے کس طرح سید امداد علی اور آمنہ لیلیٰ کو اس کی بھنک مل گئی اور وہ دونوں بیٹی کی بغاوت کرنے سے پہلے اسے لے کر بنگلہ دیش چلے گئے۔

اب رونا لیلیٰ کی حقیقی شادیوں یا یوں کہیے مکمل شادیوں کی بات سنیے۔ رونا لیلیٰ کی پہلی شادی جوان کے والدین کی رضامندی سے ہوئی۔ وہ ڈھاکے کی نواب فیملی سے تعلق رکھنے والے خواجہ جاوید قیصر سے ہوئی۔ جاوید قیصر سرکاری طور پر بنگلہ دیش سرکار کے سفیر بھی رہے۔ ان سے رونا لیلیٰ کی اکلوتی اولاد تانی لیلیٰ ہوئی۔ تان سین کی تانی کو پیش نظر رکھ کر رونا لیلیٰ نے اپنی بیٹی کا نام تانی رکھا لیکن تانی کو گانے اور موسیقی کی بجائے پینٹنگ (مصوری) سے دلچسپی رہی۔ البتہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ بنگلہ دیش ٹی وی کے لیے دو تین گیت گائے۔ اب تانی لیلیٰ ماشاء اللہ خود دو بیٹوں زین الاسلام اور آریان اسلام کی ماں بن چکی ہے۔ خواجہ جاوید قیصر کے ساتھ رونا لیلیٰ کی ازدواجی زندگی زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوسکی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دونوں کے موڈ مزاج میں بہت فرق تھا۔ ایک مکمل بیورو کریٹ۔ دوسری مکمل شوبز کی دلدادہ۔ طلاق کے بعد یہ رشتہ ختم ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد رونا لیلیٰ نے ایک سوئس بزنس مین راؤن دانیل کو اپنا ازدواجی ہمسفر بنالیا لیکن اس شخص کو رونا لیلیٰ کی شوبز سرگرمیاں پسند نہ آئیں۔ کچھ دنوں تک دونوں کے تعلقات ناخوشگوار رہے پھر آخرکار 1998ء کو ان کی شادی طلاق تک پہنچ کر ختم ہوگئی۔

پھر اسی سال رونا لیلیٰ بنگلہ دیش کے نامور فلمی ہیرو عالمگیر کی رفیقہ حیات بن گئیں اور اب تک ماشاء اللہ ان کا ازدواجی بندھن برقرار ہے

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بنگلہ دیش میں رونا لیلیٰ پر ایک فلم بھی بنی ہے جس کا نام ’’شلپی‘‘ ہے۔ رونا لیلیٰ کی زندگی پر بننے والی اس فلم میں عالمگیر نے اپنی اہلیہ کے مقابل مرکزی کردار نبھایا ہے۔ اس بنگالی فلم میں رونا لیلیٰ کے گائے ہوئے کچھ پاکستانی فلموں کے گانوں کی جھلکیاں بھی شامل ہیں۔ فلم ’’شلپی‘‘ میں رونا لیلیٰ نے خود اپنے لیے پلے بیک دیا۔ یہ فلم 1993ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

رونا لیلیٰ نے یوں تو بہت ساری اداکاراؤں کے لیے پلے بیک دیا لیکن 1973ء میں پاکستان کے مقبول ترین مزاحیہ اداکار منور ظریف نے بھی رونا لیلیٰ کی آواز کو خود پر نہایت مہارت سے فلمبند کروایا تھا۔ ہدایت کار نذر شباب کی فلم ’’رنگیلا اور منور ظریف‘‘ کے اس ڈوئیٹ سونگ میں احمد رشدی کی آواز رنگیلا پر اور رونا لیلیٰ کی آواز منور ظریف پر زنانہ گیٹ اپ میں فلمائی گئی تھی جس کے بول کچھ یوں تھے۔

’’سا......سانولا چھرو......رے......ریشمی بانہیں......

گا......گاتی جوانی، پا...... پاگل بنائیں۔‘‘

پاکستان میں اپنے آٹھ سالہ فلمی کیریئر میں رونا لیلیٰ نے دھوم مچادی تھی۔ بڑی بڑی اور نامور مستند اور تجربہ کار گلوکاراؤں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ موسیقاروں کی پہلی پسند بن گئی تھی۔ اس دور کی فلموں میں جن اداکاراؤں پر رونا لیلیٰ کے گیت عکس بند ہوئے ان میں صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، شمیم آرا، نیلو، زیبا، شبنم، رانی، نغمہ، دیبا، زمرد، عالیہ، رخسانہ، فردوس، آسیہ، حسنہ، روزینہ، شبانہ، نشو، سنگیتا، کویتا، ممتاز، نسیمہ خان ترنم، زرقا، نگو، فاخرہ شریف، عندلیب، شائستہ قیصر، مینا چودھری، یاسمین خان، چکوری، سلونی، چھم چھم، ماہ پارہ، نیا، عشرت چوہدری، نسو، نبیلہ، عشرت، جہاں، ترانہ، ریحانہ صدیقی، شامل ہیں۔

جن پر رونا لیلیٰ کی آواز میں گیت پکچرائز ہوتے تھے۔ وہ اپنے لیے خوش قسمتی تصور کرتی تھیں اور یہ سمجھتی تھیں کہ اس گانے کی وجہ سے ان کی پرفارمنس قابل قبول ہوں گی۔ آپ کی دلچسپی کے لیے ان میں سے چند چیدہ نغموں کی مثال ضروری ہوجاتی ہے۔

رانی۔ دل دھڑکے میں تم سے یہ کیسے کہوں۔ کہتی ہے میری نظر شکریہ (فلم انجمن)

دیبا۔ ہائے میرا جھمکا کھوگیا سجنا کے بازار میں (فلم نیند ہماری خواب تمہارے)

شبنم۔ تجھ جیسا دغا باز میں نے دیکھا نہیں رے۔ صورت سے تو تو ایسا لگتا نہیں رے (فلم میرے ہمسفر)

روزینہ۔ نغمہ و شعر سے ہے پیار مجھے۔ کب ہے اس دل پہ اختیار مجھے (فلم سوغات)

نشو۔ تکلف برطرف ہم تو سر بازار ناچیں گے (فلم بازار)

فاخرہ شریف۔ جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات (فلم خون ناحق)

نبیلہ۔ لو آگیا محمد ان کا اقرار لیے۔ میرے لیے پیار لیے۔ میں جھوم کر گاؤں (فلم زندگی)

زیبا۔ زندگی کتنی حسین۔ تم اگر دو ساتھ میرا۔ موت سے بھی ڈر نہیں (فلم زندگی کتنی حسین ہے)

عالیہ۔ پکارا جب چلے آؤ۔ محبت ہو تو ایسی ہو (فلم فرض اور مامتا)

کویتا۔ میں نہ کسی سے پیار کروں گی۔ دل نہ کسی پہ نثار کروں گی (فلم دو بدن)

میلوڈی کوئین رونا لیلیٰ نے اپنی گائیکی کو کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں رکھا۔ وہ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی، فوک، غزل، پاپ، ڈسکو اور ہر طرح کے گانے بڑی خوبی کے ساتھ گا سکتی ہیں۔ تاہم گیتوں کی یہ رانی اس ضمن میں کلاسیکل موسیقی کی اہمیت کی قائل ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اسٹیج پر پروگرام کرتے ہوئے نیم رقصاں ہوجاتی ہیں۔ ان کے تھرکتے اور ہاتھوں اور پیروں کی خوش ادا حرکتوں سے حاضرین پر بھی ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھی جھومنے پر مجبور ہوجاتے ہیں مگر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں وہ اپنے شوخ نغموں سے شائقین کے دلوں کو فتح کرلیتی ہیں وہاں ان کے یادگار سریلے مدھ بھرے الیہ نغمے بھی سن کر سامعین ان کی آواز کے سحر میں کھوجاتے ہیں۔

رونا لیلیٰ نے متحدہ پاکستان کے دور میں سب سے پہلے فلم ’’جگنو‘‘ کے لیے پلے بیک دیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں حصوں میں کی گئی تھیں۔ یادش بخیر۔ ڈھاکے میں عطاء اللہ شاہ ہاشمی نے ایک چھوٹا سا ذاتی نگار خانہ بنایا تھا جو ایک دو منزلہ مکان کی چھت پر تھا اور یہ عمارت گلستان سینما سے زیادہ دور نہیں تھی۔ آزاد سینما کے اوپر تھا۔

فلم ’’جگنو‘‘ کا ٹائٹل اسی نام کی چائلڈ اسٹار بے بی جگنو نے انجام دیا تھا جو فلم کے ہدایت کار ممنون حسن خان کی بیٹی ہیں۔ ممنون حسن خان کے بھتیجے قیصر مستانہ (مرحوم) نے بھی اپنے بچپن میں چائلڈ اسٹار اور بڑے ہو کر فائٹ انسٹرکٹر کی حیثیت سے پاکستان فلم انڈسٹری میں خدمت انجام دی ریلیز کے اعتبار سے رونا لیلیٰ کی پہلی فلم ہدایت کار الحامد کی فلم ’’ہم دونوں‘‘ تھی۔ اس فلم میں رونا لیلیٰ کے گائے ہوئے ابتدائی نغمے کی مقبولیت سے اکثر فلم میکرز نے رونا لیلیٰ کی صلاحیتوں کی تعریف کی

اور اس کے نتیجے میں یہ ابھرتی ہوئی گلوکارہ فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔ سرسنگیت کو جاننے اور سمجھنے والے موسیقار اور ہدایت کار بھی دلوں میں اتر جانے والی اس آواز کو اپنی فلموں کا حصہ بنانے لگے۔ اس دور کے بڑے، سینئر اور جید ہدایت کاروں میں داؤد، چاند، لقمان، سید شوکت حسین رضوی، منشی دل، شریف نیر، جعفر شاہ بخاری، ریاض بخاری، شیخ حسن، ایس سلیمان، جمیل اختر، رضا میر، حسن طارق، ریاض شاہد، شباب کیرانوی، خالد خورشید، پرویز ملک، رفیق رضوی (باجو)، فرید احمد، ثقلین رضوی، وحید ڈار، ایم اکرم، کیفی، جعفر ملک، ایم جے رانا، مسعود پرویز، اقبال یوسف، حیدر چوہدری، منور رشید، اسلم ڈار، احتشام، رحمٰن، علی سفیان آفاقی، ظفر شباب، نذرالاسلام، ضیا سرحدی، اے ایچ صدیقی، اسلم ایرانی، یونس راٹھور، مستفیض، دلجیت مرزا، اے جے کاردار، اقبال رضوی، ریاض احمد راجو، رشید اختر، اقبال اختر، اقبال کشمیری، حسن عسکری، الطاف حسین، لئیق اختر، افتخار خان، اقبال شہزاد، یوسف نصر، رضا فاضلی، ایس اے حافظ، نذیر صوفی، فیاض شیخ، رفیق علی راکھن، ابراہیم نفیس، نذر شباب، اے ریاض، راجا حفیظ، یونس راہی، مسعود رضوی، ضمیر انصاری، آغا ریاض گل، ایم اے رشید، ایم اے زاہد وغیرہ نے اپنی فلموں میں رونا لیلیٰ سے نغمہ سرائی کرائی۔ اس جگہ چند ہدایت کاروں کے نغمے جو انہوں نے اپنی فلموں کے لیے رونا لیلیٰ سے گوائے نمونتاً پیش کروں گا کیونکہ سب گیتوں کو اس جگہ شامل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

اقبال یوسف۔ وعدے کر کے صنم کیوں نہ آئے۔ پیار کے خوب وعدے نبھائے (فلم سپیرا)

منور رشید۔ چاند نگر کی میں ہوں رانی۔ روپ سنہرا مست جوانی (فلم روٹھا نہ کرو)

علی سفیان آفاقی۔ میری مرضی میں گاؤں گی۔ میں پائل چھن چھناؤں گی (فلم آس)

نذرالاسلام۔ دنیا کی شرافت دیکھ کے میں نے۔ لاج کا گھونگھرو توڑ دیا (فلم شرافت)

ضیاء سرحدی۔ رات کی اس تنہائی میں۔ بات کریں گے ہم دونوں (فلم شہزادہ سائے)

اے جے کاردار۔ اس مہکے ہوئے گلشن میں یہ پھول کی خوشبو۔ اک میں ہوں اور اک تو (فلم قسم اس وقت کی

ہمراہ شبیر احمد)

شوکت حسین رضوی۔ دیوانہ دل ہوا دیوانہ۔ ہم آج قابو میں نہیں (فلم عاشق)

شریف نیر۔ لائی میں دھنک میں ڈبو کر چنریا۔ جس میں رہیں گے پیا (فلم ناز)

لقمان۔ سنا ہے کہ دل لے کے دیتے ہیں دھوکا۔ مگر مہرباں ہم تو ایسے نہیں ہیں (فلم محل)

جعفر شاہ بخاری۔ آواز دو انصاف کو آواز دو۔ ہر دل میں کھوٹ بھرا ہے (فلم عورت اور زمانہ)

ایس سلیمان۔ اگر کوئی پوچھے بہاروں کا مطلب۔ بتا دوں گا تیری اداؤں کا نام (فلم محبت ہمراہ احمد رشدی)

رضا میر۔ موسم بہار کا ہے من کے سنگھار کا ہے۔ آجا رے آجا بالما (فلم آسرا)

اقبال اختر۔ جرا ٹھمکے ٹھمکا لگا گوریے۔ کہ آج میرے گھنگرو میں پیار چھنکے (فلم نادان ہمراہ احمد رشدی)

آغا ریاض گل۔ ہم بھی دیکھیں گے۔ آپ کب تک بے رخی فرمائیں گے (فلم ملاپ)

فن کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک لوگ آتے ہیں اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے پھول کھلاتے ہیں۔ جس طرح گلشن میں ہر رنگ کے پھول ہوتے ہیں اسی طرح فنکاروں کا بھی اپنا اپنا رنگ روپ، چھب اور چمکار ہوتا ہے۔ آواز کا جادو جگانے والی نمکیل آوازوں میں برصغیر میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور ہیں۔ گائیکی کی تاریخ میں جن کا نام رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ رہے گا۔ رونا لیلیٰ بھی ایسی ہی گلوکاراؤں کی... صف اوّل میں موجود ہیں۔ فن کوئی بھی ہو، اللہ کی دین ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ رونا لیلیٰ کو یہ عطیہ خداوندی بڑی فراخدلی سے ملی ہے۔ نوعمری سے اس نے گانا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کے گلے کے نور سے آرٹ اور کلچر کی دنیا منور ہونے لگی۔

1966ء میں کراچی سے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کرنے والی یہ گلوکارہ اپنے کیریئر کی گولڈن جوبلی مکمل کر چکی ہے اور اس دوران نہ صرف پاکستان بلکہ بنگلہ دیش اور بھارتی فلمی صنعت میں اپنے فن کی دھوم مچا چکی ہے۔ آج وہ ماشاء اللہ 65 برس کی ہو چکی ہیں مگر ان کی آواز کی وہی کھنک اور اس میں موجود نغمگی کی تازگی ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ ان کی اس خداداد صلاحیت کی بنا پر انہیں بلبل بنگال، میلوڈی کوئین اور سرسنگیت کی رانی کے خطابات ملے۔ وہ ایسی خوش نصیب گلوکارہ ہیں جن کی زندگی میں ان کی فنی زندگی کو مدِنظر رکھ کر ایک فلم بنائی گئی ہے۔ جس کا ذکر ابتداء میں کر چکا ہوں۔ یہ فلم بنگلہ دیش میں بنگلہ زبان میں بنائی گئی اور اس کا نام شلپی (یعنی فنکارہ) ہے اس فلم میں انہوں نے خود اپنا مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

1966ء سے شروع ہونے والی گلوکاری کا یہ پاکستانی سفر 1973ء میں پاکستان میں ختم ہو گیا۔ اس مختصر مدت میں اس گلوکارہ نے شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ اس دوران انہوں نے تقریباً 250 پاکستانی فلموں کے لگ بھگ 600 گانے گائے۔ جن میں اردو فلموں کی تعداد 160 ہے جن کے 350 سے زائد نغمات انہوں نے ریکارڈ کرائے جب کہ سندھی فلموں کی تعداد 25 ہے جن میں کم و بیش 90 گیت اس بنگالی گلوکارہ نے ریکارڈ کرائے۔ رونا نے تقریباً 55 پنجابی فلموں کے لیے کم و بیش 150 گیت گائے۔ ان کے کچھ گجراتی فلموں کے گانے بھی مشہور ہوئے ہیں۔

فلمی گانوں کے علاوہ رونا لیلیٰ نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کے لیے متعدد گیت اور غزلیں بھی گائی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

☆ عزیز اتنا ہی رکھو کہ دل بہل جائے۔ اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

☆ خیال و خواب ہوئی ہیں محبتیں کیسی

☆ تیری زلفیں کھل گئی ہیں شام سے پہلے۔ اک نشہ سا چڑھ گیا ہے جام سے پہلے

رونا لیلیٰ کے بہت سے گیت جو انہوں نے پاکستان میں رہتے ہوئے گائے تھے، وہ ان کے بنگلہ دیش جانے کے بعد مختلف اوقات میں مختلف فلموں کے ساتھ ریلیز ہو کر مقبول ہوئے۔ پاکستانی گلوکارہ کی حیثیت سے رونا لیلیٰ کی آخری فلم ''انوکھا پیار'' ہے۔ پہلے اس فلم کا نام ''کیسی محبت کیسا پیار'' رکھا گیا تھا۔ جو بدل کر ''انوکھا پیار'' کر دیا گیا۔ یہ ہدایت کار ایم اے زاہد کی فلم تھی جو طویل عرصے تک عکس بندی کی تکمیل میں التواء کی وجہ سے کافی تاخیر سے مکمل کی گئی۔ اس کی نمائش تقریباً 20 سال بعد 1994ء میں ممکن ہو سکی۔ یہ موسیقار خلیل احمد کی بھی آخری فلم ثابت ہوئی۔ خلیل احمد کی موسیقی میں ترتیب دیا ہوا یہ نغمہ رونا لیلیٰ نے

مہدی حسن کے ہمراہ گایا تھا۔

جسم کو پھول کہوں
آنکھ کو میخانہ کہوں

اسی طرح رونا لیلیٰ نے ہدایت کار داؤد چاند کی آخری فلم ''مٹیکھا'' کے لیے تین گیت ریکارڈ کرائے تھے۔ یہ فلم 1975ء میں ریلیز ہوئی۔ اس سے بہت پہلے وہ بنگلہ دیش جا چکی تھیں۔ اپنے نوجوان قارئین کو یہ بتاتا چلوں کہ داؤد چاند پاکستان کی اوّلین فلم ''تیری یاد'' کے ہدایت کار تھے۔ یعنی پہلی فلم سے لے کر مٹیکھا تک فلم انڈسٹری کی خدمت کرتے رہے۔

ہمارے ہدایت کار اور موسیقار اپنی پنجابی فلموں میں بھی اس اعتماد کے ساتھ رونا لیلیٰ کے گانے شامل کرتے تھے کہ اس سے ان کی فلموں کی مقبولیت بڑھے گی۔ پنجابی فلموں کے شومین حیدر چوہدری اور ان کے موسیقار جی اے چشتی نے اپنی پنجابی فلم ''بھولے شاہ'' کے سات نغمات رونا لیلیٰ کی دلکش آواز میں صدا بند کیے تھے۔ یہ 1970ء کی بات ہے۔ اسی طرح اردو فلم ''آؤ پیار کریں'' کے لیے موسیقار ایم اشرف نے بھی اس فلم کے لیے سات گانے رونا لیلیٰ کی آواز میں ریکارڈ کیے تھے۔ یہ فلم 1972ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

رونا لیلیٰ کہنے کو تو پاکستان سے بنگلہ دیش چلی گئی تھیں مگر ان کی طلسمی آواز پاکستان میں گونجتی رہی۔ رونا لیلیٰ کے جانے سے جہاں موسیقاروں اور ان کے پرستاروں کو گویا ایک انمول ہیرے کی گمشدگی کا دکھ ہوا وہاں بہت سی گانے والیوں نے سکھ کا سانس لیا کہ اب موسیقار ان کی طرف بھی توجہ دیں گے۔ جس طرح اچھی صورت سب کو اچھی لگتی ہے اسی طرح اچھی آواز بھی آواز کے جوہریوں کو اچھی لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے رونا لیلیٰ کی موجودگی میں موسیقاروں کی اوّلین پسند رونا لیلیٰ ہی ہوتی تھیں۔ سرسنگیت کی ملکہ مادام نور جہاں کو بھی بہت سے موسیقار ہائی پاس کر کے رونا لیلیٰ کا انتخاب کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ رونا لیلیٰ کی آواز ہی نہیں گائیکی کے ہر فن میں ان کا مشاق ہوتا تھا۔ کیسی ہی مشکل کمپوزیشن کیوں نہ ہو رونا لیلیٰ موسیقار کی توقعات سے بڑھ کر گاتی تھیں۔ سرسنگیت کے پنڈتوں کا کہنا ہے کہ رونا لیلیٰ جیسی مہان گانے والیاں مدتوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ رب العالمین سینکڑوں ہزاروں گانے والیوں میں سے کسی

پروفیسر سید اقبال عظیم

(1913-2000)

1913 میں معروف غزل گو شاعر سید مقبول عظیم عرش کے ہاں میرٹھ میں سید وقار عظیم کے بعد دوسرے بیٹے سید اقبال عظیم پیدا ہوئے۔ دونوں پروفیسر، ادیب اور شاعر بنے۔ سید وقار عظیم ''ماہِ نو'' کراچی کے مدیر، محقق اور استاد تھے۔ سید اقبال عظیم کا اہم کارنامہ 1954 میں کی گئی تحقیق ''مشرقی بنگال میں اردو'' محققین کے لیے بنیادی ماخذ ہے جس سے وفا راشدی، ڈاکٹر ہارون الرشید اور کسی حد تک راقم نے بھی حوالہ در حوالہ استفادہ کیا۔ پاکستان کے معماروں کی سوانح ''سات ستارے'' ان کی دوسری اور ''چراغِ آخرِ شب'' تیسری کتاب ہے۔ آپ اعلیٰ پائے کے شاعر اور بہترین معلم تھے۔ 22 ستمبر 2000، کراچی میں وفات پانے والے سید اقبال عظیم سخی حسن قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

☆☆☆

عالم تاب تشنہ

میرٹھ میں 10 جولائی 1935 کو پیدا ہونے والے سید عالم تاب علی کو شعر و ادب کی دنیا میں عالم تاب تشنہ اور تشنہ عالم تاب دونوں طرح سے پکارا جاتا ہے۔ میرٹھ سے کامرس میں پوسٹ گریجویشن (ایم کام) کیا۔ اپریل 1959 میں پاکستان آئے۔ مئی 1959 سے لاہور کے ترقیاتی ادارے میں چیف اکاؤنٹنٹ مقرر ہوئے۔ اکتوبر 1959 کو ان کی خدمات محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ نے لے لیں۔ 1967 میں تربیتی پروگرام کے لیے امریکا بھیجے گئے۔ اوا اینڈ ایم ڈپلوما کیا۔ کنکٹی کٹ اور مشی گن کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ کی سندیں حاصل کیں۔ چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ نے فیلوشپ کا اعزاز دیا۔ کراچی روڈ ٹرانسپورٹ کے جنرل منیجر (انجینئرنگ و آپریشن) رہے۔ 1950 سے 1958 تک بھرپور شاعری کی پھر 1970 سے شعرائے کراچی میں ازسرِنو متحرک ہوئے۔ 1978 میں ''موج موج تشنگی'' پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ایک مجموعہ ''آئینے کے اس طرف'' بھی بعد میں شائع ہوا۔ عالم تاب تشنہ کی وفات 11 مئی 1991، کراچی میں ہوئی۔ کراچی کے سوسائٹی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ دبستانوں کا دبستان کراچی جلد دوم میں آپ کی تاریخ ولادت 20 اپریل 1935 اور وفات 12 مئی 1991 کراچی لکھی ہے۔ اردو غزل (انتخاب) میں ولادت 20 اپریل 1935 درج ہے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقرا و سٹی، کراچی

ایک کو خصوصی طور پر نوازتا ہے اور ایسی پُر نور آواز بخشتا ہے جس سے ایک عالم کے دل و دماغ کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ رونا لیلیٰ خود بھی کہتی ہیں۔

''میری آواز میرے لیے اللہ کا بہت بڑا انعام ہے جس کے لیے میں جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ میں گانے کو گانا سمجھ کر نہیں، عبادت سمجھ کر گاتی ہوں تاکہ بندگانِ خدا کو سکون اور اطمینانِ قلب نصیب ہو۔ میری آواز سن کر وہ اپنے دکھ درد بھول جائیں۔''

نظیر صدیقی نے کہا تھا۔

رائیگاں نہیں جاتی دل پہ جو گزرتی ہے
آدمی بکھرتا ہے شاعری نکھرتی ہے

اکثر فنکاروں کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ فن کو نکھارنے سنوارنے والا خود بکھر جاتا ہے۔ اس کی اپنی زندگی کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ عزت، شہرت اور دولت کی فراوانی کے باوجود رونا لیلیٰ کی اپنی ازدواجی زندگی بھی جو تزلزل اور انتشار کا شکار رہی۔ شوبز کے بہت سے لوگ ایک ہی شریکِ حیات کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے مگر رونا لیلیٰ کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کی پہلی شادی اس کے بیورو کریٹ باپ نے اپنی مرضی اور اپنی پسند سے اپنے ہی اسٹیٹس کے شخص کے ساتھ کرائی تھی۔ خواجہ جاوید قیصر سرکاری طور پر اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ رونا لیلیٰ نے والدین کی پسند اور فیصلے پر سر تسلیم خم کیا۔ خواجہ جاوید قیصر سے شادی کر لی مگر دونوں کے موڈ مزاج میں بڑا فرق تھا۔ ایک میں حاکمیت کی خو بو تھی۔ دوسرے کو دلوں پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت حاصل تھی۔ شوہر ہونے کے ناطے جاوید قیصر کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ اس کی بیوی کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزرے۔ مردوں کے جھرمٹ میں رہے۔ اسٹیج پر اپنے جلوے لٹائے لیکن رونا لیلیٰ کے لیے تو یہ سب کچھ اس کے پروفیشن کا لازمی جز تھا۔ وہ خواجہ فیملی کی دیگر خواتین کی طرح محض خاتونِ خانہ بن کر گھر کی چار دیواری میں قید کیسے رہ سکتی تھیں؟ یہ اور ایسی ہی دیگر باتوں کے اختلاف کی وجہ سے دونوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی رہی اور ایک دن طلاق کے تین بولوں کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

دونوں نے سکون کا سانس لیا کہ روز روز کی چخ چخ سے جان چھوٹی۔ رونا لیلیٰ کی فنی سرگرمیاں جاری رہیں۔ دوبارہ گھر بسانے کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا مگر کچھ دنوں کے بعد ایک غیر ملکی پرستار ان کے بہت قریب آ گیا۔ یہ ایک سوئس تاجر تھا۔ راؤن دانیل، رونا نے یہی سمجھا کہ ایک ایسا بندہ جو ایشیائی نہیں ہے وہ بھی اس کی گائیکی کا شیدائی ہے۔ وہ اسے ایک پرستار سمجھ کر اس کی خواہش پر اس سے ملتی جلتی رہیں لیکن ایک دن جب اس نے انہیں پرپوز کر دیا تو وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ ان کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ سوئس بزنس مین ان سے شادی کا خواہش مند ہے۔ انہوں نے اسے یہ بتانے کی اور سمجھانے کی بڑی کوشش کی کہ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ ہی کافی ہے مگر وہ نہ مانا۔

''دوست اور لائف پارٹنر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

''اسی لیے تو میں کہتی ہوں۔ اتنا بڑا فیصلہ نہ کرو۔''

''مگر وہ فیصلہ تو میں کر چکا ہوں۔''

''تمہارے اس فیصلے پر شاید میں پوری نہ اتر سکوں۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ایک اچھے لائف پارٹنر کی طرح خوش رکھوں گا۔'' راؤن دانیل کسی طرح بھی نہ مانا تو وہ اس کی شریکِ زندگی بننے پر رضامند ہو گئیں۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک تو وہ نارمل رہا پھر اس بات پر ضد کرنے لگا۔

''میری لیلیٰ! یہ گانا بجانا چھوڑ دو اور زندگی کو صحیح معنوں میں انجوائے کرو۔ چلو ہم دونوں سوئٹزرلینڈ چل کر زندگی کا بھرپور لطف اٹھائیں۔ گا کر پیسا کمانے کی کیا ضرورت ہے؟ میرے پاس بہت دھن دولت ہے۔''

رونا ہنس دی۔ ''میرے مجنوں کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں پیسوں کے لیے گاتی ہوں؟''

''پھر کس لیے گاتی ہو؟''

''یہ گانا بجانا تو میری زندگی ہے جس طرح تم بغیر کھائے پیے زندہ نہیں رہ سکتے اسی طرح میں بغیر گائے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''اگر یہ بات ہے تو...... تو تم اپنے گھر میں بھی گا لینا۔ سوئٹزرلینڈ میں رہ کر بھی اپنے گانے بجانے کا شوق پورا کر لینا۔''

''مگر میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔''

''کیوں کیا مجبوری ہے؟''

''یہ میری جنم بھومی ہے۔ مجھے اپنے وطن کی مٹی سے محبت ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔''

''کیا رکھا ہے تمہاری اس جنم بھومی میں؟ تمہارے اس وطن میں سیلاب طوفان تباہی و بربادی ہر طرف ننگے بھوکے لوگ۔ آئے روز بدلتی حکومتیں۔ چھوڑو اس مسائلستان کو اور چلو اس ارضی جنت میں جسے سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں، اگر قدرت تمہیں جیتے جی جنت میں جانے کا موقع دے رہی ہے تو اسے ٹھکرا کر کیوں کفرانِ نعمت کر رہی ہو؟''

''اگر ماں بیمار پڑ جائے تو کیا اس کی اولاد اسے اس کے حال پر چھوڑ کر عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کہیں اور چلی جائے؟ تمہارے مغربی معاشرے میں تو ایسا ہو سکتا ہے مگر ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔ یہ وطن یہ میری جنم بھومی۔ میری ماں ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کسی دنیاوی جنت میں نہیں جا سکتی کیونکہ ہماری جنت تو ہماری ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔''

کچھ دنوں تک راؤن دانیل اپنی سی کوشش کرتا رہا مگر رونا لیلیٰ اس کے ساتھ اس کے دیس منتقل ہونے پر رضامند نہیں ہوئی۔ دونوں کے رشتوں میں آہستہ آہستہ دراڑیں سی پڑنے لگیں۔ آخر ایک دن رونا لیلیٰ نے کہہ دیا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا۔ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ ہی کافی ہے۔ میں بیوی کے طور پر تمہارے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اب بھی یہی کہوں گی کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے اس رشتے کو ہی ختم کر دو جو ہمارے درمیان فساد کی جڑ بنا ہوا ہے۔''

''ہاں! اب میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ تم جیسی ضدی عورت کے ساتھ یہ رشتہ برقرار نہیں رہ سکتا۔''

اور ایک دن دونوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ 1998ء کی بات ہے جب رونا لیلیٰ نے اپنے غیر ملکی مجنوں سے اپنی جان چھڑائی تھی۔ اس سال کو رونا لیلیٰ بہت اہمیت دیتی ہیں کیونکہ نہ صرف اس برس بے جوڑ رشتے سے ان کی جان چھوٹی بلکہ وہ ایک ایسے پیار کے بندھن میں اسی سال بندھ گئیں جو پیار انہوں نے اپنے دل میں کئی برسوں سے چھپا رکھا تھا۔ یہ عالمگیر تھا۔ بنگالی فلموں کا نامور ہیرو۔ اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ کر ان کی برسوں کی بے قراری کو قرار آ گیا۔

رونا لیلیٰ کو یہ ہیرو اس وقت سے اچھا لگنے لگا تھا جب انہوں نے 1993ء میں ان کی زندگی پر بننے والی فلم ''شلپی'' میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران اس کی باتیں اس کی عادتیں اس کا ایک ایک انداز اس کی ایک ایک ادا ان کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ جب بھی وہ تنہا ہوتیں۔ انہیں عالمگیر یاد آ جاتا۔ ایک عرصہ تک وہ انہیں اسی طرح تڑپاتا رہا۔ پہلی بار ان کے دل میں کسی نے اپنے پیار کی جوت جگائی تھی۔ پہلی شادی انہوں نے ماں باپ کی پسند پر کی۔ دوسری شادی غیر ملکی مجنوں کی ضد پر کی اور اب ان کا دل چاہتا تھا وہ ایک شادی اپنے دل کے کہنے پر اپنے بے قرار دل کو قرار دینے کے لیے کر لیں۔ ان کے دل کی اس بے قراری نے انہیں اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہیں دیا جب تک انہوں نے عالمگیر کو اپنا حقیقی ہیرو نہیں بنا لیا۔ اس شادی کو حقیقی معنوں میں خانہ آبادی کہا جا سکتا ہے۔ ماشاء اللہ 20 برس سے دونوں خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دونوں ایک ہی فیلڈ اور ایک ہی ماحول کے پروردہ ہیں اس لیے ان کے موڈ مزاج میں بھی ہم آہنگی ہے۔ دونوں اس رشتے پر ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ دو سابقہ شادیوں کے دوران رونا لیلیٰ کو ازدواجی زندگی کا وہ سکون نہیں ملا جس کے لیے شادی کی جاتی ہے کیونکہ اس کے دونوں سابقہ شوہر کی سوچ اور موڈ مزاج میں ہم آہنگی نہیں تھی۔

اب تک کی اطلاع کے مطابق رونا لیلیٰ عالمگیر سے خوش ہیں اور عالمگیر رونا لیلیٰ سے خوش ہے۔ دونوں شاد اور آباد ہیں۔ رونا لیلیٰ کی نئی سرگرمیوں کے لیے ان کا ذہنی طور پر پُرسکون ہونا بہت ضروری ہے۔ آج بھی اگر وہ اپنی گائیکی کے حوالے سے تر و تازہ ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہیں اپنے گھر اور گھر والے کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کوئی ڈسٹربنس نہیں ہے۔

رونا لیلیٰ اب اگرچہ زیادہ تر لندن میں رہتی ہیں مگر بنگلہ دیش آتی جاتی رہتی ہیں اور اپنی فنی پرفارمنس کے حوالے سے بھارت اور پاکستان کے دورے بھی کرتی رہتی ہیں۔ پاکستان سے ان کا بنیادی فنی رشتہ ہے۔ یہیں سے انہوں نے پلے بیک گلوکاری کا آغاز کیا اور یہیں کی فلموں میں گا کر عزت اور شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔ جس کا وہ خود بھی برملا اظہار کرتی ہیں۔

اس تحریر کے آخر میں ہم ان کے مزید مقبول اور دل میں گھر کر جانے والے نغموں کی یاد تازہ کریں گے کیونکہ جب ہم ان کے ٹاپ ٹین نغموں کا انتخاب کر رہے تھے تو

ہمیں بڑی دشواری پیش آئی تھی کہ کسے منتخب کریں اور کسے چھوڑ دیں۔

☆ نہ جھٹکو ہاتھ کرو کچھ بات کہ دل کو چین نہیں آتا (فلم نازنین)

☆ ننھی منی گڑیا رانی ایک پہیلی بوجھو نا (فلم عندلیب)

☆ ہم نے دنیا بدل دی تمہارے لیے۔ اور تم ہو کہ کوئی بھروسا نہیں (فلم جیب تراش)

☆ ساتھی ساتھ نبھانا رے۔ دل کو توڑ نہ جانا رے (فلم من کی جیت)

☆ ہمیں آج اپنا بناؤ تو جانیں (فلم پازیب)

☆ جانے والے نے یہ بھی نہ سوچا۔ ہم اکیلے ہی رہ جائیں گے (فلم دشمن)

☆ نیناں لڑ گئے سالوریا سے (فلم فرض اور مامتا)

☆ تیرا نخرہ دخرہ جانتی ہوں میں۔ تو ہے دغاباز (فلم نازنین)

☆ جو بھی غم ملتا ہے اشکوں میں چھپا لیتے ہیں (فلم سوغات)

☆ نگاہوں میں سماجانے کے دن ہیں (فلم عاشق)

☆ تو جیسا بھی ہے سالوریا۔ میرے نینوں کو بھایا۔ میرے من میں سمایا (فلم آسرا)

☆ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا۔ جھکی جھکی اڑتی گھٹا (فلم احساس)

☆ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی پیار میں کیا رکھا ہے۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ جاؤ کھیلو یہ لو جھنجنا (فلم اصول)

☆ تیز ہوئی ہے دل کی دھڑکن۔ جانے کیوں؟ (فلم جال)

☆ تیرے قدموں کی دھول پیا۔ بن کے رہوں گی (فلم جانور)

☆ اپنے پرائے چھوڑ چلے ہم۔ سکھیوں سے منہ موڑ چلے (فلم دیا اور طوفان)

☆ آ میرے جان چمن آ۔ آ میرے شیریں سخن آ (فلم جیمس بونڈ)

☆ ایک تو یہ بھرپور جوانی۔ اس پہ ہار سنگھار (فلم ندیا کے پار)

☆ ہم بھی دیکھیں آپ کب تک۔ بے رخی فرمائیں گے (فلم ملاپ)

☆ دل کی تمنا ہے یہ خدایا۔ تھام لے کوئی ہاتھ ہمارا (فلم سالگرہ)

☆ گھر کو جنت بنا کر دکھائیں گے ہم۔ یہ فسانہ حقیقت میں لائیں گے ہم (فلم میری بھابی)

☆ آجا تیرے پیار میں ہے دل بے قرار۔ یہ پیاسی نگاہیں کریں تیرا انتظار (فلم صاعقہ)

☆ ان کی نظروں سے محبت کا جو پیغام ملا (فلم ہم دونوں)

☆ گھر آنے والا ہے اک انجانا۔ دیکھا نہ بھالا ہے (فلم تہذیب)

☆ ہولے ہولے پون چلے۔ ڈولے جیارے (فلم السلام علیکم)

☆ وعدے کرکے صنم کیوں نہ آئے۔ پیار کے خوب وعدے نبھائے (فلم اک پہیلا)

☆ تکلف برطرف ہم تو سربازار ناچیں گے (فلم بازار)

☆ جب پیار کسی سے ہوتا تو ہوتا ہے یہ انجام (فلم بے ایمان)

☆ کھنکے پائل چھنکے گھنگرو۔ تجھ سے میں کیسے کہوں (فلم چاہت)

☆ کاٹے نہ کٹے رے رینا انتظار میں (فلم امراؤ جان ادا)

☆ او میرا بابو چھیل چھبیلا میں تو ناچوں گی (فلم من کی جیت)

رونا لیلیٰ کے ان کے علاوہ بھی بہت سے سدا بہار گانے پنجابی، سندھی اور گجراتی زبان کے ہیں جو اس وقت شامل نہیں کیے جا رہے ہیں جب کہ بنگالی اور انڈین گیت ان کے علاوہ ہیں۔ آج بھی اس عمر میں بھی وہ جو کچھ گاتی ہیں اور موسیقی کی محفلوں میں پرفارم کرتی ہیں، سماعت میں شہد ٹپکاتی ہیں سامعین پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ ان کی خداداد آواز کا جادو اب تک برقرار ہے۔ میں انہی کے گائے ہوئے گیت جو انہوں نے شباب کیرانوی کی سپر گولڈن جوبلی فلم ''آئینہ اور صورت'' کے لیے گایا تھا کو دہرا کر انہیں دعا دوں گا۔

مسکراتی رہو یونہی تم تم تم
پھول بن کر کھلو چاند بن کر ہنسو
جگمگاتی رہو یونہی تم تم تم

آتشی موت

عاقب اشعر

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی توجیہ ممکن نہیں۔ کتنا ہی عقل کی کسوٹی پر پرکھیں لیکن عقل حیران کی حیران رہتی ہے۔

مغرب سے برآمد عجیب وغریب واقعات

رات کے آٹھ بجے 60 سالہ گریس پٹ نے اپنی پلیٹ میں بچے ہوئے روسٹڈ آلو کے آخری ٹکڑے کو منہ میں رکھا اور نیپکن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بیٹی جینی کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔ جینی کو معلوم تھا اب اس کی ماں 10 بجے تک اپنا پسندیدہ جاسوسی ناول پڑھے گی۔ اسے ختم کرکے ہی سونے کے لیے اوپر بنے بیڈ روم کا رخ کرے گی۔

''جینی میرا انتظار مت کرنا تمہیں صبح جلدی اٹھنا ہوتا

ہے۔ اس لیے سوجانا میں 10 بجے تک سونے کے لیے آؤں گی۔" بوڑھی گریس نے بیٹی کو بتایا۔

"او کے مام لیکن آپ بھی کوشش کرنا کہ جلدی آجائیں۔" جینی نے ماں سے کہا۔

گریس سر ہلاتی ہوئی اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئی۔

10:15 بجے گریس جب بیڈ روم میں داخل ہوئی تو جینی گہری نیند میں تھی۔ گریس نے بستر کا رخ کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس وقت اسے ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی جیسے کسی چیز کی کمی ہو پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس نے تو آج پائپ ہی نہیں پیا۔ پچھلے 10 برس سے اس کی عادت تھی کہ رات سونے سے پہلے وہ نیچے آتی اور آتش دان کے سامنے آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر پائپ سے لطف اندوز ہوتی۔ پچھلے کتنے ہی سالوں سے تعطل نہیں آیا تھا۔ آج نہ جانے کیسے وہ پائپ پینا بھول گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پائپ پیے بغیر اسے نیند نہیں آئے گی سو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ بستر کے ساتھ والی میز پر دھرے پائپ میں تمبا کو بھرا اور بستر سے اتر آئی۔ سنبھل سنبھل کے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ کچھ گنگنا رہی تھی۔

باہر سامنے والے لان میں بے تحاشا پھول کھلے تھے ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ بہار اپنے جوبن پر تھی۔ سب کچھ اپنے معمول کے مطابق تھا۔ گریس آنے والے وقت سے بے خبر سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سامنے آرام کرسی اسی کی منتظر تھی اور شاید موت بھی!

☆......☆

صبح جینی جب اپنے بال باندھتی سیڑھیاں اتر رہی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا منظر اس کا منتظر ہوگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا اور حواس مختل ہو رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ماں سامنے زمین پر پڑی ہوئی ہے۔

اس کا سر آتش دان کے پاس تھا جب کہ جسم آتش دان کے ساتھ والے سنگی فرش پہ پڑا تھا۔ جب کہ ٹانگیں لکڑی کے مرکزی فرش پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے خشک لکڑی کا تنا پڑا سلگ رہا ہو۔ اوپری جسم جل کر انگاروں کا ایسا ڈھیر لگ رہا تھا جو اوپر سے تو سفید راکھ سے ڈھکا ہو لیکن اندر سے دہک رہا ہو۔ سر، بازو اور ٹانگیں بھی جلنے سے متاثر ہوئی تھیں۔

حیرت انگیز طور پر آتش دان میں آگ نہ تھی۔ قریب ہی رکھے ایک ریک میں موم بتی مکمل طور پر جل کر موم کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ بوڑھی گریس کے جسم کی چربی پگھل کے آتش دان کے سامنے والے سنگی فرش کے پتھروں پر ایسے چپک گئی تھی کہ اسے بعد میں کھرچ کے اتارنا پڑا۔

سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ پورے فرش پر جلنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ قریب پڑے اخبارات بالکل محفوظ تھے جیسے کمرے میں کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

جلنے سے ہونے والی اموات میں مرنے کی وجہ عموماً دھواں پھیپھڑوں میں بھر جانا ہوتی ہے لیکن اس کیس میں دھوئیں کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ بالکل انکاری تھی۔ موت کا پتا جینی کو لاش دیکھ کر ہی ہوا۔ اس بات کے شواہد بھی ہیں کہ اس رات کچھ اور لوگ بھی گھر میں تھے لیکن کسی کو آتش زنی کی خبر نہ ہوئی۔

اس کیس پر تحقیق کرنے والے ایک رکن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آتش دان میں آگ کے کوئی آثار نہیں ملے۔ لکڑی کے فرش پر آگ سے جھلسنے تک کے نشان نہ تھے لیکن بوڑھی گریس کی ہڈیاں تک جل چکی تھیں۔

☆......☆

4 مارچ 1980ء دوپہر 12:30:

ٹونی میک من کو ایک فون کال موصول ہوتی ہے۔ آفیسر کالونی میں ایک گھر میں آتش زدگی کی اطلاع ہے۔ ممکنہ طور پر کسی جانی نقصان سے بچنے کے لیے فوری جائے حادثہ پر رپورٹ کریں۔

ٹونی گزشتہ سات برسوں سے لینکشائر فائر بریگیڈ سے منسلک تھا اور اس طرح کی کال کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ جب ٹونی جائے حادثہ پر پہنچا تو وہ بہت ساری آگ اور دھواں دیکھنے کی اُمید کر رہا تھا مگر حیرت انگیز طور پر متاثرہ مکان آگ اور دھوئیں سے یکسر خالی تھا۔ موقع پر موجود ایک پولیس آفیسر نے ٹونی کو بتایا کہ ایک بوڑھی عورت اس مکان میں اکیلی رہتی ہے اور جو کچھ تم اگلے چند لمحوں میں دیکھنے والے ہو اس پر یقین بھی کرنا۔

ٹونی دھڑکتے دل کے ساتھ مکان میں داخل ہوا اور جو کچھ اس نے دیکھا اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھے۔ بوڑھی عورت کا بالائی جسم آتش دان کے پاس پڑا تھا جب کہ اس کا زیریں جسم قالین پر بکھرا ہوا تھا۔ گھٹنوں سے سر کے بالوں تک سارا جسم راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا لیکن گھٹنوں سے پاؤں کی انگلیوں تک جسم بالکل صحیح سلامت

تھا۔ حتیٰ کہ اس عورت نے جو جرابیں پہن رکھی تھی وہ بھی ہر قسم کے نقصان سے محفوظ تھیں۔ لاش کے عین اوپر چھت کے علاوہ پورے کمرے میں آگ یا دھوئیں کے کوئی آثار نہ تھے۔ ٹونی نے اپنے بیان میں لکھا کہ اس سے پہلے میں نے اس قسم کا کوئی حادثہ نہیں دیکھا۔ آتش زدگی سے متاثرہ لاشیں اس سے بری حالت میں دیکھنے کو ملیں مگر ان کے اردگرد کمرے کی اشیاء بھی سلامت رہی ہوں ایسا پہلی بار دیکھنے کو ملا تھا۔ متذکرہ بالا یہ دونوں واقعات بھی ان بے شمار واقعات میں شمار ہوتے ہیں جن کی کوئی عقلی یا سائنسی توجیح پولیس، فائر بریگیڈ یا فرانزک سائنس ماہرین پیش نہ کر سکے۔ آتش زدگی کے ایسے پُراسرار کیسوں کو جلنے کی وجہ سے فوری موت یا spontancous human combustion یا SHC کا نام دیا گیا۔

SHC کا سب سے پہلا کیس 26 جون 1613ء کو کرائسٹ چرچ میں رپورٹ ہوا جب ایک بدقسمت بوڑھی جان ہچن رات کو اپنی بیوی کے ساتھ سویا تو آدھی رات کو ایک دھماکے کے ساتھ اس کا جسم آگ سے بھڑک اٹھا۔ گویا خشک لکڑی کے تنے سے آگ کی لپٹیں پھوٹ رہی ہوں۔ اس کی بیوی نے اپنی ماں کی مدد سے اسے گھسیٹ کر گھر سے باہر نکالا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی لاش تین دن تک گلی میں پڑی جلتی رہی۔ آخر جب سب کچھ راکھ ہوگیا تو آگ خود ہی بجھ گئی۔

اس سے پہلے تاریخ SHC کے بارے میں خاموش ہے ایسا شاید سترہویں صدی سے قبل مواصلاتی نظام اور رپورٹنگ کے ناقص نظام کی وجہ سے ہے یا صنعتی ترقی سے ہونے والی جینیاتی یا موسمیاتی تبدیلیاں آنے والے وقتوں میں اس طرح کے واقعات کا محرک بنیں۔

ان واقعات کی حقیقت بیان کرنے کے لیے ماہرین نے سب سے پہلے یہ رائے قائم کی کہ کثرت شراب نوشی اس کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ الکوحل انسانی جلد کی اوپری سطح کے خلیوں میں سرائیت کر جاتا ہے اور جب آگ جلد کے قریب لائی جائے تو یہ الکوحل آگ پکڑ لیتا ہے لیکن اس پر تحقیق کرنے والوں نے اس تھیوری کو یہ کہہ کر بالکل بوگس قرار دے دیا کہ شراب انسانی جلد میں سرائیت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور ایسے واقعات کی وجہ کچھ اور ہے۔

پہلی رائے کی صحت سے انکار ہوا تو تحقیق کے نئے در وا ہو گئے۔ مختلف ماہرین نے اپنی اپنی توجیہات پیش کیں مگر

ثناء الحق صدیقی

(1919-1994)

شاعر، ادیب، محقق، نقاد اور مترجم استاد پروفیسر ثناء الحق صدیقی کے بارے میں کیا لکھوں راقم جب مشرقی پاکستان سے کراچی آئے تو یہاں کے ادبی منظر نامے پر بے شمار اہل علم و فن باحیات تھے۔ 1978 میں آمنہ ہائی اسکول میں فاضل اردو کی کلاس کے طالب علم تھے۔ زندگی میں جن بزرگوں کے دیکھنے سے دل میں محبت کے جذبات امڈ آئے ایسے لوگوں میں ثناء الحق صدیقی کا نام بھی آتا ہے۔ جن لوگوں نے "العلم" سہ ماہی کا مطالعہ کیا ہے وہ لوگ جانتے ہیں کہ ثناء الحق صدیقی شاعر، ادیب، نقاد اور مترجم ہونے کے ساتھ علمی و ادبی کتابوں پر تبصرہ بھی کرتے تھے۔ جب "پاکستان کے نعت گو شعراء" لے کر میں "العلم" سہ ماہی کے دفتر گیا تو میرے ساتھ امین میر نگری بھی تھے۔ جس انداز میں "پاکستان کے نعت گو شعراء" کو دیکھا اور میری ہمت بندھائی بھولنے کی بات نہیں۔ میں آج سوچ رہا ہوں "پاکستان کے نعت گو شعراء" کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ اب خاک میں پنہاں صورتیں میں کوئی پانچ سو شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر شکیل احمد ضیاء، ثناء الحق صدیقی، پروفیسر ہارون رشید، اختر لکھنوی، حفیظ تائب جیسے لوگوں نے راقم الحروف کو راہ علم نہ دکھائی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تھانہ بھون دیوبند میں 17 ستمبر 1919 کو جنم لینے والے ثناء الحق صدیقی ہمیشہ علم و ادب سے محبت کرنے والوں کے درمیان اپنی عمدہ تصانیف کی وجہ سے زندہ رہیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔ ان کی تصانیف میں عمدہ اردو عروض، یادگار ایوب قادری، مولانا محمد علی جوہر (حیات اور تعلیمی نظریات)، تاریخ شاہ عالم، تاریخ اسپین (قبل از اسلام)، زمین پر رہ کر آسمان کی سیر، بزم انجم، میر و سودا کا دور، تصوف کی حقیقت، مہ و انجم سرفہرست ہیں۔ 19 اپریل 1996 کو کراچی میں انتقال ہوا اور آسودۂ خاک کراچی ہوئے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی، کراچی

کوئی بھی ایک رائے سب کی سند حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی حتیٰ کہ بی بی سی کی ڈاکومینٹری سیریز Q.e.d نے اس پر خصوصی پروگرام نشر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت کے فرانزک اور فائر سائنس ماہرین سے رابطہ کیا گیا اور پروگرام ریکارڈ کرلیا گیا۔

22 اپریل 1989ء کو بی بی سی نے اس سلسلے کا پہلا پروگرام نشر کیا جو بیک وقت امریکا میں بھی دکھایا گیا۔ اس طرح کی اموات کی متوقع وجہ بیان کرنے کے لیے دو چیزوں پر خصوصی زور دیا گیا:

1۔ آکسیجن کی عدم دستیابی۔

2۔ کینڈل اینڈ وک یا موم بتی نظریہ۔

میٹروپولیٹن پولیس کے فرانزک ماہر ڈیوڈ ہالیڈے نے بیان کیا کہ اس نے جتنے بھی واقعات دیکھے وہاں کوئی بیرونی آتش زنی کا منبع جیسے کہ آتش دان، موم بتی یا چولہا موجود پایا۔ ڈیوڈ ہالیڈے یہاں یہ مفروضہ پیش کرتا ہے کہ ممکنہ طور پر متاثرہ فرد کثرت شراب نوشی یا ہارٹ اٹیک کی وجہ سے آگ پر جا پڑا ہو۔ ایک دفعہ جب اس کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تو پھر کینڈل ایفیکٹ کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی اور دیر تک جلنے کی وجہ سے جسم راکھ میں تبدیل ہوگیا ہو۔

ڈاکٹر ڈوگل ایڈنبرگ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ہیں۔ اس پروگرام میں وہ کینڈل اینڈ وک ایفیکٹ کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔ ''انسانی جسم، اندر سے باہر کی طرف ایک طرح سے موم بتی سے مشابہ ہے۔ موم بتی میں دھاگا اندر کی طرف ہوتا ہے اور موم باہر ہوتی ہے۔ موم آگ کی حدت سے پگھلتی ہے اور پگھلا ہوا موم دھاگے پر لگ کر اسے مزید جلنے میں مدد دیتا ہے یوں موم بتی خود ہی جلتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم میں بھی چربی موم کی طرح کام کرتی ہے۔ یہ چربی پگھل کر کپڑوں پر لگ جاتی ہے جس سے آگ مزید پھیلتی جاتی ہے اور انسانی جسم ایک موم بتی ہی کی طرح جلتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر ڈوگل نے اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے ایک تجربہ بھی کرکے دکھایا۔ اس تجربے میں کسی جانور کی چربی سے تیار کیے گئے ایک ساسیج جس کو کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپیٹا گیا تھا کے ایک سرے کو آگ دکھائی گئی۔ مفروضے کے عین مطابق چربی پگھل کر کپڑے کے بقیہ حصے کے جلنے کا محرک بنتی گئی اور یوں یہ ساسیج ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکمل جل کر راکھ ہوگیا۔ یہ ساری کارروائی ٹائم لیپس ویڈیو کی تکنیک کی مدد سے پروگرام میں دکھائی گئی تھی۔

اب سوال یہ اٹھا کہ اگر اس سارے مفروضے کو درست بھی تصور کرلیا جائے پھر بھی یہ آگ صرف جلنے والے شخص تک ہی محدود کیوں رہتی ہے۔ آگے پیچھے قریب کی اشیاء اس کی دست برد سے کیسے اور کیونکر محفوظ رہتی ہیں؟

اس سوال کا جواب فرانزک سائنس کے ایک اور ماہر ڈاکٹر ایس نے کچھ یوں دیا کہ اگر ایک کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ بند ہو اور آکسیجن کا کوئی اور ذریعہ موجود نہ ہو تو اس کمرے میں آکسیجن لیول گر کر صرف 16% رہ جائے گا جس سے ایک جسم دھیرے دھیرے آگ سے سلگ تو سکتا ہے لیکن آگ اردگرد کی اشیاء تک پھیل نہیں سکتی۔

بی بی سی کے اس ڈاکومینٹری پروگرام نے بہت سارے سوالوں کے جواب دے دیے تھے مگر ابھی بھی چند انتہائی اہم سوال، جواب کے متقاضی تھے۔ ان سب سوالوں میں سے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کینڈل ایفیکٹ سے گوشت تو جل کر راکھ ہوجائے گا مگر کیا ہڈیاں بھی خاک ہوسکیں گی۔ پروگرام میں اس پر کوئی بات نہیں کی گئی تھی جب یہ سوال ان سے کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ ہڈیوں کے جلنے کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ تجربے میں ہڈیاں شامل نہیں تھیں لیکن بعد میں ڈاکٹر ڈوگل نے اس بات کی تصدیق کی کہ جب بھی تجربہ ہڈیوں کے ساتھ کیا گیا تو ہڈیوں کو معمولی نقصان کے علاوہ کچھ خاص فرق نہ پڑا۔ راکھ میں تبدیل ہونا تو بعید از قیاس ہے۔ صرف یہی نہیں اس کے ساتھ اور بھی کئی سوالات اٹھے جیسے کہ کیا SHC سے متاثر ہونے والے تمام افراد موٹاپے کا شکار تھے جیسے کہ کینڈل ایفیکٹ میں چربی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی مگر ایسا نہیں تھا SHC سے متاثر کئی افراد دبلے پتلے تھے جن میں چربی کی مقدار بہت کم تھی۔

اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ انسانی جسم جو کہ ساٹھ ستر فیصد تک پانی سے بنا ہے کیا اس کو چربی کے ایک ساسیج سے تشبیہ دینا درست ہے؟ بالکل اسی طرح کمروں کی ساخت کپڑوں کی نوعیت اور شراب نوشی کی عادت تمام لوگوں میں مختلف پائی گئی۔ پھر سب لوگ کیسے بالکل ایک جیسے طریقے سے شکار ہوئے۔

آکسیجن کی عدم دستیابی کے حوالے سے بھی کہا گیا کہ تمام واقعات میں کھڑکیاں دروازے بند نہیں پائے گئے

تھے۔ پھر کیسے آگ باقی چیزوں تک پھیلنے سے باز رہی۔ یہ اور اس طرح کے بہت سارے سوالات تھے جن کے تسلی بخش جواب بی بی سی کی ٹیم نہ دے پائی۔ اس طرح بی بی سی کی پیش کردہ تھیوری کو سو فیصد درست ماننے سے انکار نہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ تھی۔

پیٹر ہیو اور جینی رینڈلز بھی ان بہت سارے لوگوں میں سے تھے جن کی تسلی بی بی سی کی رپورٹ نہ کر سکی۔ ان دونوں نے اپنی تحقیق کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور مسز ولیری سے ملاقات طے کر لی۔ مسز ولیری لنکاشائر میں لاشوں کو بھٹی میں جلا کر ٹھکانے لگانے والے ایک ادارے میں بطور سینئر رکن کام کرتی تھیں۔ جب پیٹر نے مسز ولیری کو SHC سے مرے لوگوں کی تصاویر دکھائیں تو مسز ولیری دنگ رہ گئی۔ وہ اس بات پر حیران تھیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہڈیاں بالکل راکھ بن جائیں۔ مسز ولیری نے دونوں میاں بیوی کو بتایا کہ وہ لاشوں کو عموماً 650c سے 950c تک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے مشین میں جلاتے ہیں پھر بھی ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر یہ عمل مزید وقت کے لیے دہرایا جائے تو مسز ولیری کا جواب تھا کہ اس سے ہڈیاں مزید کالی تو ہو جائیں گی لیکن راکھ پھر بھی نہ بن پائیں گی۔ پھر خود ہی بتایا کہ ہڈیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک فائنل عمل کیا جاتا ہے جس میں ہڈیاں ایک گھومنے والی مشین میں ڈالی جاتی ہیں جس میں لوہے کے پچھ بڑے بڑے گیند ہوتے ہیں۔ اس مشین میں کئی گھنٹے رہنے کے بعد ہی ہڈیاں راکھ میں بدل پاتی ہیں۔

آکسیجن کی عدم دستیابی والی تھیوری پر بات کرتے ہوئے مسز ولیری نے بتایا کہ ہم جس طریقے سے لاشوں کو ٹھکانے لگاتے ہیں وہ تو اس تھیوری کے بالکل الٹ ہے۔ آکسیجن کی بڑی مقدار اور ہائی پریشر ہی لاش کو جلا کر ختم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آکسیجن کی کمی یا عدم دستیابی سے لاش جل جل کر کالی تو ہو جائے گی مگر راکھ میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔

صورتِ حال مزید دلچسپ موڑ تب اختیار کرتی ہے جب SHC کے بہت سارے نئے کیس رپورٹ ہوئے جس میں متاثرہ شخص گھر یا کسی بھی عمارت سے باہر کھلے میں تھا۔ اس طرح کے کیسز میں آگ لگنے کا کوئی ذریعہ بھی پاس نہیں تھا۔ ایسا ایک کیس 25 مئی 1989ء کو بڈاپسٹ جرمنی میں ریکارڈ پر آیا جب ایک شخص اپنی بیوی کے سامنے تب شعلوں میں گھر گیا جب وہ رفع حاجت کے لیے ہائی وے پر اپنی کار سے نیچے اترا۔ ڈاکٹروں نے بعد میں تصدیق کی کہ آگ باہر سے اندر تک نہیں پہنچی بلکہ جسم کے اندر سے باہر کی طرف پھوٹی ہے۔

اس ضمن میں تازہ ترین کیس جو ریکارڈ پر آیا مائیکل فارہارٹے کا ہے۔ اس کیس کو ملک کا پہلا آفیشل SHC کا کیس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حادثہ 22 دسمبر 2010ء کو آئرلینڈ میں پیش آیا جب اسی طرح ایک شخص گھر میں مردہ پایا گیا۔ سوائے اس کی لاش کے باقی آتشزدگی کے کوئی نشان نہیں پائے گئے۔ پولیس اور فرانزک ماہرین نے اپنی ہر کوشش کر لی مگر موت کی اصل وجہ جاننے میں کامیاب نہ ہو پائے۔ اس کیس کی پیروی کرنے والے جج نے اپنے بیان میں لکھا۔ ''اپنی 25 سالہ سروس میں اس طرح کا کیس بھی نظر سے نہیں گزرا۔ باقی تمام اموات کی وجوہات کی عدم موجودگی کی وجہ سے اور تمام شواہد کی نشاندہی کی بنیاد پر یہ کیس Spontaneous Human Combustion کے طور پر گنا جا سکتا ہے۔

یہ وہ پہلی آفیشل تحریر ہے جس میں SHC کو وجۂ موت قرار دیا گیا ہے۔

ایک امریکی سائنسدان لیری آرنلڈ ان اموات کی وجہ خلیاتی لیول پر ہونے والے نیوکلیئر فیوژن ری ایکشن کو قرار دیتے ہیں۔ اس ری ایکشن کو Cold fusion بھی کہا جاتا ہے۔ چند دیگر سائنسدان بھی اس تھیوری پر کام کر رہے ہیں۔

جان ہیلر کہتے ہیں کہ انسانی جسم میں موجود پانی کی برق پاشیدگی ان عجیب و غریب اموات کی وجہ ہو سکتی ہے۔

ان اموات کا شکار افراد میں خودکشی کا رجحان بھی پایا گیا ہے۔ سونفی انرجی، ڈپریشن یا کچھ اور پُراسرار روحانی عوامل کو بھی ان اموات سے جوڑا جاتا ہے۔

موت کی وجہ طبعی ہو، حادثاتی یا مجرمانہ عوامل نفسیاتی ہوں یا روحانی ان بے حد عجیب و غریب اور ہولناک اموات کی حقیقت ابھی تک صیغہ راز میں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا تیز رفتار سائنسی ترقی اس قابل ہو پائے گی کہ ان اموات کی حقیقت سے پردہ اٹھا کر ان کے تدارک کے لیے اقدامات کر سکے یا پھر ابنِ آدم اسی طرح نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر راکھ کے ڈھیر میں بدلتے رہیں گے۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا تیسواں حصہ

نسرین نے جس اعتماد سے کہا تھا کہ تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں تمہارا وعدہ یاد دلاؤں گی، بس تم مجھ سے ایک وعدہ کر لو۔

یہ چار حرفی لفظ وعدہ بھی عجیب ہے۔ اس کی گہرائی اتھاہ ہے اسی لیے میں کوئی وعدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب تک میں بلائنڈ کھیل رہا تھا۔ انجام کیا ہوگا مجھے خود پتا نہیں۔ ہاتھ میں بہت تھوڑا وقت تھا۔ بیوی بچے پاکستان سے چل پڑے تھے۔ امریکا اور کینیڈا میں فاصلہ ہی کتنا ہے، کسی بھی وقت

یہاں پہنچ سکتے تھے۔ طارق اور اس کی بیگم کو منا لینا کون سا مشکل کام ہے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو میں نسرین کو کیسے مناتا؟ یہی کچھ ذہن میں پک رہا تھا۔ مجھے بار بار اشفاق اور احمر یاد آرہے تھے۔ وہ دونوں بچپن سے یک جان و قالب تھے۔ اسکول سے یونیورسٹی تک دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ اشفاق کی شادی ہو چکی تھی مگر احمر ہنوز کنوارہ تھا۔ دونوں کا بزنس بھی ایک تھا، دونوں کے بزنس الگ تھے لیکن کام میں مماثلت تھی۔ اشفاق لیدر جیکٹ تیار کرتا تھا۔ اس کا کارخانہ نیو کراچی میں تھا۔ اس کے کارخانے سے نزدیک ہی احمر نے کارخانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے کارخانے میں ٹی شرٹ تیار ہوتے تھے۔ دونوں نے یورپ اور امریکا کو منڈی بنا رکھا تھا۔ ہر سال دونوں ایک ساتھ غیر ممالک کا دورہ کرتے تھے۔ نئے نئے گاہک تلاش کرتے تھے۔ آرڈر لیا کرتے تھے، اس بار بھی وہ دونوں ساتھ نکلے تھے۔ یو اے ای کے بعد انہوں نے امریکا کے گاہکوں سے ملنے کا طے کیا تھا۔ فون انہوں نے کر دیئے تھے۔ کلائنٹ بھی حساب کتاب تیار کیے بیٹھے تھے جس دن وہ امریکا پہنچے اس دن موسم مناسب نہیں تھا۔ ہوٹل پہنچ کر وہ دونوں ہی تھکن اتارنے کے لیے لیٹ گئے۔ کافی دیر آرام کیا اور پھر نیچے ڈائننگ روم میں جانے کے لیے اٹھ گئے۔ وہ اپنے کمرے کو لاک کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تھے کہ سامنے والی لفٹ کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر کی عورت باہر آئی۔ اس کی عمر ایسی نہ تھی کہ اس سے کوئی عشق کی پینگیں بڑھاتا مگر تھی خاصی جاذب نظر۔ اسے دیکھ کر احمر کے اندر کا کھلنڈرا بچہ بیدار ہو گیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں چلا میں چلا۔“ اشفاق نے گھبرا کر کہا۔ ”کیا ہوا؟“ تو وہ بولا۔ ”سامنے دیکھ ادھیڑ عمر کی ہے مگر حسن کا دریا ہے، جوانی کا سمندر ہے، سرتاپا قیامت ہے۔ مجھ پر تو قیامت گزر رہی ہے۔“

اشفاق نے ہلکے سے اس کی پیٹ پر دھپ ماری اور کہا۔ ”پاکستان لوٹتے ہی بیگم سے کہہ دوں گا، لڑکی ڈھونڈو ورنہ یہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ جواب میں احمر مسکرا کر رہ گیا۔

لفٹ سے نکلنے والی عورت ان کے قریب سے مسکراتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دونوں بھی آگے بڑھ گئے۔ نیچے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر انہوں نے ناشتے کا آرڈر دیا۔ ابھی بیرا سرو کر کے گیا ہی تھا کہ قتالہ عالم ڈائننگ ہال میں نظر آگئی۔ وہ دروازے پر کھڑی ہال کا جائزہ لے رہی تھی پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ان کی میز پر پہنچ گئی۔ وہ دونوں اسے منہ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے کہ اس نے پوچھا۔ ”اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔“

احمر نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“

جواب ملتے ہی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ احمر نے پوچھا۔ ”ناشتے میں کیا لیں گی؟“

”دو سلائس اور فش فرائیڈ۔“ اس نے اطمینان سے کہا پھر ان کا جائزہ لے کر بولی۔ ”آپ انڈین ہیں؟“

دونوں بیک وقت بولے۔ ”نہیں پاکستانی۔“

”پاکستانی......واہ...... مجھے پاکستانی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں نائجیرین ہوں، والد کا تعلق ایشیا سے تھا۔ والدہ انگلینڈ کی لیکن دونوں ہی اپنی دنیا سے قطع تعلق کر کے نائجیریا میں زندگی گزار گئے۔ ان کے بعد ان کا کاروبار میں نے سنبھالا پھر شادی کی، شوہر بھی ایشین تھا لیکن زیادہ دیر ساتھ چل نہ سکا۔ شیر کے شکار کا شوقین تھا۔ ہر مہینے اندرون ملک چلا جاتا تاکہ اپنے شوق کو پورا کرے۔ دو سال پہلے وہ شکار پر گیا تو خود شکار ہو گیا۔ تب سے اس کے کاروبار کو بھی میں سنبھال رہی ہوں۔“

”ہم بھی شکاری ہیں لیکن شیر کا شکار کبھی نہیں کیا، ہمیں تو خود کو شکار کرانا پسند ہے۔“ احمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس جواب پر باقی دونوں بھی ہنسنے لگے اور یہ محفل ہنسی پر ختم ہو گئی۔ احمر اور اشفاق کو کلائنٹ سے ملنا تھا۔ دونوں اجازت لے کر ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ شام میں واپسی ہوئی تو دونوں ڈائننگ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے کھانا منگوایا تھا کہ وہ عورت اندر داخل ہوئی اور صبح کی طرح سیدھے ان کی ٹیبل پر آگئی۔ اس نے بیٹھنے کی اجازت طلب کی پھر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”دراصل مجھے ایسے نوجوان بہت پسند ہیں جن کے چہروں پر زندگی ہو اور عادت میں بے ساختگی۔ بناوٹی اور چالاک مردوں سے مجھے نفرت ہے۔“

احمر نے پوچھا۔ ”آپ ڈنر میں کیا لیں گی؟“

”سلائس اور فرائیڈ فش۔“ پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”ڈنر کے بعد مجھے ایک پیگ لینے کی عادت ہے۔ آپ ٹھہرے پاکستانی، ایسا کوئی شوق ہو گا نہیں اس لیے میں بار سے ہو آتی ہوں تب تک آرڈر سرو ہو جائے گا۔“

وہ اٹھ کر بار کاؤنٹر کی طرف چل دی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ دو سے زیادہ پیگ اپنے اندر اتار چکی ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر بولی۔ ”دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے آیئے باہر ٹہل آتے ہیں۔“

دونوں سر تسلیم خم ہے کی تصویر بنے اس کے ساتھ ہو لیے۔ ہوٹل سے ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے ایک پارک تھا۔ وہ تینوں اسی طرف چل دیئے۔ سارے راستے وہ ہی بولتی رہی کہ یہ بات ہے، بھئی ہوا یہ...... اتنی باتوں کے بعد بھی اس نے ان دونوں کا نام نہیں پوچھا۔ نام میں رکھا بھی کیا تھا۔ دونوں ہی ایک جیسے تھے .... دونوں اس کی باتوں کی روانی کے آگے بے بس تھے اور کچھ اس کے حسن سے مسحور تھے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ واپسی پر اس نے پھر بار کا رخ کر لیا اور یہ دونوں ڈائننگ میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ ادھر ان کی کافی ختم ہوئی ادھر وہ آموجود ہوئی۔ وہ دونوں کمرے میں جانے کے لیے اٹھ گئے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہولی۔ اس کی باتیں ختم ہو کر نہ دے رہی تھیں احمر نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بھی اندر آگئی۔ اس کی زبان یکساں رفتار سے چل رہی تھی۔ وہ اپنی جوانی کے قصے سنائے جا رہی تھی۔ اب وہ دونوں بور ہونے لگے تھے کہ اس نے کہا۔ ”ڈیل ناؤ...... آپ کل کی فلائٹ سے جا رہے ہیں۔ آئی کین انٹرٹین اونلی ون۔ ٹاس پلیز۔“

وہ دونوں دوست حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ غیر اختیاری طور پر اشفاق کا ہاتھ جیب کی طرف چلا گیا اور پانچ سینٹ کا سکہ اس کے ہاتھ پر چمکنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سکہ لے لیا پھر بولی ”کال“۔

احمر اور اشفاق ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ پھر بولی۔ ”کال پلیز۔“

”ہیڈ۔“ اشفاق کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے سکہ ہوا میں اچھالا۔ سکہ زمین پر گرا تو سب جھک گئے۔ اشفاق جیت گیا۔ احمر نے مسکرا کر کہا۔ ”جایئے جناب!“

صبح سویرے اشفاق آکر واش روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر باہر آیا تو احمر اٹھ چکا تھا۔ دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی.... انہیں گلاسگو کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ جلدی جلدی تیاری کرنے لگے۔ اشفاق شرمندہ تھا۔

احمر پر ہار اور شکست کی تھکن طاری تھی۔ ٹیکسی نے انہیں ائرپورٹ پر اتار دیا۔ دونوں ڈیپارچر لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ کال کا انتظار کرنے لگے تبھی اشفاق بولا۔ ”میں ایک غلطی کر بیٹھا ہوں۔ اب پشیمان ہو رہا ہوں۔“

احمر بولا۔ ”غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ بھول جاؤ۔ جو ہوا ہے بھول جاؤ۔ جوانی میں ایسی غلطیاں ہوتی ہی ہیں۔“

”بات کچھ اور ہے۔ بات یہ ہے کہ صبح اٹھ کر اس نے میرا نام پتا پوچھا۔ میں جلد بازی میں تھا پھر شادی شدہ ہوں گھر میں کہیں یہ فون ون نہ کر دے اس لیے تمہارا نام پتا لکھ کر دے دیا۔“

یہ سنتے ہی احمر غصے سے اکھڑ گیا کہ اسے پتا دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اگر کوئی بات ہو گئی تو پاکستان تک پہنچ جائے گی۔“

اس نے اس بات کا اتنا برا منایا کہ قطع تعلق کر لیا۔ وقت گزرتا رہا۔ کئی ماہ گزر گئے کہ ایک دن احمر کا فون آگیا۔ ”یار ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

اشفاق نے بے دلی سے کہا۔ ”بولو۔“

”یار تمہیں امریکن ہوٹل والی کیتھی یاد ہے ناں، کل اس کے وکیل کا خط آیا ہے۔“

احمر نے جلدی سے کہا۔ ”یار مجھے اس واقعے کا بہت افسوس ہے۔ تم میری بیوی کو جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی شکی ہے؟ کنوارے تھے اسی لیے تمہارا کام اور پتا لکھوایا تھا۔“

”اشفاق نے کہا۔ پہلے میری پوری بات تو سنو، اس کے وکیل نے خط میں لکھا ہے کہ کار حادثے میں وہ مر گئی۔ اس نے وکیل کے پاس بہت پہلے وصیت کر رکھی تھی اس وصیت میں اس نے اپنی جائیداد اور بینک میں جمع رقوم میرے نام کر دی ہے۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میں نے فون کیا ہے کہ تم نے میرا نام پتا اسے دیا۔“

احمر اور اشفاق کا واقعہ .... مجھے نسرین پر فٹ نظر آرہا تھا کہ انسان مستقبل سے نابلد ہوتا ہے۔ مستقبل کا اگلا منظر نامہ کیا ہو گا اسے بالکل خبر نہیں ہوتی ہے۔ میں وعدہ کرلوں تو اس کا انجام کیا ہو گا اس کی خبر مجھے بالکل نہ تھی۔ اسی لیے خاموش رہ گیا۔ اس کے وعدہ کرو کی رٹ نے مجھے وہاں سے اٹھ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ دائیں جانب وہی گھنا جنگل تھا اور بائیں جانب جھیل ٹیلوں کی اوٹ میں تھی۔ ہم کچھ دیر اترتے رہے اور جب زمین کی سطح پر پہنچ کر بائیں جانب مڑے تو ایک نیا اور انوکھا منظر ہمارے سامنے تھا۔

میرے سامنے ہزاروں مرغابیاں پانی اور پتھروں پر بیٹھی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں پہلی بار اتنی بڑی ڈار

اتنی بڑی تعداد میں یہ پرندے دیکھ رہا تھا۔ تعجب اس بات پر تھا کہ وہ سب کی سب خاموش تھیں۔ کوئی آواز، کوئی پھڑ پھڑاہٹ نہ تھی جو ان کی موجودگی کا احساس دلا سکے۔ اگر میں وہاں اپنی آنکھیں بند کر دیتا تو صرف ہواؤں کا لمس اور جنگلی پھولوں کی مہک ہی محسوس کر سکتا تھا۔

جھیل کا پانی ریت پر چڑھا ہوا تھا۔ جہاں چھوٹے بڑے پتھر بکھرے تھے۔ وہ بظاہر کوئی دلدل سی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ صرف ریت ہی تھی۔ وہاں پانی گہرے سبز رنگ کے دکھتے تھے۔ یہ کوئی آدھے میل سے کچھ چوڑا ٹکڑا تھا جس کے کناروں پر بے شمار جنگلی پھولوں کے پودے لہراتے اور ان کی خوشبو فضا میں ہوائیں لیے اڑتی تھیں۔ اس پورے ماحول میں میرے علاوہ نسرین اور سعد تھا۔ ہمارے علاوہ یہاں کوئی نہ تھا۔ سعد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''واؤ۔''

میں نے اسے چپ کرا دیا کہ کہیں یہ اڑ نہ جائیں مگر اڑتے تو کتنے اڑتے جتنے بھی پرواز بھرتے پھر بھی نیچے کچھ کمی نہ ہوتی۔ ہزاروں پرندوں کے شفاف سبز پانیوں میں واضح عکس منظر کی دلکشی کو کہاں سے کہاں لے گئے تھے۔

جدھر بھی نظر جاتی ہر طرف پانی کے اوپر، پانی کے نیچے سیاہ مرغابیاں تھیں۔ کچھ بیٹھی تھیں اور کچھ آہستہ آہستہ تیر رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مرغابیوں کی یہ کھیپ ہزاروں میل سے چلیں اور سب کی سب ستانے کے لیے یہاں اتر گئیں۔ تھکی ہوئی تھیں تو شاید اسی وجہ سے خاموش تھیں۔ دور جھیل کے نیلے پانی بھی ساکن تھے کہ کہیں لہروں کے شور سے یہ مضطرب نہ ہو جائیں۔ آسمان پر چمکتا سورج بھی مدھم پڑنے لگا اور اپنی شعاعیں نرم کرتا گیا تاکہ انہیں آسودگی ملے۔ ہم بھی خاموشی سے بغیر پلکیں جھپکائے یہ منظر دیکھ رہے تھے کیونکہ خدشہ تھا کہ پلکیں جھپکیں تو یہ منظر کہیں تحلیل نہ ہو جائے۔ اس لیے چوڑے تالاب کے گرد مرغابیوں کی تعداد سے بھی زیادہ پھول تھے۔ جھاڑیوں سے سر نکالے ہوا سے جھومتے تو پانیوں میں ان کا عکس رقص کرتا نظر آتا۔

نسرین اپنی خوب صورت انگلیاں میرے بازو میں پیوست کیے یہ منظر حیرت و استعجاب سے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کی گرفت سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ تحتی تشکر کی ہے۔ اس نظارے نے سب کو پُرجوش کر دیا تھا۔ سعد ماں سے کہہ رہا تھا کہ یہ کینیڈا کے قومی پرندے ہیں۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ میرے من کا من موجی پرندہ ہے۔ جہاں گردی پر نکلا ہے۔ آج یہاں تو کل کسی اور آسمان تلے پرواز کرے گا۔

ہم تادیر یہ عجیب منظر دیکھتے رہے پھر معلوم نہیں کس مرغابی نے ایک آواز بلند کی اور پھر غول کے غول تھرتھرائے۔ پر کھولے اور ایک گونجتی ہوئی پھڑ پھڑاہٹ ہمارے کانوں تک کسی لہروں کی صورت پہنچی پھر یہ پھڑ پھڑاہٹ بڑھتی گئی اور ایسا لگا کہ آسمان ان سے چھپ گیا ہو۔ منظر تاریک سا ہو گیا اور مرغابیوں کی آوازوں نے اور پروں کی پھڑ پھڑاہٹوں نے مل کر ایک سماں باندھ دیا۔ نسرین کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''او مائی گاڈ۔''

میں ریت پر بیٹھا تو ماں بیٹا دونوں میرے ساتھ آبیٹھے۔ مرغابیوں کا اڑنا جاری رہا اور بہت دیر تک آسمان ان سے بھرا رہا۔ میں نے نیچے پانیوں پر اپنی نظر ڈالی تو ایسا محسوس ہوا کہ سب کے سب تو یہیں بیٹھے ہیں۔ وہی دور دور تک سیاہ دھبے، وہی سبز پانیوں میں ان کے عکس اور وہی منظر جو ہمیں پہلی نظر میں ملا تھا۔ ان کی کثرت کا اندازہ لگانا میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا۔

بہت سے اڑ گئے اور بہت سے بیٹھے رہے۔ میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ ''بہت ہی شاندار۔ ناقابلِ بیان۔'' آسمان کی جانب میں نے آنکھیں اٹھا کر اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے یہ منظر ہمارے لیے بنا کر رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمارا سحر ٹوٹا اور ہم حرکت میں آئے۔

سعد کو ایک بار میں نے بولنے سے روکا تو وہ ابھی تک خاموش تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر اپنی گود میں لیا اور پوچھا۔ ''دوست یہ سب کیا تھا؟''

وہ بولا۔ ''انکل یہ Candion Goose تھیں۔''

میں اس کی معصومیت پر ہنس پڑا۔ وہ میری گود میں بیٹھا تھا اور نسرین میرے پیچھے سے آکر کان میں بولی۔ ''تمہارا شکریہ، جو مجھے آج یہ سب دکھلانے یہاں لے آئے۔''

اس منظر سے میرا نکلنے کو جی نہ چاہتا تھا مگر ہمیں جانا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ کیمپنگ سائٹ سے ہوتے ہوئے بیچ پر آئیں گے اور وہیں سے غروب آفتاب کا منظر دیکھیں گے۔

ہم ریت پر سے چل کر دوسری سمت آئے جہاں کی زمین سخت تھی، درخت تھے، جھاڑیاں اور گھاس تھی۔ یہاں بھی جھاڑیوں میں سفید، گلابی اور پیلے پھول کھلے تھے اور انہی پھولوں کے رنگوں کے متعدد ٹینٹ ذرا ذرا سے فاصلے پر /

لگے تھے۔ ہر ٹینٹ کی اپنی سائٹ تھی جو لمبے لمبے درختوں اور پستہ قد جھاڑیوں سے گھری تھی۔ ہر سائٹ میں لکڑی کے بینچ اور میز تھی اور ساتھ ہی آگ جلانے کی جگہ۔ میز پر کھانے سجے تھے جن کو آگ پر پکایا گیا تھا۔

میں نے نسرین سے کہا۔ ''اگر ہم پاکستان میں کیمپنگ کر رہے ہوتے تو گوشت کو سیخوں میں پرو کر انہیں بھون رہے ہوتے۔ میز پر ہاٹ پاٹ میں دہی بڑے، چنے چھولے، شامی کباب، سموسے، چٹنی، کولڈ ڈرنک کے علاوہ پھل بھی تھے۔ ایسا لگتا کہ کیمپنگ کرنے نہیں کوئی دعوت اڑانے آئے ہوں اور یہاں زیادہ سے زیادہ ہاٹ ڈاگ چند ڈبل روٹیاں اور چند کین کولڈ ڈرنک کے ساتھ لائے ہیں مگر پھر بھی ہم سے زیادہ خوش ہیں۔''

نسرین بتانے لگی کہ میں نے بھی سنا ہے افغانی اور پاکستانی بہت بسیار خور ہیں۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ایسے پاکستانی بھی دیکھے ہیں جو رات کے کھانے کے بعد میٹھے میں بھی پیزا اور برگر کھاتے ہیں۔'' میں اسے بتا رہا تھا کہ زندگی اور موت بلاشبہ اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر کھانا پینا اور اس سے احتیاط برتنا تو بندے کے اختیار میں ہے۔ میں جب بھی پاکستان جاتا ہوں تو میرا چھوٹا بھائی میرے پاس آبیٹھتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس فلاں کو جانتے ہو... ناں۔ میں جواب دیتا ہوں ہاں جانتا ہوں پھر بتاتا ہے کہ وہ فوت ہو گیا ہے۔ میں چونک کر پوچھتا ہوں کیسے فوت ہوا ہے۔ وہ پھر بتاتا ہے کہ بس نماز پڑھ کر گھر آیا، کھانا کھایا، پھر ذرا سی گیس ہوئی تو پھکی کھائی اور پھکی منہ میں ہی تھی کہ بے چارہ بیٹھے بیٹھے فوت ہو گیا پھر کسی دوسرے کی نوتکی کی ملتی جلتی داستان سناتا۔ میں پوچھتا کہ یہ بیٹھے بیٹھے کیسے مر گئے تو جواب دیتا تقریباً سب لوگ ایسے ہی تو مرتے ہیں۔ اسے پھر یہ بتانا پڑتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے جو مرتے ہیں ان کا دل اچانک بند ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی شریانیں چربی سے بھری ہوتی ہیں اور یہ جو گیس کے لیے پھکی کھا رہے ہوتے ہیں وہ دراصل ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔

نسرین بولی۔ ''تم کیا مرنے کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ یہ تو دیکھو کہ سب لوگ کتنا انجوائے کر رہے ہیں۔''

میں نے ہنس کر کہا کہ میرا بھائی بھی یہی کہتا ہے کہ سب کی موت لکھی تھی آگئی اور تم اپنا فلسفہ لے کر بیٹھ گئے ہو۔

ہر ٹینٹ کے باہر رونق لگی تھی۔ ہاٹ ڈاگ کے دھوئیں کی خوشبو ہر جانب پھیلی تھی۔ ڈنر انہیں سورج غروب ہونے سے پہلے ختم کرنا تھا۔ ٹینٹ کی کیمپنگ میں لائٹ نہیں ہوتی بلکہ اپنی اپنی روشنی لے کر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نیکروں میں موٹی پتلی لڑکیاں قہقہے لگا کر کوئی نہ کوئی چیز بھون رہی تھیں۔ اسٹوروں سے خریدی گئیں اور فریزر میں رکھی گئیں چکن کے کباب بھی کوئلوں اور لکڑی کی آگ پر لگا کر تیار ہو رہے تھے۔ دھواں اٹھتا اور درختوں کی ٹہنیوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ دو برگر کھائے، کوک یا بیئر کا ٹن چڑھایا اور پھر مست ہو کر سی ڈی پلیئر پر میوزک سننے لگے یا پھر بیچ کی جانب جا نکلے۔

ہم کیمپنگ سائٹ میں گھومتے رہے۔ میں ٹینٹ دیکھ کر اپنے وہ دن یاد کر رہا تھا جب میں ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں میں کیمپنگ کیا کرتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے پہاڑ، وادیاں، گلیشیر، جھرنے اور ندیاں یاد آ رہی تھیں۔ میرے نزدیک یہ کیمپنگ بھی کوئی کیمپنگ تھی کہ گاڑی سامنے کھڑی ہے، وہیں سے ٹینٹ نکالا اور دس قدم دور جا کر لگا دیا۔ مزہ تو تب ہے کہ پورے دن کا ٹریک کرو اور شام سے پہلے کسی ویرانے میں ندی کنارے تھکے ہارے پہنچو اور وہیں فیصلہ کرو کہ کیوں نہ یہیں ٹینٹ لگا لیا جائے۔ میں شاہ جی کو یاد کر رہا تھا جو نانگا پربت کے ٹریک پر میرے ساتھی تھے۔ جنہوں نے بھی میرا سفرنامہ ''نانگا پربت کا عقاب'' پڑھا ہے وہ شاہ جی کے فین ہو گئے تھے۔

سورج زوال کی جانب آ رہا تھا اور ہم واپس بیچ کی جانب چل رہے تھے۔ راستے میں واش روم آیا اور میں فریش ہونے گیا تو اتنے صاف ستھرے اور چمکتے ہوئے فرش اور واش بیسن دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ٹشو پیپر اور تاول وافر مقدار میں رکھے ہوئے تھے۔ ہر وقت ان کی صفائی ہوتی رہتی ہے۔ جراثیم کش ادویات کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ فرش بالکل خشک تھا اور دیواریں کسی قسم کی لکھائی سے صاف تھیں۔

ہم بیچ کی جانب آ رہے تھے تو دیکھا کہ دائیں جانب کی جھاڑیوں میں بے تحاشا جنگلی پھول ہیں اور بہت بڑی تعداد میں بڑے سائز کی تتلیاں ان پھولوں پر اڑ رہی ہیں۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گی۔ رنگ ان کا زرد اور گہرا نیلا تھا۔ ساتھ کچھ گورے فوٹو گرافی کر رہے تھے۔ جہاں جو بھی چیز نظر آئی تو بہت زیادہ تعداد میں نظر آئی۔ درخت، پھول، تتلیاں، مرغابیاں سب اتنی زیادہ کہ نظر کا دھوکا محسوس ہو رہا تھا۔ رنگ اتنے شوخ کہ یقین ہوتا تھا کہ یہ زمین کے نہیں آسمان کے رنگ ہیں۔ آسمان گہرا نیلا، پانی گہرے سبز اور

نیلے پھولوں کے رنگ شوخ، جھیلیں میلوں پھیلی ہوئیں اور حسن تو بے پناہ۔

شاپ کے سامنے سے گزرے اور دیکھا کہ بہت سے ٹورسٹ آرام کی غرض سے اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ چپس، سلاد اور برگر کھائے جا رہے ہیں۔ ہر جانب کوک اور سیون اپ چل رہی ہے۔ بڑے بڑے ڈسٹ بن ہیں جن میں ایک ایک کاغذ کو زمین سے اٹھا کر اس میں پھینکا جا رہا ہے، ہر چیز ایک قرینے اور ترتیب سے ہو رہی ہے۔

ہم بیچ پر آئے تو ہماری چادر اور سامان ویسے کا ویسا پڑا تھا جیسے ہم چھوڑ گئے تھے۔ نسرین اور سعد تھک چکے تھے اسی لیے چادر کو جھاڑ کر اس پر لیٹ گئے۔ سورج غروب ہونے میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ غروب آفتاب سے قبل کے سنہری لمحے شروع ہونے والے تھے۔ افق پر ہر چیز سنہری رنگوں میں لپٹتی جا رہی تھی۔

میں دور جھیل کے نیلے پانیوں کی سطح پر ان کشتیوں اور بجروں کو دیکھ رہا تھا جو دور سے ساکن لگ رہے تھے۔ نہ جانے کب سے وہ وہاں تھے۔ یہ ان شکاریوں کی کمین گاہیں تھیں جو گہرے پانیوں میں مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ خالی ہاتھ وہ آتے اور بہت کچھ سمیٹ کر واپس لوٹتے۔ ان کی اس لڑائی میں کوئی ہار نہیں تھی۔ نری جیت ہی جیت تھی۔ مچھلیوں کے شکار کی صورت اور پورے دن کی آسودگی اور وہ بھی دور کے دھیمے اور خاموش پانیوں میں۔

اچانک جھیل سے لگی ایک پہاڑی سے کوئی چیز اڑی۔ مجھے لگا کہ کوئی پتنگ ہے مگر جب غور سے دیکھا تو پیرا گلائیڈنگ کرتے اور پرندوں کی طرح اڑتے کچھ بم جو تھے۔ چوڑائی میں کم اور لمبائی میں طویل وہ پیرا شوٹ فضا میں اڑنے لگے پھر دوسرے اور تیسرے پیرا شوٹ نمودار ہوئے۔ پرندوں سے بھی وہ اوپر اڑ رہے تھے۔ جہاں چاہتے وہیں اپنی لگام موڑ لیتے۔ کتنا دلکش اور دل آویز احساس ہوتا ہوگا جب وہ جھیل کے پانیوں کے اوپر ڈوبتے سورج کا منظر دیکھتے ہوں گے۔ دو سال پہلے میں بھی یورپ میں پیرا گلائیڈنگ کے تجربے سے گزر چکا ہوں۔

خنک ہوائیں میری شرٹ میں گھس آئی تھیں اور مجھے گدگدی ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کے اوپر اڑتے ہوئے انہیں تسخیر کرنے کا احساس میرے اندر آ بیٹھا تھا۔

نسرین نے چائے اور سینڈوچ مجھے پکڑا دیے۔ چائے ابھی تک گرم تھی۔ اس کے ہلکے ہلکے گھونٹ بھر کر قرار آ رہا تھا۔ سکون اور طمانیت کی لہریں جسم میں خون کی جگہ گردش کر رہی تھیں اور ٹھنڈی ہوائیں انہیں زیادہ مہمیز کرتی تھیں۔

جہاں سورج ڈھل رہا تھا وہاں چھائے اِکّا دُکّا بادل ایکدم رنگین ہو گئے۔ کرنیں ان بادلوں کے کناروں کو منور کرتیں آسمان اور زمین کی جانب منعکس ہو رہی تھیں۔ سرخ، گلابی، نارنجی اور پیلے رنگ کے بادلوں سے پھوٹ کر آسمان پر چھاتے چلے گئے۔ افق رنگ گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے آسمان پر سونا پگھل کر بہنے لگا ہو۔ وہاں سے شعلے برسنے لگے۔ سارا جہاں شوخ رنگوں سے رنگین ہو گیا۔ نیلا چمکدار آسمان دور سے کھڑا جیسے مسکرا رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سورج نئے جہانوں میں ابھرنے سے پہلے ایسے رنگ دکھاتا ہے۔ وہ عالم سجود میں تھا اور قدرت اس کا سجدہ قبول کر رہی تھی۔ اگر سجدے کے عوض ایسا انعام ملتا ہے تو میں کیوں اس سے اتنا غافل رہتا ہوں؟ میں یہ سوال اپنے آپ سے کر رہا تھا۔ ہم کیوں اپنے رب کے جلوے دیکھ نہیں سکتے۔

اللہ نے یہ رنگ مجھے عطا کیے تھے۔ میں شکر کے احساس کے ساتھ انہیں اپنے اندر جمع کر رہا تھا۔ میری تمام حسین ترین یادیں میری محبت اور سیاحت سے جڑی ہیں، محبتوں نے عجیب احساسات دیے اور سیاحت نے عجیب و غریب رنگ دکھلائے۔ روشن دن، ملگجے اندھیرے اور چاندنی راتیں میرے اندر ایک محبت کی صورت زندہ ہیں۔

سورج ڈوب چکا تھا مگر رنگ شوخ سے شوخ تر ہوتے گئے۔ یہ وہ رنگ نہ تھے جو سورج ڈھلتے ہی اڑ جائیں۔ یہ تو اور زیادہ نکھر آئے تھے۔ افق سے رنگ نہ اڑے مگر منظر سے ہم اڑنے کی تیاری کرنے لگے۔ ہماری کیب شاید پارکنگ میں آ چکی تھی۔

ہمارا قیاس درست ثابت ہوا۔ کیب مع ڈرائیور موجود تھی۔ ہم اپنے کرائے کے ٹاؤن ہاؤس پہنچے تو اندھیرا تیزی سے امڈتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ کل بارہ بجے دوپہر آ جائے۔ اس نے سر ہلایا اور اچھی رات کی نوید سناتا رخصت ہو گیا۔ غلطی سے میں نے گھر کے اندر کی کوئی لائٹ نہیں جلائی تھی اس لیے وہ سارا اندھیرے میں ڈوبا سعد اور نسرین کو خوف زدہ کر رہا تھا۔ بیٹے نے ماں کا بازو تھام رکھا تھا اور ماں نے میرا۔ اس اندھیرے میں قفل کے نمبر ملانا بھی دشوار عمل تھا۔ ٹارچ بھی اندر تھی اور دور کے

گھروں کے پوسٹ لیمپ اتنے زیادہ روشن نہ تھے کہ میرے کام آ سکتے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ گھر کے پیچھے ڈور وال کو جھیل سے واپسی پر میں نے شاید لاک نہیں کیا تھا۔ ان دونوں سے کہا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں پیچھے سے ڈور وال میں گھر کے اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ نسرین کہنے لگی۔

"میں اس اندھیرے میں یہاں اکیلے نہیں رک سکتی۔"

اس کو سمجھانا بے فائدہ تھا اور میں اس طرح انہیں خوف زدہ چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔

ہم تینوں گھر کے پہلو سے گھاس پر چلتے ہوئے پیچھے کی جانب آئے۔ ارد گرد اور جھیل تک پہنچے جہاں اندھیرے کا راج تھا۔ ہواؤں کے چلنے سے درخت شور مچاتے تھے۔ سردی نہ تھی مگر خنکی بڑھ چکی تھی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے ڈیک تک آئے اور اوپر آ کر میں نے ڈور وال کو سرکایا، شکر ہے وہ کھلی ہوئی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے اور کچن کی لائٹ جلائی تو ان دونوں کی جان میں جان آئی۔ سعد اندھیرے سے نکلا تو پھر سے چھتری کو کھولنے بند کرنے لگا۔

ہوٹل کی بجائے کسی گھر کو کرائے پر لینے کا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنے جوتے اور موزے اتارے اور صوفے پر دراز ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نسرین اور سعد اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نسرین نے جاتے ہوئے کچن کی کھڑکی کھول دی تھی جس کی وجہ سے تازہ ہوا لیونگ روم میں بھر گئی۔ میں آسودگی سے صوفے پر لیٹا اپنے جسم کی تھکن دور کرنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر مجھ پر غنودگی چھا گئی۔

میری آنکھ تب کھلی جب ہمیشہ کی طرح نسرین نے ہی مجھے جھنجوڑا۔ دیکھا تو وہ شاور لے کر شلوار قمیص پہنے کھڑی تھی۔ میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تیاری تو ایسی ہے کہ جیسے کسی دعوت میں جا رہی ہو۔"

بولی۔ "باہر کی مٹی اور گرد کی وجہ سے کپڑے خراب ہو رہے تھے۔ سوچا شاور لے کر تبدیل کر لوں۔" اتنے میں سعد بھی آ گیا۔ اس نے بھی ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔

میں نے کہا۔ "تم ماں بیٹا تو نئے نکور ہو گئے۔ میں تو دوسرے کپڑے بھی ساتھ نہیں لایا۔"

نسرین بولی۔ "تو شاور ہی لے لو۔ تر و تازہ ہو جاؤ گے۔" اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔ "میں اتنے میں چائے بنا لیتی ہوں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پہلے کھانا لگا دو۔ چائے بعد میں پئیں گے۔"

پھر اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ نہا کر تازہ دم ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے نیا دن نکل آیا ہو۔ گیلے سیاہ لمبے بالوں میں نکھرتا خوب صورت چہرہ کسی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تازگی اور نور کا لمس تھا۔ وہ آج اپنے حسن پر نازاں نظر آ رہی تھی۔ مدتوں بعد اس کے چہرے پر احساس حسن کی وجہ سے بے اعتنائی تھی۔ اس کا سراپا کسی غرور میں ڈوبا تھا۔ وہ جو پہلے مجھے دیکھا کرتی تھی، اب اس کی نظروں میں بے پروائی تھی۔ یہ اس لڑکی کی طرح دکھتی تھی جو خوشی خوشی دلہن بن کر اپنے نئے گھر میں مالکن کی طرح داخل ہوتی ہے اور پھر اگلے روز اپنی سہیلیوں کو ناز و نخرے سے اور اترا کر دیکھتی ہے۔ یہ کچھ پا لینے کا احساس ہوتا ہے جو اس کو بلندی تک جا پہنچاتا ہے۔ میں اسے دیکھ کر مسکراتا ہوا باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

میں گرم پانی سے تا دیر شاور لیتا رہا۔ تمام تھکن دور ہو گئی جو میں صوفے پر لیٹ کر اپنے جسم کی دور کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جھاڑ کر اپنے وہی کپڑے پہنے اور لیونگ روم میں آ گیا۔

کھانا میز پر اس نے لگا دیا تھا۔ مائیکرو ویو میں پلاؤ گرم کر کے رکھا تھا۔ شامی کباب کے ساتھ گوشت کا سالن بھی تھا۔ روٹیوں کو پیک سے نکال کر اس نے فرائی پین میں گھی لگا کر تلا ہوا تھا۔ وہ خاصا اہتمام کر کے آئی تھی۔ سیاحت میں اچھا کھانا اور گہری نیند ہو تو سیاحت کا مزہ دگنا ہو جاتا ہے۔ کھانا تھا بھی انتہائی لذیذ اور مصالحے اس نے پاکستانی ذائقے سے ڈالے تھے۔ سعد کے لیے اس نے چکن میکرونی تیار کی تھیں جسے وہ بڑے شوق سے کھا رہا تھا۔ ہم دونوں کھانے سے فارغ ہوئے اور صوفے پر آ بیٹھا۔ اس نے چائے چولہے پر چڑھا دی۔ سعد اپنے کھلونے نکال کر قالین پر بیٹھا ان سے کھیلنے لگا۔

ابھی رات کے نو بجے تھے مگر محسوس ایسا ہو رہا تھا کہ آدھی رات بیت چکی ہو۔ چائے پیتے ہوئے میرے دماغ میں ایک خیال پک رہا تھا۔ میں رات کا کچھ پہر اس جھیل کے کنارے گزارنا چاہتا تھا جس کا ہیولا لائٹ بجھانے پر کچن کی کھڑکی سے مجھے اب نظر آیا تھا۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ اگر میں نسرین سے اس کا تذکرہ کروں تو کہیں مجھے بہکا ہوا انسان ہی نہ سمجھ لے پھر سوچا کہ اگر سمجھتی ہے تو آج ہی سمجھ لے تاکہ کل کو اسے مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ وہ میرے

ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی اور اپنی عادت کے مطابق پاؤں کافی کمبل پر رکھے تھے۔

مجھے سوچتا دیکھ کر بولی۔ "اب کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ٹھہر کر بتاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "میں بتا دوں؟"

"ہاں بتا دو۔" میں اس کی جانب دیکھ کر بولا۔

"تم کچن کی لائٹ بند کر کے کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ یقیناً تم جھیل ہی دیکھ رہے ہو گے۔ میں سمجھ گئی ہوں تمہارے ذہن میں کیا پک رہا ہے۔"

ہم تینوں جھیل کنارے آبیٹھے تھے۔ پلاسٹک کی ایک آرام دہ کرسی اٹھا لائے تھے جس پر کمبل اوڑھے سعد بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ نسرین نے بھی کمبل لپیٹا ہوا تھا۔ میں نے صرف اسپرنگ جیکٹ پہن رکھی تھی اور سر پر نسرین کی اونی ٹوپی چڑھا لی تھی۔ ہمارے آگے فائر پٹ میں لکڑیوں کو آگ لگی تھی اور ان کے شعلے ہوا کے زور سے ہماری جانب لپک رہے تھے۔ جھیل کی خاموش سطح، مہیب اندھیرے اور گہری خاموشی نے اس جگہ کو طلسم کدہ بنا رکھا تھا۔

یہاں آنے سے پہلے ہمارے درمیان اس بات پر بحث ہوئی تھی کہ میں یہاں تنہا آؤں گا یا وہ دونوں بھی ہمراہ جائیں گے۔ میں تنہا جانا چاہتا تھا۔ سعد تھک چکا تھا اور اسے نیند آرہی تھی۔ میں نے نسرین سے کہا تھا کہ باہر سردی ہے سعد کو نیند بھی آرہی ہے اس لیے میں اکیلا جاتا ہوں۔ وہ کہنے لگی کہ مجھے بھی ساتھ جانا ہے۔ ہم سعد کو اکیلا گھر میں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ڈیک پر رکھی کرسیاں فولڈنگ تھیں۔ ایک وہ اٹھائی۔ کمبل ساتھ لیے اور شارج کے ساتھ لائٹر بیگ میں ڈالے۔ میں نے چائے بنا کر تھرماس میں رکھی اور سب کچھ لا کر یہاں بیٹھ گئے۔ یہاں کی لکڑی میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ شعلہ دکھاؤ تو بھڑک اٹھتی ہیں۔ شعلے بلند ہوئے تو اردگرد کے درخت سرخ روشنی میں نہا گئے۔ جھیل کی سطح واضح ہوتی گئی۔ اندھیرے کا خوف نسرین کے دماغ سے اترا تو پُرسکون ہو کر پاؤں بینچ پر رکھے اور کمبل اوڑھ کر شعلوں کو تکنے لگی۔ ہوا چل رہی تھی اور ساتھ شعلوں کو زیادہ بھڑکا رہی تھی۔ ہم گرد و نواح کے ماحول سے کٹ کر شعلوں سے جڑ گئے تھے۔

راتوں کا اپنا ایک طلسم ہوتا ہے۔ اندھیروں میں بیٹھ کر روشنیوں کا تکنا۔ جیسے چاند کو دیکھنا، تاروں سے دل بہلانا یا اپنے اندر جھانک کر کوئی چنگاری کریدنا پھر اپنے دل میں کسی حقیقت یا پھر مجاز سے اجالا کرنا۔

یادوں کو کبھی موت نہیں آتی۔ ان کا کوئی کفن نہیں ہوتا اور نہ کوئی قبر ہوتی ہے۔ جب چاہا انہیں کہیں گاڑ دیا اور جب ضرورت پڑی دوبارہ سے زندہ کر دیا۔ یہ معجزہ اللہ نے صرف انسان کو دیا ہے، انہیں مار کر پھر سے زندہ کرنے کا۔ آگ کے شعلوں پر نظر رکھنے سے یکسوئی بڑھتی ہے اور یکسوئی دماغ اور دل کو روشن کر دیتی ہے۔ میں اس وقت یادوں میں ڈوبا نہ تھا بلکہ مستقبل کے ان لمحوں میں گھرا تھا جو شاید مجھ سے جلد ٹکرانے والے تھے۔ میرے اندر آنے والے دنوں کا رتی برابر بھی خوف نہ تھا اور اسی لیے میں خوش تھا۔ میرا دل کچھ لوگوں کے لیے دھڑک رہا تھا جو میرے ساتھ جڑے تھے اور ان کے لیے بھی جواب آکر جڑے تھے۔

سرخ روشنی سے جھیل کنارے سر اٹھاتے خودرو پھول حیرت سے ہمیں دیکھتے تھے کہ یہ کون ہیں جو اس پہر ان کی تنہائی میں مخل ہوئے ہیں۔ ہوائیں شعلوں سے لپٹ کر میرے پاس حدت لیے آتیں اور میں ان کی تمازت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ نسرین نے مجھے کپ میں چائے ڈال کر دی اور میں خاموشی سے گرم چائے کو پی رہا تھا۔ حرارت میرے اندر بھی تھی اور آس پاس بھی پھیلی ہوئی تھی۔ نسرین کی صورت اور آگ کی صورت۔ اس کا چہرہ میں نے دیکھا جو سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اور آگ اسے تمتما رہی تھی معلوم نہیں باہر کی آگ سے یا اپنے اندر کی آگ سے۔ آگ مجھ سے لڑ رہی تھی اور میں آگ سے۔

میں اس پر لکڑیاں اب نہیں ڈال رہا تھا کہ کہیں وہ زیادہ بھڑک نہ جائے۔ میں اپنے آپ سے برسرِ پیکار تھا۔ یہ میری جنگ تھی جو میرے اندر جاری تھی۔ میری یہ جدوجہد اس زندگی کی سب سے مشکل جدوجہد تھی۔ آہستہ آہستہ شعلے مدھم پڑنے لگے۔ دھیمی آنچ میں نے رہنے دی جو زندگی کی علامت تھی۔ میرے اندر ایک انجانی خوشی بھرتی چلی گئی۔

نسرین نے پوچھا۔ "آگ کو تیز کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا۔ "اس لیے کہ آسمان کے تارے آگ میں کم نظر آتے ہیں۔"

اور پھر شعلے مدھم پڑے تو جھیل کے اوپر آسمان کے سب تارے جگمگانے لگے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے پھر اتنے قریب چلے آئے کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہمیں چھو لیں گے یا ہم ہاتھ بڑھا کر انہیں اپنی مٹھی میں بند کر لیں گے۔ جھیل کے شفاف پانیوں پر شوخ تاروں کا عکس جھلمل جھلمل کرنے لگا۔

تارے پانیوں میں ڈوب کر لہرانے لگے۔ ایک ایسا منظر میرے سامنے الٹتا چلا آیا جس کا میں نے بہت کم تصور کیا تھا۔ یہ ان محبتوں کی طرح تھا جس کو میں اپنا نصیب بھی نہ سمجھتا تھا مگر آج وہ سامنے کھڑی تھیں۔ میں پہلے بھی اپنے دوستوں سے کہتا چلا آیا ہوں کہ میری تمام حسین یادیں یا تو میری محبتوں سے جڑی ہیں یا پھر سیاحت سے مگر اس رات کی یادیں محبت اور سیاحت دونوں سے بندھی ہوئی تھیں۔

میں اور نسرین دونوں بینچ پر بیٹھے تھے۔ میرے پاؤں زمین پر تھے اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پر تھیں۔ دونوں ہاتھ ٹھوڑی کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ نسرین نے پاؤں بینچ پر رکھے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں جھیل میں تاروں کے عکس پر تھیں۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ یہ منظر ہمیں گنگ کیے بیٹھا تھا۔ آسمان بادلوں سے صاف تھا اور کائنات کا سارا انتظام ہمارے اوپر آسمان پر چلا آیا تھا۔ بگ ڈپر یا دب اکبر کے سات ستارے واضح نظر آرہے تھے۔ میں آسمان کی لامحدود وسعتوں میں سر اٹھا کر یہ معجزہ دیکھنے لگا اور جب تھک گیا تو سر جھکا کر جھیل کے پانیوں کے اندر انہیں دیکھنے لگا۔

نسرین بولی۔ ”اچھا کیا جو شعلوں کو کم کر دیا ورنہ یہ آسمان اور تارے ہمیں نظر ہی نہ آتے۔“ میں نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا، پوچھنے لگی۔ ”تمہارے دل میں میری محبت چاند جیسی ہے یا تاروں جیسی؟“

”اس کا کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”مطلب نہ پوچھو۔ جو دل میں آئے بتا دو۔“

میں نے کہا۔ ”تاروں جیسی۔“

بولی۔ ”وہ کیوں؟“

جواب دیا۔ ”چاند کی محبت میں گو شدت ہے مگر اس کی مانند بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ درمیان میں تاریک راتیں بھی آجاتی ہیں مگر تاروں کی محبت مدھم ہے مگر اس میں ٹھنڈک ہے۔ ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ اگر یہاں بادل ہیں تو وہ کسی اور زمین پر دمک رہے ہوتے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”ہر بات کا جواب تمہارے پاس کہاں سے آجاتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تم جب سوال کرتی ہو تو جواب تمہارے چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”تم میرا چہرہ دیکھتے بھی ہو؟“

میں نے جواب نہ دیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے لیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بولی۔ ”تم نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میں بھی تمہارے لیے کچھ لائی ہوں۔“

پوچھا۔ ”کیا؟“

دایاں ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ مٹھی میں ایک کاغذ دبا تھا۔ پوچھا۔ ”یہ کیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”پڑھ کر سناتی ہوں۔“

”میں خود پڑھ لوں گا۔“ میں نے حیرت سے اس کاغذ کو دیکھ کر کہا۔

وہ بولی۔ ”تمہیں فارسی نہیں آتی۔ میں خود سناتی ہوں۔ یہ نظم ہے۔“

میں نے اپنی نظریں جھیل کے پانیوں میں تیرتے تاروں پر رکھ لیں اور اس نے کاغذ میرے حوالے کیا اور خود زبانی یہ نظم مجھے سنانے لگی۔

وہ کاغذ ابھی تک میرے پاس رکھا ہے۔ فارسی کے ساتھ اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی لکھا ہے۔

(ترجمہ) اس رات تمہارا نغمہ میں نے
ایک خوب صورت آواز میں سنا
میں ایک پیاسے ہرن کی طرح
اس آواز کے پیچھے پھرتا رہا
میں آہستہ آہستہ چشمے پر پہنچا
مجھے وہاں کوئی آواز یا نغمہ سنائی دیا
اوہ میری پری تو کہاں ہے
اپنا دلنشیں چہرہ مجھے کیوں نہیں دکھلاتی
تم کون سی جنت میں ہو
اس کے دروازے مجھ پر کیوں نہیں کھولتی
میں نے تمہیں ہر جگہ تلاش کیا
میں نے چاند اور تاروں سے تمہارا پوچھا
پھر تمہاری خوشبو مجھ کو کھلتے پھولوں سے آئی
میں نے پھر پھولوں سے التجا کی
کہ تمہارا پتا مجھے بتائیں
اوہ میری پری تو کہاں ہے

وہ سُر میں گنگنا رہی تھی۔ دھیمے دھیمے سے کسی ندی کی مانند بہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں سُر تھا۔ اس نے مجھے ترجمہ سنانا چاہا مگر میں نے روک دیا۔ ترجمہ میں بعد میں پڑھ لیتا۔ اس نغمے کو اصل زبان میں سننا زیادہ دلکش تھا۔ اس کی آواز میں رچاؤ تھا۔ بانسری کی طرح مدھر پن تھا۔ کچھ تھا

جو دل میں اتر رہا تھا۔ اس کی شخصیت کے پرت آہستہ آہستہ میرے آگے کھل رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اگر تم حسین نہ بھی ہوتی تو پیار کرنے کے لیے تمہاری آواز بھی بہت تھی۔“

وہ خاموش میرے کندھے سے لگ کر بیٹھی رہی۔ اس کے چمکتے گھنے بالوں سے آتی نسوانی خوشبو مجھے مخمور کر رہی تھی۔ اس کے بالوں پر سانس لیتے وقت میں نے زندگی کا لمس محسوس کیا۔ وہ سراپا محبت تھی۔ اس میں بہت کچھ تھا مگر اس کا کسی نے دھیان نہ رکھا تھا۔ اسے وقت کے تند تھپیڑوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ میں اس میں بہت سی صلاحیتیں دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی عام سی لڑکی سمجھ کر دولت کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی صلاحیتوں کو نکھار کر انہیں اس کی اپنی بہتری کے لیے استعمال کراؤں۔“ میں اپنے پلان کے مطابق چل رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تم نے پہلے بھی کبھی گنگنایا ہے؟“

”صرف سعد کی پیدائش کے بعد۔ جب رات کو اسے سلاتی تھی تو لوری دیتی تھی اس کو۔“ وہ دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔

”کبھی کسی نے سراہا؟“

”شوہر تو ڈانٹ دیتا تھا۔ کہتا تمہاری یہ آواز میرے لیے بیکار ہے۔ جب تک بھائی تمہارا حصہ تمہیں نہیں دیتے تم میرے لیے بیکار ہو۔“ وہ روہانسی ہوگئی پھر بولی۔ ”ایک بار میں کچن میں کام کر رہی تھی۔ سعد کمرے کے اندر کارٹ میں سویا تھا۔ میں اس کا دودھ بناتے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی۔ شوہر آیا اور اس نے بہت غصہ کیا۔ میں نے احتجاج کیا۔ اس نے مجھے دھکا دیا تو کاؤنٹر کا کونا میرا بازو گھائل کر گیا۔“

اس نے قمیص کا بازو اوپر کر کے کہنی سے نیچے مجھے اپنا زخم دکھایا۔ وہاں دو انچ سے لمبے زخم کا ایک نشان تھا۔ میرا دل بہت خفا ہوا مگر اپنے احساسات کا اظہار کر کے اس وقت میں اسے کمزور نہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”وہ تمہارا ماضی تھا۔ اب ختم ہو گیا ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ وہ اب لوٹ کر نہیں آئے گا۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”تم بے کار نہیں ہو، تم میں صلاحیتیں ہیں ان کو آگے بڑھاؤ۔“

وہ بولی۔ ”کس طرح؟ میں تو گورنمنٹ کے دیے گئے ڈرا اسٹور کی جاب پر اپنا گھر چلا رہی ہوں اس کے علاوہ میں کیا کر سکتی ہوں؟“

میں نے اس سے کہا کہ میری جانب دیکھ کر میری بات غور سے سنو۔

وہ سمٹ کر پیچھے ہوئی اور میری جانب غور سے دیکھنے لگی کہ معلوم نہیں کیا بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم یہ اسٹور کی جاب چھوڑ دو گی۔ میں تمہارا داخلہ کسی کالج میں کرواؤں گا۔ اونٹاریو گورنمنٹ اور فیڈرل گورنمنٹ آسان قسطوں پر قرضہ حسنہ دیتے ہیں، ان کے لیے جو پڑھنا چاہتے ہوں، گھر کا خرچ بھی دیتے ہیں اور تم تو ایک بچے کی سنگل ماں ہو۔ تمہارے لیے تو ان کے بہت پروگرام موجود ہیں۔ میرے خیال میں تم نے آئی ٹی یا ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں پہلے ڈپلوما کرنا ہے اور پھر یونیورسٹی سے ڈگری لینی ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں اب نہیں پڑھ سکتی۔ بہت مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے اور قرضہ بھی ملتا ہے یا نہیں؟“

میں نے کہا۔ ”تم قرضے کی فکر نہ کرو۔ ہو جائے گا۔“

”نہ ہوا تو؟ مجھے نہیں ملے گا اور پھر کیا کروں گی۔ گھر چلاؤں گی کیسے اور سعد کی کیسے دیکھ بھال کروں گی؟“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”اگر قرضہ نہ ملا تو میں کچھ کروں گا۔ میں کہہ رہا ہوں تو میرا یقین کرو۔“ میں نے اس کے دونوں کندھوں پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”تم کچھ کرو گے؟ ابھی بھی دو دو جاب کرتے ہو، فیملی بھی آرہی ہے اور کہتے ہو کہ میں کچھ کروں گا۔“ اس نے میرے ہاتھ کندھوں سے ہٹائے۔

”مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم پڑھ لو گی۔ تمہارے لیے کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔

”میں نہیں پڑھ سکتی۔ میں کالج یا یونیورسٹی میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں اسی طرح سعد کو پال لوں گی۔ مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالو۔“ اس کی آواز اونچی ہوگئی تھی۔

”جو تم پال رہی ہو۔ اسے پالنا کہتے ہیں۔ کل کو اس کی ہزار ضروریات ہوں گی تم گورنمنٹ کے دیے گھر میں اسے بڑا انسان بناؤ گی۔“ میں بھی طیش میں آرہا تھا۔

”مجھے گورنمنٹ کے گھر میں رہنے کا طعنہ مت دو۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ میں بھکاری نہیں ہوں میں تو اپنے حالات سے ستائی ہوئی تھی اور یہاں چلی آئی۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے غصے سے کہا۔ ”تم میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ میں یہ نہیں کہہ رہا تھا۔“

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”مجھے میرے حالات پر چھوڑ دو۔ میری فکر نہ کرو۔ تم مجھ سے وہ کام کرانا چاہتے ہو جو میں کر ہی نہیں سکتی۔ الٹا گورنمنٹ کے ہزاروں ڈالر کا بوجھ بھی اپنے اوپر ڈال لوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس کے اس رویے پر مجھے غصہ آگیا۔

میں بولا۔ ”نیند کا بہانہ مت کرو۔ ابھی ٹھیک ٹھاک بیٹھی تھیں اور اب نیند آرہی ہے۔“

اس نے آگے بڑھ کر سوتے ہوئے سعد کو اٹھانا چاہا۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روک دیا اور کہا۔ ”تم اسے اٹھا کر اوپر کمرے تک نہیں چل سکتیں اور کہتی ہو کہ میں اسے پال لوں گی۔“

میں نے سعد کو اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں کرسی اٹھائی اور چل پڑا۔ اس نے سامان سمیٹ کر بیگ میں ڈالا اور روتی آنکھوں سے میرے پیچھے پیچھے آنے لگی۔

میں نے کرسی ڈیک پر رکھی اور گھر کے اندر آکر سعد کو بیڈ پر لٹایا۔ اس پر کمبل ڈالا اور پیار کر کے باتھ روم میں جا کر رات کا ڈریس پہنا پھر اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ مجھے برا لگا تھا جب اس نے کہا کہ میری فکر نہ کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

میں بہت دیر بیڈ پر آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ میں جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔ اس نے ایک پل میں مجھے اپنے آپ سے علیحدہ کر دیا تھا۔ مجھے نیند نہ آئی اور میں اپنا کمبل اور تکیہ لے کر لیونگ روم میں آیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔ خاصی دیر بعد مجھے نیند آئی اور میں وہیں سو گیا۔

کچن کی کھڑکی سے صبح کی سپیدی داخل ہوئی تو میں اچانک اٹھ بیٹھا۔ تادیر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ صبح کا نور چھایا تھا۔ آسمان کی ہلکی روشنی زمین کے خدوخال واضح کر رہی تھی۔ درخت ہواؤں سے پہلے کی طرح جھوم رہے تھے اور سامنے جھیل کی سطح دھند سے ڈھکی تھی۔ باہر پرندوں کا شور برپا تھا۔

میں آہستگی سے اٹھا۔ نسرین کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی مگر وہاں مکمل سکوت تھا۔ غالباً دونوں سو رہے تھے۔ میں نے جاگرز پہن کر باہر نکل آیا۔

رات کے واقعے نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میں باہر نکھری اور خنک ہوا میں آکر گہرے گہرے سانس لینے لگا، ارد گرد شوخ نرم و سبز گھاس کو دیکھا۔ درختوں کو لہراتے دیکھا اور پرندوں کی بولیاں سنیں تو میری کوفت دور ہوگئی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا جھیل تک آیا۔ آتے وقت میں نے جھیل پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی تھی بلکہ اسے دور سے دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ میں اسے اس کے روبرو بیٹھ کر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اسی بینچ پر جا بیٹھا جہاں کل رات ہم نہ پڑھنے کی بات پر جھگڑ اٹھے تھے۔ میں وہیں بیٹھ گیا جہاں وہ کل بیٹھی تھی۔ ابھی وہ نہ تھی مگر گمان ہوتا تھا کہ وہ یہیں ہے۔

میں نے جھیل کو دیکھا تو ایک دلفریب منظر تھا۔ دھند سے وہ چھپی نہ تھی بلکہ دھند اس کے اوپر چند فٹ کے فاصلے پر آکر ٹھہر چکی تھی۔ دھند شاید اس کی خاموشیوں میں مخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ جھیل کے نیلے پانی اور دھند علیحدہ علیحدہ واضح نظر آرہی تھیں۔ اوپر درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ آسمان صاف اور اجلا تھا۔ کہیں کہیں بادل رک سے گئے تھے۔ ہوا میں خنکی کی وجہ سے میں دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے ہوئے سکڑا بیٹھا تھا۔ وہ اندر ناراض ہو کر سوئی تھی اور میں ادھر اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ میرے پیچھے بنے گھر کے ایک کمرے میں سوئی تھی اور مجھے یاد آرہی تھی۔ اس نے مجھے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ چاہتا تو اسے آواز دے کر اٹھا دیتا اور وہ میرے ہمراہ چلی بھی آتی مگر میں اسے کچھ ٹائم دینا چاہتا تھا۔ پر میں اب بیٹھا پچھتا رہا تھا کہ آخر کیوں میں اسے ٹائم دینا چاہتا ہوں۔

میں نے کئی طرح کی صبحیں دیکھی ہیں۔ وہ صبح بھی جو ڈیرہ میں سندھ کنارے نظر آتی ہے جب سامنے مشرق کا آسمان سرخ ہوا چاہتا ہے اور دریا کی تند موجیں آپس میں ٹکراتی اور شور مچاتی انجانی منزلوں کی جانب بڑھتی ہیں۔ وہ صبح جو فیری میڈو میں پہاڑی پر بیٹھے مجھے ملی جب نانگا پربت کی بلند چوٹیاں سنہری ہو رہی تھیں اور ساتھ رائے کوٹ گلیشیر کے ٹوٹنے چٹخنے کی پرہیبت آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ صبح شمشال گاؤں کے ریسٹ ہاؤس کی کھڑکی سے دیکھی تھی جب اسکول جاتی ایک بچی پاک سرزمین شاد باد کی آواز آنے پر اپنا بستہ کھیتوں میں رکھ کر احتراماً کھڑی تھی۔ وہ صبح جو طغر میں اپنے خیمے کا پردہ کھولنے پر مجھے نظر آئی تھی

جب ساتھ جنگل سے سرسراتی ہوائیں نیچے وادی میں اتر رہی تھیں۔ وہ صبح بھی جو سوئٹزرلینڈ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پہاڑی پر بنے تنہا کاٹیج کی کھڑکی سے جھانکتی تھی جب بادل پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے آرہے تھے اور چمکتی سرسبز وادی کی ڈھلوانوں پر جانوروں کی گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن چہار سو پھیلی تھی۔ وہ صبح جو پیرس کے قدیم اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے نظر آئی تھی جب سامنے گھروں کی منڈیروں پر بے حساب پرندے بیٹھے تھے۔ وہ صبح بھی جو زرمٹ کے پہاڑی کاٹیج کی بالکونی سے مجھے نظر آئی تھی جب میٹرہارن پیک صاف دکھتی تھی مگر وادیوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ صبح بھی جو لوزیان کے پرانے شہر میں ہوٹل کی کھڑکی سے میں نے دیکھی تھی جب شہر سکوت کے عالم میں تھا اور سامنے قدیم گرجا گھر نے پانچ گھنٹے بجائے تھے۔ وہ صبح بھی جب جھیل سیف الملوک کے پُراسرار حسن میں، میں اکیلا داخل ہوا تھا اور میں نے ملکہ پربت کو سر اٹھا کر نہیں بلکہ سر جھکائے جھیل کے پانیوں میں عکس کی صورت دیکھا تھا اور وہ صبح جب میں پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی کے رینٹل ہاؤس کے پیچھے جنگل کنارے جھیل کو دیکھ رہا تھا جہاں دھند اور پانیوں نے آپس میں ایک متبرک فاصلہ رکھا تھا اور درختوں پر بیٹھے پرندوں نے شور مچایا تھا۔ جہاں میں اکیلا بیٹھا اس لڑکی کو دکھی دل سے یاد کر رہا تھا جو مجھ سے روٹھ کر اپنے کمرے میں سوئی تھی۔ مجھے اس پر غصہ بھی تھا رنج بھی اور پیار بھی۔

اور پھر مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو وہی تھی۔ چادر اوڑھ رکھی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے اور شانوں سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں تھرماس اور ایک دوسرے ہاتھ میں اونی ٹوپی اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نگاہوں میں شکایت تو نہ تھی، نہ کوئی گلہ تھا۔ پر یہ ندامت کیوں تھی؟ میں نے اس سے کہا۔ ”تم اتنی جلدی کیوں اٹھ گئیں؟ یہ آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں؟ اس سردی میں چلی آئیں؟ سعد کو بھی اکیلا چھوڑ آئی پاگل لڑکی؟“

اس نے میری باتوں کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ہاتھ بڑھا کر اونی ٹوپی تھماتے ہوئے بولی۔ ”سردی تھی تو اسے کیوں چھوڑ آئے؟“

میں نے ٹوپی اپنے ہاتھ میں پکڑ لی تو وہ بولی۔ ”صبح تم کو چائے چاہیے ہوتی ہے ناں۔ تم بیٹھ جاؤ میں کپ میں چائے ڈالتی ہوں۔“

میں بیٹھتا چلا گیا۔ وہ ساتھ آبیٹھی مگ میں بھاپ اڑاتی چائے ڈال کر مجھے دی۔ اس کے چہرے پر پشیمانی تھی جو مجھے گھائل کیے جاتی تھی۔ میں نے مگ بینچ پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا سر پیچھے سے تھام کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر چہرے پر بہنے لگے تھے۔ میں نے.... رندھی آواز میں پوچھا۔ ”رات کو تم سوئی نہیں؟“

جواب میں اس نے میری جیکٹ میں منہ چھپاتے ہوئے صرف ”ہوں“ کہا۔ میں شدت جذبات سے کراہ اٹھا۔

اس میں اتنی تمازت تھی کہ اس کی آنچ سے میں سلگ رہا تھا۔

شدت احساس نے اس کے چہرے کے نقوش اور زیادہ خوب صورت کر دیے تھے۔ صبح کا ہر سو پھیلا نور اور بکھرتے رنگ سب سمٹ کر اس کے چہرے پر اتر آئے تھے۔ گویا ایک کیف اور انجانی خوشبو کہیں سے آکر فضا میں ٹھہر گئی تھی۔ جھیل کے پار، کہیں دور، بہت دور سورج طلوع ہوا تو آسمان کچھ نارنجی ہوا لیکن جب کرنیں بادلوں سے ٹکرائیں تو گلابی ہوتی گئیں۔ پرندے خاموش ہو گئے یا کہیں پرواز کر گئے۔ میں پیٹھ پر تھپکی دے رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ وہ... رو رہی ہے۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی گلاب کلیوں سے لگا لیے۔ پھر بولی۔ ”مجھے معاف کر دو۔“

”معافی کس بات کی؟“ میں خفگی کی وجہ بتا کر اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”اپنا وعدہ شروع کرنے سے پہلے ہی توڑنے کی اور تم کو......“

میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”کون سا؟“

”ایک وعدہ تم سے لیا تھا۔ باقی کے تو میں نے نبھانے تھے اور یہ کہ آئندہ تمہارا ہر کہا مانوں گی۔“ وہ بولی۔

”یہ تو نہیں کہ تمہارے وعدوں کے حساب کتاب میں تم پر کوئی بوجھ لاد دوں۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”میں اب داخلہ ضرور لوں گی۔ میں اب آگے پڑھائی کروں گی۔ دراصل میں گورنمنٹ کے قرضے کا نام سن کر گھبرا گئی تھی۔ بہت سے لوگ ایران میں بھی اس طرح پھنس جاتے ہیں۔“ اس نے اصل وجہ بتا دی۔

''ایک تو یہ ایران نہیں، یہاں تمہاری حیثیت سنگل مادر کی ہے اس کے لیے بہت سی مراعات ہیں۔ میں نے بہت کچھ معلوم کر رکھا ہے۔ میں گارنٹی دیتا ہوں کہ تمہاری فیس صد قرض تمہارا گورنمنٹ معاف کر دے گی۔ ساتھ میں گھر کا خرچ اور سعد کے لیے بے بی سٹنگ کے اخراجات بھی کرے گی۔ صرف ہر سمسٹر کو محنت کر کے پاس کرنا ہوگا اور میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔ کوئی مشکل ہوئی تو تم کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ راضی نظر آئی تو اپنی بات کی مضبوطی کے لیے میں نے کہا۔

''تم بس مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ مجھے اکیلا نہ ہونے دینا۔ باقی میں سب کرلوں گی۔ تم ہو تو مجھے معلوم ہے کہ کوئی مشکل نہ ہوگی اور یہ میرا داخلہ وغیرہ کب اور کیسے ہوگا؟'' وہ بولی۔

''تم نے ایران سے بیچلر کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ یہی بہت ہے۔ ہمبر کالج میں داخلہ ہو جائے گا۔ ابھی چند ماہ میں جب نیا سمسٹر شروع ہوگا اسی دوران میں سارا پروسیس شروع کردوں گا۔'' میں نے اپنا لائحہ عمل بتایا پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں وہاں سے ڈپلوما لے لو۔ اس کے لیے تعلیمی اسناد کی ایران میں جانچ پڑتال بھی نہیں کرانی پڑے گی بعد میں یونیورسٹی سے ڈگری لے لینا۔ آج کل ہیومن ریسورس کی جاب بہت ہیں اور وہاں صرف لڑکیوں کو ہی رکھا جاتا ہے۔'' میں نے مختصر طور پر اسے تفصیل بتائی۔

''تو میں ہیومن ریسورس میں کام کروں گی؟'' وہ خوشی اور حیرت سے بولی۔

''جو دوسری کرتی ہیں تو کیا ان پر سونے کے پتر چڑھے ہوتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر اس کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو ابھی سے تصور میں تمہیں کسی دفتر میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔''

''مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو۔'' اس نے ایسے انداز سے پوچھا کہ اسے تھوڑا سا کھینچ کر اپنے نزدیک کرلیا اور باقی وہ خود قریب آگئی۔ اب میں اس سے کہہ رہا تھا اور وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔

''ہم اپنی زندگی میں بہت سے رشتوں کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔ کچھ مذہبی، کچھ معاشرتی، کچھ قانونی اور کچھ لوگ آپس میں مل کر خود بنالیتے ہیں جیسے تم اور میں۔ اور کچھ رشتے اللہ کی دین ہوتے ہیں جیسے تمہارا اور سعد کا رشتہ۔ ہر رشتے اور تعلق کی مضبوطی کے کچھ نہ کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ میں یہاں اور رشتوں کی نہیں صرف دو رشتوں کی بات کروں گا۔ دونوں تم سے جڑے ہیں۔ ایک میں اور دوسرا سعد۔ ایک ہم نے بنایا ہے اور دوسرا اوپر والے نے۔ یہ دونوں مضبوط ہیں مگر حقوق دوسرے کے مجھ سے زیادہ ہیں۔ اگر آج میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو ہوسکتا ہے کہ کل مجھے بھی تمہاری ضرورت پڑ جائے مگر سعد کو تمہاری ضرورت ہر لحظہ رہے گی اور تمہیں اس کی۔ آج تم کسی اسٹور پر کام کرتی ہو اور گھر کا خرچ چلاتی ہو مگر کل اس جاب سے تمہارے اخراجات پورے نہیں ہوسکیں گے۔ سعد اسکول میں جب دوسرے بچوں کو اور طرح کی زندگی جیتے دیکھے گا تو کبھی اس کا دل بجھے گا اور کبھی دماغ کا پارہ چڑھے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اور سہارے تلاش کرے۔ ان سہاروں میں سب سے آسان اور خطرناک راستہ نشہ کرنے کا ہے جو ان دنوں تعلیمی اداروں میں بہت بڑھ چکا ہے۔ آج جو... کچھ اپنے لیے کروگی تو وہ دراصل بیٹے کے لیے ہوگا۔ اگلے چند سالوں میں تم جو کچھ حاصل کروگی اس سے سعد کے آگے معتبر اور قابلِ فخر ماں تو ہوگی ہی ساتھ ساتھ اپنی حیثیت کو بھی مضبوط کرلوگی اسی لیے میں معاشرے میں تمہارا باوقار اور بلند رتبہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہی میری تمنا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ تم یہ سب پانے کے لیے میرا ساتھ دوگی۔''

میں بول رہا تھا اور دورانِ گفتگو اس کی مجھ پر گرفت متواتر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ میرے پورے وجود میں سمائی جا رہی ہے۔ میں نے بات ختم کی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اس کے سر کو سہلا رہا تھا۔ اسے دلاسے دے رہا تھا۔ اسے چپ کرا رہا تھا اور پھر میرے اپنے آنسو بہنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''میرا رتبہ تو کل جا کر کہیں بنے گا مگر تم نے آج یہ سب کہہ کر اپنا مرتبہ بہت ہی بڑھا لیا ہے۔ میرے اپنوں نے تو مجھے بے یار و مددگار کر کے اس دنیا کے حوالے کر دیا تھا مگر تم غیر تھے اور اپنوں سے بھی بڑھ گئے ہو۔''

''میری اتنی تعریف نہ کرو کہ میں اپنے بارے میں کسی بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاؤں۔'' میں نے بائیں ہاتھ سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا کیونکہ دایاں بازو اس کی گرفت میں تھا۔

''میری دعا ہے کہ تم اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم رہو۔ میں اس دعا کے علاوہ تمہیں کیا دے سکتی ہوں۔ میرے پاس تو تم کو دینے کے لیے صرف یہی ہے۔'' وہ سراپا محبت اور پیار میں ڈوبی کہہ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہی بہت ہے بلکہ بہت سے بھی بہت زیادہ ہے۔''

''میری محبت بھی تو تمہارے پاس ہے، میرا سب کچھ بلکہ میری زندگی بھی کیونکہ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گی اور اگر میں مرگئی تو مجھے یقین ہے کہ تم سعد کو تو سنبھال لوگے۔'' اس نے یہ بولا تو میں نے کہا کہ اب اٹھ جاؤ۔ سعد کہیں جاگ نہ جائے۔

وہ اٹھی اور آنکھیں پونچھ کر مسکرائی اور دونوں ہاتھوں سے ساتھ پڑی اونی ٹوپی اٹھا کر میرے سر پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''سردی لگ گئی تو پورا دن چھینکتے پھروگے۔''

ہم واپس آرہے تھے تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ افق کے سارے گلابی، سرخ، نارنجی اور سنہری رنگ اس کے چہرے پر تھے۔ ہم دونوں مکمل اطمینان کے لمحوں میں تھے۔ اس نے معلوم نہیں کیا پالیا تھا مگر میں اسے کالج میں داخلہ لینے کے لیے راضی کرنے پر اندر سے بہت خوش تھا۔

ہم گھر میں آئے تو سعد ابھی بھی سو رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ''رات تم کبھی صوفے پر سوئے اور میں تو جاگتی ہی رہی۔ تم کمرے میں جا کر سو جاؤ، سعد کے ساتھ اور میں تمہارے بیڈ پر سو جاتی ہوں۔'' کچھ ہی دیر میں مجھے نیند نے آلیا۔ بیدار ہوا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ روشنی پیچھے کھڑکی کے پردوں سے چھن چھن کر کمرے میں آرہی تھی اور سعد ابھی تک سویا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کل بہت تھک گیا تھا۔

میں آہستگی سے اٹھا کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ بچہ جب بھی جاگتا ہے تو وہ ماں کو چاروں جانب دیکھتا ہے اور جب نہیں ملتی تو پریشان ہو جاتا ہے۔ بچے کو بیدار ہونے پر ماں کی ضرورت ہوتی ہے اور بوڑھے کو بیوی کی۔ بچوں کو ماں کی قدر نہیں ہوتی لیکن جب وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے بیوی کی قدر محسوس ہوتی ہے، وہ اور بات ہے کہ مانتا نہیں۔

میں لیونگ روم میں آیا تو باہر درختوں پر پرندوں کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ تھی۔ میں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور اپنے کمرے میں آیا جہاں نسرین سو رہی تھی۔ دبے قدموں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو میرے بیڈ پر کمبل اوڑھے وہ مدہوش سی نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چہرہ کمبل سے باہر پہلو کی جانب تھا۔ بال کھلے تھے۔ میں تادیر اس کے چہرے کے نقوش چوری چوری دیکھتا رہا کیونکہ جاگتی حالت میں اس کی جانب زیادہ دیر تک میں اپنی نگاہیں نہیں ٹکا سکتا تھا۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی بلکہ جھجک تھی۔ اس کی جانب چند لمحے دیکھ کر آنکھیں خود بخود جھک جاتی تھیں۔ ایک خاموش، پُروقار اور ٹھہرا ہوا ساتھ مجھے ہمیشہ نئے جہانوں میں لے جاتا ہے اور میں اس وقت ان ہی جہانوں میں تھا۔ اس کے چہرے پر روشنی کا ایک ہالہ تھا اس کے نقش میں ایک مدھر پن تھا۔ اس کے سیاہ بال خزاں کے چمکتے چاند کے گرد کالے بدلوں کی طرح دکھتے تھے۔ وہ جاگتی ہوئی مجھے اچھی لگتی تھی لیکن آج سوتے میں بھی مجھے اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ اس کی سیاہ اور لمبی پلکیں جیسے جھیلوں پر بادل تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا ساتھ اتنا پیارا ہے کہ میرے جیسا شخص اس کی تلاش میں کسی ندی کی طرح بہنے لگے گا۔ میں نے جرأت کی اور آگے بڑھ کر اس کے بکھرے بال درست کرنے لگا۔ میرا لمس محسوس ہوا تو جھیلوں پر سے بادل ہٹ گئے۔ مجھے دیکھا تو کچھ دیر دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں خمار تھا۔ اس کے قرب کی تمازت سے میں پگھلا جا رہا تھا۔ دل آویزی کا تحفہ ہر خوب صورت چہرے کو نہیں ملتا مگر اسے قدرت نے یہ تحفہ بے تحاشا عطا کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جلدی سے اٹھو۔ میں نے چائے کا پانی رکھ دیا ہے۔ اب تک تو ابل کر بہہ گیا ہوگا۔''

اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔ سعد کا پوچھا۔ بال باندھے اور دیکھتے ہی دیکھتے مجھ سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔

ہم سب تیار ہو کر ناشتا کر رہے تھے۔ میرے برابر والی کرسی پر سعد تھا اور سامنے نسرین۔ میں نے کیب کو بارہ بجے پہنچنے کے لیے فون کر دیا تھا۔ آملیٹ اور بریڈ کے سلائس وہ دونوں کھا رہے تھے اور میں چاولوں کے ساتھ قورمہ کھا رہا تھا۔ نسرین نے سامان پیک کر لیا تھا۔ سعد نے لمبی نیند کے بعد اپنی تھکاوٹ دور کر لی تھی اور اب چھتری گود میں رکھے ناشتا کر رہا تھا۔ میں نے کھانا کھا کر سب ڈِش یعنی کوڑا لفافوں میں ڈالا اور باہر رکھے ایک ڈرم میں پھینک آیا جسے ٹرکوں میں ڈال کر کہیں پھینکا جاتا ہے۔ نسرین نے سب سامان سمیٹ کر کچن کو پھر سے چمکایا تھا۔ سارے برتن اس نے ڈش واش میں ڈال کر اسے اسٹارٹ کر دیا اب وہ مطمئن تھی۔ ہم نے مل کر گھر کو اس حالت میں بدل دیا جو ہمیں آتے وقت ملا تھا۔

میں کچن کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا اور اس جھیل کو دیکھ رہا تھا جہاں ہم نے زندگی کے یادگار لمحات گزارے تھے۔ اس

جگہ پر اس قربت میں پھر سے آنا ممکن تھا یا نہیں میں یہی سوچ کر اداس کھڑا تھا۔ نسرین قریب آئی اور بولی۔ ''جو تم دیکھ رہے ہو، میں بھی وہی دیکھ رہی ہوں۔ پر جو میں محسوس کر رہی ہوں وہ شاید تم نہیں کر رہے ہو گے۔ تم نے مجھے یہاں لاکر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یادوں کے انمٹ نقوش میرے دل پر ثبت ہو گئے ہیں۔ میں تمہارا شکریہ تو ادا نہیں کروں گی کیونکہ یہ لفظ اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر سوچتی ہوں کیا کہوں جو میرے جذبات کی عکاسی کر سکے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''تم نے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا ہے۔ میں نے بھی سب محسوس کر لیا ہے اپنے ان احساسات کے بدلے اب میں یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھے کہیں چھوڑ تو نہیں جاؤ گی؟''

وہ سرشاری میں بولی۔ ''تمہارا اظہار محبت بھی بڑا دلکش ہے اور یہ میری زندگی کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔''

اتنے میں دروازے کے باہر کیب آ کر رکی۔

تقریباً ہر انسان اپنی زندگی میں دنیا کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ دوڑنے والے کو ڈھونڈنے پر یا پھر خواہش کرنے پر کچھ ایسے لمحات ملتے ہیں کہ وہ سستانے کے لیے ذرا دیر کو رکتا ہے۔ یہ سستانا بالفاظ دیگر ایک پڑاؤ ہوتا ہے جہاں آپ اس بھاگ دوڑ سے بے زاری اختیار کرتے ہیں۔ جب بھی آپ اس سے اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں تو یہ ایک نئے روپ میں آپ کو اپنے درشن کراتی ہے۔

ہمارے ساتھ بھی آج ایسا ہی ہوا تھا۔ ہم گھر سے روانہ ہونے لگے تو ڈرائیور نے مجھ سے کہا کہ تم لوگوں کو میں لیک آن دی ماؤنٹین سے پہلے کسی اور جگہ لے چلتا ہوں۔ میں نے جب پوچھا کہ کیا بہت خوب صورت جگہ ہے تو اس نے جواب دیا۔ ''تم اور تمہاری فیملی وہ جگہ دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔''

میں نے کل کی طرح پھر سے سر کھجاتے ہوئے شکریے کے ساتھ ہامی بھری۔

وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ پہاڑی چوٹی سے لے کر نیچے تک درختوں سے ڈھکی تھی۔ آسمان آج بادلوں سے صاف تھا مگر رنگ ہمیشہ کی طرح وہی نیلا تھا۔ دائیں جانب دور تک پھیلے سرسبز کھیت تھے۔ کھیتوں میں متعدد پھولوں سے لدے درخت تھے۔ سورج کی پڑتی کرنوں نے سبزے کو جھلسایا نہیں بلکہ زیادہ نکھار دیا تھا۔

یہ فارم ہاؤس تھا۔ آلو کی فصل تیار تھی۔ کھیتوں کے بیچ قالین کی طرح بچھے سبزے کے قطعات تھے۔ خوب صورت گھر تھے۔ ساتھ میں فصل کو اسٹور کرنے کے لیے قدیم بارن ہاؤس بنے تھے۔ یہ مخروطی چھتوں والے لکڑی کے بڑے بڑے ہال تھے جن میں فصل کاٹ کر اسٹور کی جاتی تھی۔ بارن ہاؤسز پر لال رنگ چڑھایا ہوا تھا۔ یہ بارن ہاؤس، گھاس کے میدان، کھیت اور پھولوں سے بھرے درخت سب مل کر ایک حسین منظر تخلیق کر رہے تھے۔ صاف، شفاف اور خاموشی میں بڑی سڑک سے میں یہ منظر دیکھ رہا تھا جس میں کوئی انسان نہ تھا اور صرف اس پر اڑتے پرندے تھے۔ ایسا سماں تھا کہ نظر نہ ہٹتی تھی۔ ایسا نظارہ کہ دل میں اتر رہا تھا۔ ان گھروں میں رہنے والے مجھے انتہائی خوش نصیب لگ رہے تھے جن کو یہ تنہائی، یہ خاموشی اور خوب صورتی میسر آئی تھی۔ یہاں کی زمین میں دفن ہونے والوں کے بھی کیا نصیب تھے کہ ہوا کا کوئی جھونکا بھی ان کی قبروں پر پھولوں کی بارش کر دیتا ہو گا۔ ان کے مرقد پر گھنے درختوں کی چھاؤں ہوتی ہے اور جہاں خنک ہوائیں ان سے لپٹ لپٹ کر چلتی ہیں یہ کوئی جنت کا ٹکڑا تھا جو زمین پر آگرا تھا۔

نسرین پچھلی سیٹ سے میرے کان کے قریب آ کر بولی۔ ''یقین نہیں آ رہا کہ اتنی ساری خوب صورتی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ یہ سب خواب ہے۔''

میں بولا۔ ''مجھے خواب بالکل نہیں لگ رہا کیونکہ تمہاری خوب صورت ناک میری گردن کو چھو رہی ہے۔''

کیب ایک جگہ رکی جہاں بائیں جانب جھیل تھی۔ اس میں تیز رفتار بوٹس بھاگتی پھر رہی تھیں۔ اس میں متعدد جزیرے تھے جن پر انتہائی دیدہ زیب مکانات بنے تھے اور جہاں جہاں گھر نہ تھے وہاں سرسبز پھولوں سے لدے درخت تھے۔ ایک راستہ جھیل کے اندر تک چلا گیا تھا اور ہماری کیب اس پر چل رہی تھی۔ دونوں جانب ایسے مناظر جن کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہے۔ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ خوب صورت اور اجلے اجلے گھر، نرم دبیز قالینوں کی طرح بچھا سبزہ، درخت، پھول، نیلا آسمان اور پیچھے دور دور تک نیلے پانیوں کی جھیل اور اس میں پھیلے ہرے بھرے چھوٹے چھوٹے جزائر، سڑک کی دونوں جانب یہی نظارہ تھا۔ یعنی ہم جس پٹی پر جا رہے تھے وہ جھیل کے پانیوں سے تین جانب گھری تھی۔ ہر گھر کے اردگرد کئی رنگ کے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ایسے خوشنما پھول لہرا رہے تھے کہ رنگ ان کے اتنے شوخ کہ آنکھوں میں بستے جا رہے تھے۔

ڈرائیور ہمیں بتا رہا تھا کہ یہ یہاں کا مہنگا علاقہ ہے۔ ہر گھر کے پاس آٹھ ایکڑ سے زیادہ زمین ہے اور کوئی گھر ایک کنال سے بڑا نہ ہو گا۔ باقی کی زمین کو لینڈ اسکیپ کے لیے استعمال کرنا تھی۔ کوئی اور تعمیر (ایک گھر کے علاوہ) کی اجازت نہ تھی اور لینڈ اسکیپ کو بھی ایک معیار پر رکھنا ضروری تھا۔

ہر گھر کی موٹر بوٹ گھر کے پیچھے جھیل پر کھڑی تھیں۔ جہاں نہیں تھیں تو وہ کھلے پانیوں میں تھیں۔ خاموشی ایسی تھی کہ کوئی درخت کا پرندہ چہچہاتا تو کان کھڑے ہو جاتے۔ کیب کو ایک جگہ روک کر جھیل کے کنارے کھڑے ہو گئے اور اس کے خاموش آسمان کو تکنے لگے۔ یہاں سے جانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ہم بینچ پر بیٹھے یہ نظارہ کر رہے تھے۔ نسرین نے کہا کہ جی نہیں کرتا یہاں سے اٹھ کر جائیں۔ سعد بھی حیرانگی سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔

میں اس علاقے کو بجا طور پر جھیلوں کی زمین کہہ سکتا ہوں۔ ایسی زمین کہ اگر اس جگہ جھیل نہیں تو لامحالہ طور پر ایک آدھ میل دور کوئی نہ کوئی جھیل ضرور ہو گی۔ زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہ تھا جو ہریالی سے خالی ہو۔ کوئی ایک درخت ایسا نہ تھا جس پر پھولوں کے انبار نہ ہوں اور جس پر پرندے نہ چہکتے ہوں اور جو عطر بیز ہواؤں سے جھوم نہ رہا ہو۔ تنہائی ایسی کہ جو آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔ دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آتا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لوگوں کے قدموں سے یہ جگہ میلی ہو جاتی ہو گی اس لیے بنی نوع انسان کا داخلہ یہاں ممنوع کر دیا گیا ہے۔

پھر ایک پہاڑ آیا اور سڑک اوپر کی جانب اٹھتی چلی گئی۔ عموماً پہاڑی سڑکیں ڈھلوانوں پر بنی ہوتی ہیں مگر یہ سیدھا چوٹی پر چڑھتی جا رہی تھیں اردگرد جنگلات تھے جنہوں نے پورے پہاڑ کو سبزے میں ڈھانپ دیا تھا۔ یہاں کی گاڑیوں کے انجن مضبوط ہوتے ہیں اور ان کے لیے ایسے راستوں پر چڑھنا قطعاً مشکل نہیں ہوتا۔ یہ سفر طویل ثابت نہ ہوا اور ایک دم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے جہاں ایک جھیل ہماری منتظر تھی۔

کیب سڑک کنارے رکی جہاں پہلے سے چند گاڑیاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ڈرائیور نے اتر کر کہا۔ ''یہی لیک آن دی ماؤنٹین ہے۔ آپ لوگ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا یہاں گزاریں۔ میں یہیں انتظار کروں گا۔''

بائیں جانب ایک انتہائی دیدہ زیب جھیل اپنی ازلی تنہائیوں میں گھری نظر آتی تھی۔ یہ ایسا مقام تھا جو جھیلوں کے رسیا کو ایک ہی نظر میں سحر زدہ کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جیسے اناکونڈا سانپ اپنے شکار کو اپنی طلسمی آنکھوں سے جکڑ لیتا ہے۔ ایسے ہی اس جھیل نے مجھے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ اس علاقے میں اتنا حسن تھا کہ میرے لیے ناممکن ہے کہ ایک ایک مقام کو دوسرے سے جدا کر کے علیحدہ علیحدہ اس کی لفظوں میں تصویر کشی کر سکوں۔

لیکن مجھے نیرا میڈو کا حسن زیادہ بھاتا تھا۔ اس کے حسن کی بات ہی کچھ اور ہے۔ نیرا میڈو کا خیال آیا تو نظروں کے سامنے شاہ جی کا چہرہ ابھر آیا۔ ان کا معصومیت بھرا انداز یاد آنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ مجھے وہ اندھیری رات بھی یاد آنے لگی جس رات موت ہم سے ایک ڈیڑھ فٹ دور رہ گئی تھی۔ اگر آواز دے کر روکا نہ جاتا تو شاید ہم میں سے کوئی نہ بچتا۔ صبح دن کی روشنی میں اسے دیکھا تو دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ یہ سوچ کر ہم سب لرز گئے تھے کہ اندھیرے کی چادر میں لپٹی ایک پتلی سی پگ ڈنڈی پر ہم چلتے رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی اگر ذرا سا بھی لڑکھڑاتا تو سیدھا کئی سو فٹ وادی میں جا گرتا۔ ایسی خطرناک پگ ڈنڈی تھی وہ مگر جب ہم اوپر پہنچے تھے تو اوپر کا حسن دیکھ کر سب کے سب مبہوت رہ گئے تھے لیکن یہ علاقہ جہاں ہمیں ڈرائیور لے کر آیا تھا برا نہیں تھا۔ قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔ ایک جھیل بھی تھی۔ وہ ایک بہت بڑی جھیل جس میں دور دور تک لیک اونٹاریو کے پانی پھیلے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کہاں دیکھوں اور کہاں نہ دیکھوں۔ بادل کے ٹکڑے کہیں سے آ کر ہمارے اوپر رک گئے تھے اور آسمان کے رنگ یہاں آ کر بدل سے گئے تھے، وہ رنگین ہو چکا تھا۔ پورا آسمان اپنے رنگوں سمیت جھیل کے نیلے پانیوں میں منعکس ہو رہا تھا۔ جھیل کے کناروں پر جنگلات تھے۔ اونچے اونچے درخت، جن کا عکس پورے کا پورا جھیل کے کناروں پر ایک گولائی میں پھیلا تھا۔ لیک اونٹاریو بھی نیلی جھیل تھی مگر یہاں قدرت نے زیادہ رنگ گھول دیا تھا۔

ہم چلتے ہوئے ایک پرانے بوڑھے درخت کے پاس گئے جس کی ٹہنیاں زمین کو چھونا چاہتی تھیں۔ وہاں بہت سی پکنک ٹیبل رکھی تھیں اور ہمارے علاوہ اردگرد اس وقت کوئی نہ تھا۔ ہم ایک بینچ پر درخت تلے بیٹھ گئے جہاں گلابی پھولوں سے بھری شاخیں ہمارے چہروں کو چھو رہی تھیں۔ نسرین نے ایک شاخ اپنے اوپر سے ہٹائی تو لاتعداد کلیوں کی بارش اس

پر ہونے لگی۔ کچھ کلیاں اس کے بالوں سے اٹکیں، کچھ نے چہرے کو چھوا اور باقی اس کا دامن بھر گئیں۔ میں نے کیمرے کا بٹن دبا دیا اس وقت اتاری گئی تصویر میں وہ گلابی کلیوں سے لدی مسکرا رہی ہے۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اس ماحول کو اپنے اندر جذب کرنا چاہا تھا۔ آنکھیں موندھیں تو دل کے دیے روشن ہو گئے۔ سعد کے معصوم چہرے کا لمس میری گود میں تھا اور تازہ خنک ہوا میری شرٹ میں گھس رہی تھی۔ جسم تازگی سے نہا گیا تھا۔ معطر ہوا سے درخت کی ٹہنیاں سرگوشیاں کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ کہتی تھیں اور میں سمجھ رہا تھا۔ راز کی باتیں ہم میں ہو رہی تھیں۔ ایسے راز جن کے بھید کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ راز کھل جاتے تو دل ان کی یادوں سے خالی ہو جاتا۔ وہ سرگوشیاں دل سے وعدے وعید لے رہی تھیں اور دل ان کو یقین دہانیاں کرا رہا تھا پھر میں نے اپنے سر پر لمس محسوس کیا اور بقول پروین شاکر ''روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی'' آنکھیں کھول کر دیکھا تو دو مسکراتی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ آنکھوں میں دیکھا تو گلابی کلیوں کا مسکراتا ہوا عکس تھا۔ عکس میں محبت کا بہتا دریا تھا اور دریا میں فنا کر دینے والی تلاطم خیز موجیں تھیں۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ''حیرت سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''میں حیرت سے تو نہیں دیکھ رہا تجسس سے دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''کیسا تجسس؟''

''میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ وہ وجہ تلاش کر رہا تھا جس نے مجھے بدل دیا ہے۔''

''وجہ ملی یا نہیں؟''

''کچھ تمہاری آنکھوں میں پائی اور باقی شاید میرے دل میں ہوگی۔''

''وہ وجہ مجھے نہیں بتاؤ گے جو میری آنکھوں میں چھپی تھی۔'' وہ شوخی سے مسکرا کر بولی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''یہاں بینچ پر بیٹھ کر جھیل کی جانب دیکھو پھر مجھے بتاؤ تمہیں کیا کیا نظر آ رہا ہے؟ اور کیا محسوس ہو رہا ہے؟''

وہ مجھے بتانے لگی۔ ''جھیل کے نیلے پانی، نیلا آسمان، کہیں کہیں بادل، اڑتے پرندے، جھیل کے اردگرد درخت، بہت سے درخت، ہرے بھرے درخت، پھولوں سے بھرے درخت، جھیل کے کناروں پر ان کا عکس، جھیل کی ساکن سطح، تنہائی، خنک ہوائیں، خاموشی بلکہ گہری خاموشی، بلا کی خوب صورتی، پھول، مدہوش کر دینے والے لمحے، تمہارا ساتھ، مطمئن سانسیں، بہت کچھ پا لینے کا احساس، کہیں کھو جانے کی آرزو، مختلف نظر آتی دنیا، بدلی بدلی سوچیں اور......''

میں نے کہا۔ ''بس یہیں رک جاؤ۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''یہ دیکھ کر تمہاری سوچیں بدل گئیں اور میں نے یہ سب اور بہت کچھ تم میں اور تمہاری آنکھوں میں دیکھا جس نے مجھے بدل ڈالا اور یہی وجوہات ہیں جس کا تم پوچھ رہی تھی۔''

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں سوالات اٹھنے لگے۔ بولی۔ ''یہ جو کچھ تم نے مجھ میں یا میری آنکھوں میں پایا۔ کیا کبھی پہلے نہیں پایا؟ اور کیا کبھی پہلے بھی بدلے ہو؟''

''میری زندگی کے راستے پر بہت سے لوگ تھے۔ کچھ پیچھے رہ گئے اور کچھ آگے نکل گئے مگر مجھے بدلا تو میری بیوی سمیعہ نے بدلا اور مکمل بدل ڈالا۔ شادی سے پہلے بلکہ منگنی سے بھی پہلے جب میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پیار دیکھا تھا جو آنسوؤں کی صورت رہتا تھا تو میں بدل گیا۔ اس کے لیے مکمل بدل گیا تھا۔ میں آج بھی اسے ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر میں کچھ نہیں بلکہ نامکمل ہوں۔ ہم لڑتے بھی ہیں۔ جھگڑا بھی ہوتا ہے مگر ہم دونوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔''

میں یہ کہہ کر کھو سا گیا۔ نسرین نے میرے ہاتھ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ مسکرا کر بولی۔ ''تم نے سچائی اور ایمانداری سے اور بڑے سلیقے سے یہ سب بتا دیا اور مجھے مطمئن کر دیا۔ میں مطمئن اس لیے ہوں کہ تم نے جو کچھ مجھ سے کہا ہوگا وہ بھی سچائی اور ایمانداری سے کہا ہوگا۔''

ہم کچھ دیر میں اٹھے اور اس مشاہدہ گاہ کی جانب گئے جہاں کھڑے ہو کر جھیل کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ لکڑی کا بنا ایک بڑا سا پلیٹ فارم تھا جو جھیل کنارے بنا تھا۔ اس کے گرد لکڑی کی باڑ تھی جس پر ہم ٹیک لگائے کھڑے جھیل کے دور دور تک پھیلے پانیوں کو دیکھ رہے تھے۔ کناروں پر درختوں کا عکس تھا جس نے جھیل میں کچھ نئے رنگ بھر دیے تھے۔ آسمان پر بادلوں اور ان کے رنگوں نے پانیوں میں جلترنگ پیدا کر دی تھی۔

(جاری ہے)

سخت جان

فرزانہ نکہت

انسان کی زندگی محنت کے گرد گھومتی ہے، گر انسان محنت نہ کرے تو زندگی کانٹوں کی سیج ہے اور اگر محنت کرتا رہے تو آنے والا وقت اس کے لیے گلزار ثابت ہوتا ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محنت وہی کرتے ہیں جن کے خمیر میں یہ جذبہ ہوتا ہے. اس علاقے کے لوگ محنت کرنا جانتے ہیں یہی ان کی پہچان ہے.

کڑی محنت کرنے والوں کا خطہ، وہ ملک جہاں محنت فرض ہے

ناروے کے باشندے کرۂ ارض کے انتہائی سخت جان اور جفاکش ہوتے ہیں۔ سیاحوں کو یہ خصوصیت ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ سرخ رخساروں والے لڑکھڑاتی چال چلنے والے، کمسن بچے بھی ٹھٹھرا دینے والی سردی سے بے نیاز برف سے ڈھکے میدانوں میں دوڑتے بھاگتے نظر آ جاتے ہیں۔ مخصوص لباسوں میں ملبوس نانیاں دادیاں بڑے پُروقار انداز سے برف پر اسکائی انگ کر رہی ہوتی ہیں۔ خاندانوں کے خاندان آرکٹک سرکل سے اوپر کیمپنگ کے لیے یوں جا رہے ہوتے ہیں گویا وہ ڈزنی لینڈ کی سیر کے لیے جا رہے ہوں۔

اہلِ ناروے کی سخت جانی اور جفاکشی نے تاریخ سازی بھی کی ہے۔ ہزاروں سال پہلے وائی کنگ حملہ آور ناروے سے نکل کر دنیا کی انتہائی دور دراز کی اجنبی اور نامعلوم سرزمینوں کو کھوجنے کی مہم پر نکلے تھے۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک کھوج و جستجو اور دریافتوں کا شوق اہلِ ناروے کی

فطرت کا حصہ ہے۔ 1911ء میں روالڈ ایمنڈسن اور اس کے چار ہم وطن قطب جنوبی پر پہنچے تھے۔ وہ پہلے انسان تھے جنہوں نے وہاں قدم رکھا تھا۔ اب تقریباً ایک صدی بعد بھی نارویجین مسلسل قطبی مہمات میں مصروف ہیں اور قطبین کو دور دور اندر تک کھوجتے پھر رہے ہیں۔ 1990ء میں ارلنگ کاج اور اس کا ساتھی بورگ اوسلینڈ چار دوسرے ملکوں کی ٹیموں پر سبقت لے جاتے ہوئے قطب شمالی پر اس حالت میں پہنچے تھے کہ نہ تو ان کے ساتھ کتے تھے نہ ہی انہیں کسی قسم کی مدد حاصل تھی اور نہ ہی انہیں ہوائی جہازوں کے ذریعے خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت کی ترسیل کی سہولت حاصل تھی۔ 1993ء میں ارلنگ کاج پہلا شخص تھا جو تن تنہا قطب جنوبی پر پہنچا تھا۔ اس کے دو سال بعد لیف آرنے پہلی خاتون تھی جو تنہا اسکائی انگ کرتے ہوئے قطب جنوبی پر پہنچی تھی۔

ایسا آخر کیوں ہے کہ ناروے جس کی کل آبادی چار اعشاریہ چار ملین یعنی تائی پائی کی آبادی جتنی ہے مسلسل ایسے سخت جان اور جفاکش باشندے پیدا کر رہا ہے؟

یہ معاشی ضروریات نہیں ہیں۔ ایک زمانے میں ایسا ہوا تھا کہ ملک کی بنجر اور غیر زرخیز زمین کی وجہ سے ناروے کے باشندے اپنی زندگی اور بقا کے لیے ادھر اُدھر نکل گئے تھے لیکن اب دو عشروں سے وہ بحر شمالی کے تیل کے ذخائر کی بدولت خوش حال اور فارغ البال بن چکے ہیں۔

سردی اور برف اہل ناروے کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ ان سے لطف اندوز ہونا جانتے ہیں۔ مہم جوئی، خطرات پسندی اور محیرالعقول کارنامے انجام دینا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ ارلنگ کاج نے اپنے قطب جنوبی پہنچنے کے ایک سال بعد ماؤنٹ ایورسٹ بھی سر کرلی تھی اور ناروے ہی کی گریٹا ؤنرنے نو مرتبہ نیویارک سٹی میراتھن جیتی تھی۔ وہاں اسے مہم جوؤں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے کئی مرتبہ سائیکلوں پر دنیا کا چکر لگایا اور کشتی میں عبور کیا اور پاپیادہ گرین لینڈ کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیمائش کی۔

اہل ناروے کی سخت جانی اور جفاکشی کا راز برف رواں یا برف باد آورد میں پنہاں ہے۔ جو لوگ یہ راز معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ جب اس کے دارالحکومت اوسلو پہنچتے ہیں تو وہ انہیں دنیا کے دیگر دارالحکومتوں سے کچھ مختلف نہیں دکھائی دیتا۔ درختوں پر گری برف سورج کی دھوپ میں جگمگا رہی ہوتی ہے۔ شہر سے نکلنے والے برف سے ڈھکے سب راستے دور ایک جنگل میں جا نکلتے ہیں۔ اس جنگل میں لوگ اپنی اتوار گزارنے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ جنگل "اوسلو مارکا" یعنی اوسلو کا جنگل کہلاتا ہے۔ یہ سات جنگلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا کل رقبہ امریکی شہر شکاگو جتنا ہے اور یہ اوسلو سے صرف بیس منٹ کی مسافت پر ہے۔

اس جنگل میں جوان بچے بوڑھے سب اسکائی انگ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنگل کے کناروں پر جابجا ہٹس بنی ہوتی ہیں جن میں الاؤ روشن ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے ان کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔

ناروے میں اس طرح اتوار گزارنا وہاں کی روایات کا ایک حصہ ہے۔ اتوار کا دن اہل ناروے بجائے گھر میں ٹی وی کمپیوٹر وغیرہ کے سامنے بیٹھ کر گزارنے یا آتش دان کے سامنے بیٹھ کر کتابوں وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے باہر گزارنا پسند کرتے ہیں۔

پہاڑی سلسلوں میں ویک اینڈ کیبن بھی بنے ہوتے ہیں۔ جہاں اسکائی انگ کے شوقین آکر ٹھہرا کرتے ہیں۔ ان میں اسکائی انگ کے زبردست مقابلے ہوتے ہیں۔ اوسلو سے 35 میل دور للیہمر کے پہاڑوں میں 1994ء میں اہل ناروے کی سرمائی اولمپک گیمز منعقد ہوئی تھیں۔ یہ جگہ اہل ناروے کے لیے اتوار کے دن سیر و تفریح کی بہترین جگہ شمار ہوتی ہے۔

نارویجین بچوں کو کمسنی ہی سے برف پر دوڑنے بھاگنے کھیلنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ان میں اسکائی انگ سے دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ سات سات سال کے بچے بڑے آرام سے برف پوش پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر چڑھ اتر سکتے ہیں اور اسکائی انگ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ یہ کمسن بچے گروہ کی صورت میں کسی نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر وہاں برف میں دبی گھاس پھونس ٹہنیاں وغیرہ نکال کر الاؤ جلاتے ہیں اور اپنے آپ کو گرمائش پہنچاتے ہیں۔ ایک امریکی سیاح جب وہاں کی سیاحت پر پہنچا تھا تو اس نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر بچوں کی ایک ٹولی کو آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے دیکھا تھا۔ اس وقت درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے دس درجے نیچے گرا ہوا تھا اور وہ خود سردی سے بری طرح کپکپا رہا تھا۔ ایک بچے نے جب اسے دیکھا تو بولا۔ "آپ نے گرم کپڑے کیوں نہیں پہنے؟"

وہ سیاح اس وقت موٹی سی چمڑے کی جیکٹ اور عام جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ناروے کی کہاوت ہے۔ "برا موسم کوئی چیز نہیں لیکن برے کپڑے واقعی ایک چیز ہیں۔"

نارویجین فطرت کو تعلیم کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ "زندگی کلاس روم کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہے۔" ایک اسکول ماسٹر کا کہنا تھا۔

آرکٹک سرکل کے اوپر آلٹا کا ایک رہائشی اگنار برگ اس پر یوں صاد کرتا ہے۔ "گھر میں ہمارے پاس ٹی وی کمپیوٹر وغیرہ سب کچھ موجود ہیں لیکن ہم تمام تر اسباق گھر سے باہر دامن فطرت میں رہتے ہوئے سیکھتے ہیں اور یہ سیکھتے ہیں کہ کسی بھی چیز کا حصول ایسا آسان نہیں کہ بس بٹن دبایا اور وہ ہمیں مل گئی۔"

اگنار اور اس کی بیوی آئرین اپنے کمسن بیٹے کے ساتھ الاسکا میں دریائے یوکان تک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ "ہم اپنے بچوں کو صرف ایک ہی چیز دے سکتے ہیں اور وہ ہے فطرت سے محبت۔" آئرین کا کہنا ہے۔

ناروے کے معروف شہر ڈریمن میں وہاں کے مشہور مصنف نور بوسین لارسن رہتے ہیں جنہوں نے ناروے کی دریائی، آبادکاری اور اس کے باشندوں و دیگر خصوصیات کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھ رکھی ہیں۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ آخر ان کا ملک یوں دلیرانہ فطرت کے مقابلے میں کیسے ڈٹا رہتا ہے تو انہوں نے جواب دیا۔ "اس کا جواب نین سن کے پاس ہے۔"

ناروے کا مشہور مہم جو سیاح نین سن 1888ء میں گرین لینڈ کی سیاحت پر روانہ ہوا تھا۔ اس نے لکڑی کے تختوں پر یعنی اسکائی انگ کرتے ہوئے اس جزیرے کے طول و عرض کو ناپا تھا۔ جب اس نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تھا تو ناروے کی حکومت نے اسے انتہائی خطرناک سمجھتے ہوئے اس مہم کے لیے ایک کرونا کی مدد دینے سے بھی انکار کردیا تھا لیکن جب ستائیس سالہ زوالوجسٹ نین سن اور اس کا عملہ اس مہم سے بخیر و عافیت واپس آگئے تو حکومتی سطح پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور حکومت نے نین سن کی اگلی مہم کے لیے اسے معقول امداد اور سہولیات بھی فراہم کیں۔ یہ مہم کشتی کے ذریعے منجمد بحر آرکٹک کو عبور کرنے کی تھی۔ نین سن کا کہنا تھا کہ اگر کشتی سائبیریا کے منجمد ساحلوں سے آگے کہیں برف میں پھنس گئی تو سیلابی رو اسے ضرور ناروے کے شمال میں دھکیل دے گی۔

نین سن نے اپنی اس کشتی کے پہلو گولائی میں بنوائے تھے تاکہ آرکٹک کی برف اسے کچل نہ دے۔ یہ تیاری کرنے کے بعد وہ اپنے اس سفر پر روانہ ہوگیا تھا۔ اس کی کشتی تین سالہ بعد ناروے کے شمال میں سات سو میل کی دوری پر نمودار ہوئی لیکن نین سن اس میں نہیں تھا۔ وہ قطب کے مرکز کی طرف سفر پر جاچکا تھا۔ وہ اس سے دو سو چالیس میل کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ یعنی کسی بھی سابق مہم جو کے مقابلے میں بہت آگے تک۔

ناروے کو بجا طور پر قطبی مہمات سر کرنے والوں کا لیڈر کہا جاتا ہے۔ 1905ء میں سویڈن سے اپنی علیحدگی کے اعلان کے بعد اس نے بڑی تیزی سے ہر میدان میں ترقی کی منزلیں طے کیں۔ بوسین لارسن کہتے ہیں۔ "نارویجین ہونے کا مطلب ہے نین سن کی طرح جدید دنیا کے وائی کنگز بننے کی کوشش کرنا۔"

نارویجینوں کو جو چیز ایسا سخت جان اور جفاکش بنائے ہوئے ہے وہ زندگی کے چیلنج قبول کرنے کی امنگ اور اس سے لطف لینا ہے۔

شاعر لکھنوی (1989-1917)

محمد حسن پاشا 16 نومبر 1917 کو منظور حسین پاشا کے گھر لکھنو میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا ذوق ان کی سرشت میں شامل تھا۔ 1950 میں کراچی آئے زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے مقدور بھر کوشش کی اور کئی ادوار سے انہیں گزرنا پڑا۔ تاہم پائے ثبات میں لرزش ولغزش نہیں آنے دی۔ حسن پاشا ایک ایسے شخص کا نام ہے جس نے اپنی دنیا آپ پیدا کی۔ کراچی کی ادبی دنیا میں اپنی انفرادی شناخت آپ منوائی۔ ان کا مجموعہ غزل "زخم ہنر" ادب شناس حلقوں میں پہنچا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ حسن پاشا کو ادبی دنیا میں شاعر لکھنوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاعر لکھنوی خوش قسمت انسان تھے اپنے پیچھے علم و ادب سے شغف رکھنے والی اولاد چھوڑ گئے جس نے ان کے دینی ادب سے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے نعتیہ مجموعہ "نکہت و نور" کو طباعت کے زیور سے مزین کیا۔ آج نعتیہ ادب سے تعلق رکھنے والے احباب اس سے اپنی بساط کے مطابق استفادہ کر رہے ہیں۔ شاعر لکھنوی ایک حادثے کا شکار ہو کر 23 دسمبر 1989 کو وفات پاگئے عزیز آباد قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

قسط نمبر: 14

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انھی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات نے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف گھمنڈ جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او ولاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلو خلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغوا کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے بحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی کیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ''کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔'' روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں اور کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظرانداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت پیچھے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا۔ ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ بجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھا بھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ پی پی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہو گا ہم نے سیٹ اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی عمران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہو گیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان

پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آ گیا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے احساس ہو گیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی۔

اب آگے پڑھیں

میں اسے رگیدتا ہوا لے گیا اور قریب دھرے کنٹینروں سے ٹکرایا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرا سر نہ ٹکرائے۔ البتہ اس کا سر میں نے کنٹینر کی فولادی دیوار سے ٹکراتے دیکھا، اسی سبب وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کی چوٹ کی شدت کا اندازہ لگانے میں ایک لمحہ بھی وقت ضائع کیے بغیر میں نے سنبھل کر اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا مگر وہ بھی کائیاں تھا۔ مجھ سے زیادہ اسے لڑائی بھڑائی کا تجربہ تھا۔

اپنے مختل پڑتے حواسوں کو سنبھالا دیتے ہوئے اس نے بھی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مجھ پر وار کیا۔ اس کی داہنی ٹانگ حرکت میں آئی۔ وہ اس پوزیشن میں نہ تھا کہ پوری لات گھماتا مگر ایک خاص انداز مشاقی سے اس نے اپنی ٹانگ کے گھٹنے سے کام لیا۔ وہ میرے پیٹ پر رسید ہوا تھا۔

ضرب بڑی جاں کش تھی۔ میں درد سے بلبلا اٹھا اور حلق سے امڈتی چیخ کو نہ روک سکا جو اس کے لیے یقیناً حوصلے اور ہمت کا سبب بنی ہوگی کیونکہ اگلا لمحہ میری ٹھوڑی پر اس کے گھونسے کے ٹکنے کا ثابت ہوا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ شکر تھا کہ میری زبان دانتوں تلے نہیں آئی تھی ورنہ وہ کٹ جاتی۔

میرے حواس اس مردود کے دو حملوں میں ہی مختل پڑ چکے تھے۔ ایسے ہی ایک اور لمحے میں اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے مجھے سہارہ پچھاڑتے ہوئے دھکیلا اور پھر میرے سینے پر سوار ہو کر میری گردن اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔ دم گھٹنے کے باعث میرے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہونے لگیں۔

''کون ہو تم؟ اور میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے؟'' وہ بھیڑیے کی مانند غرایا۔ ''کس نے بھیجا تھا تمہیں اور کس مقصد کے لیے؟''

میرے حلق سے ہنوز ''اوغ..... غاغاں'' جیسی بے ربط و بے ہنگم سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔

''میرے پاس پستول ہے، اسے نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی مجھے......'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ''جواب دو میری بات کا۔ کس کے آدمی ہو؟'' کہتے ہوئے اس نے مجھے بولنے کے لیے موقع دیا اور میری گردن پر اپنے ہاتھوں کی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔

میں تو اپنی چوٹیں سہلانے کے بھی قابل نہ رہا تھا۔ اسی سبب تکالیف کا احساس فزوں ہونے لگا تھا پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا۔ مجھے اس کے عقب سے کسی تنے کے سائے کی جھلک نمودار ہوتے دکھائی دی اور اگلے ہی لمحے میں نے حملہ آور کی گردن کو کسی کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں دیکھا۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور مجھ سے اچھل کر پرے جا گرا۔ میں کھانستا ہوا اٹھ بیٹھا اور اپنی گردن اور مضروب ٹھوڑی سہلانے لگا۔ میں نے غفورے کو دیکھا تھا۔ وہ سایہ اسی کا تھا، حملہ آور نے شاید اسے بھی میرا ساتھی سمجھتے ہوئے پھرتی کے ساتھ پستول نکال لیا مگر غفورے نے شاید اس کے ہاتھ کو قمیص کے نیچے سے رینگتے دیکھ لیا تھا اور آگے بڑھ کر اس نے اس کے چہرے پر لات رسید کر دی تھی۔

ٹھیک اسی وقت گولی چلی تھی۔

''ڈزا'' میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ بوڑھے باپ کے بعد میں کبھی نہیں چاہ سکتا تھا کہ اس کا جوان گبرو بیٹا بھی میرے لیے ایسی ہی قربانی دے لیکن جب میں نے نشانہ خطا جاتے اور غفورے کو اسی طرح تنا کھڑے پایا تو نجانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے میرے اندر جنون خیز بجلیاں دوڑا دیں۔ میں اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہوا اور وحشت جنوں میں اس کی جانب لپکا۔

غفورے کی لات کھا کر وہ گرا تھا اور اسی دوران اس نے گولی چلا دی تھی، اسی سبب نشانہ اس کا خطا ہو گیا تھا۔

غفورے کی لات چہرے پر اس کے خاصی زوردار لگی تھی جس کے باعث وہ چند ثانیوں کے لیے مخبوط الحواس ہونے لگا تھا۔ پستول اگرچہ ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ میں نے اسی لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سب سے پہلے اپنی لات اسی پستول والے ہاتھ پر رسید کی تھی۔ نتیجتاً پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور جا گرا پھر جیسے مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔

میں نے اس حملہ آور کو مکوں اور لاتوں پر رکھ دیا۔ وہ نڈھال ہو گیا۔ مقابلے پر اترنے کی کوشش اس نے چاہی تھی

کہ غفورا بھی اس پر ٹوٹ پڑا۔

''غفورا! اس حرام زادے کا تعلق تمہارے باپ کے قاتلوں سے ہے۔''

میں نے چلّا کر غفورے سے کہا تو وہ مزید خار میں آگیا اور پھر مار مار کر ہی حملہ آور کا بھرکس نکال دیا۔

چند لوگ اِدھر اُدھر سے آکر وہاں آن موجود ہوئے اور حیرت و پریشانی سے یہ سب تماشا دیکھنے لگے۔ غفورے نے ہانپتے ہوئے ان سے کچھ کہا تو انہوں نے اپنے سروں کو بیک وقت اثباتی جنبش دی تھی اور وہ خاموشی سے اِدھر اُدھر سرک گئے تھے۔

''غفورا! وہ حرام خور شکورا کدھر ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت.... اس سے دریافت کیا۔ سانسیں میری بھی پھولی ہوئی تھیں۔ ''وہ بھی لانچ میں ان کے ساتھ مل گیا ہے۔''

وہ میرے استفسار کا مطلب سمجھتے ہوئے جواباً بولا۔ ''بے فکر رہو صاحب! میں اسے لانچ کے ساتھ ہی رسی سے باندھ آیا ہوں۔'' میں اس کی عقل مندی پر اش اش کر اٹھا۔

''شاباش غفورا! یہ تم نے بہت اچھا کام کیا۔'' میں نے توصیفی لہجے میں اس سے کہا۔ ''اسے بھی اُدھر ہی لے چلتے ہیں۔''

وہ آدمی بھی معاملے کی نزاکت پر پریشان سا نظر آنے لگا۔ تاہم غرّانے اور ہمیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا تو غفورے کی ایک ہی دھمکی اس کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔

''اوئے خنزیر کا بچہ! یہاں سارا ہمارا آدمی کام کرتا ہے۔ میرے ایک حکم پر تجھے بھاری پتھر سے باندھ کر سمندر کی تہہ میں پہنچا دیں گے۔ شرافت سے اپنا منہ بند رکھو ورنہ......'' اس نے تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ آدمی گھور کر رہ گیا۔

ہم اسے دبوچ کر اسی لانچ کے پاس آگئے۔ آدمی کا پستول تھوڑی سی کوشش سے میں نے ڈھونڈ کر اٹھا لیا تھا۔ اسے میں نے رومال میں لپیٹ کر ہی پکڑا تھا۔

وہاں شکورا بندھا ہوا تھا اور بے چین و پریشان نظر آرہا تھا۔ اس کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔

''اوئے حرام خورا جانتا ہے تو نے کس کی مدد کی تھی؟'' غفورا اسے دیکھتے ہی خونخوار لہجے میں بولا۔ ''یہ لوگ میرے بابا سائیں کے قاتلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''غفورا! کوئی ایسی جگہ ہو جہاں انہیں لے جا کر پوچھ گچھ کی جاسکے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''چلو صاحب!'' اس نے مختصراً کہا اور پھر میرے ہی ایماء پر اس نے قیدی کے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے باندھ دیے۔

غفورا ایک ٹین کے بنے حجرا نما کمرے میں آگیا۔ یہ بندرگاہ کے بعید ترین گوشے میں بنا ہوا تھا۔ کمرا خاصا کشادہ تھا۔ یہاں ایک برتھ فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک فولادی پائیوں کا زنگ آلود بیڈ تھا۔ اس پر رلی اور موٹا بوسیدہ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ چند کرسیاں تھیں۔ ان دونوں کو میرے کہنے پر غفورا نے کرسیوں پر بٹھا کر باندھ دیا۔

کمرے کی بتی جلا دی گئی تھی۔

''صاحب! آپ کے لیے کچھ کھانے پینے کو لاؤں؟'' غفورا نے مجھ سے پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ میں ذرا ان سے دو باتیں کرلوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے بعد ایک نظر آدمی پر ڈالی۔ وہ پریشان بھی نظر آرہا تھا میری طرف خونخوار نظروں سے بھی گھور گھور کر تکے جارہا تھا۔ میں نے اسے سردست دانستہ نظر انداز کردیا اور شکورے کی طرف رخ پھیرا۔

شکورا کے لیے یہ ساری صورتِ حال خود اسے مشکل میں ڈالتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی جس کے آثار اس کے اترے اترے مضطرب الحال چہرے سے ہویدا ہوتی تھی۔

''شکورا! تم نے لانچ میں آکر ایک غلطی تو کر ہی لی، یعنی ایک طرف اپنے آدمیوں سے غداری اور اپنے ساتھی مزدور کے باپ کے قاتلوں کی مدد۔'' میں نے دانستہ گفتگو کی ابتداء شکورا سے کی تھی۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا تھا۔

''تمہاری یہ حرکت نہ صرف تمہارے اپنے ساتھی مزدوروں سے نفرت میں مبتلا کرنے کا سبب بن سکتی ہے بلکہ تم ایک طویل عرصے کے لیے پولیس کے چکروں میں بھی بری طرح پھنس کر رہ جاؤ گے۔ غفورے اور میری گواہی کافی ہو گی۔ ہاں! اگر ہم سے تعاون کرو تو تمہاری بچت ہو سکتی ہے۔''

''مم مم صاحب! مم...... میں تیار ہوں۔ مم...... میرا واقعی ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس لالچ میں آگیا تھا۔'' وہ گھگیا کر بولا۔ اس پر اس کے ساتھی غفورا نے بلوچی میں نہایت درشت لہجے میں اس سے کچھ کہا تھا۔ جو ظاہر ہے میری سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ تاہم انداز ایسا ہی تھا کہ وہ اسے جھڑک رہا تھا۔

''پہلے مجھے شروع سے ان کے متعلق بتاؤ۔ یہ دو آدمی تھے، ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس سے آگے شروع ہو جاؤ۔''

غفورا فرفر بتانے لگا۔ ''صاحب! میں اس وقت لانچ کے انجن کا آئل چینج کر رہا تھا اور تھوڑی بہت صفائی میں مصروف

تھا۔ چاچا جھومر لانچ میرے حوالے کرکے خود آرام کرنے گھر چلا گیا تھا۔ اسی وقت یہ دونوں آدمی میرے پاس آئے۔ اس کے کاندھے پر ایک بوری لدی ہوئی تھی۔'' اس نے قریب کرسی پر اپنی طرح رسن بستہ حالت میں بیٹھے آدمی کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔

''اس کے ساتھی نے مجھ سے برتھ گیارہ کی طرف چلنے کا کہا، جدھر اس عربی (بن رائد) کا شپ لنگر انداز تھا۔ میں نے انکار کیا تو انہوں نے مجھے پانچ ہزار روپیا کرایہ دینے کا لالچ دیا۔ اتنے ذرا سے فاصلے کے لیے اتنا زیادہ کرایہ کا سن کر مجھے حیرت اور خوشی تو ہوئی تھی اور دل میں لالچ بھی آیا مگر مجھے ان پر شک بھی گزرا پھر بوری کی طرف دیکھنے لگا تو وہ میری پریشانی کو سمجھ کر بولے کہ اس بوری میں اندرونِ سندھ کے شہر خیرپور کی اعلیٰ درجے کی کھجوریں ہیں جسے وہ اس عربی کو تحفے میں دینا چاہتے ہیں۔

مجھے پانچ ہزار کا لالچ تھا، میں تیار ہوگیا اور پھر انہیں سوار کرا کے برتھ نمبر گیارہ کی طرف لانچ لے کر روانہ ہوگیا۔ راستے ہی میں انہوں نے مجھے تین ہزار مزید دینے کی پیشکش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اس بات کو راز میں رکھو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا، میرا کیا جاتا تھا۔ میں نے فوراً ہاں کر دی۔ کھرے کھرے آٹھ ہزار میری جیب میں آرہے تھے۔ اتنے تو میں تین ہفتوں میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ میں نے خوشی خوشی انہیں برتھ گیارہ پر پہنچا دیا۔''

''وہاں وہ جہاز موجود تھا؟ میرا مطلب ہے اس عربی کا؟'' میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

''کیا؟'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میرے چہرے پر ان گنت شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ میں جلدی سے اس کی طرف دیکھ کر بے چینی سے بولا۔ ''آگے بولو، پھر تم نے انہیں کہاں اتارا تھا؟''

اسی وقت وہ آدمی چیخا اور شکورے کی طرف اپنی گردن موڑ کر اسے دھمکاتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ سب بتا کر اچھا نہیں کر رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہم کتنے خطرناک لوگ ہیں۔ منہ بند رکھو اپنا یہ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

اس آدمی کی ڈھٹائی اور اپنی ''خطرناکی'' کا گھمنڈ اس قدر عروج پر تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو کر عضلات تک غیظ و غضب کے مارے لرزنے لگے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ شکورا بھی مجھے اس کی دھمکیوں پر ایک لمحے کے لیے خوف کا شکار نظر آنے لگا تھا۔ وہ بدک کر اس کی طرف کچھ ایسی ہی نظروں سے تکنے لگا تھا۔ میرا دماغ بھنا کر رہ گیا۔ میں نفرت و غیظ تلے اپنے ہونٹ بھینچ کر اس آدمی کی طرف بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر پُرغیض لہجے میں بولا۔

''تمہیں اپنی جس خطرناکیوں کا گھمنڈ ہے ناں وہ عنقریب بھاپ بن کر اڑنے والا ہے۔ اس کی مثال تمہارے سامنے ہے کہ تم اس وقت لنڈورے چوہے کی طرح ہماری گرفت میں ہو اور تمہارے گردگھنٹال بھی اسی بھاپ میں اڑنے والے ہیں۔ اب اگر تم نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

پھر میں شکورا کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہاں! شکورے آگے بولو؟ پھر کیا ہوا؟ تم نے وہاں اس عربی کا جہاز نہیں دیکھا تو پھر انہیں کہاں لے کر گئے تھے؟'' میرے استفسار پر شکورا اسی آدمی کی طرف کچھ خوف زدہ سی نظروں سے تکنے لگا، جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ اسی بات نے شاید مجھ سے زیادہ غفورا کو طیش دلا دیا۔ اس نے غفورے کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا جس کے باعث شکورا کرسی سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ وہ اس قدر تھڑولا ثابت ہوا کہ رو پڑا۔ غفورے نے غصے سے ہونٹ بھینچ کر اسے کرسی سمیت پھر سے سیدھا کردیا۔

''اڑے او! زنانیوں کی طرح کیا روتا ہے؟ صاحب کی بات کا جواب دے سیدھی طرح اس (موٹی سی گالی) سے تو ہم ابھی نمٹ لیتے ہیں۔ تو بھی اس کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔''

غفورے نے اسی آدمی کی طرف ایک خونخوار سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ اس (موٹی گالی) کے ساتھ تیرا بھی حشر نشر ہو جائے۔ دیکھ شکورے! یہ میرے باپ کے بے گناہ قتل کا معاملہ ہے اور میں اس کا بیٹا ہوں۔ تو نہیں جانتا کہ مجھے اپنے باپ سے کس قدر محبت تھی۔ ایک وہی تو تھا میرا غمگسار اور دکھوں، سختیوں میں مجھے حوصلہ اور ہمت دینے والا۔ میں نے بھی قسم کھا رکھی ہے شکورا کہ جب تک میں اپنے باپ کے قاتلوں کو عبرت کا نشان نہیں بنالیتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا اور جو بھی ان قاتلوں کا ساتھ دے گا اسے بھی میں اس جرم میں شامل سمجھوں گا۔''

غفورے کی دھمکی اس آدمی سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ اس کا سیاہ گال تھپڑ لگنے کے باعث متورم سا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے بعد غفورا نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے اپنا سوال ایک

بار پھر اس کے سامنے دہرایا۔ ابھی میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان دونوں مذکورہ آدمیوں نے جو بوری اٹھا رکھی تھی اس کے اندر کیا تھا۔

''تم بتا رہے تھے کہ برتھ نمبر گیارہ پر تم نے کوئی جہاز لنگر انداز نہیں دیکھا تھا تو پھر تم انہیں کہاں لے کر گئے تھے؟ اور جہاز کہاں تھا؟''

شکورا نے ڈری ڈری اور کن انکھیوں سے ایک بار پھر اسی آدمی کی طرف دیکھنے کی کوشش چاہی تھی، وہ بھی بڑی ڈھٹائی سے اس کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اپنی کچھ دیر پہلے والی زبانی کلامی دھمکی کو اب اپنی آنکھوں سے دہرا رہا ہو مگر شکورا نے اس بار پرواہ نہ کی اور فرفر جواب دینے لگا۔ بولا۔ ''مم مم...... صاحب! میں نے ان دونوں کو پانی لانچ میں برتھ نمبر گیارہ پر ہی سے کر گیا تھا، وہاں کوئی جہاز نہیں نظر آیا تھا۔ انہوں نے مجھے جزیرے کے ایک ساحل کی طرف لانچ موڑنے کا کہا...... اور......''

''شکورے!'' وہ آدمی پھر چیخا اور میرا جیسے دماغ مارے طیش کے بھک بھک کرنے لگا لیکن مجھ سے پہلے ہی غفورا ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''تو ایسے باز نہیں آئے گا۔'' (موٹی گالی) کہتے ہوئے وہ دانت کچکچاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ ایک لات اس کی کرسی کو رسید کی کرسی الٹتے ہی غفورا نے اس کے جکڑ بند کھول دیے۔ وہ آدمی آزاد ہو گیا۔

''آ جا مردان! اب یا تو یا میں!'' کہتے ہوئے وہ اس آدمی پر پل پڑا۔ آدمی بھی ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ بھی باقاعدہ اس کے مقابلے پر اتر آیا۔ میں نے دانستہ کسی قسم کی مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دونوں تنومند تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔

میں ایک طرف کھڑا غور سے ان کے لڑنے بھڑنے کا انداز دیکھ رہا تھا۔ آدمی کی تربیت اپنی جگہ مگر غفورا کے انداز سے خالص جنگجوانہ پن نظر آتا تھا۔ اس نے پل بھر میں ہی اسے بچھاڑ کر رکھ دیا۔ غصے اور طیش میں تو غفورا اسے جان سے ہی مارنے لگا تھا کہ مجھے درمیان میں آنا پڑا۔

غفورے کی مار سے آدمی لہولہان ہو گیا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کی شاید کوئی ایک آدھ ہڈی پسلی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ فرش پر پڑا اینٹھ رہا تھا۔ شکورا تھر تھر کانپنے لگا اور رحم طلب نظروں سے غفورے کو تکنے لگا۔

''بہت وقت ضائع ہو گیا۔ اب اپنی زبان مت روکنا شکورے! بولتا چل آگے۔'' میں نے اسے گھور کر کہا۔ وہ وہیں سے ہی بتانا شروع ہو گیا جہاں سے سلسلہ منقطع کیا تھا۔

''میں ان دونوں کے کہنے پر انہیں لے کر اسی ساحل کے نزدیک پہنچا اور لوٹنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے مجھے رکنے کو کہا، پھر اس کا دوسرا ساتھی موبائل فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا جو میں نہ سن سکا۔ اس کے بعد وہ دونوں آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے اس کے بعد ان کا ساتھی میرے ساتھ لوٹ آیا۔ دوسرا ساتھی کہاں گیا، مجھے اس کا نہیں پتا۔''

''وہ بوری اسی کے پاس تھی؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر اس کے چہرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ میں غفورے کی طرف پلٹا۔

''غفورا! اس آدمی کو ادھر ہی باندھ دو اور شکورے کو لے کر میں اس جگہ جانا چاہتا ہوں۔'' غفورے نے فی الفور ایسا ہی کیا اور آخر میں اس نے بھی میرے ساتھ چلنے کا اصرار کیا تو میں نے انکار کر دیا اور اسے ادھر ہی رکے رہنے کی ہدایت کی۔

تھوڑی دیر بعد میں شکورے کے ساتھ اس کی لانچ میں روانہ ہو گیا۔

☆......☆

رات پوری طرح جھک آئی تھی۔ لانچ اپنی مخصوص ''پھٹ...... پھٹ'' کرتی آواز میں منزل کی جانب بڑھی چلی جا رہی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے موجودہ اور تازہ کار حالات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔

سی گوڈیز غائب تھا۔ فرحانہ کو اغوا کر کے نجانے کہاں لے جایا گیا تھا؟ اس اغوا کے پیچھے کیا کھچڑی پک رہی تھی یا پکنے والی تھی؟ اس سلسلے میں جو سوال میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ابھر رہے تھے اسی تیزی سے اس کے کچھ مکمل نامکمل جواب بھی بن رہے تھے۔

بہرکیف میری سوچوں کا لب لباب یہی تھا کہ فرحانہ کے اغوا کے پیچھے دو مقاصد کارفرما ہو سکتے تھے ان دونوں باپ بیٹوں کے۔

پہلے تو یہ کہ ثمیر نے فرحانہ کو محبت کا جال پھینک کر رام کرنے کی کوشش چاہی ہوتا کہ بعد میں وہ اس کے ذریعے کوئی مطالبہ منوا سکے۔ دوسرا یہ کہ جب ان دونوں باپ بیٹوں نے دیکھا کہ میں نے ان کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے، تاہم اس کے باوجود فرحانہ کم از کم ثمیر کو اس سارے چکر میں بے قصور سمجھے ہوئے تھی تو پھر کیوں اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی؟ اس کا جواب یہی تھا کہ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ میں

اس سازش کو سمجھ چکا ہوں اور ان کا راستہ کھوٹا کرنے کے در پے ہوں تو انہوں نے محبت کے چکر والا سلسلہ ختم کرنے لوہار کی ایک ہی ضرب لگاتے ہوئے فرحانہ کو اغوا کر لیا۔

چنانچہ اب یہ ممکن تھا کہ شاہ میر عنقریب رانا بشیر سے اپنا کوئی دیرینہ مطالبہ منوانے کی کوشش کرے گا۔ تاوان کا مطالبہ لغو خیال تھا۔ کیونکہ شاہ میر جیسے ڈان کے پاس رانا بشیر سے زیادہ دولت تھی۔

ہاں! یہ کہا جا سکتا تھا کہ شاہ میر اپنی کالا سونا والی مہم میں پڑنے والے ایک رخنے کو بھرنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا جس پر رانا بشیر نے گرہ لگا رکھی تھی۔ اب شاہ میر وہ گرہ اس کی بیٹی کو اغوا کر کے ہی کھولنا چاہتا تھا۔

میرا ذہن رسا اسی خیال پر بار بار ''کلک'' ہو رہا تھا لیکن سی گوڈیز کہاں غائب تھا؟ بن رائد اور اس کا خونی چیلا راکا کدھر تھے؟ ابھی میں مزید غور کرنا چاہتا تھا کہ مجھے شکورے کی آواز نے خیالوں کی بھنور سے ابھارا۔

''صاحب! ساحل نزدیک آ گیا ہے۔''

''کیا یہ وہی ساحل ہے جہاں تم نے ان دونوں کو اتارا تھا؟'' میں نے سامنے ایک تاریک ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''ہاں، صاحب! یہ وہی جگہ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، ساحل سے لگا دو لانچ کو اور تم میرے ساتھ اترو۔'' میں نے کہا۔

''جو حکم صاحب!'' وہ فدویانہ لہجے میں بولا۔ غفورے کی غضب ناکی اور اپنا پول کھل جانے کے بعد وہ غفورا سمیت میرا حکم ماننے پر بلا چوں و چرا رضامند تھا۔

اطراف میں تاریکی کا راج تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور آخیر راتوں کا چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا۔ ساحل پر مدھم روشنی تھی، فضاء میں مرطوب سی ہوا کھلی ہوئی تھی۔ دور پرے کچھ ٹمٹماتی روشنیوں کے آثار نظر آتے تھے۔ وہاں شاید آبادی تھی۔ میں چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے کھڑا رہا اس کے بعد شکورے سے ایک بار پھر پوچھا۔

''تمہیں پورا یقین ہے کہ تم نے انہیں اسی جگہ اتارا تھا؟ میرا مطلب ہے تمہیں یہ جگہ تو اچھی طرح یاد ہے ناں.....؟'' میرے اس طرح دوبارہ استفسار پر وہ ایک بار پھر گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''جی صاحب! بالکل یہی جگہ ہے، جہاں میں نے ان دونوں کو اتارا تھا۔ وہ دیکھیں کھجی کا ایک ٹنڈ درخت، میں نے اس کی نشانی رکھی تھی۔ وہ مٹی کا اونچا جبل بھٹ (ٹیلہ) اس پر آک بوہ کی جھاڑیاں ہیں۔''

''ہوں!'' میں نے ایک ہنکاری بھری پھر کسی خیال کے تحت ریتیلی زمین پر اردگرد نظر ڈالتے ہوئے اس سے بولا۔ ''یہ بتاؤ کہ اب اس کے دوسرے ساتھی کو کیسے تلاش کریں؟ تم پیرا دیکھ لیتے ہو؟''

''اس کا مجھے کوئی تجربہ تو نہیں اگر ٹھہرو میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں، ٹارچ لے آؤں۔'' وہ یہ کہہ کر پلٹا اور لانچ کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بار جب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں بڑی سی ٹارچ تھی۔ وہ اس نے جلائی اور ریتیلی زمین پر اس کی روشنی پھینکی۔ ذرا دیر تک وہ چند قدم آگے پیچھے اور دائیں بائیں جا کر کچھ دیکھتا رہا اس کے بعد مجھ سے بولا۔

''آؤ صاحب! وہ آدمی اس طرف گیا ہے۔'' وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف بڑھا تو میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ چند قدم چلتا رہا۔ لگ بھگ کوئی بیس پچیس قدم چلنے کے بعد وہ رکا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ارے...... یہ کیا؟''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں تک تو یہ اکیلا چلا جا رہا تھا مگر پھر اس کے ساتھ ایک اور آدمی آ ملا۔''

''اچھا!''

''لیکن بڑی عجیب بات ہے صاحب کہ......'' وہ اتنا کہہ کر رکا اور مجھے ذرا وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر دائیں بائیں اور آگے پیچھے چند قدم چل کر دوبارہ میرے قریب آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی صاحب کہ یہاں آ کر اس آدمی کے ساتھ جو دوسرا شخص آ ملا تھا اس کے پیروں کے نشان محدود ہیں، یعنی اس کی کہیں سے بھی آمد کے آثار ریت پر نظر نہیں آ رہے ہیں جیسے وہ آسمان سے گرا ہو۔'' میں پہلے تو اس کی بات پر حیران سا ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج ہو گئی۔ میں نے شکورے سے پوچھا۔

''اس مقام پر جہاں تمہیں دوسرے شخص کے پیروں کے نشانات نظر آ رہے ہیں۔ وہ کس طرح کے ہیں؟''

وہ ہنوز ٹارچ کی روشنی پھیلائے جھک کر بغور ریت پر دیکھنے میں مگن تھا۔ پھر سیدھا ہو کے بولا۔ ''ہاں صاحب! یہاں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ اس جگہ پر کچھ ملے جلے نشانات نظر آتے ہیں۔''

"چھتے رہو گے.... جلدی..... میں سمجھ گیا ہوں کہ اس کے ساتھ دوسرا کون شخص ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ میرے لہجے میں ایکا ایکی ایک جوش سا عود کر آیا تھا۔ وہ ششدر سا ہوگیا۔ اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

"آ..... آپ جانتے ہو اسے صاحب؟ کون ہے یہ؟ کک..... کہیں بھوت تو نہیں؟"

"نہیں اس نے اپنے کاندھے پر جو بوری لاد رکھی تھی وہ شخص اسی کے اندر سے برآمد ہوا ہے۔ آگے بڑھو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اوہ تو اس کا مطلب ہے اس بوری کے اندر!" وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا اور اسی وقت کوئی شعلہ سا لپکا، میں نے شکورے کو بغیر آواز نکالے تیورا کر گرتے دیکھا۔ اسی وقت دوسرے شعلے کی جھپک مجھے لپکتی محسوس ہوئی اور میں نے خود کو بہ سرعت نیچے گرا دیا اور تیزی سے قریب بوہ کی جھاڑیوں کی طرف رینگ گیا۔ کوئی سائیلنسر لگے پستول سے ہم پر "خاموش" فائر داغ رہا تھا۔ میرے اعصاب ایک دم تن گئے تھے اور سینے میں دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

یہ بہت خطرناک صورتِ حال تھی۔ ہم شاید کسی چھپے بیٹھے دشمن کی نظروں میں آ گئے تھے اور اس نتیجے میں بے چارہ شکورا مارا گیا تھا۔ مجھے اس کا افسوس تھا۔ مجھے اب اپنی جان کی فکر لگ گئی لیکن کالیا جیسے جفادر اور جنگجو ساتھی یار کے ساتھ رہ کر اور ایسے حالات نے مجھے بھی کافی تجربہ سکھا دیا تھا۔ اسی سبب میں نے اپنے حواسوں کو یکجا رکھتے ہوئے فوری طور پر ان "اندھی" گولیوں سے خود کو بچانے کی کوشش چاہی تھی مگر ابھی پوری طرح خطرے سے باہر نہ تھا۔

مجھ سے قدرے بائیں جانب شکورا بے حس و حرکت ریت پر پڑا تھا اور اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر گر پڑی تھی۔ اس کی روشنی کا دائرہ سوئے اتفاق اسی جگہ پر پڑ رہا تھا جدھر سے میں نے شعلے کی لپک کو محسوس کیا تھا۔ وہاں مجھے ایک تنومند ہیولے کی جھپک دکھائی دی تھی۔ وہ کسی چوکس بلے کی طرح ایک ریتیلے ٹیلے کی ڈھلان پر دبکا ہوا تھا۔

مجھے سخت پچھتاوا ہوا کہ میرے پاس کوئی اسلحہ نہ تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور اس خطرناک اور سنگین تر صورتِ حال میں ہی مجھے یاد آیا کہ میرے پاس ایک بھرا ہوا پستول موجود تھا جو پہلے والے حملہ آور کا تھا جس پر میں نے قابو پایا تھا۔ ایسے میں وہ پستول میرے حوصلے اور جوش کو فزوں کر گیا، میں نے پھر ایک لمحہ کی بھی دیر کیے بغیر وہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

ادھر وہ "دشمن" ہیولا گری ہوئی ٹارچ کی روشنی کے دائرے میں آتے ہی بدکا تھا مگر میں نے بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر فائر جھونک دیا۔ وہ اس وقت اپنی جگہ بدلنے کے لیے حرکت پذیر تھا کہ ایک چیخ مار کے گرا۔ میرے دھڑکتے ہوئے دل پر مسرت کی بجلی چمکی۔ میرا نشانہ بے خطا نہیں گیا تھا۔ گولی اسے لگی تھی..... تب ہی دوسرے لمحے میں نے اسے لنگڑاتے ہوئے پیچھے مڑتے دیکھا اور میں نے پھر اس پر گولی چلائی۔

اس بار میری دانستہ کوشش یہی تھی کہ اس کے پیروں کو ہی نشانہ بناؤں۔ نشانہ اس بار بھی بے خطا نہیں گیا تھا اور وہ دوسری چیخ مار کے گرا۔ اب کی بار وہ نہ اٹھ سکا۔ تاہم اس نے لیٹے لیٹے اپنے زخمی وجود کو قدرے موڑا اور میری جانب فائر داغا۔ میں بھی محتاط تھا۔ پورا ادراک تھا مجھے کہ پستول اس کے پاس بھی تھا اسی لیے میں زمین پر گر گیا۔ یوں بھی اس کا ایسی حالت میں اس کا نشانہ اتنا تیر بہ ہدف نہیں ہوسکتا تھا لیکن اندھی گولی کا کیا بھروسا احتیاط اور بچاؤ پھر بھی ضروری تھا۔

میں نے ایک لمحے میں تیسرا فائر داغنے کا سوچا اور اپنا خیال مسترد کر دیا۔ کیونکہ میری چلائی ہوئی دونوں گولیاں اسے لگی تھیں اور وہ خاصا زخمی تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس میں اب چلنے کی سکت تو نہیں رہی تھی مگر مجھے اپنے قریب آنے سے روکنے کے لیے وہ گاہے بہ گاہے مجھ پر گولیاں چلا سکتا تھا۔

میں نے پل کے پل..... سوچا کہ اسے اتنی بھی مہلت دینا میرے لیے کچھ اچھا ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیا خبر اس کے اور ساتھی بھی کہیں قریب ہی فروکش ہوں اور میرے پستول سے چلنے والی دو گولیوں کے دھماکے انہیں یہاں تک آنے پر مجبور کر دیتے۔ مقامی لوگ بھی متوجہ ہوسکتے تھے۔ لہٰذا اس مہم کو جلدی نمٹانا ازبس ضروری تھا۔

میں نے پینترا بدلا اور تیزی سے بائیں جانب رینگتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ٹارچ زمین پر جوں کی توں پڑی ہوئی تھی اور اس کی روشنی کا ہالہ ایک مقام پر پڑ رہا تھا جو پھیکی پڑنے لگی تھی۔

مطلوبہ سمت میں جہاں میرا شکار زخمی یا بے ہوش پڑا تھا، ہنوز موجود تھا اور بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ میں اس کی سمت رینگتا ہوا ذرا رک گیا اور اس پر بہ غور نظریں جما دیں۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی اور ایک ہاتھ ریت پر پھیلا ہوا تھا جس کے قریب ہی پستول دھرا پڑا تھا۔ اس کی لمبی نال تھی۔

یہی وہ سائیلنسر لگا پستول تھا جس سے اس نے ہم پر فائرنگ داغی تھی اور جس کے نتیجے میں غریب شکورا مارا گیا تھا۔

میں دم سادھے سینے کے بل چند ثانیے اسی طرح ریت پر لیٹا رہا۔ ہوسکتا تھا کہ یہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میرے قریب آتے ہی وہ لپک کر اپنا پستول اٹھا کر مجھ پر ایک عدد "خاموش" فائر کر دیتا لیکن میں کب تک اسی طرح منتظر رہتا؟ معاملے کو جلد سے جلد نمٹانا بھی تھا۔ لہٰذا میں اٹھا اور اپنا پستول ہاتھ میں پکڑے محتاط انداز میں اس کی طرف کو بڑھا اور سب سے پہلے اس کے سائیلنسر لگے پستول پر قبضہ جمایا تب جا کر یقین آیا کہ دشمن واقعی بے ہوش تھا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کی دائیں ٹانگ کے ٹخنے پر ایک گولی اور دوسری گولی اس کی بائیں ران پر لگی تھی۔ وہاں سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور چہرہ پہچان لیا۔ یہ اسی کا ہی دوسرا ساتھی تھا جو ہماری گرفت میں تھا اور دونوں بے ہوش فرحانہ کو بوری میں بند کر کے یہاں تک لائے تھے۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ زندہ تھا مگر بے ہوش تھا۔ میری چلائی ہوئی دونوں گولیوں نے اسے خاصا زخمی کر دیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ فرحانہ کہاں ہوسکتی تھی؟ اس کا جواب یہی آدمی دے سکتا تھا بشرطیکہ کہ ہوش میں آ جاتا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور قابلِ ذکر شے نہ پا کر شکورے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مرطوب ریت پر اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کے بازو کو تھام کر سیدھا کیا تو مجھے اس کے سینے سے خون ابلتا دکھائی دیا۔ اس کے مردہ چہرے پر ریت کے ذرات مدھم روشنی میں چمک رہے تھے۔ ایک ہی گولی نے شاید اس کا کام تمام کر ڈالا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر انگلیاں رکھ کر دیکھا۔ زندگی کی علامت دیتی دھڑکتی ہوئی نس جامد تھی۔ اس کی موت کی تصدیق ہوتے ہی مجھے اس کا دکھ ہوا۔ مزدور اور غریب آدمی تھا۔ چار پیسوں کی خاطر لالچ میں آ کر اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر..... تیزی سے پلٹا اور ٹارچ اٹھا کر اپنے زخمی اور بے ہوش شکار کی طرف پلٹا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔

وہ غائب تھا۔ سنسنی کی ایک تیز لہر میرے پورے وجود میں سرائیت کر گئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھا، پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں نے جھک کر اس جگہ کا جائزہ لیا۔ وہاں ریت پر گھسٹنے کے نشانات موجود تھے۔ ان کے سہارے میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا اور چند ہی قدم چلنے کے بعد مجھے دو ایک نشان قریب جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے نظر آئے۔

اپنا پستول ہاتھ میں تانے میں دبے پاؤں اس جھنڈ کی طرف بڑھا اور ایک دم ہی مجھے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔

وہ زخمی نیم مردہ سا آدمی ایک بار پھر بے سدھ انداز میں جھاڑیوں کے عقب میں پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے غرا کر کہا۔

"وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"کک..... کون لڑکی؟" وہ ہکلایا۔

"ہوں..... تو گویا اس حالت میں بھی تمہیں چالاکی سوجھ رہی ہے۔" میں نے دانت پیس کر غصے سے کہا۔

"تت..... تم کون ہو؟" اس نے سوال کر ڈالا۔

"میں وہی ہوں جس نے تمہیں شاہ میر کی ڈیفنس والی کوٹھی سے رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ کو بوری میں ڈال کر کار میں یہاں تک آتے دیکھا ہے۔ تمہارا ساتھی بھی ہمارے قبضے میں ہے۔ لہٰذا اب وقت ضائع کیے بغیر میرے سوال کا جواب دے دو۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ سمجھ گیا تھا کہ اس کا بھانڈا پہلے ہی پھوٹ چکا ہے۔ بولا۔

"تم کون ہو؟"

"شاہ میر اور تم سب کی موت!" میں نے پھنکار کر کہا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی گردن پر پستول کی سرد نال رکھ دی۔ "اب میرا وقت ضائع مت کرنا۔ ورنہ اس تاریک جزیرے میں..... تمہیں گولی مار کے ہلاک کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

"م..... میں سب بتا دوں گا۔ پہلے مجھے اسپتال تو پہنچا دو۔" وہ ممنایا۔ شاہ میر جیسے ڈان کا یہ کرگا یا تو واقعی تھڑدلا تھا یا پھر مجھے بے وقوف سمجھے ہوئے تھا۔ میں نے غرا کر کہا۔

"میں تمہیں قبر میں پہنچاؤں گا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو۔" کہتے ہوئے میں نے اس کی گردن پر پستول کی سرد نال کا دباؤ بڑھا دیا تو وہ ایک دم اپنی اوقات میں آ گیا۔

"ختم کر ڈالو مجھے مگر تمہیں فرحانہ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس کی ہٹ دھرمی پر میرا دماغ بھنا گیا۔ تاہم بے رحمانہ سی طمانیت سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔ فرحانہ کو تو میں تلاش کر ہی لوں گا۔ اپنا وقت تم پر کیوں ضائع کروں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا اور پستول کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف کردیا۔

''ٹھہ...ٹھہرو!'' وہ فوراً لرزتے لہجے میں بولا۔ میرے نفسیاتی وار تلے اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔

''فرحانہ کہاں ہے؟ اس سوال کو آخری موقع سمجھو۔''

''تم مجھے گولی تو نہیں مارو گے؟''

''یہ تمہارے جواب پر منحصر ہوگا کہ تم کتنا سچ بولتے ہو۔''

''میں نے اسے ایک قریبی ہٹ میں لے جا کر بند کردیا ہے۔''

''وہ ہٹ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے مجھے راستہ بتایا۔ یہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ جاتا ہوا راستہ تھا۔

''یہاں سے کتنے قدموں کے فاصلے پر؟''

''چالیس یا زیادہ سے زیادہ... پچاس قدم۔''

''میں تمہیں سہارا دیتا ہوں۔ وہاں تک چلو اگر یہ جھوٹ نکلا تو وہیں تمہیں گولی ماردوں گا۔'' میں نے خوں ناک غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

''م م..... میں چلنے سے معذور ہو چکا ہوں۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ ''تم جا کر دیکھ آؤ، مجھے ادھر ہی پڑا رہنے دو۔ واپس آ کر۔'' اس کا جملہ حلق میں ہی رہ گیا۔ اس کی چالاکی پر بھنا کر میں نے پستول کا فولادی دستہ اس کی پیشانی پر رسید کردیا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی اور وہاں سے خون جاری ہوگیا۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ برآمد ہوگئی۔

''تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں تمہاری باتوں میں آجاؤں گا۔ میں تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر وہاں تک لے جاؤں گا اور یاد رکھنا۔ اتنی مشقت کے بعد تب بھی فرحانہ وہاں نہ ملی جہاں تم کہہ رہے ہو تو وہیں تمہارا حشر نشر کرڈالوں گا، چلو۔'' یہ کہتے ہوئے میں اسے اٹھانے لگا تو وہ بول پڑا۔

''سس..... سنو...... اُف..... فرحانہ وہاں نہیں ہے۔ میں تمہیں سچ بتائے دیتا ہوں۔''

''میں یہی سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے سانپ جیسی پھنکار سے کہا۔

''فرحانہ کو راکا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔'' اس نے بتانا شروع کیا اور راکا۔ جیسے بے رحم درندے کا نام سن کر اور یہ بھی کہ فرحانہ اس کی شیطانی گرفت میں جاچکی ہے، میں پریشان ہوگیا۔ وہ آگے بولتا رہا۔

''شاہ میر نے ہمیں حکم دیا تھا کہ فرحانہ کو بے ہوش کرکے اس جزیرے تک پہنچانا ہوگا۔ جہاں راکا ایک ہٹ میں پہلے سے موجود ہوگا۔ فرحانہ کو اس کے حوالے کرکے ہمیں واپس لوٹنا تھا۔''

''راکا اسے کہاں لے گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنے جہاز میں جو یہاں سے بیس ناٹیکل میل کے فاصلے پر کھرے سمندر میں روانگی کے لیے تیار تھا۔''

''یہ جہاز سی گوڈ یز تو نہیں تھا۔ بن رائد کی ملکیت؟''

میری اس معلومات پر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے شاہ میر کے دشمن نعمان عرف نومی کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔

''ہاں!'' اس کا جواب اثبات میں تھا۔

میں بے بسی سے دانت پیس کر رہ گیا۔ اگلا سوال کیا۔ ''کیا وہ جہاز اب روانہ ہو چکا ہوگا؟''

''یقیناً!''

''اس کی منزل؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم!''

میں نے پھر بھی اس کی تصدیق کرنا مناسب سمجھا اور اسے کاندھے پر اٹھالیا وہ کراہ کر رہ گیا اور مجھ سے پوچھتا رہا کہ میں اسے کہاں لے جارہا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے کاندھے پر سوار کیے بالآخر اس جگہ پر پہنچ گیا، جہاں ایک لکڑی کا شکاری کیبن نما مختصر سا ہٹ بنا ہوا تھا۔ وہ خالی تھا۔ تاہم وہاں ایسی نشانیاں مجھے نظر آئی تھیں کہ کوئی یہاں فروکش رہ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں شکورا کی لاش اور اپنے زخمی شکار کو اسی لانچ میں لیے واپس بندرگاہ پر آگیا۔

غفورا بے چینی سے میرا ہی منتظر تھا۔ میں نے اسے ساری کہانی بتادی۔ اسے شکورے کی موت کا دکھ بھی ہوا تھا اور اس پر غصہ بھی آیا تھا کہ ایک ذرا پیسوں کے لالچ میں آکر وہ مارا گیا تھا۔

میں نے اسی وقت کالیا کو فون کیا۔

''ابے لے جگری! کدھر ہے تو؟'' وہ جیسے چھوٹتے ہی بولا۔ ''بڑی دیر کردی۔ بتا کیا ہوا؟'' وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال کہہ گیا۔

میں نے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اس سے وہاں کی خبر لی۔ وہ بولا۔

''میں نے ویسا ہی کیا ہے جیسا تو نے کہا تھا۔'' وہ بولا۔

میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''حکم کیسا یار! میں بھلا تمہیں کوئی حکم دے سکتا ہوں۔ یہ بتا یہ کارنامہ تو نے اکیلے کیسے انجام دیا؟''

''ابے لے جگری!'' وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں لوٹ آیا۔ ''اپنی تو ساری زندگی ہی ایسے کاموں کو کرتے گزری ہے۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے روانہ ہوتے ہی میں بھی کسی کی نظروں میں آئے بغیر کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا تھا ان کے تعاقب میں پتا تو تھا مجھے ان کی منزل کا پھر بھی ایک رکشا ان کے پیچھے لگالیا تھا۔ واپسی میں ثمیر اکیلا تھا اپنی کار میں۔ بس، ایک ویران مقام پر چھاپ لیا اس کو اور اسی کی کار میں صفورا نکل پڑا۔ ملیر کینٹ سے صفورا بہ مشکل بیس منٹ کا تو فاصلہ ہے۔''

''گڈ!'' میرے منہ سے اس کے لیے بے اختیار توصیفی جملہ برآمد ہوا۔ وہ ہنس پڑا۔ پھر میں نے پوچھا۔

''یہ بتا کہ تو نے ان دونوں باپ بیٹوں کی گفتگو سنی تھی؟ مزید کیا باتیں ہوئی تھیں ان کے درمیان؟''

''کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی ان کے بیچ۔'' کالیا بولا۔ ''وہی باتیں ہوتی رہی تھیں جو میں تجھے بتا چکا ہوں۔ اب آگے تو بتا..... جگری!''

''تو صفورا والے مکان میں ہی ہے ناں ثمیر کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! شکار بھی ساتھ ہے۔ کبھی ڈرا ہوا لگتا ہے اور کبھی دھمکیاں دینا شروع کردیتا ہے۔ تو آجا تو اپنے کام کو تکمیل تک پہنچائیں۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ اپنے بھائی فہیم کی طرح میں شاہ میر کے بیٹے کو بھی انتقاماً اسی دائمی عذاب سے دوچار کرنا چاہتا تھا۔ اپنے دشمن دیرینہ سے انتقام کے موقع کا ہاتھ آجانے کی مسرت میرے اندر کی آتش انتقام کو مزید فروزاں کرنے کا سبب بن رہی تھی اور ایک بے پایاں مسرت کا احساس ... ہو رہا تھا مجھے۔

آگ سے آگ ہی بھڑکتی ہے۔ حالانکہ میں اس فطرت کا انسان نہیں تھا۔ مگر حالات کی منہ زور آندھی ایک شریف اور عام انسان کو بھی میرے جیسا بنادیتی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی راہوں پر چل پڑتا ہے جس کے بارے میں اس نے کبھی تصور تک نہیں کیا ہوتا اور پھر یہی بگولے اسے اٹھا کر ایسی راہ پر لا پٹختے ہیں کہ اس پر چلتے رہنا اس کی مجبوری ہی نہیں بلکہ جزولاینفک قرار پاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہوا تھا۔ میرے باپ کو ایک جھوٹے الزام کی پاداش میں قربانی کا بکرا بنایا گیا۔ اسے پھانسی ہوگئی۔ اس کے بعد میرے بھائی فہیم کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔ جوان بہن کو اغوا کرلیا گیا۔ ان حالات نے میرے جیسے ایک شریف اور عام خو آدمی کی ڈگر ہی بدل ڈالی اور یوں میں نے اپنے دشمنوں کو جو معاشرے کے ناسور بھی تھے۔ پہلے دماغ جنگ کے ساتھ شکست دی پھر جہاں ضرورت ہاتھ اور ہتھیار کی پڑی تو تقدیر نے شیراز عرف کالیا کو میرا دست راست بنادیا۔ کالیا جرائم کی دنیا کا وہ جغادر انسان تھا جو اپنے استادوں کا بھی استاد ٹھہرا تھا اور آج اس نے بھی مجھے اپنی سنگت میں کچھ ایسا ہی بنادیا تھا کہ میں اپنے دشمنوں کے ساتھ اسی بے رحمی کے ساتھ نمٹوں جس طرح وہ سفاکی کا لبادہ پہنے میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

بہرکیف بہت سی باتیں اور آیندہ کے لائحہ عمل ایک تواتر کے ساتھ میرے ذہن میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے اور میں ان پر غور کیے بغیر کسی ایک نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ لہٰذا کالیا سے بولا۔ ''کالیا! حالات کچھ مختلف سی صورت اختیار کرنے لگے ہیں۔ تیرا کیا مشورہ ہے؟ پہلے اس تازہ صورتِ حال سے نمٹنا چاہیے جس کا اس وقت میں شکار ہوں۔''

''تو کیا کرنا چاہتا ہے؟'' اس نے میرا عندیہ لیا۔

''یہاں کی پولیس سے مدد طلب کروں اور ان دونوں کو ان کے حوالے کردوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ دونوں شاہ میر سے اپنے تعلق کو کبھی نہیں ظاہر کریں گے جگری! صاف مکر جائیں گے اور الٹا تجھ پر کوئی الزام لگادیں گے۔''

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ اس صورت میں جب کہ بندرگاہ کا ایک مزدور شکورا بھی ان کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے؟'' میری بات پر دوسری جانب چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی طاری رہی۔ کالیا نے شاید اس طرف غور نہیں کیا تھا۔ خاموشی کے اس مختصر وقفے کے دوران میرا ذہن بھی اس گمبھیر صورتِ حال پر غور کررہا تھا۔

''اپنا غفورا کیا کہتا ہے؟'' اچانک کالیا کی استفہامیہ آواز ابھری۔

''وہ یہی کہتا ہے کہ معاملہ پولیس کے سپرد کرنا ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا کیونکہ پیش آمدہ حالات سے آگاہی کے بعد غفورا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ وہ بھی اس

وقت میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس سے بات کرکے ہی میں نے کالیا کو فون کیا تھا۔ آگے بولا۔ ”وہ خود اس بات کی گواہی دے گا کہ معاملہ کیا تھا۔“

”اچھا!“ کالیا کی خیال انگیز آواز ابھری۔ ”معاملہ اس کے ساتھی کے قتل کا نہ ہوتا تو ہم اپنے طریقے سے اسے حل کرنے کی کوشش کرتے جگری! لیکن اب یہی کرنا پڑے گا۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ شکاری طرف سے محتاط رہنا۔“ میری مراد ثمیر سے تھی۔

”اس کی طرف سے بے غم ہو جا جگری! بس تو یہ معاملہ خیریت کے ساتھ نمٹا کے آجا جلدی صفورا والے مکان پر میں وہیں تیرا انتظار کر رہا ہوں لیکن متعلقہ تھانے سے رابطہ کرنے سے پہلے اپنے انسپکٹر کامران سے بھی بات کر لینا وہ ہماری ساری صورت حال سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس طرح متعلقہ تھانے کی پولیس تمہیں زیادہ تنگ نہیں کرے گی۔“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کا مشورہ اچھا تھا کیونکہ انسپکٹر کامران ہی وہ واحد آدمی تھا جو میرے حالات سے اچھی طرح واقف تھا اور میں نے بعض کیسز میں اس کی مدد کی تھی۔

کالیا کے اس صائب مشورے پر میرے ذہن میں ٹھٹھہ کے انسپکٹر وجاہت سیال کا بھی خیال آیا۔ وہ بھی انسپکٹر کامران کی طرح ایک ایماندار، دلیر اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ ”الکبیر“ جیسی لانچ والے خطرناک کیس میں اس کی میں نے خاطر خواہ مدد کی تھی اور وہ مجھ سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔

میں نے کامران سے بات کرنے کے بعد اس سے بھی مدد کی درخواست کر ڈالی تھی۔ اس نے بھی مجھے تسلی دی تھی اور مجھ سے کہا تھا کہ چند منٹوں بعد مجھ سے دوبارہ رابطہ کرے۔ کیونکہ متعلقہ تھانے کا انچارج اس کا واقف کار تھا۔ اب وہ یہ چیک کرنا چاہتا تھا کہ آیا اب بھی وہ وہاں تعینات تھا یا نہیں۔ خوش قسمتی سے ایسا ہی ہوا کیونکہ جب دوبارہ وجاہت سیال سے میں نے رابطہ کیا تو اس نے یہی کہا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم نے متعلقہ تھانے سے رابطہ کر لیا۔ بدنصیب شکورے کا دنیا میں ایک دور کی رشتے کی خالہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ چاچا جھومر نامی ایک عمر رسیدہ شخص کی لانچ پر وہ کام کرتا تھا۔ متعلقہ تھانے کی پولیس نے میرا اور غفورے کا بیان قلم بند کیا اور انسپکٹر دلشاد خاں نامی تھانہ انچارج کے روبرو بھی پیش کیا تھا ہمیں۔

وہ ایک خاصی عمر کا تھانہ انچارج تھا۔ انسپکٹر کامران اور انسپکٹر وجاہت سیال کے فون کرنے کے بعد اس نے مجھے زیادہ تنگ نہ کیا ورنہ وہ مجھے صورت اور مزاج سے ہی خاصا کڑک اور ”مشکل“ انسپکٹر دکھائی دیتا تھا۔

پھر بھی اس نے مجھے چند ضروری باتوں کے لیے پابند کر دیا تھا۔ مثلاً میں اس کے حکم پر جہاں بھی ہوں اور جیسی حالت میں بھی ہوں فوراً ضرورت پڑنے پر اس سے ملنے کا پابند رہوں گا۔ نیز کیس کے جلد حل کرنے پر میں اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالوں گا۔ کسی اعتراض کی صورت میں، پہلے اس سے بات کروں گا اور اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کروں گا وغیرہ۔

اس کی اتنی ساری شرائط سن کر میں اندر سے بڑا منغض ہوا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ بلا کا رشوت خور اور ایک تساہل پسند پولیس افسر تھا۔ مجھے یہ انسپکٹر دلاور کا دوسرا روپ ہی نظر آتا تھا۔ تاہم میرے لیے یہی بہت تھا کہ اس نے میرے سلسلے میں رسمی کارروائی کر کے مجھے جانے دیا تھا۔

میرے لیے یہ عمومی صورتِ حال خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ دلشاد خاں مجھے لمبے چوڑے قانونی چکروں میں پھنسا سکتا تھا۔ مجھے اس بات کا دھڑکا تھا کہ اس جیسے پولیس انسپکٹر شاہ میر جیسے مجرموں کے لیے ”آسان“ ثابت ہوتے ہیں۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے غفورے کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ میں نے غفورا کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کے بعد خیبر کار میں صفورا کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس ساری کارروائی میں صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ خود میں بھی بے حد تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ رات بھر کی مارا ماری اور مہم جوئی نے میرے اعصاب شل کر دیے تھے مگر اس کا کھڑ تیل برآمد نہ ہو سکا تھا۔ ماسوائے اس کے کہ شاہ میر کے دو آدمیوں کو میں پولیس کے حوالے کر چکا تھا اور اس درمیان میں ایک اور بے گناہ مزدور میرے سفاک دشمنوں کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔

نیند اور تھکن کے باعث سر میرا بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل سی ہو رہی تھیں، حالانکہ اتنی صبح ... روڈ پر ٹریفک کم ہی تھا پھر بھی میں کار کو ایک مناسب رفتار سے ہی ڈرائیو کر رہا تھا کہ کہیں غنودگی میں کار ... بے قابو نہ ہو جائے۔ لہٰذا گھنٹے بھر بعد ہی میں صفورا والے مکان پر پہنچا۔

دستک کے جواب میں جمی نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ وہ جماہیاں لے رہا تھا اور نیند میں ہی بیدار ہوا تھا۔

اندر ہی ایک کھلے صحن میں مجھے ثمیر کی کار بھی کھڑی نظر آ گئی

تھی۔ جمی نے بتایا کہ کالیا سو رہا ہے۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور سب سے پہلے بھائی اور بہن عاصمہ کے علاوہ چاچا انور شاہ کو بھی خیریت کا ایک ایک میسج کیا اس کے بعد میں نے گرم پانی کا غسل لیا۔ تب تک جمی کے ایک ساتھی نے مجھے ابلے ہوئے دو انڈوں اور ایک کپ چائے کا ناشتہ تھما دیا۔ وہ کرنے کے بعد میں بستر پر گر گیا۔

☆......☆

اگلے دن چڑھے میں سوتا رہا۔ ایک بجے میری آنکھ کھلی تو کالیا کو کمرے میں جمی اور دوسرے ساتھی سے باتیں کرتے پایا۔

”جگری! کیسے ہو؟“ وہ مجھے جاگتا پا کر میری طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔ میں نے ایک تھکی تھکی سی جماہی لی اور کسلمندی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ٹھیک ہوں بہت تھکا ہوا تھا میں تو لیٹتے ہی سو گیا۔“

”اچھا کیا جگری! آرام بھی ضروری ہے۔ چل جا منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جا تو اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ بولا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے عاصمہ بہن کو فون کیا اور اپنی اور گھر کی خیریت کے بعد میں نے چاچا انور شاہ کو بھی خیریت کا ایک عدد فون کھڑکا دیا اور بولا کہ میں گھر سے ہوتا ہوا اڈے پر پہنچوں گا۔

ثمیر کو ایک اسٹور نما بوسیدہ سے کمرے میں مقید کیا گیا تھا۔ یہ کمرا ایئر ٹائٹ تھا۔ یعنی یہاں سے آواز باہر نہیں جا سکتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ثمیر کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور منہ پر اسکاچ ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی شے نہ تھی ماسوائے سیمنٹ کے فرش پر ایک سالخوردہ سے بچھے ہوئے ایک میٹرس کے۔ وہ اسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

کالیا نے مجھے بتایا تھا کہ ثمیر کے موبائل پر کئی کالیں آ چکی ہیں مگر اس نے کوئی کال اٹینڈ نہیں کی۔ یہ اس کے باپ شاہ میر کی کال تھی۔ وہ یقیناً دبئی پہنچ چکا تھا مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیٹا ثمیر ہمارے قبضے میں تھا۔ میں نے کالیا سے ثمیر کا سیل فون لے کر وہ نمبر اسکرین پر لا کر دیکھا۔ وہ دبئی کا نمبر تھا اور ثمیر سے میں نے تصدیق کر لی تھی کہ یہ بھی اس کے سیل فون کا ہی نمبر تھا۔

کچھ سوچ کر میں نے وہ سیل فون کالیا سے لے کر اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔

ثمیر پوری طرح سے ہوش میں تھا اور بہت ہی زیادہ مضمحل اور مضطرب الحال نظر آ رہا تھا۔ پریشانی اور تشویش نے اس کا خوبرو چہرہ تک مسخ کر ڈالا تھا۔

کالیا اور اس کے مذکورہ دونوں ساتھی یقیناً اس کے لیے اجنبی ہو سکتے تھے مگر میں تو ہرگز نہیں اسی سبب جب اس کی مجھ پر نظر پڑی تو ایک ذرا ناقابل یقین انداز کے چونکنے کے ساتھ ہی بڑی نفرت اور غصیلے پن کے تاثرات مرحلہ وار ہی اس کے چہرے اور آنکھوں سے مترشح ہوئے تھے اور وہ مجھے جیسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے کے لیے بے چین نظر آنے لگا۔ اس کی رسن بستہ وجود کی تھرتھراہٹ اور بے چینی سے یہی نظر آتا تھا۔

اس وقت کالیا اور جمی بھی میرے ساتھ موجود تھے۔ میں چند ثانیے زہر خند نظروں سے ثمیر کو گھورتا رہا اور میرے چشم تصور میں اپنے بھائی نعیم کی حالت زار گردش کرنے لگی۔ اپنے کبرو جوان بھائی کا ادھورا اپاہج وجود اور شاہ میر کا وہ چند سطری کاغذ کا ٹکڑا جس کی بے رحم سطریں آج بھی مجھے ازبر تھیں۔ میرے سینے کی آتش انتقام کو جوالہ مکھی کی طرح بھڑکانے پر محمول کر رہا تھا۔ اسی اندر کی آگ میں ایک مسرت بھرا احساس بھی جاگ رہا تھا جو اپنے دشمن سے ویسا ہی جوابی انتقام کا موقع میسر آ جانے پر محسوس ہوتا ہے۔ دشمن گرفت میں تھا اور میں اس سے بھیانک انتقام لینے کے لیے بے چین۔

میں چند قدم بڑھا کر اس کے قریب آیا اور قدرے جھک کر میں نے اس کے منہ سے اسکاچ ٹیپ اکھیڑ دی۔

اس نے چند گہرے گہرے اور عجلت آمیز انداز میں سانس لیے اس کے بعد بھبکتے ہوئے بولا۔ ”تت...... تم...... ام...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بہت بھیانک انجام ہو گا تمہارا۔“

”اچھا!“ میں نے زہریلے طنز سے کہا۔ ”پہلے اپنے انجام کی تو فکر کر لو۔“

”بہت جلد...... بہت جلد...... میرا باپ تم سے اچھی طرح نمٹ لے گا دو ٹکے کے گھٹیا آدمی...... تالے، کنجیاں بنانے والے فٹ پاتھی فقیر کی اولاد!“ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان بپا ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔

اس کی ہرزہ سرائی اور طیش ناکی اس کی شکست خوردگی اور بے بسی کا پتا دیتی تھی لیکن اپنے باپ سے متعلق ایسے ذکر پر میرا اندر جیسے ایک طوفانی بگولے کی زد میں آ گیا اور میں نے نہایت خوں ناک انداز میں دانت بھینچ کر اپنے ایک ہاتھ کی گرفت میں اس کی گردن دبوچ لی اور قدرے جھک کر اپنا غیظ آلودہ چہرہ اس کے چہرے کے بالکل قریب کرتے ہوئے

ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

’’جس تالے چابی بنانے والے کو تم فقیر کہہ رہے ہو وہ واقعی ایک فقیر منش انسان تھا۔ ایک نیک اور شریف انسان جو انسانیت کا دشمن نہیں تھا اور نہ اس کے ہاتھ کسی بے گناہ انسان کے خون سے رنگے ہوئے تھے، مجھے بھی ایسے عظیم انسان کی اولاد ہونے پر فخر ہے لیکن تمہیں اس بات پر شرمندگی اور ندامت ضرور ہونا چاہیے کہ میرے برعکس تم ایک ایسے انسان کی اولاد ہو جو بذات خود انسانیت پر ایک بدنما دھبا ہے۔

میرے باپ کے علاوہ اس کے ہاتھ نجانے اور کتنے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگے ہوں گے۔ اس نے میرے معصوم اور جوان بھائی کے ساتھ بھی انسانیت سوز بربریت کا مظاہرہ کیا، بڑی بے رحمی اور بیدردی کے ساتھ اس نے میرے بھائی کی دونوں ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ بتاؤ مجھے اب ایک نیک اور شریف فقیر منش آدمی کی اولاد ہونے میں مجھے فخر ہوگا یا تمہیں ایک خونی اور سفاک انسان کے تخم لعنت جیسی گالی ہونے پر ندامت۔‘‘

’’میں تمہاری اس فضول کی تقریر سے بالکل بھی متاثر نہیں ہونے والا۔‘‘ وہ غصیلے پن سے بولا۔ ’’بہتر یہی ہے کہ مجھے چھوڑ دو اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔‘‘

’’تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں معاملے کو رفع دفع کرنا چاہتا ہوں؟‘‘ میں نے سیدھے کھڑے ہو کر بے پروانہ انداز میں کہا۔ ’’میں نے تو معاملے کی ابتداء کر ڈالی ہے۔ خون کے بدلے خون اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ۔‘‘

یکایک میری آنکھوں سے خوں ناک چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ پورا جسم ایک غضب ناک ارتعاش کی زد میں آ گیا۔ اپنے بھائی نعیم کا ٹانگوں سے عاری وجود میری چشم تصور میں گھومنے لگا۔ میں نے دیکھا ثمیر کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لیے خوف کے سائے لہرا گئے۔ دہشت کی سرخی اس کے چہرے پر لکیروں کی صورت امڈی تھی۔

’’تت..... تم ..... کیا کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ؟‘‘

’’وہی جو تمہارے بزدل باپ نے میرے جوان بھائی کے ساتھ کیا تھا۔‘‘

’’کک..... کیا کیا تھا؟‘‘ وہ ہنوز ہق دق تھا۔

’’میرے بھائی کی ٹانگیں کاٹ ڈالی تھیں اس نے اور اب میں بھی تمہارے ساتھ وہی کروں گا۔‘‘ میری آنکھوں سے ہی نہیں لہجے سے بھی سفاکی مترشح ہونے لگی تھی۔

’’تت..... تم ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ..... مم ..... میں کسی معمولی آدمی کا بیٹا نہیں ہوں۔‘‘

’’بہت گھمنڈ ہے تمہیں اپنے آپ پر..... ہیں؟ میرا بھائی بھی تو کسی معمولی آدمی کا بھائی نہیں تھا۔‘‘

’’کالیا!‘‘ میں نے بدستور اپنی جلتی سلگتی نظریں اس کے چہرے پر گاڑھے رکھتے ہوئے کالیا کو پکارا۔

’’ہاں، جگری بول۔‘‘

’’شاہ میر نے میرے بھائی کی ٹانگیں تو گلوٹین سے کاٹی تھیں نا اس میں اتنا درد کا احساس بھی نہیں ہوتا مگر میں اس کی ٹانگیں تیز بغدے سے کاٹوں گا اور اس کی چیخوں کی آوازیں اس کے ظالم باپ کو سناؤں گا۔ یہ بتا کالیا مجھے کہ اس کی آوازیں باہر تک تو نہیں سنی جاسکیں گی نا؟‘‘

’’بے غم ہو جا جگری! میں نے بتایا نا ابھی تجھے کہ یہ کمرا ائر ٹائٹ ہے۔‘‘

’’سامان تیار کرو۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

’’ابے لے جگری! ابھی حاضر کرتا ہوں۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے جمی سے کچھ کہا اور وہ فوراً کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

ثمیر کی آنکھیں مارے دہشت کے پھٹ گئی تھیں۔ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ اس کا دہشت آمیز سکتہ ٹوٹا اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

میں ثمیر کا چہرہ تکنے لگا تھا۔ میری آنکھوں سے مجنونانہ انتقام کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جبکہ ثمیر کا سارا گھمنڈ اور غرور ہوا ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت کے مارے پھیلنے لگی تھیں۔ چہرہ آنے والے سفاک لمحوں کی اذیت ناکی کا تصور کر کے متورم سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرے انتقام سے بھرے ہوئے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا واقعی میں یہ سب کرنے کا پکا تہیہ کیے ہوئے تھا؟ جبکہ اس وقت میرے روم روم سے آتش انتقام اور آنکھوں سے جوالہ مکھی پھوٹتا وہ صاف دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں جمی لکڑی کی ایک گول ’’مڈی‘‘ اور ایک تیز دھار بغدا لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ مڈی بڑی اور خاصی وزنی تھی، جسے اس نے اپنے ایک کاندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ وہی سامان تھے جو قصائیوں کے پاس رکھے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر ثمیر کی حالت مزید غیر ہونے لگی۔

جمی نے وہ مڈی اتار کر ثمیر کے قریب رکھی اور بغدا بھی اس پر رکھ دیا۔ ثمیر اب میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر ان دونوں چیزوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ جمی کے ساتھ ظہیر بھی نمودار ہوا تھا۔

اس نے مرہم پٹی کے سامان کو ایک شاپر میں ڈالے رکھا تھا۔ وہ بھی اس نے وہیں رکھ دیا۔

’’کالیا! روئی کے پھائے اور گاز پیس پہلے سے بنالو تاکہ خون زیادہ رسنے کی صورت میں جلد پٹی کر دی جائے ورنہ کمرے میں بہت سارا خون پھیل جائے گا اور باہر تک نہ چلا جائے۔ زخموں پر ٹانکے تو میں خود بھی لگا لوں گا۔ وہ میرا کام ہے۔‘‘ میں نے کالیا سے کہا۔ میری آواز شدت انتقام تلے بھاری اور گھر گھراتی سی ہوئی جا رہی تھی۔

ثمیر کی سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ ان سارے ’’لوازمات‘‘ کو دیکھ کر وہ بری طرح خوف زدہ ہو رہا تھا۔

’’ابے لے جگری! سب تیار ہے۔ پہلے کون سی ٹانگ کو مڈی پر رکھوں؟‘‘ کالیا نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت میرا رواں رواں شدت انتقام تلے کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور وہی نمبر ری ڈائل کر دیا جس سے کال آ رہی تھی اور ثمیر سے تصدیق ہو چکی تھی کہ آنے والی کال اس کے باپ شاہ میر ہی کی تھی۔

دوسری جانب بیل جا رہی تھی کالیا جان چکا تھا کہ میں سفاکی کا کھیل کھیلنے سے پہلے کیا کرنا چاہتا ہوں اور ثمیر بھی یہی کچھ سمجھے ہوئے تھا۔ وہ پھر چیخنے چلانے لگا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ پھر دھمکیاں دینے لگا مگر اب اس کے لہجے اور آواز میں وہ بات نہیں رہی تھی۔ اب اس میں خوف اور بوکھلاہٹ کا عنصر غالب تھا۔

میں نے شاہ میر کا نمبر پنچ کرنے کے بعد اس کا اسپیکر وائیڈ کر دیا تھا۔ میں اپنے دشمن باپ کے قاتل اور بھائی کے سفاک مجرم شاہ میر سے ایسے وقت میں بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اور میرا اندر شدید غیظ تلے بری طرح سرکش تھا۔

’’ہیلو! بیٹا! کیا بات ہے؟ اتنی دیر سے تمہیں فون کر رہا ہوں تم کال اٹینڈ ہی نہیں کر رہے ہو؟ خیریت تو ہے ناں؟‘‘ تیسری بیل پر اچانک ہی شاہ میر کی آواز ابھری تھی۔

’’شاہ میر!‘‘ اس مردود کی آواز سنتے ہی میرے حلق سے جوش غیظ تلے پھٹی پھٹی آواز برآمد ہوئی جبکہ دوسری جانب یکلخت سناٹے دار خاموشی طاری ہو گئی۔ اپنے بیٹے کے موبائل فون پر اس کی آواز سننے کی بجائے میری آواز نے شاہ میر کو ایکا ایکی سناٹے کی سی کیفیت سے دوچار کر ڈالا تھا۔ اس کے سان دگمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس کے بیٹے ثمیر کے سیل فون پر اسے میری آواز سننے کو ملے گی۔

’’کیوں..... رذیل انسان! سانپ سونگھ گیا؟‘‘ میں نے پھر زہریلے لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے شاہ میر کی مجھے پھنکار سے مشابہ ایسی ہنکاری خارج ہوتی محسوس ہوئی جیسے وہ حقیقت کے بعین بعین پہنچ چکا ہو۔ تب ہی اس کی سرد آواز ابھری۔

’’میرا بیٹا کہاں ہے؟ میری اس سے بات کرواؤ۔‘‘

’’ضرور تمہیں اپنے بیٹے کی آواز ہی نہیں اس کی چیخیں بھی سناؤں گا۔ یہ لو کرو بات اپنے لاڈلے سے۔‘‘ انتہائی مغلوب الغضب ہو کر یہ کہتے ہوئے میں چند قدم آگے بڑھا اور سیل فون اس کے منہ کے قریب کر دیا۔ وہ وائیڈ اسپیکر پر اپنے باپ کی آواز سننے کے بعد اس سے بات کرنے کے لیے بے چین دکھائی دینے لگا تھا۔

’’پپ..... پپا! ی ی ..... یہ لوگ اور اس کے ساتھی ..... مم ..... میں ان کی ق ..... قق ..... قید میں ہوں..... پپ ..... پلیز مجھے چھڑا لیں..... پپا! ی ی ..... یہ لوگ مم ..... میری.....‘‘ اسی وقت میں نے فون اس کے منہ سے ہٹا لیا اور پھر سیدھا کھڑے ہو کر شاہ میر سے بولا۔ ’’ہو گئی تسلی..... شاہ میر..... ! لیکن..... ابھی تو تم نے اپنے لاڈلے کی صرف آواز ہی سنی ہے..... ابھی میں تمہیں اس کی وہ چیخیں بھی سناؤں گا جب اس کی ٹانگوں کو میں تیز بغدے سے کاٹ ڈالوں گا۔ سیل فون آن رہے گا۔ شاہ میرا‘‘ کہتے ہوئے میں نے سیل فون قریب کھڑے جمی کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی اسے مختصری ہدایت بھی دے ڈالی کہ وہ فون پر کوئی بات کرنے کی کوشش نہ کرے اور جب میں ثمیر کے ساتھ ’’کارروائی‘‘ کروں تو وہ سیل فون کو اس کے چیختے چلاتے منہ کے قریب ہی کیا رکھے تاکہ دوسری طرف سے شاہ میر اپنے بیٹے کی اذیت ناک چیخوں کی آوازوں کو سن سکے۔

یہ ساری باتیں شاہ میر بھی یقیناً سن رہا تھا۔ کالیا یک ٹک میرا چہرہ تکے جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے لیے میرا یہ روپ نیا ہو لیکن میں نے دیکھا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ بھی رقصاں تھی۔

’’نعمان!‘‘ دوسری جانب سے شاہ میر کی غیظ ناک آواز ابھری جس میں کپکپاہٹ بھی طاری تھی۔ ’’یہ میرا بیٹا ہے..... شاہ میر کا بیٹا تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ تم جہاں کہیں بھی ہو لیکن پاکستان میں میری ایک فون کال سے تمہارے خلاف تھرتھلی مچ جائے گی۔‘‘

مجھے اس کی ڈھٹائی، گھمنڈ اور ہٹ دھری پر مزید طیش

چڑھ گیا۔ اسی لہجے میں بولا۔ ”وہ بھی میرا بھائی تھا شاہ میر! جس معصوم کے ساتھ تم نے ظلم و بربریت کا ایسا کھیل کھیلا تھا کہ شیطان بھی پناہ مانگتا ہوگا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ وہ تمہارا بھائی تھا مگر...... یہ میرا بیٹا ہے، یاد رکھنا۔ اس کا حساب میں تمہارے پورے خاندان سے لوں گا لیکن معاملہ ختم کرنے کے لیے میں تمہیں پانچ کروڑ دینے کو تیار ہوں۔“

اس کی بات پر میرا غیظ و غضب آسمان کو چھونے لگا۔ سینے میں سلگتی انتقام کی آگ مزید فروزاں ہو کے بھڑکنے لگی۔ تنفس مارے طیش اور جوش تلے سوا ہونے لگا تھا۔ کس قدر غرور تھا اس شخص کو اپنے آپ پر، اپنی طاقت پر اور اپنی دولت پر جبکہ مجھے یہ کچھ گردان ہی نہیں رہا تھا۔ کسی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا اور اس کے ساتھ سودے بازی پر مجبور ہو جاؤں گا۔

”خون کا بدلہ خون ہوگا شاہ میر اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ!“ میں غیظ ناک آواز میں بولا۔ ”تم جب تک فون کال کرو گے میں تمہارے لاڈلے کو ادھورا کر چکا ہوں گا شاہ میر! فون کال مت کاٹنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بغدا تمہارے بیٹے کی ٹانگوں پر آزمانے کی بجائے اس کی گردن پر مار دوں۔ جنگ ہے تو جنگ ہی سہی۔ تمہیں گھمنڈ ہے اپنی طاقت اور دولت کا تو مجھے ناز ہے اپنے جذبے اور اس جنگ کے میدان میں ڈٹے رہنے کا...... لو اب...... سنو.......... اپنے بیٹے کی آوازیں اور اندازہ لگانے کی بھی کوشش کرو کہ اس کی بھی خوف اور دہشت سے وہی حالت ہو رہی ہے جو میرے معصوم بھائی کی ہوئی ہوگی جب تو نے اس کے ساتھ بربریت کا کھیل کھیلا تھا.. (گالی)!“

میرے لہجے کی گھن گرج، آواز کی پر تعلیت اور جوش و جذبے سے جھلکتی تپش سے شاید شاہ میر کو ادراک ہونے لگا تھا کہ میں کس قدر تاؤ کھائے ہوئے تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن میں نے سیل فون ہٹا دیا اور پھر کالیا کو اشارہ کر دیا۔ فون کے وائیڈ اسپیکر پر مجھے شاہ میر کی بوکھلاتی آوازیں آرہی تھیں، وہ اب بھی گھمنڈی لب و لہجے اور دھمکیوں سے کام چلانے کی بے سود کوشش کر رہا تھا جبکہ میں اپنے کام میں معروف ہو گیا، کالیا نے میرے مخصوص اشارے پر کسی قصائی کی طرح ثمیر کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور بغدا اٹھا لیا۔ ثمیر کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ جمی نے میری ہدایت کے مطابق سیل فون کو آن ہی رہنے دیا تھا اور احتیاط سے تھامے ہوئے اسے ثمیر کے منہ کے قریب کیے رکھا ہوا تھا۔

ثمیر کا چہرہ خوف و دہشت سے سپید پڑنے لگا تھا۔ زندہ حالت میں وہ اپنا یہ حشر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ معافیوں پر اتر آیا۔ کالیا نے اس کی ٹانگوں میں بندھی ہوئی رسی تیز دھار بغدے سے کاٹ ڈالی اور قریب کھڑے ظہیر کو اشارہ کیا۔ اس نے اس کی دوسری ٹانگ دبوچ لی۔ ثمیر کو یقیناً یہ اسٹور نما سیلن زدہ سا کمرا مذبح خانہ معلوم ہو رہا ہوگا۔

”نن...... نہیں ...... خ...... خدا...... کے لیے یہ مت کرو...... ایسا مت کرو...... ی ی ظلم ہے، یہ درندگی کی انتہا ہے۔“ وہ منتیں کرنے لگا میری۔

”تمہارے باپ نے بھی تو میرے بھائی کے ساتھ ایسی ہی درندگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب تمہیں اپنے باپ کے کرتوتوں کی سزا بھگتنا ہوگی۔“ میں نے ابلتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کر خونخوار سی غراتی آواز میں کہا۔

”پپ...... پاپا! اسے روکو...... ی ی ...... مجھے ...... آ...... و......“ وہ چیخ پڑا کیونکہ اسی وقت میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر مڈی کے اوپر رکھ دی اور دانستہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے بغدے کو فرش پر یوں گرایا جیسے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا ہو، بغدے کے گرنے کی فولادی چھنک شاہ میر نے بھی سن لی تھی اور وہ پاگل ہو گیا۔ وائیڈ اسپیکر پر اس کی آواز ابھری۔

”نن...... نعمان! ٹھہ...... ٹھہر جاؤ ذرا...... مم...... میری بات سنو...... مم...... میں......“ وہ بدحواس ہونے لگا، اس کا سارا گھمنڈ اور غرور جیسے ناک کے راستے بہنے لگا تھا۔

میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بہ آواز بلند کالیا سے بولا۔

”قینچی سے اس کی پتلون رانوں تک چیر ڈالو تاکہ مجھے صحیح طرح سے اندازہ ہو سکے کہ مجھے کہاں تک بغدا چلانا ہے اس کی ٹانگوں پر۔“ میری آواز میں سفاکی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں، اس وقت مجھے ماسوائے انتقام اور بدلے کی آگ کے کچھ نہیں نظر آرہا تھا۔

”گاز پیس، روئی کے پھائے اور زخموں پر ٹانکا لگانے کا سامان قریب کر دو۔“ میں نے چلا کر تحکمانہ کہا تاکہ شاہ میر بھی سن لے۔

”سب تیار پڑا ہے استاد!“ ظہیر نے کہا۔

میں نے ثمیر کی ٹانگ دبوچ رکھی تھی۔ کالیا نے بڑی سی قینچی لے کر اس کی پتلون کو رانوں تک چیر ڈالا۔ قینچی اسٹیل کی تھی اور بڑی بھی۔ تیز تو اس قدر تھی کہ کپڑا چرنے کی واضح آواز ابھری تھی۔

”پپا...... پپا...... یہ ظالم قسائی لوگ میری دونوں ٹانگیں کاٹ ڈالیں گے، مجھے کسی طرح بھی ان کے بھیانک چنگل سے بچاؤ...... میں...... میں یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکوں گا مر جاؤں گا۔“ ثمیر ہذیانی آوازوں میں چیخا۔ خوف اور بغدے سے ٹانگیں کٹنے کا تصور بھی اس کے لیے عذاب جاں بنا ہوا تھا۔

”نن...... نعمان! مت کرو ایسا خدا کے لیے میرے بیٹے کے ساتھ مت کرو ایسا...... ظلم...... میں تم پر اور تمہارے خاندان پر دولت کی بارش کر دوں گا، مم...... میرا یہ وعدہ ہے...... تم آزما سکتے ہو......“ شاہ میر کی لرزتی کانپتی آواز ابھری۔

”ابھی تو تم مجھے اور میرے خاندان کو خون میں نہلانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔“ میں نے زہریلے طنز سے کہا۔ ”اب پتا چل گیا کہ میں کیا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ وہی کچھ جو تم کر سکتے تھے لیکن ادلہ بدلہ تو ضرور ہوگا۔ یہ نعمان کا اٹل اصول ہے۔“

”دد...... دیکھو، نعمان...... ارک جاؤ۔“ وہ پھر کھگیا کر بولا مگر میں نے اس کی بات ایک بار پھر سنی ان سنی کرتے ہوئے۔ ثمیر کی ران تک برہنہ ٹانگ کو پکڑ کر کھینچا اور مڈی پر رکھ دی۔ ثمیر چلا کر بولا۔

”رر...... رکو...... دد...... دیکھو، تت...... تم یہ سب کرنا چاہتے ہو تو خدا کے لیے مجھے پہلے بے ہوش کر دو کوئی ٹیکا لگا دو بے ہوشی کا۔“ اس کے لہجے اور آواز سے اب انتہا درجے کی بے بسی اور شکست خوردگی نمایاں ہونے لگی تھی جسے سن کر شاہ میر بھی بوکھلا کر رہ گیا، وہ تو اب باقاعدہ رو پڑا اور اسی رندھی ہوئی آواز میں دوبارہ میری منتیں سماجتیں کرنے لگا۔

”نعمان...... ! مت کرو یہ سب میرے بیٹے کے ساتھ...... میں ایک باپ ہوں، یہ میرا لخت جگر ہے۔“

”میرا چھوٹا بھائی فہیم بھی میرا لخت جگر ہی تھا شاہ میر!“ میں بھی جنونی انداز میں چلایا۔ ”یہ لو اب...... چلانے لگا ہوں بغدا۔“

کہتے ہوئے میں اکڑوں بیٹھا اور اپنا بغدے والا ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ ثمیر اپنے حواس کھونے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کھلے ہوئے منہ میں چیخ رواں تھی۔ وہ اپنی ٹانگ میری گرفت سے چھڑانے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا لیکن میں نے مضبوطی سے اس کی ٹانگ ایک ہاتھ سے دبوچ رکھی تھی۔ جمی اور کالیا نے بھی اسے دبوچ رکھا تھا۔ میرا اٹھا ہوا بغدے والا ہاتھ وہ دیکھ رہا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ پیچھے آرہا۔ ثمیر نے اس کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں نے اپنے ہونٹ اور دانت بیک وقت بھینچ کر پوری قوت سے بغدے کا وار کیا اور اگلے ہی لمحے اسٹور کے محدود کراہتے ہوئے ماحول میں بغدے کی کسی ٹھوس شے سے ٹکرانے کی گونج دار سی دھمک سنائی دی۔ ثمیر کے حلق سے لرزہ خیز چیخ برآمد ہوگئی لیکن ...... پھر اگلے ہی لمحے یکلخت سناٹا طاری ہو گیا۔ سب کو جیسے لمحوں میں سانپ سونگھ گیا۔ سیل فون پر بھی خاموشی طاری ہو گئی تھی مگر دوسری طرف سے اس کے وائیڈ اسپیکر پر ہلکی ہلکی سرسراہٹ ابھرتی سنائی دیتی تھی۔

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ دایاں ہاتھ بغدے کے دستے پر جما ہوا تھا اور بغدے کا چوڑا چمکتا ہوا پھل لکڑی کی مڈی پر دھنسا ہوا تھا جبکہ ثمیر کی ٹانگ مڈی کے کنارے پر تھی۔ وہ سلامت تھی۔ میں چند ثانیے اسی طرح اپنا سر جھکائے لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا اس کے بعد بغدے کو مڈی میں پیوستہ چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا اور قریب پڑی ڈریسنگ کے سامانوں والی شاپر کو لات رسید کرتا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا اور دوسرے کمرے میں آکر میں ایک کرسی پر اپنا سر جھکائے بیٹھ گیا۔

میرے حلق سے سسکیوں کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا۔ پورے وجود پر جذبات انگیزی کی طاری تھی۔ میرے تصور میں وہ دردناک منظر گھومنے لگا جب اس درندہ صفت آدمی شاہ میر نے میرے بھائی کے ساتھ یہی سب کیا ہوگا۔

معاً کسی نے آہستگی سے میرے جھکے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے سر اٹھا کے دیکھا وہ کالیا تھا۔

”میں جانتا تھا جگری! بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ تو اپنی فطرت میں ایسا ہے ہی نہیں۔“

”کک...... کالیا!“ میری آواز جذبات تلے لڑکھڑا گئی۔ ”یار! لوگ کس طرح ایسی سفاکانہ درندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟“

”اس لیے کہ وہ اپنی فطرت اور خو میں درندے ہوتے ہیں۔ سفاک اور خونی درندے! انہیں ایسے کھیل میں مزہ آتا ہے وہ اپنی جبلت میں شیطان ہوتے ہیں مگر تو ایسا نہیں ہے، تو انسان ہے ایک سچا انسان۔“ کالیا بولا۔ میں نے دیکھا اس

کی آنکھیں بھی نمناک سی ہو رہی تھیں اور آواز و لہجے میں لرزش۔

میں بے اختیار اس کے گلے لگ کر رو دیا۔

"کالیا! میرے یار! میرے معصوم بھائی نے بھی اسی طرح شاہ میر کے آگے رحم کی منتیں کی ہوں گی، وہ بھی تو بے چارہ اسی تکلیف اور جاں گسل عذاب سے گزرا ہوگا، اس نے بھی تو شاہ میر کے آگے بھیک مانگی ہوگی۔ اس وقت کیا حال ہوا ہوگا غریب کا جب اس کی ٹانگوں پر اس درندہ صفت شاہ میر نے گلوٹین کا بلیڈ گرایا ہوگا...... آہ...... کاش! میں بھی یہ سب ثمیر کے ساتھ کر سکتا۔"

"بس کر میرے یار نومی! مت ہلکان کر اس قدر خود کو۔" وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے گلوگیر سے لہجے میں بولا۔ "دیکھ جگری! یہ دکھ اپنی جگہ مگر تیرا ضمیر تو مطمئن ہے ناں کہ تو نے کسی پر ایسا بربریت انگیز ظلم نہیں کیا۔ اختیار میں تیرے ہوتے ہوئے تو نے بدلہ نہیں لیا۔ جگری! یہ معافی جیسا عمل تو مومنوں کا ہوتا ہے۔ چل اب سنبھال لے اپنے آپ کو پھر اس جرم خنزیر کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔"

"مجھے ثمیر کا سیل فون دو۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ کالیا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ہولے سے بولا۔

"تیرے کمرے سے نکلتے ہی میں نے اس کتے سے بات کی تھی۔" اس کا اشارہ شاہ میر کی طرف تھا۔ "میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوا ہے، اس کی تسلی کے لیے ثمیر کی اس سے بات کرا دی تھی مگر وہ دونوں رزیل باپ بیٹے یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ تم پیسوں کے لالچ میں آ گئے ہو۔"

اس نے فون نکالا ہی تھا کہ شاہ میر کی کال آ گئی۔ میں نے آن کر کے کان سے لگا لیا مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ شاید میری سانسوں کے مدوجزر کی سرسراہٹیں سن کر خود ہی بول پڑا۔

"نعمان؟" دوسری جانب سے اس کی استفساریہ آواز ابھری۔

"بولو!" میں خود پر قابو پا چکا تھا اور سرد لہجے میں بولا۔

"پانچ کروڑ کی رقم کہاں پہنچا دوں تمہیں؟" اس کے لہجے میں طاقت اور دولت کا گھمنڈ دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ پیسے کی قوت سے وہ جیت چکا ہے۔ میرا پارہ پھر چڑھنے لگا مگر اسی وقت کالیا نے میرے کاندھے کو ہولے سے تھپتھپایا تھا اور پھر میں اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"یہ حرام کا پیسا اپنے پاس رکھ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے کمینے انسان! میں تیرے سے کچھ اور چاہتا ہوں۔"

دوسری جانب لمحہ بھر کو خاموشی رہی پھر اس کی سپاٹ آواز ابھری۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ کو فی الفور زندہ سلامت اس کے گھر پہنچاؤ۔" میں نے کہا۔ میری بات پر اسے یکلخت جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ظاہر ہے اسے گمان بھی نہ ہوگا کہ میں فرحانہ کے بارے میں سب جان چکا تھا۔

"ف...... فرحانہ؟" وہ انجان بن کر بولا لیکن اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ تجاہل عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"انجان مت بنو شاہ میر!" میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے مردود و لعین انسان؟ میں تو تیرے ایک ایک کرتوت سے واقف ہوں جس کی سیاہی ہر روز تو اپنے بدنما چہرے پر ملتا ہے۔ زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کر فرحانہ کو تیری کوٹھی سے دو افراد بے ہوشی کی حالت میں بوری میں بند کر کے بندرگاہ کی طرف لے کر گئے تھے۔ وہ دونوں اب تھانے میں ہیں اور کچھ سننا چاہے گا یا اب بھی جھوٹ کی گنجائش باقی ہے؟"

میرا لہجہ حد درجہ زہر خند ہونے لگا تھا۔ اسے ایک بار پھر چند ثانیوں کے لیے چپ لگ گئی تھی۔ میری زبان سے اس قدر تفصیل اور اپنے دونوں آدمیوں کا حشر کے بارے میں سن کر وہ یقینی طور پر ششدر رہ گیا تھا، کم از کم اس کی اچانک خاموشی سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا پھر اس کی آواز ابھری۔

"تم پتا نہیں کیا کہے جا رہے ہو؟ فرحانہ کو میں نے اغوا نہیں کروایا ہے اور نہ ہی ان دو آدمیوں سے میرا کوئی تعلق بھی ہے جن کی تم بات کر رہے ہو؟"

میری زبان سے اس قدر صراحت سننے کے بعد اس کے جھوٹ بولنے کی گنجائش تو بالکل نہیں رہتی تھی لیکن باوصف اس کے وہ بدستور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر تم جھوٹ بولتے رہو، میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا اور تمہارا لاڈلا بیٹا ہماری بیگار کا شکار رہے گا۔ تم نے جو کرنا ہے کر لینا تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں بھی تمہیں اچھی طرح جواب دینا جانتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا لیکن ذرا ہی دیر بعد دوبارہ بیل گنگنائی۔ دوسری جانب وہی تھا اور بدستور ایک بار پھر اسی ڈھٹائی اور جھوٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے

پیسوں کا لالچ دینے لگا تو میں سرد لہجے میں کہا۔

"اگر اب بھی تم نے وہی بکواس کی تو میں فون آف کر دوں گا۔ بولو فرحانہ کو کب گھر بھیج رہے ہو؟" میرے مسکت جواب پر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا اور بالآخر مائل بہ سچ ہوتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ فرحانہ کو میں نے ہی اغوا کرایا ہے لیکن اب اسے واپس لوٹانے میں کچھ وقت لگے گا کیونکہ وہ اب اس ملک میں نہیں رہی۔"

اس کی بات پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ فرحانہ کو انہوں نے بن رائد کے کارگو شپ پر زبردستی سوار کروا کر بیرون ملک روانہ کر دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں یہ حقیقت شاہ میر کہ فرحانہ کو تمہارے دولوں کتوں نے بن رائد جو درحقیقت تمہارا ہی دست راست ہے، کے کارگو شپ سی گوڈیز پر زبردستی سوار کرا دیا ہے۔ لہٰذا فرحانہ کو فوری طور پر کسی تیز رفتار لانچ کے ذریعے اسی وقت واپسی کا حکم جاری کرو۔ مجھے پتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ناممکن نہیں ہے۔"

"میں نے کہا ناں کہ فرحانہ کسی اور کے قبضے میں جا چکی ہے۔ اس کی واپسی میں کچھ وقت لگے گا۔ مجھے چند دنوں کی مہلت......"

"پھر وہی بکواس۔" میں پھنکارتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اسی طرح چالاکی چلتے رہے تو پھر میں وہ کر گزروں گا جسے انجام دینے کے لیے میرے سینے میں ابھی تک آگ بھڑکی ہوئی ہے۔"

"میں تمہیں اپنے بیٹے کی رہائی کے بدلے میں پیسے......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ کال ہی کاٹ دی تھی میں نے بلکہ سیل فون بھی آف کر دیا تھا۔

"کالیا! اس بات کی تصدیق اس خبیث نے بھی کر دی ہے کہ فرحانہ کو بن رائد کے شپ میں سوار کرا دیا گیا ہے۔ اب ہمیں خود بھی کچھ کرنا پڑے گا۔" میں نے کالیا سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ بولا۔

"ابے لے جگری! فرحانہ اور اس کے باپ رانا بشیر سے اب ہمارا کیا جاتا ہے؟ بھاڑ میں ڈالو اسے اور شاہ میر کے خلاف پھندا کسنے کی سوچ۔"

کالیا کی بات اپنی جگہ درست تھی لیکن کالیا ان باتوں کی گہرائی میں پوشیدہ ایک گمبھیر سازش کو سمجھنے سے قاصر تھا جو میرے دماغ میں آئی تھی۔ یہی نہیں میں اب تک پیش آمدہ حالات کی کشاکشی سے یہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ شاہ میر کا فرحانہ کو اغوا کروانے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا۔

لہٰذا جب میں نے اسے یہ بات بتائی کہ شاہ میر اس طرح فرحانہ کے باپ کو بلیک میل کر کے رانا بشیر سے وہ سب غیر قانونی کام کروا سکتا ہے جس کے لیے رانا بشیر نے اسے انکار کر رکھا ہے اور ان دونوں کے بیچ اسی دیرینہ تنازعے کی وجہ سے میرے بے گناہ باپ کو قربانی کا بکرا بنا کر پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا تو کالیا دنگ رہ گیا۔

"ابے لے جگری! میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا حالانکہ بہت سی باتوں سے میں بھی واقف ہوں۔" وہ چونک کر بولا۔ "اس کا اب ایک ہی حل ہے۔ رانا بشیر سے اس سلسلے میں ملا جائے۔ دیکھیں اس کی کیا مرضی ہے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ شاہ میر نے اسے فون کر کے اب تک اپنے کام کے لیے اسے راضی کر لیا ہوگا۔"

"ہوم!" میرے حلق سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔ "میرا خیال ہے مجھے پہلے فون پر رانا بشیر..." ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرے اپنے سیل فون پر بیل گنگنا اٹھی۔ میں نے قدرے چونک کر اپنا فون نکالا اور اسکرین پر دیکھ کر چونک گیا کہ یہ رانا بشیر ہی کی کال تھی۔

"ہیلو!" میں نے کہا تو دوسری جانب سے رانا بشیر کی بدحواس سی آواز ابھری۔

"نومی بیٹے! کہاں ہو تم؟ جلدی سے میرے پاس آ جاؤ۔ خدا کے لیے انکار مت کرنا...... ہم...... تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"آپ گھر پر ہی ہیں اس وقت؟" میں نے غیر تاثر لہجے میں پوچھا۔ میں اس کی پریشانی اور تشویش کی وجہ جانتا تھا۔ اسے شاید اب تک اپنی بیٹی کے غائب یا اغوا کا پتا چل چکا تھا بلکہ کوئی بعید نہیں کہ شاہ میر نے اپنے دیرینہ مطالبے کے سلسلے میں اسے ایک عدد خود بھی اب تک فون کھڑکا دیا ہوگا اور رانا بشیر سے چوں کہ میری پہلے سے ہی شاہ میر اور اس کے بیٹے ثمیر کے حوالے سے سیر حاصل گفت و شنید ہو چکی تھی اسی لیے اب، اسے میری ہی مدد کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ تاہم اب دیکھنا یہ تھا کہ رانا بشیر اور میں مشترکہ طور پر ایک دوسرے کی کیا مدد کر سکتے تھے؟

بہرکیف میں نے جواب میں کہا۔

"ہاں...... ہاں! میں گھر پر ہی ہوں، پلیز جلدی آ جاؤ۔" وہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اور کالیا کار میں کلفٹن روانہ ہو رہے تھے۔

لگ بھگ کوئی نصف پون گھنٹے بعد ہم کلفٹن کے علاقے میں تھے۔ رانا بشیر کی کوٹھی یہاں سے چار بلاک کے بعد فورتھ اسٹریٹ پر تھی۔ دن کا وقت تھا۔ اس جیسے پوش علاقے میں رش اور لوگوں وغیرہ کی بھیڑ چال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

کار میں ہی چلا رہا تھا کہ ایک سنسان موڑ پر اسٹیئرنگ وہیل کاٹتے ہی مجھے سامنے رانا بشیر کی کوٹھی کا دروازہ نظر آ گیا جو کارنر پلاٹ پر تھا۔ یہ بنگلا نما کوٹھی تھی۔ میں نے کار کی رفتار آہستہ کر رکھی تھی اور نجانے کیا ہوا کہ دفعتاً ہی... میرے دل کو نامعلوم سی بے چینی نے جکڑ لیا یا پھر شاید یہ میری چھٹی حس کا شاخسانہ تھا کہ میرے دل میں عجیب سی کھٹک پیدا ہونے لگی، لامحالہ میں یہی سمجھا تھا کہ یہ سب بیتے ہوئے حالات کا ہی پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔

کار میں نے لے جا کر سیدھا بڑے سے گیٹ کے قریب ...... روک دی۔ ساتھ ہی میں اپنے گرد و پیش سے حد درجے چوکنا تھا۔ سامنے ماؤزر تھامے چوکیدار کو دیکھ کر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی کیونکہ وہ میرا اور میں اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھا تھا اور مجھے پہچانتے ہی بولا۔ ''صاحب! اندر آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں مگر یہ کون ہے؟ اسے تو صاحب نے نہیں بلایا تھا؟'' وہ میرے برابر والی سیٹ پر کالیا کو دیکھ کر بولا۔ غالباً وہ اس کے لیے اجنبی تھا۔

''یہ میرا دوست ہے شیراز، رانا صاحب اسے بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

میں نے جواب میں اس سے کہا تو اس نے مطمئن انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور آگے جا کر گیٹ کھول دیا۔ میں کار اندر لے آیا۔ وہاں آگے لے جا کر میں نے کار کو پورچ میں کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نیچے اتر آئے۔

یکایک جانے کیوں کوٹھی میں مجھے غیر معمولی سے سناٹے کا احساس ہوا۔ شاید اس کی وجہ.... فرحانہ کی غیر موجودگی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ ہاں! اندر کا کوئی ملازم بھی تو باہر نہیں آیا تھا ہمیں لانے کے لیے ابھی میں اسی الجھن میں تھا کہ وہ بھی رفع ہو گئی کیونکہ میں نے مرکزی دروازے سے ایک جانے پہچانے ملازم کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جلدی میں آ رہا تھا اور خاصا ادھیڑ عمر کا تھا، یہ بھی میرا شناسا ہی تھا۔

''سب کچھ ٹھیک تھا تو پھر.... میرے دل کو بے چینی نے کیوں گھیرے رکھا تھا؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔ کالیا شاید میری اس کیفیت کو کب سے نوٹ کیے ہوئے تھا قدرے مسکرا کر دبی سی آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے جگری؟ تو کچھ بے چین سا لگ رہا ہے؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بس ذرا شاید موجودہ صورت حال کا شاخسانہ ہے، اس نے مجھے نروس سا کر رکھا ہے۔''

''ابے لے جگری! تو بھی نروس ہوتا ہے؟'' وہ ہنسا۔ ملازم تب تک ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ کسی دباؤ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''آیئے جناب! اندر تشریف لے چلیں، صاحب آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور ایک نظر کالیا پر ڈالتے ہوئے کچھ پوچھنا چاہا تھا کہ میں نے اسے بھی کالیا سے متعلق وہی کچھ بتایا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں باہر گیٹ پر چوکیدار کو بتلا چکا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟'' میں نے دانستہ آہستہ روی سے دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ جیسے چونک کر بولا۔

''نن...... نہیں تو جناب! وہ بس صاحب اندر کچھ پریشان سے ہیں۔'' میں سمجھتا تھا کہ ان سب کو فرحانہ کی پریشانی ہی ہو سکتی تھی۔

ہم اندر آ گئے۔ ملازم نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم مختصر سی مگر چوڑی راہداری پر چلتے ہوئے مذکورہ کمرے کی طرف بڑھے۔ کالیا میرے عقب میں تھا اور وہ ملازم مجھ سے چند قدم آگے چل رہا تھا۔ مجھے اس کی چال میں بھی کچھ عجیب سا ڈولتا پن محسوس ہوا تھا کہ .... اچانک جانے کیوں میرا دل کسی نامعلوم خدشے سے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ عقب میں مجھے معاً ہی کالیا کی ہلکی سی مگر بے ساختہ آواز سنائی دی۔

''ابے لے۔''

میں رک گیا اور جیسے ہی گردن گھما کر دیکھا تو مجھے اپنی بے نام سی بے چینی اور کھٹک کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہوا نظر آ گیا۔

دو گیم تیم کرخت صورت افراد کو میں نے عقب میں دیکھا۔ ان میں سے ایک نے پیچھے سے کالیا کی گدی کو اپنے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا اور اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال کو کالیا کی پشت سے لگا رکھا ہو جبکہ دوسرا میری جانب بڑھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں... پستول تھا جس کی نال میرے سینے

موسم بہار کے گلکوں سلسلوں سے سجا ماہ مارچ 2018ء کا دل خوش کن شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط وار ناول اہم دوراہے پر

محبت لفظ ہے لیکن...... حیا بخاری کی خوب صورت تحریر

عطیہ ہدایت اللہ، عقیلہ حق، اسما قادری کی خصوصی دلکش کہانیاں

نامور مصنفہ، شاعرہ اور

براڈکاسٹر غزالہ رشید کی بزم

میں دل پزیر آمد

خوب صورت موڑ آصفہ ضیا کا مکمل ناول

اس کے علاوہ

افسر سلطانہ، عاصمہ عزیز، طیبہ عنصر، تہمینہ چودھری، تحسین اختر، دانیہ آفرین، بنتِ سحر و دیگر ماہر قلم کاروں کی متاثر کن تحریریں

شائستہ زریں کا خصوصی سروے ماہِ مارچ میں یومِ خواتین کے موقع پر

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگا رنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ......

کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"کوئی آواز نکالے بغیر چلتے رہو۔" آخرالذکر اسلحہ پوش نے مجھ سے تحکمانہ درشتی سے کہا اور میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

"اور...... تم بھی......" اس نے ہمارے آگے چلنے والے ملازم سے بھی یہی کہا جو پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ تاہم اس کے انداز سے صاف لگتا تھا کہ اسے پہلے سے اس صورتِ حال کا ادراک تھا۔

اگر یہاں فرحانہ والا معاملہ نہ ہوتا تو کم از کم میں کسی مغالطے میں نہیں رہتا۔ کوٹھی میں خاموشی، ملازم کا چہرہ کسی دباؤ کی زد میں اور رانا بشیر کا فون پر مجھ سے اس طرح بات کرنا جیسے ان کی سانسیں چڑھی ہوئی ہوں۔ چنانچہ بادی النظر میں یہ سب کچھ دیکھ کر محسوس کر کے یہی سمجھ میں آتا تھا کہ اس کی وجہ فرحانہ کا اغوا ہے۔

لیکن ایک بات مجھے الجھائے ہوئے تھی۔ وہ تھا چوکیدار۔ کم از کم اس کا اطمینان اور سکون کہیں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا کہ اسے "اندر" کی خطرناکی کا علم ہو۔ ہوسکتا تھا کہ انہوں نے اس نظروں میں آئے بغیر اندر نقب لگالی ہو؟ لیکن یہ میرا قیاس تھا ممکن تھا انہوں نے کوئی اور ترکیب چلی ہو۔

ہمیں اسی طرح گن پوائنٹ پر کمرے میں لایا گیا تو یہاں گویا پہلے سے ہی "کھچڑی" تیار تھی جس پر مجھے کچھ خاص حیرت نہ ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جس طرح اس بدبخت اور مردود شاہ میر کے بیدار مغز میں سمایا تھا۔ اس کی یہ چال بروقت اور خاطر خواہ رہی تھی۔

سامنے صوفے پر رانا بشیر نڈھال سے حالوں میں بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے ایک آدمی پستول تانے کھڑا تھا جبکہ ایک اور یعنی چوتھا آدمی دروازے کے قریب بیٹھا چوکس انداز میں کھڑا تھا۔ یعنی کل ملا کر سردست یہ چار ہی افراد تھے.... بعد میں کتنے مزید نمودار ہوتے تھے اس کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔

صورتِ حال مخدوش تھی۔ ہمیں گن پوائنٹ پر لینے والوں نے ہماری جامہ تلاشی لینے میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میرے پاس تو ایسی کوئی شے نہیں نکلی تھی البتہ کالیا کے پاس سے ایک عدد ٹی پسٹل اور چاقو برآمد ہوا تھا۔ ہمارے سیل فون اور پیسے تک انہوں نے رکھ لیے تھے گویا "کیسے" بالکل خالی کروا لے تھے۔

اس کے بعد ہمیں صوفوں پر دھکا دیا اور سب ہم پر گنیں تانے کھڑے ہوگئے۔ ایک آدمی جو ٹھگنے قد مگر گھٹی ہوئی جسامت کا تھا۔ وہ اپنا سیل فون نکال کر کسی سے بات کرنے لگا۔

"جی جناب! آپریشن کامیاب ہوگیا ہے، شکار ہاتھ میں ہے۔" کہنے کے بعد وہ دوسری طرف سے کچھ سنتا رہا پھر بولا۔ "جی ہاں جناب! شکار کے ساتھ اس کا ایک ساتھی بھی ہے۔ جی...... ٹھیک کہا...... او کے...... یس......" وہ کہتا رہا اور دوسری جانب اپنے کسی "باس" سے ہدایت لیتا رہا اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

"شکار" سے ان کی مراد میں ہی ہوسکتا تھا اور کیا شک تھا کہ یہ لوگ شاہ میر علی کے مسلح کارپرداز تھے۔

وہی ٹھگنے قد اور گھٹی ہوئی جسامت والا شخص جو شاید ان کا گینگ لیڈر بھی تھا مجھ سے بڑے خونخوار لہجے میں بولا۔ "ثمیر صاحب کو کہاں یرغمال بنا رکھا ہے تم لوگوں نے؟"

"کون ثمیر؟" میں یک دم انجان بن گیا۔

"ابے لے۔" اسی درمیان میں مجھے پاس بیٹھے کالیا کی مخصوص انداز میں ہلکی سی بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ ٹھگنا شخص کالیا کی طرف گھور کر بولا۔

"کک...... کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔" کالیا نے خوف زدہ نظر آنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کسی دیسی ساختہ ڈرامے کا گھسا پٹا مکالمہ دہرا دیا۔

"زیادہ چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر نعمان! ثمیر کا پتا بتاؤ۔ ورنہ......" اس نے تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پھر حیرت زدہ سا ہو کر بولا۔

"نعمان......؟ کون نعمان......؟ ہم تو سیٹھ صاحب کے پاس اپنا بل لینے آئے تھے اور سندھ کمپنی سے آئے ہیں۔ ان صاحب کے دفتر میں ہم نے کمپیوٹرز سپلائی کیے تھے۔"

میرے ذہن میں فوری طور پر مہلت حاصل کرنے کی غرض سے جو بہانہ آیا وہ میں نے گھڑ ڈالا تھا۔

"کیوں بے...... سالے دھوراجی کی اولاد! بولتا کیوں نہیں کہ ہم سیلز مین ہیں۔" میں نے آخر میں دانستہ پاس بیٹھے کالیا کو مصنوعی غصے سے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ بھی بدستور احمقوں کی طرح خوف زدہ ہونے کی اداکاری دکھاتے ہوئے ان سے بولا۔

"بھھ...... بھائیوں! آپ اگر یہاں ڈکیتی کی واردات کرنے آئے ہو تو بے شک کرو ہمارا اس سیٹھ سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ہم تو معمولی سے سیلز مین ہیں۔"

"معمولی سے سیلز مین اپنے پاس پستول نہیں رکھا کرتے ہیں۔" گٹھے ہوئے جسم والا کالیا کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے طنز سے بولا۔ اس کی گردن پر بھی چربی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔

"بھھ...... بھائی! یہ میرا نہیں ہے، کمپنی والوں نے ہمیں دیا ہے، ریکوری کے لیے نکلتے ہیں ناں...... اکثر ہماری جیب میں نیٹ کیش بھی ہوتا ہے۔ اس کا لائسنس ہے میرے پاس جو کمپنی کے نام سے ہے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" ٹھگنا آدمی جھلا کر چلایا۔ کچھ لگتا تو تھا کہ وہ ہماری چال میں آنے لگا ہے مگر رانا بشیر کے فون والی بات سے ہم مار کھا رہے تھے۔ اس نے پریشان حال سے خاموش بیٹھے رانا بشیر کو درشتی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ دونوں وہی ہیں...... ناں......؟ جنہوں نے تم سے فون پر بات کی تھی؟"

میں اور کالیا دونوں کی طرح رانا بشیر کا منہ تکنے لگے۔ اس روئے زمین پر وہی ایسا شخص تھا جو اس وقت ہماری چال کو سمجھ رہا تھا یوں میں اور کالیا دل ہی دل میں اس کے بیدار مغز ہونے کی دعائیں مانگنے لگے۔

"یہ دونوں بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ یہ اور سندھ کمپنی کے ملازمین ہیں اور اپنا بل لینے آئے ہیں۔" بالآخر رانا بشیر نے گویا ہماری مشکل کو آسان کرنا چاہا۔ آگے بولا۔

"اچھا! تو بل لینے یہ لوگ دفتر کی بجائے گھر پر آتے ہیں۔" ٹھگنے نے طنز کیا۔

"میں آج دفتر ہی کب گیا ہوں؟" رانا بشیر نے جواب ٹھونکا۔

ٹھیک اسی وقت کمرے میں بیل گونجی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ یہ انٹرکام کا بزر تھا جو باہر گیٹ پر نصب تھا اور یقیناً کوئی ملاقاتی باہر آیا تھا اور اب چوکیدار اس کے بارے میں اپنے "صاحب" یعنی رانا بشیر سے اس کی تصدیق چاہتا تھا کہ اسے اندر بھیجے یا نہیں۔

"یہ کون آیا ہے؟" معاً اسی ٹھگنے سرغنہ نے کہا۔

"کیا پتا یہ وہی ہوں جو تم لوگوں کو مطلوب ہیں؟" میری بجائے کالیا نے جھٹ سے کہا۔

"اپنی چونچ بند رکھو تم!" سرغنہ نے اس کی طرف گھور کر کہا اور کالیا احمقوں کی طرح اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی اور انگوٹھے سے اپنے دونوں ہونٹوں کو "چیچ" کر کے بیٹھ رہا۔ مجھے اس موقع پر بھی اس کی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔ ہمیں غیر

جمال احسانی (1951-1998)

کراچی کے ادبی منظر نامے میں ستر کی دہائی میں ابھرنے والے شاعر جمال احسانی جنہیں ادبی دنیا میں جمال احسانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سرگودھا میں 21 اپریل 1951 کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد جمال عثمانی اور والد کا نام ظہور حسین عثمانی تھا۔ والدین پانی پت (مشرقی پنجاب) سے ہجرت کر کے یہاں آبسے تھے۔ جمال کا بچپن سرگودھا میں گزرا۔ تاہم تلاش معاش میں وہ کراچی آئے اور کورنگی میں اپنے ماموں کے ساتھ قیام کیا۔ کرکٹ، فلموں اور شعروشاعری کا شوق تھا۔ کورنگی میں ساجد رامپوری، شفیق زیدی، سلیم کوثر اور انور جاوید ہاشمی کے ہمراہ مشاعروں میں شرکت کی۔ حیدرآباد میں بڑی ہمشیرہ کو والدہ نے بلایا تو جمال بھی وہاں چلے گئے لیکن کراچی کی کشش دوبارہ انہیں یہاں لے آئی۔ محکمہ اطلاعات سندھ کے ماہنامہ "اظہار" میں شہناز نور، صابر ظفر، فاطمہ حسن اور مقصود حمیدی کے ساتھ جمال احسانی کا نام بھی مجلس ادارت میں شامل ہوگیا۔ طبیعت میں ہلچل اور آگے بڑھنے کی خواہش میں بڑے لوگوں سے تعلقات استوار کرنے کا ہنر جمال احسانی کو آتا تھا۔ کورنگی سے نکل کر وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعلقہ اہل قلم شعراء سلیم احمد، قمر جمیل، احمد ہمدانی، عبیداللہ علیم، افتخار عارف کو ہائے ہیلو کہتے مشتاق احمد یوسفی تک پہنچے۔ اسد محمد خان، جون ایلیا اور علیم کی دوستی لندن تک گئی۔ جہاں ساقی فاروقی کے مہمان رہے اور اپنے دوسرے مجموعے "رات کے جاگے ہوئے" پر نہ صرف مضمون لکھوائے بلکہ کراچی میں تقریب کے لیے ساقی فاروقی کو شرکت پر بھی آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پہلا مجموعہ "ستارۂ سفر" لاہور اور پھر کراچی سے شائع کرایا۔ پس مرگ، تارے کو مہتاب کیا، اسلام آباد سے فاطمہ حسن کی کوششوں سے شائع ہوا۔ 10 فروری 1998 کو کثرت شراب نوشی کے باعث وفات ہوئی۔ گلستان جوہر کراچی کے قبرستان میں سپردخاک کیے گئے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد

سنجیدہ سا پاکر سرغنہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اب ان کے انداز و اطوار سے "چوکس پن" عنقا محسوس ہونے لگا تھا۔

"اٹھو! آگے بڑھ کر انٹرکام کی کال اٹینڈ کرو۔" سرغنہ نے درشتی کے ساتھ رانا بشیر سے تحکمانہ کہا۔ "خبردار! جو کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو بہت بھیانک انجام سے دوچار کردیے جاؤ گے۔"

رانا بشیر کسمساتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور... لکاسی کے اس دروازے کی طرف بڑھا جدھر قریب دیوار کے ساتھ انٹرکام کا ریسیور نصب تھا۔ جو ہرکارہ اس کے صوفے کے عقب میں اپنی گن ہاتھ میں لیے کھڑا تھا وہ محتاط انداز میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

میرے دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ آنے والے کون تھے یہ؟ میں نہیں جانتا تھا لیکن اتنا ضرور ہوگیا تھا کہ ان چاروں ہرکاروں کو یقیناً ہماری طرف سے شبہ ہونے لگا تھا کہ ہم ان کا "مطلوبہ" شکار نہیں ہوسکتے تھے لیکن ہم اس صورتِ حال سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے اور کیسے؟ اس کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

تاہم میری نظریں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے رانا بشیر کی طرف جمی ہوئی تھیں اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔

رانا بشیر دیوار تک گیا اور انٹرکام کا ریسیور اچکنے کی زحمت کیے بغیر اس نے اس کے چینل بورڈ پر نصب ایک بٹن دبا کر لگے ہوئے مائیک اینڈ اسپیکر پر پوچھا۔

"ہاں، دولت خان! کون آیا ہے؟" دولت خان شاید وہی چوکیدار تھا جو گیٹ پر ماؤزر لیے متعین تھا۔ اسے کچھ پتا ہی نہ تھا کہ اندر اس کے "صاحب" کے ساتھ کیا بیت رہی تھی۔

دوسرے لمحے اس کی آواز ابھری۔

"صاحب جی! باہر دو افراد آئے ہیں۔" انٹرکام کے اسپیکر پر دولت خان کی بات پر میں تقدیر کے اس عجیب اتفاق پر ششدر رہ گیا تھا۔ کالیا بھی بھونچکاں تھا۔ رانا بشیر کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔

"کس سے ملنا چاہتے ہیں یہ دونوں؟" مجھے لگا تھا کہ رانا بشیر کا یہ سوال طرح ڈالنے والا تھا۔ وہ کسی مہلت کے انتظار میں تھا۔ سوال غیر متعلقہ سا تھا۔ ظاہر ہے یہاں کی اقامت گاہ پر آئے ہیں تو اسی سے ہی ملنا چاہتے ہوں گے آنے والے۔

"وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" دوسری جانب سے دولت خان نے بتایا۔

"نام پوچھو...... نام......" رانا بشیر کے عقب میں کھڑے ہوئے اسی پستول بدست نے سرگوشی میں ہدایت کی۔

"بھیج دو انہیں اندر۔" رانا بشیر اس سے پہلے ہی چوکیدار کو حکم دے چکا تھا۔ ہرکارہ دانت پیس کر رہ گیا۔ تب ہی اس نے غصے سے ہونٹ بھینچ کر رانا بشیر کو پیچھے سے کالر دبوچ کر گھما کر پھیری دے ڈالی۔ رانا بشیر ادھیڑ عمر تھا۔ اس کے اعصاب اور قویٰ مضمحل ہوچکے تھے، حالات اور پریشانیاں بھی اس کی وجہ تھی۔ وہ یہ زور نہ سہہ سکا اور لڑکھڑا کر قالین پر گرتا چلا گیا۔

ہرکارے کو یہی غصہ تھا رانا پر کہ اس نے اس کی ہدایت سنے بغیر ہی چوکیدار کو جواب دے دیا تھا۔

"تم دونوں جاؤ باہر اس ملازم کو کور کرکے آنے والوں کو اندر لے آؤ۔" اسی ہرکارے نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا۔ "شاید آنے والے ہی ہمارا شکار ہوں۔"

وہ شاید سرغنہ کا نائب تھا۔ دو ساتھی ہرکارے ملازم کو کور کیے کمرے سے باہر نکل گئے۔

"اب نہیں تو کبھی نہیں۔" میرے اندر کوئی چیخا۔ تقدیر نے ہمیں اچانک ایک سنہری موقع دیا تھا۔ سرغنہ اور اس کے نائب کے انداز و اطوار سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اب ہمیں "خطرناک شکار" سمجھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ ہم سے غافل ہوگئے تھے اور اپنے آنے والے "متوقع" شکار کو چھاپنے کے لیے پُرجوش۔

میں نے کن انکھیوں سے کالیا کی طرف دیکھا تھا، بہ ظاہر ڈرا سہما کھڑا تھا مگر وہ کچھ کرنے کے لیے پر تولے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس وقت دونوں ہرکارے کمرے میں موجود نہیں تھے اور بھلا اس سے اچھا سنہری موقع ان پر قابو پانے کا اور کیا ہوسکتا تھا؟ یہ کالیا جیسا جغادری کیا میرے جیسا عام آدمی بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میرے لیے ہی نہیں بلکہ کالیا کے لیے بھی بڑا حیرت ناک ثابت ہوا تھا۔

رانا بشیر کے اندر جانے کیسا جوش یکایک ہی ابھرا تھا کہ اس نے قالین پر گرے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے بالکل پاس ہی کھڑے نائب ہرکارے کی ٹانگوں پر اپنے کاندھے سے زوردار ٹھوکر رسید کرڈالی۔ یقیناً اس میں وہ غصہ جو اسے رسوا کر گرنے پر اور اپنی بیٹی کے اغوا کے غم کی وجہ سے کافی دیر سے ان کے اندر پل رہا تھا اسی لیے وہ طیش میں آگیا تھا۔

ٹھوکر نائب ہرکارے کے لیے ہی غیر متوقع تھی، اسی لیے وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا۔ سرغنہ کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا فاصلہ ہم سے بمشکل چند قدموں کا تھا۔ سرغنہ

چونکا، کالیا اپنی جگہ سے اچھلا اور جب تک ٹھگنے سرغنہ کو سنبھلنے کا موقع ملتا کالیا اس پر جا پڑا تھا۔

متوقع کشاکشی کے ان سنسنی خیز لمحات کے لیے میں بھی خود کو تیار کیے بیٹھا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی کالیا نے حرکت کی میں اپنے شکار کو پہلے ہی نظروں میں لیے ہوئے تھا جس تک میری قدرے رسائی بھی تھی، کیونکہ رانا بشیر کی غیر متوقع ٹھوکر نے اس کا توازن بگاڑ ڈالا تھا اور وہ لڑکھڑا کر اسی صوفے پر آن پڑا تھا جس کے پاس ہی میں موجود تھا۔ اس کے صوفے پر لڑھکتے ہی پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے تو نہیں گرا تھا البتہ صوفے کے کشن پر جا پڑا تھا۔ جب تک وہ سنبھلتا، میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے مار کھاتا تھا مگر ڈیل ڈول اس کا مجھ سے نسبتاً بھاری تھا لیکن میرے جوش جذبے کے سامنے وہ کچھ نہیں تھا۔

اس پر پڑتے ہی میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پر جڑ دیا تھا۔ اس کے حلق سے کراہتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔ وہ چند ثانیوں کے لیے جھنجلا گیا تھا۔ میں نے مکا رسید کرتے ہی اسے زور سے دھکا بھی دے ڈالا تھا اور بہ سرعت پلٹ کر میں نے صوفے سے اس کا گرا ہوا پستول جھپٹ لیا تھا، وہ تب تک فوری طور پر سنبھل کر میری جانب کو لپکا تھا مگر میں نے دوسرے ہی لمحے پستول اس کی طرف تان لیا اور بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

"خبردار! ایک قدم بھی آگے مت بڑھانا۔" وہ وہیں رک گیا۔

ادھر کالیا سرغنہ کے ساتھ نبرد آزما تھا مگر میری آواز سنتے ہی وہ دونوں ٹھٹکے تھے۔ کالیا اسے پستول سے تو محروم کرچکا تھا مگر وہ مجھے ان دونوں میں سے کسی کے ہاتھ میں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ان کی لڑائی میں جانے کہاں جا پڑا تھا۔ اس کا ملنا ضروری تھا لیکن یہ وقت اس کی تلاش کا بہرحال نہ تھا۔

دونوں ہرکاروں کو اپنے پستول کی زد میں لیتے ہی میں نے کالیا سے کہا کہ وہ سرغنہ کا پستول تلاش کرے۔ یہ کام اس نے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے نمٹایا تھا۔

شاہ میر کے دیسی ساختہ یہ ہرکارے یقیناً کرائے کے حاصل کردہ ہوسکتے تھے، البتہ پروفیشنل ضرور نظر آتے تھے۔ شاہ میر جیسے ڈان کے لیے دنیا کے کسی بھی خطے میں ایسے کرائے کے "ہائر" کرنا کیا مشکل تھا۔

ابھی ان کے دو ساتھی باہر تھے اور نہ جانے ان کے ساتھ آنے والے وہ دو افراد کون تھے جنہیں ظاہر ہے یہاں لا کر تختۂ مشق بننا تھا؟ تاہم باقی دو ہرکاروں پر قابو پانا ضروری تھا جبکہ ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ یہاں موجود ان دونوں مغلوب ہرکاروں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بے بس کیا جاتا۔ یہ مشکل رانا بشیر نے حل کردی۔ اس نے بتایا کہ اس کمرے کے ساتھ ہی ایک کمرا اور ہے ان دونوں کو وہاں مقید کیا جاسکتا ہے۔

میں اور کالیا مسلح تھے۔ دونوں ہرکاروں کی جرأت نہ ہوسکی کہ وہ ہماری حکم عدولی کرتے۔ کالیا نے ایک کام اور نمٹایا تھا۔ ان دونوں ہرکاروں کو نہ صرف مذکورہ کمرے میں بلکہ اس کے باتھ روم میں بند کردیا۔ ہم جب تک اس کام سے فارغ ہوکر نکلے تو وہ دونوں ہرکارے، رانا بشیر کے یتیم صورت ملازم اور دو اجنبی افراد کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ میں اور کالیا ان سے نمٹنے کے لیے اپنی پوزیشنیں پہلے ہی سنبھال چکے تھے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی ہم نے اچانک عقب سے نکل کر ان کی کنپٹیوں پر پستولوں کی نالیں رکھ دیں۔ ان دونوں کو یکلخت سانپ سونگھ گیا۔ کالیا نے ایک کے ہاتھ سے پستول اچک لیا جبکہ میں نے اپنے شکار سے پستول چھینا تو اس بدبخت نے نجانے میری کون سی غلطی سے فائدہ اٹھالیا اور پستول میری طرف بڑھانے کے انداز میں اس نے اسی ہاتھ کی ضرب میرے پستول والے ہاتھ پر رسید کردی۔ مجھے بوکھلانے کا بھی وقت نہ ملا تھا کہ اس نے میرے پیٹ پر گھونسا رسید کردیا۔

اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور میرا مدمقابل چیخ مار کر گرا، تاہم اس نے گرتے ہی اپنے پستول سے کالیا پر گولی چلادی مگر کالیا پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کے مدمقابل نے اپنے ساتھی کی قربانی ضائع جاتے دیکھ کر حرکت کی اور کالیا پر لات رسید کردی، جو اس کے سینے پر پڑی۔ کالیا ابھی اسے اپنے پستول کی گولی کا نشانہ بنانا چاہتا ہی تھا کہ وہ اس کی لات کھا کر پرے جا گرا۔

میرے ہاتھ سے نکلا ہوا پستول مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر قالین پر گرا پڑا تھا۔ میں اسے اٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ کالیا کی گولی کا شکار ہرکارہ جو میرا مدمقابل تھا، جسے کالیا کی گولی شاید پہلو میں کہیں لگی تھی اور وہ قالین پر گرا تھا، نے لیٹے لیٹے میری ٹانگ میں اڑنگا لگا دیا، میں اس سے الجھ کر منہ کے بل گرا۔ ان کے ساتھ آنے والے دو افراد شاید رانا بشیر کے کوئی ملاقاتی تھے، دونوں ہی درمیانی عمر کے تھے۔ یہ صورتِ حال ان کے لیے غیر متوقع ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی تھی اور وہ ایک کونے میں جادبکے تھے۔

ادھر کالیا کے مدمقابل نے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے

دروازے کی طرف دوڑ لگائی تھی کہ اس کی راہ میں رانا بشیر آ گیا۔ وہ اس عمر میں بھی خاصا جوشیلا نظر آنے لگا تھا۔ معاملہ اس میں بیٹی کا بھی تھا، انہوں نے شاید بتا دیا تھا کہ ان کی بیٹی انہی کے قبضے میں ہے۔ یوں بھی وہ مجرم تھے۔

وہ اس کے راستے پر آیا تو اس ہرکارے نے انہیں دھکا دینا چاہا مگر رانا بشیر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ ہرکارے نے تھوڑی ہی سی کوشش سے رانا بشیر کو پرے دھکیل دیا مگر تب تک کالیا کو موقع مل چکا تھا اور اس نے وہیں سے ہی اس آدمی پر جست لگائی تھی جبکہ ادھر میں نے منہ کے بل گرتے ہی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ٹھیک اسی وقت دوسری گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ مجھے اپنی بائیں کنپٹی کے بالکل قریب ہی گولی کی آتشیں جھپک محسوس ہوئی۔ اسی بدبخت زخمی ہرکارے نے اپنا پستول اچک کر مجھ پر گولی چلا دی تھی مگر اتنے قریب سے اس کا نشانہ بے خطا نہیں جا سکتا تھا۔ اسی بات کی حیرت تھی مجھے مگر جلد ہی عقدہ کھلا کہ ایسے میں اس ادھیڑ عمر ملازم نے بھی جوش دکھایا تھا۔ ایسا شاید اس نے اپنے ”صاحب“ کو دیکھ کر کیا تھا۔ بچاؤ کی صورت میں ہر کوئی اپنا اپنا حصہ ڈال رہا تھا۔ ملازم نے اسے جب میرا نشانہ لیتے دیکھا تو اس نے ایک بڑا سا گلدان تپائی سے اٹھا کر اس پر دے مارا تھا۔ وہ اس کی پیشانی پر لگا تھا۔ میں اسے اور کوئی موقع دیئے بغیر ہی اس پر جھپٹا اور اس کا پستول چھین کر جوتوں سے اس کی تواضع کر ڈالی۔ اس بدبخت کی چلائی ہوئی گولی سے میں بال بال موت کے منہ میں جانے سے بچا تھا۔ اسی بات کی گھبراہٹ میری طیش جنوں میں بدل گئی تھی۔

اسے مار مار کے ادھ موا کرنے کے بعد میں کالیا کی طرف متوجہ ہوا تو یہ دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہاں دروازے پر چوکیدار دولت خان اپنا ماؤزر تانے کھڑا تھا۔ وہ گولیوں کی آواز سے اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس نے کالیا کے مدمقابل ہرکارے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

میں نے اور کالیا نے سب سے پہلے ان کا اسلحہ قابو کیا تھا۔ تب تک چوکیدار اور کالیا باقی دو ہرکاروں کو بھی ملحقہ کمرے کے باتھ روم سے کھینچ کر لے آیا تھا۔

کالیا کی مدد سے چوکیدار دولت خان اور ملازم جس کا نام لعل بخش تھا۔ ان چاروں ہرکاروں کو رسی وغیرہ کی مدد سے باندھ دیا۔ البتہ جس ہرکارے کو گولی لگی تھی۔ اس کی مرہم پٹی کالیا کو کرنا پڑی تھی۔ گولی کھال چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم خاص گہرا نہیں تھا۔ اس زخمی ہرکارے کی صرف ٹانگوں کو باندھا گیا تھا۔ وہ یوں بھی نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔

پیش آمدہ حالات کی گرما گرمی کے بعد میرے اعصاب شل ہونے لگے تھے۔ رانا بشیر اور کالیا بھی تھکے تھکے نظر آنے لگے۔ اگلے ایک گھنٹے بعد ہم ذرا فریش ہو کر صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ رانا بشیر بڑی ستائشی نظروں سے مجھے اور کالیا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاصا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ اس کی بیٹی فرحانہ کے سلسلے میں ہم ہی شاہ میر کی کھٹیا کھڑی کر سکتے ہیں۔

”تم دونوں بہت دلیر اور بہادر ہو۔“ وہ ہم دونوں کی طرف بیک وقت دیکھتے ہوئے توصیفی لہجے میں بولا۔

”شاہ میر جیسے خطرناک آدمی کے ان چاروں ہرکاروں پر اس طرح تم دونوں نے اپنی جان پر کھیل کر قابو پایا ہے، اس نے مجھے بڑا حوصلہ اور امید بخشی ہے کہ تنہا میں بھی نہیں ہوں، میرے ساتھ تمہارے جیسے بہادر ساتھی موجود ہیں لیکن مجھے اپنی بیٹی کی بے حد فکر ستا رہی ہے، وہ اس رذیل آدمی شاہ میر کے قبضے میں ہے۔“

میں نے ایک نظر کالیا پر ڈالی، اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور میں نے رانا بشیر کو ساری حقیقت بتا دی، جسے سن کر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ بے اختیار شدت غم سے اپنا سر جھکا کر رو پڑا۔

”رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا رانا صاحب!“ بالآخر میں نے کہا۔ ”ہمارا دشمن مشترکہ ہے اور ہمیں اس سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہوگا۔“ میری سنجیدہ گوئی پر رانا بشیر نے فوراً رونا بند کر دیا۔ اس کا چہرہ اب شدت غم سے ہی نہیں غصے سے بھی سرخی مائل ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے سنبھل کر بولا۔

”تم تعاون کی بات کر رہے ہو؟ شاہ میر میرا دشمن ہی نہیں میری بیوی رفعت کا بھی قاتل ہے اور اب اس بدبخت نے میری بیٹی کو بھی اغوا کر کے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ میرا دل تو شاہ میر سے انتقام لینے کے لیے سخت بے چین ہے۔ میں بھلا تم سے تعاون کیوں نہ کروں گا۔ بولو کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو کیسے پتا چلا اپنی بیٹی کے اغوا کے بارے میں؟ اور یہ چاروں ہرکارے آپ سے کیا چاہتے تھے؟“ میں نے اس کے متورم چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

”شاہ میر نے مجھے فون کر کے صرف اس قدر ہی بتایا تھا کہ میری بیٹی اس وقت اس کے قبضے میں ہے اور اگر میں نے پولیس کو مطلع کیا تو وہ زندہ نہیں رہے گی۔ میں نے پوچھا اس سے وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ... فی الحال وہ اپنے چار آدمی میری طرف روانہ کر رہا ہے۔ ان سے معاملات طے کر لو میں بعد میں دوبارہ فون کرتا ہوں۔

یہ لوگ آ گئے مگر یہاں آتے ہی انہوں نے مجھ سے بیٹی کے اغوا کے سلسلے میں کوئی بات نہ کی اور مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ میں پہلے کسی بہانے سے فون کر کے تمہیں یہاں بلاؤں اس کے بعد وہ اصل بات کریں گے۔ لہٰذا مجھے مجبوراً تمہیں فون کرنا پڑا مگر تم تو خود ہی آنا چاہ رہے تھے۔ خیر! اسی درمیان میں شاہ میر کا فون آیا تو اس نے مجھ سے یہی کہا کہ اگر میں اپنی بیٹی کو دوبارہ خیریت سے اور بہ سلامت دیکھنا چاہتا ہوں تو میں اس کا وہی پرانا مطالبہ مان لوں جس کی وجہ سے اس ظالم نے میری بیوی رفعت کا خون کیا تھا اور تمہارے باپ کو بے گناہ پھانسی چڑھا دی گئی تھی۔ میں اس سفاک انسان کی درندگی سے اچھی طرح واقف تھا اور بالآخر اس کا مطالبہ تسلیم کرنے پر میں نے حامی تو بھر لی تھی لیکن پہلے اپنی بیٹی فرحانہ کی واپسی کی شرط رکھی۔

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اسی دوران تم آ گئے۔

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا اور پھر تشویش آمیز پریشانی سے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس مردار نے میری پھول سی بیٹی کو سمندر پار پہنچا دیا ہے۔ آہ کتنا بدنصیب شوہر ہوں میں کہ ابھی تک اپنی بیوی کے قاتل کو کیفر کردار تک نہ پہنچا سکا اور اب میری پیاری اکلوتی بیٹی فرحانہ بھی اس درندے کی خونی چنگل میں جا چکی ہے۔ میں تو بالکل ہی ٹوٹ چکا ہوں۔ جی چاہتا ہے خودکشی کر لوں مگر میری بیٹی کا کیا بنے گا۔ نعمان! بیٹا میری مدد کرو۔ میں بوڑھا اتنے صدمات نہیں برداشت کر سکتا۔ خدا کے لیے نعمان! خدا کے لیے!“

وہ انتہائی شکست خوردگی کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آ کر میرے قدموں میں گر پڑا۔ مجھے اس پر ترس بھی آیا تھا۔ اس کی حالت اور ذہنی کرب کا بھی احساس ہوا۔

میں نے آہستگی سے اسے کاندھوں سے تھام کر کھڑا کیا اور دوبارہ اس کی جگہ پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد اپنی جگہ آ کر براجمان ہو گیا۔

”اس طرح ہمت ہارنے اور بے حوصلہ ہونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، رانا صاحب!“ میں نے دھیرے سے کہا۔ ”میں نے ہی نہیں بلکہ میرے اس جاں نثار دوست شیراز (کالیا) نے بھی پوری کوشش کی تھی کہ فرحانہ کو اس کے چنگل سے بچا لیا جائے۔ حالانکہ ہم کسی اور مقصد کے تحت شاہ میر کی رہائش پر گئے تھے مگر وہاں تمہاری بیٹی کو شمیر نے چالاکی سے بلوا کر یہ کھیل کھیلا تھا اپنے باپ کے ساتھ مل کر۔ اس روز کی ملاقات اور گفتگو کے بعد دونوں باپ بیٹا کھٹک گئے تھے کہ اب وہ فرحانہ کو زیادہ دیر بے وقوف نہیں بنا سکتے اسی لیے ان دونوں نے یہ آخری قدم اٹھا ہی لیا۔“

”میں تم دونوں کا تہہ دل سے مشکور ہوں بچو!“ وہ انتہائی رقیق اور پُرشفقت لہجے میں ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں ہمارے لیے تشکر کے جذبات ہلکورے لے رہے تھے۔

”تم دونوں کو میں ہر طرح کی مکمل سپورٹ دوں گا۔ جتنا روپیا درکار ہو میں پانی کی طرح بہا دوں گا، بس اس شیطان کے قبضے سے میری پھول سی بیٹی کو واپس دلا دو مجھے اور اس شیطان کو بھی اس کے بھیانک انجام تک پہنچنا چاہیے۔“

”فی الحال تو پیسوں کی بات رہنے دیں رانا صاحب!“ اس بار کالیا نے اس سے مخاطب ہو کے کہا۔ ”جب اس کی ضرورت پڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے شاہ میر کا فون دوبارہ آئے۔ ہمیں پہلے ان ہرکاروں کے بارے میں سوچنا ہوگا۔“

”انہیں پولیس کے حوالے ہم نہیں کر سکتے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”شاہ میر جس انداز میں ہم سے جنگ کر رہا ہے ہم بھی اسے اسی کے انداز میں ہی جواب دیتے رہیں گے تاکہ اسے بھی ہمارے پانی کا اندازہ ہو سکے۔“

”پولیس کو تو ویسے بھی انفارم کرنا خود کو لمبے چوڑے چکروں میں پھنسانے کے مترادف ہوگا۔“ کالیا نے کہا۔ ”تاہم جہاں تک ممکن ہو پولیس اور ان قانونی چکروں سے دور ہی رہا جائے۔“ پھر اس نے رانا بشیر کی طرف دیکھ کر اس سے بھی رائے چاہی۔

”آپ کا کیا خیال ہے سیٹھ صاحب؟“ وہ رانا صاحب کو سیٹھ صاحب ہی کہتا تھا۔

”خیال تو برا نہیں ہے لیکن اب کیا کیا جائے؟ کہیں ایسا تو نہیں شاہ میر طیش میں آ کر میری بیٹی کو خدانخواستہ کوئی نقصان نہ پہنچا دے؟“ اس کے لہجے میں گہری تفکیر کا عنصر غالب تھا۔

”فرحانہ اس کے چنگل میں نہیں ہے اب تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کی گرفت میں ہے۔“ میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ”اس مردود نے کرنا وہی ہے جو وہ آپ سے چاہتا ہے، یعنی جرمنی کے مال کی سپلائی وغیرہ لیکن ہمارے سلسلے میں تو اس نے یہ جوا کھیلنے کی کوشش کی تھی کہ لگے ہاتھوں تمہارے ذریعے ہم پر قابو پا سکے۔ کیونکہ اس کا بیٹا ہماری گرفت میں ہے۔“

''دو گولیوں کے چلنے کی آواز ابھری تھی۔ ممکن تھا ارد گرد قریب کے بنگلوں میں ان کی آوازیں سنی گئی ہوں۔ کہیں کوئی مددگار پولیس کو فون نہ کھڑکا دے؟ میں باہر جا کر گیٹ پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔'' اچانک چوکیدار دولت خان نے پتے کی بات کہی۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا ہے دولت خان!'' رانا بشیر اس سے بولا۔ ''ویسے اس وقت کوٹھیوں میں چند ہی مکین ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ ساری رات ہلہ گلہ مچا کر گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں۔ اِکا دُکا کسی چوکیدار یا ملازم نے آواز سنی ہو تو وہ دولت خان کو باہر آرام سے کھڑا پا کر مطمئن ہو جائیں گے۔ یوں بھی یہاں کوئی کسی پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرتا نہ ہی ان کے پاس ٹائم ہوتا ہے۔''

دولت خان اپنا ماؤزر تھامے باہر نکل گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ہم سب چونک پڑے۔ رانا بشیر نے ملازم لعل بخش کو کارڈلیس لانے کا کہا۔ وہ جلدی سے لے آیا اور صوفے پر بیٹھے ہوئے رانا بشیر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس دوران میں نے رانا سے کہا کہ اگر شاہ میر کی کال ہے تو اسپیکر وائیڈ کر دے تاکہ ہم بھی اس کی گفتگو براہ راست سن سکیں، میرا تو یہی خیال تھا کہ اس نے اپنے کسی ہرکارے سے بات کرنے کی کوشش چاہی ہوگی مگر رابطہ نہ ہونے کی صورت میں اس نے دوبارہ یہاں فون کھڑکا دیا تھا۔ بعد میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا۔

''ہیلو۔''

''تمہارے ہاں موجود میرا کوئی آدمی فون نہیں ریسیو کر رہا ہے، کیا وہ نرغے میں آ گئے ہیں تمہارے؟'' دوسری جانب سے حسب توقع شاہ میر کی غصے سے بھنائی ہوئی آواز ابھری۔

کارڈلیس کے وائیڈ اسپیکر پر اس کی گونجتی ہوئی آواز میں صرف درشتی کا ہی تاثر نہ تھا بلکہ اس کی تہہ میں چھپی ہوئی بوکھلاہٹ آمیز پریشانی کا بھی عنصر غالب تھا، جسے محسوس کر کے میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

''تمہارے آدمی پرلے درجے کے نکمے اور اناڑی ثابت ہوئے ہیں۔'' رانا بشیر نے ویسا ہی کہا جیسا کالیا نے اسے ہدایات دی تھیں۔ ''انہوں نے مجھ کمزور بڈھے پر تو آسانی سے قابو پا لیا تھا مگر وہ ان دونوں چھوکروں کے سامنے بالکل بے بس ہو گئے، کم از کم کچھ زیادہ پیسے خرچ کر کے ذرا تگڑے کتے تو خرید لیتے شاہ میر!''

رانا بشیر کے جواب پر یکلخت دوسری جانب خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر لمحہ بھر بعد ہی اس کی بھیڑیے جیسی غراہٹ ابھری۔

''ہوم م...... تو یہ بات ہے۔ بہت یقینی بات ہے کہ تمہارا اور نوی کا آپس میں گٹھ جوڑ ہو چکا ہے اس لیے تم میرے ساتھ اس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ ایک بات یاد رکھنا رانا! تمہاری حسین اور جوان کنواری بیٹی میری قید میں ہے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکے بازی کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''اپنی بکواس بند کرو!'' رانا بشیر طیش کے عالم میں چلا کر بولا۔ ''اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اپنی غلطی تسلیم کر لو تو کام کی بات ہو سکے لیکن ایک بات بتا دوں شاہ میر! اگر میری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے تو تمہارا جوان گبرو بیٹا بھی کسی کی گرفت میں ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ نعمان اور مجھے تم نے خود ہی ایک کشتی کا سوار بنا دیا ہے۔ اس میں بھلا شک کی کیا بات ہے مگر یہ بات غلط ہے، میں تم سے اپنی بیٹی کے بدلے میں واقعی معاملے کی بات کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت کو تسلیم کرو اور پہاڑ کے نیچے آ کر برابری کی سطح کی بات کرو۔''

''تو اپنی اوقات بھول رہا ہے بڈھے!'' شاہ میر کی غصے سے لرزتی آواز ابھری۔ ''اس دو ٹکے کے چھوکرے نعمان کی میرے سامنے کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اپنے بیٹے کو میں ان کے قبضے سے چھڑا ہی لوں گا۔ تم سے معاملے کی بات بعد میں کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے رانا سے کہا کہ فون کے سی ایل آئی پر نمبر دیکھے۔ پتا چلا وہ بیرون ملک سے ہی کال تھی۔ کوڈ امارت کی کسی ریاست کا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ دبئی سے بھی کہیں اور نکل گیا تھا۔

شاہ میر کے اس طرح خفا ہو جانے سے رانا بشیر پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رانا صاحب! شاہ میر گیدڑ بھبکیاں دے رہا ہے۔ وہ سخت جھلایا ہوا ہے۔ ایک طرف اس کی چال کامیاب گئی تو دوسری جانب وہ ہم سے مات کھا رہا ہے۔ صبر کرو ذرا، اس کے پاس تم سے معاملے کی بات کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔''

''لیکن تم جانتے ہو نوی کہ وہ کون سے معاملے کی بات کر رہا ہے۔ میرے لیے تو اس کا وہ مطالبہ ماننا بھی دو بھر ہے۔'' رانا بشیر پریشانی سے بولا۔

''وہ بعد کی بات ہے ہم وہ سنبھال لیں گے۔ اس کے لیے بھی ہم نے ایک ایسی چال سوچ رکھی ہے کہ شاہ میر کے کالا سونے والے میگا پروجیکٹ کی عمارت گر جائے گی بلکہ دیوالیہ بھی ہو جائے گا لیکن یہ سب بہت صبر و...... استقامت اور نہایت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔''

میری بات پر رانا بشیر کی کچھ تسلی ہوئی۔ پھر بولا۔ ''اب

کے ان چار کتوں کا کیا کریں؟'' اس کا اشارہ ہرکاروں کی طرف تھا۔

''اس کا بندوبست کرتے ہیں۔'' کہتے ہوئے میں نے کالیا سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ انسپکٹر کامران سے اس سلسلے میں بات کی جائے کیونکہ اسے ان سارے معاملات کا علم تھا۔

''ایڈووکیٹ زنیرہ سے کیوں نہیں مشورہ کر لیتے؟'' کالیا نے کہا۔

''نہیں یار!'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے وہ مجھ سے ایک ہی بات کرے گی کہ انہیں فوراً متعلقہ تھانے کی پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور خود ہم بھی تھانے پہنچ جائیں۔''

''ہمم!'' کالیا نے پُرسوچ ہنکاری خارج کی تھی۔ پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے اپنے کامران صاحب سے بات کر کے دیکھ لو۔ ان ہرکاروں کو آزاد چھوڑنا مناسب نہ ہوگا۔ آج کل اپنے اڈے کے بھی حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں ورنہ انہیں کچھ روز کے لیے وہیں مہمان بنا ڈالتے۔''

میں نے اسی وقت انسپکٹر کامران سے فون پر رابطہ کیا اور اسے تفصیل سے ساری بات بتا دی۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ ایڈووکیٹ زنیرہ نے میرا کیس اسے ہی سونپ رکھا تھا۔ لہٰذا اس نے مجھ سے کہا کہ اصولی اور قانونی طور پر موجودہ کیس متعلقہ تھانے میں ہی رانا بشیر کی مدعیت میں درج ہوگا۔ بعد میں اسے پرانے کیس کا سلسلہ قرار دیتے ہوئے میں متعلقہ تھانے کے انچارج کو تحریری طور پر درخواست کروں گا کہ وہ اسے میرے پاس منتقل کر دے۔ یوں بھی اب تک ایسا ہی ہو رہا تھا۔

میں نے اس کی بات پر صاد کیا تو وہ آخر میں بولا کہ مجھے زنیرہ کے علم میں بھی یہ بات لانی چاہیے... کیونکہ اس نے ہی میرے باپ کی بے گناہ پھانسی اور رفعت خانم مرڈر کیس کے مجرموں کو تلاش کا کیس دائر کر رکھا ہے وغیرہ۔

میں نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے زنیرہ سے رابطہ کیا تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ ہو تو وہ اسے ہینڈل کر سکے۔ چنانچہ اس نے بھی کم و بیش وہی باتیں کیں جو انسپکٹر کامران نے مجھے بتائی تھیں۔

رانا بشیر نے ہمارے ایماء پر اسی وقت متعلقہ تھانے کی... پولیس بلوالی۔

ایک موبائل گاڑی پر درمیانی عمر کا ایس آئی جمال ریاض اپنے پانچ ماتحت ساتھی اہلکاروں کے ساتھ وہاں پہنچا اور ضابطے کی کارروائی نمٹاتا رہا۔ اسی دوران میں نے اس کی انسپکٹر کامران سے بھی بات کروا دی اور تھوڑی دیر میں زنیرہ بھی وہیں آ گئی۔

یہ سب کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اور کالیا کو پولیس کی روایتی تفتیش کے لمبے چوڑے چکروں میں نہیں پڑنا پڑا جبکہ ہرکاروں نے وہی بیان دیا کہ جس کی ہمیں توقع تھی کہ وہ شاہ میر کو نہیں جانتے تھے اور وہ تو محض رانا بشیر سے کاروباری گفتگو کرنے آئے تھے کہ کسی بات پر ناراض ہو کے انہوں نے اپنے دو ''بدمعاش'' یعنی مجھے اور کالیا کو بلوا لیا۔ وغیرہ۔

اس سارے چکروں میں کم و بیش تین گھنٹے لگ گئے۔ ہمیں بھی تھانے جانا پڑا تھا۔

اسی وقت کالیا کو استاد بھابھا کا فون آ گیا اور اسے اڈے جانا پڑ گیا جبکہ میں نے گھر کی راہ لی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔

شام کو جاگا تو فوزیہ کی کال آئی ہوئی تھی۔ میرے دل نے جیسے نازک سے انداز میں دستک دی اور فوراً ہی میں نے اسے کال بیک کر ڈالی۔

''کیسے ہو نوی! خیریت تو ہے ناں؟ آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' وہ پریشانی سے بولی۔ مجھے فوزیہ کی یہ عادت بے حد اچھی لگتی تھی کہ وہ مجھ سے کسی قسم کا کوئی گلا شکوہ نہیں کرتی تھی۔ چاہے پیار میں ہی سہی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میں اپنی کس اہم نوعیت کی ذاتی جنگ میں مصروف کار ہوں۔ وہ بے چاری میری کامیابی کی دعائیں ہی مانگا کرتی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسی ہو؟'' میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''میں نے اسے بتا دیا کہ میں سو رہا تھا اسی لیے اس کی کال ریسیو نہ کر سکا۔''

''میں تو ٹھیک ہوں مگر نوی! حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟ خیریت تو ہے ناں؟'' میں نے قدرے تفکر آمیز انداز میں چونک کر پوچھا۔

''دو تین روز میں گل شیر خان اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ آ رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن میں تو ان کے آنے سے پہلے تمہارے آنے کا انتظار کیے بیٹھی تھی نوی؟''

اس کے لہجے میں مجبوری کا ارتعاش سمٹ آیا تھا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے یاد بھی دلا دیا تھا اور شکوہ بھی کر ڈالا تھا۔ یوں اس کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ میں نے لمحہ بھر کو خیال انگیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''کیا تم اس روز کی میری باتیں بھلا بیٹھے تھے؟'' مجھے تھوڑا

خاموش پاکر اس نے تفکر آمیز بے چینی سے دوبارہ کہا۔

”ہرگز نہیں فوزیہ! میں بھلا یہ باتیں کیسے بھول سکتا ہوں؟ تم نے یہ کیسے سوچ لیا بھلا؟ مجھے تو اس روز کا ایک ایک لفظ تمہارا کہا ہوا ابھی تک یاد ہے اور میں تبھی سے بے چین رہا ہوں۔“ میں نے فوراً اسے جواب دیا۔ ”اور تم بالکل پریشان مت ہونا۔“

میں نے ازراہ تسلی کہا۔ ”میں کل ہی چاچا انور شاہ اور عاصمہ کو تمہارے بابا جانی کے ہاں رشتہ لینے کے لیے پروگرام تیار کیے بیٹھا ہوں۔“

”سچ..... تت..... تم سچ کہہ رہے ہو نعمان؟“ وہ ایک دم جیسے معصوم بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

”تم میری زندگی ہو فوزیہ! اور میری زندگی کا حاصل وحصول بھی میں بھلا تم سے کوئی بات جھوٹ یا غلط کہہ سکتا ہوں...... لل...... لیکن......“ اچانک ہی آخر میں میری زبان تھوڑا لڑکھڑا گئی، وہ بے چین ہو گئی۔ اسی لہجے میں فوراً مستفسر ہوئی۔

”لیکن کیا نومی؟“

”تمہارے بابا جانی مان جائیں گے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ بات ایسی تھی کہ اس کے نفی کا ہم دونوں ہی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ذرا سی چپ کے بعد جب فوزیہ بولی تو مجھے اس کی آواز میں ہی نہیں لہجے میں بھی لڑکھڑاہٹ سی صاف محسوس ہوئی تھی۔

”نومی! اللہ کے حضور میں تمہارے اور اپنے لیے بہت دعائیں مانگتی ہوں۔ تم بھی مانگا کرو۔ دعاؤں سے بڑی بڑی پریشانیاں اور مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔ تم اللہ پر بھروسا کر کے آؤ...... اللہ بہتر کرے گا۔“

میں نے اس سے اس کے باپ کی ہاں یا نہ کے بارے میں اس کی اپنی ذاتی رائے لینا چاہی تھی تاکہ دل بے چین کو کچھ آسرا ہوتا مگر فوزیہ نے معاملہ اللہ پر چھوڑا ہوا تھا اور بے شک وہی اللہ ہی مشکل کشا اور حاجت روا تھا۔ تاہم تقدیر کی بوالعجبی اور آزمائش سے میں تھوڑا خائف سا تھا۔ بولا۔

”اس میں کیا شک ہے کہ اللہ ہی ہماری مشکل آسان کر سکتا ہے فوزیہ! میں بھی دعا کروں گا۔ ہماری محبت بے لوث ہے پاکیزہ اور معصوم بھی تم دعا کرو۔ میں عاصمہ اور چاچا انور شاہ سے بات کرتا ہوں۔“

”کیا تم بھی ان کے ساتھ آؤ گے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم بتاؤ میرا آنا مناسب ہوگا؟“

”میرا خیال ہے کہ ابھی نہیں۔“ فوزیہ نے ہولے سے جواب دیا۔

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ خیر تم فکر نہ کرو، او کے؟“ میں نے بات ختم کرنے کی نیت سے کہا۔

”او کے، خدا حافظ!“ فوزیہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن میں لاری اڈے پہنچا اور چاچا انور شاہ سے تھوڑا وقت مانگا۔

”خیر تو ہے بھائی بھتیجے! آج بڑے دنوں بعد تمہیں ہم سے بھی بات کرنے کا وقت ملا۔“ انہوں نے شفقت آمیز مسکراہٹ سے پیار بھرا طنز کیا تو میں تھوڑا خجالت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”چاچا! حالات ہی ایسے رہے کہ آپ سے دو گھڑی بیٹھ کر تفصیل سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔“

”ارے تم سنجیدہ ہو گئے بھائی بھتیجے! میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔ اچھا بتاؤ کیا بات ہے؟“

میں نے چاچا انور کو اپنے فوزیہ سے متعلق ساری بات بتا دی۔ وہ یہ سب سن کر پہلے تو چند ثانیوں کے لیے ہکا بکا سے ہو گئے پھر بولے۔

”اوہو تو یہ کہانی یہاں تک آ پہنچی ہے۔ بھائی بھتیجے! بات تو ذرا ٹیڑھی ہے لیکن تیری خواہش کے آگے تو میں دنیا سے ٹکرا جاؤں گا۔ یہ عطا محمد کیا شے ہے بھلا...... لیکن...... اگر انہیں یہ بات بری لگی تو پھر کیا کرو گے تم؟ بات تو میں کر ہی لوں گا ان سے۔“

”کیوں چاچا؟ بری کیوں لگے گی؟ عاصمہ بہن آپ کے ساتھ ہوگی اور پھر عطا محمد مجھے بھی اچھی طرح جانتا ہے بلکہ میری تو بہت عزت کرتا ہے، بہت بھروسا کرتا ہے مجھ پر!“ میں نے قدرے حیرانی سے چاچا انور شاہ کا چہرہ تکتے ہوئے کہا۔

”برخوردار رشتوں ناطوں کی بات کچھ اور ہوتی ہے۔ پھر لڑکی کے رشتے کے سلسلے میں تو بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ خیر! تم فکر نہ کرو زیادہ سے زیادہ ناراضگی کا ہی اظہار کرے گا نا پھانسی تو نہیں لگائے گا۔“

میں چاچا انور کی بات پر پریشان سا ہو گیا۔ اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

”کیوں چاچا! ایسی کیا بات ہے آخر؟ آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟ کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟“

”ہاں برخوردار! وجہ تو خاص ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولے اور میری پیشانی کی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ نجانے چاچا انور شاہ ایسا کیا کہنے والے تھے جو میرے علم میں نہ تھا؟

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(عبدالجبار رومی قصور کا جواب)

ناہید ابرار...... شجاع آباد

یہ اشکوں کی مدھم ستارے بجھا کر ذرا اور نزدیک آؤ خدارا
زمانے کی گردش بہت تیز تر ہے نہ چھٹ جائے ہاتھوں سے دامن تمہارا

زرین اختر...... کاموکی

یہ رہ قول ہے یہ شام ابد ہے تری جستجو میں کے ہوش اب ہے
چلے جا رہے ہیں نہ منزل نہ جادہ کے یاد رکھیں کے بھول جائیں

(نزاہت افشاں مہورہ فتح جنگ جواب)

افسر علی...... چکوال

یہ مچلتے ہوئے جذبے یہ دھڑکتے ہوئے دل
کفر و ایمان کی پہچان نہ جانے کیا ہے

فہد حسن...... کراچی

یہاں دلوں پہ حقیقت کے راز کھلتے ہیں
یہ میکدہ ہے یہاں خیر و شر کی بات نہیں

خالدہ شیخ...... چنیوٹ

یہ دنیا آئینہ خانہ ہے شاید
ہر اک رخ سے نظر آئے ہم ہی ہم

(ملشی عزیز سے لڈن کا جواب)

شاہد بٹ...... لاہور

یہ خود کو لبادوں میں چھپانے والے
بات کرتے ہیں تو اوقات نکل آتی ہے

نیاز احمد...... حیدرآباد

یوں ہی رہے جو پنجۂ وحشت دراز دست
پھر فصل گل رہے کہ چمن میں خزاں رہے

(مریم بنت کاشف حیدرآباد کا جواب)

فرحت الماس...... فیصل آباد

یہ کیوں ساحل سے سر دھنتی ہیں موجیں
یہ کیسا شور ماتم ہو رہا ہے

نورین فاطمہ...... لاہور

یہ دل ہے اور یہ زخم یہ آنکھیں ہیں اور یہ تم
یہ شہر دیکھ لو تو یہ بازار دیکھنا

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

مبارزہ امتیاز...... منڈی بہاؤالدین

یہ مہکتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی آگ
نرم نیندوں کے شبستانوں میں ڈھل جائے گی

نصیر احمد نصیر...... ملتان

یہ مری تلاش کا جرم ہے یہ مری وفا کا قصور ہے
کہ جو دل کے جتنے قریب ہیں وہ نظر سے اتنا ہی دور ہے

اقبال علی...... شجاع آباد

یہ رات تاروں بھری رات ڈھلنے والی ہے
چلو اٹھو کوئی توبہ شکن کو لاؤ

کائنات بتول...... ملتان

یہ کہیں گے وہ کہیں گے دل میں ٹھانے تھے بہت
چار آنکھیں ہوتے ہی سارا گلہ جاتا رہا

(ناصر اشرف ملتان کا جواب)

سید انیس احمد...... تاروال

مرے داغ دل سے ہے روشنی اسی روشنی سے ہے زندگی
مجھے ڈر ہے اے مرے چارہ گر یہ چراغ تو ہی بجھا نہ دے

نوشین عارف...... فیصل آباد

محبتوں کے یہ رشتے عجیب رشتے ہیں
میں خاک پا سہی کتنے دلوں میں بستا ہوں

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

نیاز جتوئی...... لطیف آباد

یہ تو پیڑوں کے گیت ہیں اختر
چاندنی رات اور تنہائی

سعید احمد خان...... ملتان

یہ ضروری نہیں ہر شخص کو رستہ مل جائے
جس کو دروازہ سمجھتے ہو وہ دیوار بھی ہے

زرین بانو...... ملتان

یہ ہے دل کا سفینہ اس کو کیا غم
یہ خود طوفان ہے خود ناخدا ہے

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

نظیر نیازی..........بہاولپور

اُف یہ خاموش سیاہ رات امنڈتے بادل
اف یہ تنہائی کا عالم یہ سسکتی ہوئی یاد

محمد خالد.........کوئٹہ

آج پھر پیاس کے ٹیلوں سے بگولے اٹھیں
آج پھر ابر کا امکان دکھایا جائے

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

زاہد علی..........لاڑکانہ

یہ تجسس آشنا بچہ ہے عہدِ رزم کا
یہ تو اس دھن میں کھلونا توڑ کر بھی دیکھ لے

(عبدالجبار روی قصور کا جواب)

عبدالستار.........ساہیوال

رات دن زیرِ زمیں لوگ چلے جاتے ہیں
نہیں معلوم تہ خاک تماشا کیا ہے

(ندرت فیضان، احمد پور کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.........فورٹ عباس

وہ ملتا یوں تھا کہ ہو بات چند لفظوں میں
میں کرتا کیا کہ میرا قصہ مختصر ہی نہ تھا

عبدالجبار روی انصاری..........قصور

واللہ گیسوؤں کی گلی میں ان کی سرسراہٹ ہوئی ہے
ہوا چھیڑے بہانہ کے بالوں کو یا وجہ کوئی اور ہے

(اسی بارک پوری کراچی کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری.........کراچی

ارمان شوق حسرت غم آرزو دل کا لوٹنا
اتنے طویل قصے ہیں تھوڑی سی زندگی میں

(شگفتہ یاسمین کراچی کا جواب)

نزاہت الشال.........میورہ فتح جنگ

ابھی سورج نہیں ڈوبا ذرا سی شام ہونے دو
میں خود ہی لوٹ جاؤں گا مجھے ناکام ہونے دو

اسلام صدیقی..........ملتان

ابھی نہیں ہیں میسر مجھے قدم میرے
نہیں ہیں مجھ سے شناسا رفاقتیں میری

(اشرف جہانگیر لیہ کا جواب)

منشی عزیز مئے.........لڈن وہاڑی

آج موسم کا اشارہ ہے کوئی آئے گا
گھر کا آنگن نہ سہی، دل ہی کشادہ کرلیں

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

خیام شیخ..........مظفر آباد

یہ تاج محل جو چاہت کی آنکھوں کا سنہرا موتی ہے
ہر رات جہاں دو روحوں کی خاموشی زندہ ہوئی ہے

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

مسرت بانو.........ٹوبہ ٹیک سنگھ

آنکھ جب ابڈبا گئی ہو گی
آپ کی یاد آ گئی ہو گی

اجمل بٹ..........لاہور

اے مری زیست کی حسیں امید
صبح کا تیری انتظار ہوں میں

ثاقب احمد مثالی..........حیدر آباد

اشفاق میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا کبھی
اس کو خیالِ راہ گزر بھی نہ آئے گا

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ذیشان افسر.........کراچی

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

عباس بٹ.........لاہور

یہ بدلتی قدریں ہی حاصلِ زمانہ ہیں
بار بار ماضی کے یوں ورق نہ الٹا کر

آمنہ شیریں..........مظفر گڑھ

یہی اک راستہ باقی رہا ہے
سو میں نے خود کو تنہا کرلیا ہے

حسین امجد خان..........لاہور

یہ بھی اک طرفہ تماشا ہے کہ اب شہر کے لوگ
کوئی مصلوب اگر ہو تو خوشی کرتے ہیں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2018ء تک علمی آزمائش 146 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
108

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت،

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

علمی آزمائش-146

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں ...... 30 مارچ 2018ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

وہ الہ آباد کے سیشن جج تھے۔ اسی شہر میں 15 فروری 1846 میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اتنا کچھ کہا کہ انہیں شعراء کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا جانے لگا۔ اپنے دور کے نامور شاعر مانے گئے۔ آج بھی ان کی شاعری کو لوگ پسند کرتے ہیں۔

علمی آزمائش 144 کا جواب

غیاث الدین بلبن کے دور میں پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک خواجہ ملک علی ہند آئے۔ بلبن نے انہیں پانی پت میں سیر حاصل دیہات پرگنہ میں عطا کیا۔ وہیں 1837 میں الطاف حسین حالی کی ولادت ہوئی۔ شادی کے بعد تحصیل علم کے شوق میں دہلی آگئے۔ ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ گھر والے آکر زبردستی واپس لے گئے۔ یہ ذکر 1855 کا ہے۔ غدر کے بعد دوبارہ دہلی آکر نواب مصطفٰی خان شیفتہ کی مصاحبی کی۔ اردو شاعری میں بڑا نام کمایا۔ کہتے ہیں کہ ان کا ایک مسدس ہی انہیں جنت میں لے جائے گا۔

انعام یافتگان

1۔ اطہر حسین، چنیوٹ　2۔ ماسٹر عنایت بھٹو، جیکب آباد　3۔ نثار میمن، میرپور خاص

4۔ نوشین اختر، کراچی　5۔ ضیاء الاسلام، سرگودھا

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نامہ تحریم، وجاہت دکیل عثمان خان، عطیہ نورین، پروین بیگم، عنایت اللہ خان، قیام الدین، جلیل احمد

جعفری، پروین اختر، محمد یونس، فیروز الدین، سبطین عابدی، مہر الٰہی، منبر انشاں، غلام حسین، الیاس محمد، آفتاب حسین، محمد شعیب، تبسم صدیقی، مظفر حسین سید، یاسمین خان، باسط حسن، انیس احمد، نواب سلیم، صباحت مرزا، امتیاز احمد، صوفی تبسم، انیس اختر، فیض اختر، سعید اختر، انعام گل، فردوس جبیں، کاظم پاشا، محمد کوثر، زینت تبسم، ملک فیض محمد، ذیشان علی، نگار بٹ، ناہید خان، نور علی نور، اشرف بٹ، نسیم شاہ۔ ملتان سے محمد معین چشتی، لقیر محمد، ذیشان مینگل، اختر الاسلام خان، ناصر علی، زہیب الدین خان، ملک محمد انور، امتیاز حسین، احمد علی احمد، عنایت حسین، کاظم زیدی، صابر خان، نعمان خان۔ لڈن دہاڑی سے ہشی محمد عزیز ہے۔ حاصل پور سے شجاعت محمد خان، نصیر پور سے اللہ دتہ۔ حیدرآباد سے حذیفہ، مریم کاشف، نیاز ملکانی۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، معین الدین، فیض یاب احمد، آفتاب خان، نوازش علی۔ حافظ آباد سے محمد ابراہیم، خلیق الرحمن۔ کشمور سے فیض محمد۔ شہداد کوٹ سے محمد عنایت اللہ۔ راولپنڈی سے ریحانہ ایوب، معین انور، قادر علی، مسعود اظہر، نبیلہ عطاری، فرحین احمد، کاظم علی خان، عتیق احمد، کاظم جعفری، ملیحہ نقوی، افتخار خان، نوشین اختر، ضیاالاسلام۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ کشمور سے فیض محمد، اکبر علی۔ ڈیرہ غازی خان سے رانا محمد ارسلان، رانا زاہد حسین، منیر احمد، نازش خان، طلعت حسن۔ حیدرآباد سے: زریاب فرحان' اقرا مظاہر۔ لطیف آباد' حیدرآباد سے: طہ یاسین' نسرین رانا' توقیر جمالی' نزہت پروین' مسکان بھٹو۔ پشاور سے: محمد شہزاد اعظم' کشمالہ ملتی' گلباز خان' مفتی اکبر خان' عمران وردگ' فہیم احسان زئی' ڈاکٹر نعمان شہزاد خان۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک' ثاقب سجاد' محمد عاقب جنید' سید محمد احسن نواز' عبدالخالق چوہدری' عبدالقادر' یاسمین ملک' فرزانہ مصطفٰی' کائنات مرزا' شاہینہ اسلم چوہدری' روایت خان' کلثوم شہزاد' سرفراز اکرم خان' عنبرین شاہد' محمد اسلم۔ لالہ موسیٰ سے: بشریٰ اصغر' صفدر ملک' ارشد محمد ولی' صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی' آزاد کشمیر سے: لیاقت علی۔ بھمبر' آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ ڈڈیال ضلع میرپور آزاد کشمیر سے: محمد ہارون .... خانیوال سے: گل لیاقت' اسما توحید' ملک فیروز' اعجاز حسین محمد اقبال۔ ملتان سے: سید فیض الحسن شاہ گیلانی' لبنیٰ ارشاد' امام بخش ملک' ادریس سلمان' محمد معین چشتی' نازش فاروقی' خواجہ محمد حسین' محمد شفیق بھٹی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: آصف اقبال' ڈاکٹر ایس اے اختر۔ سوئی ضلع ڈیرہ بگٹی سے: محمد اکمل خان۔ نوشہرو فیروز سے: نعمت اللہ سومرو۔ فرید ٹاؤن' ساہیوال سے: محمد افضل۔ اٹک سے: محمد نصیر۔ سرگودھا سے: علی اصغر گوجر' محمد سعید قریشی ڈیرہ اسماعیل خان سے اعجاز احمد خان، محمد ظفر اللہ، قمر علی خان، رابیعہ خان، نسیم اختر۔ بہاولنگر سے جہانزیب بنگش، فتح محمد، شیر خان زرولی، خان تبسم، ارسلان خان۔ بہاولپور سے کلیم اصغر، اعجاز زیدی، سید محمد لئیق، ظفر اقبال، ممتاز شاہد۔ نوشہرہ سے اشرف خالجی، نصرت حسین، نیاز حسین۔ خوشاب سے ارشد چھیا، غلام محمد، عباس علی، شجاع آباد سے حسن علی زیدی۔ میانوالی سے احسن علی خان، نگار سلطانہ۔ حاصل پور سے نعمان ادریس خان۔ سکھر سے طارق علی، حیات محمد، کیفی جوکھیو۔ پاک پتن سے نصیر اشرف۔ کوہاٹ سے افضل خان۔ خانیوال سے اشرف جہانگیر۔ پشاور سے گل ضمیر خان، زرولی خان، غلام پنجتن طوری، عنایت اللہ، شاہد حیات، شکیل حیدر، احمد کمال، خوشاب سے نرگس خان۔ کوئٹہ سے ملک نواز، ابراہیم جوئیہ، نثار احمد، عباس خان، واہ کینٹ سے محمد فیض، صابر علی۔ فیصل آباد سے بلال حمید، شبیر علی سید، خواجہ محمد عارف۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، فریدہ افتخار، محمد ذیشان، خالد عثمانی، برجیس فاروق احمد، عنایت پراچہ، سہیل خان، دانش ہاشمی، بشیر احمد۔ ساہیوال سے عبدالستار محمد اشرف، فیاض احمد، احمد قریشی۔ مریدکے شاہد احمد۔ شرق پور سے علی نیازی۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ ملک وال، ناصر حسن، ڈاکٹر علی۔ خان پور سے فصیح اللہ، عاہر شیخ۔ صفدر آباد سے عباس حسن۔ کالا شاہ کاکو نصیر احمد۔ منڈی فیض آباد سے ادریس احمد۔ جڑانوالہ سے زاہد علی زاہد۔ سدھار سٹی سے فیصل آباد، رانا ریاض۔ چنیوٹ سے زاہد حسن، فیض محمد، شریف احمد۔ قائد آباد سے ادریس احمد۔ کالا باغ سے تسنیم کیفی محمد۔ پنڈی بھٹیاں سے سہیل شاہ۔ مصطفٰی آباد سے یونس خان۔ جلال پور بھٹیاں سے احمد بشیر۔ پھالیہ سے نسیم احمد بٹ۔ فتح جنگ سے نزاہت افشاں، زاہد خان، منڈی بہاؤالدین سے محمد شفیق۔ مظفر آباد سے شاہینہ بھٹ۔ بالاکوٹ سے محمد مستفیض۔ جھنگ صدر سے نیلوفر شاہین، امجد علی، رومانہ شاہین، نثار بٹ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اطہر خان۔ تلہ گنگ سے فہمی عباس۔ تونسہ شریف سے نادر شاہ۔ جہلم سے قدرت اللہ۔

ممالک غیر سے نوید محمد ساہنی (دبئی یو اے ای)۔ ناصر الدین (شارجہ یو اے ای)۔ شاہد عباس (جرمنی)۔ اصغر علی ترمذی (بیڈ فورڈ یو کے)۔ تابش احمد (لندن یو کے)۔ اشرف عباس (ٹورنٹو کینیڈا)۔ خالق امجد (ڈیرا دبئی)

پچھتاوا

مکرمی جناب

السلام علیکم

یہ سچ بیانی میرا کی ہے، اس کی ماں کی ہے۔ اسے ہر اس لڑکی کو پڑھنا چاہیے جو والدین کے تجربے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتیں، خود کو عقلِ کل سمجھتی ہیں اور اپنے غلط فیصلے کو ہی منوانا چاہتی ہیں۔

فضہ خان

(ہری پور)

زیرو پاور کے بلب کی سبز مدھم روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چھت کے وسط میں گھومتا پنکھا اپنی آدھی سے زیادہ عمر اسی جگہ گزار چکا تھا اور اپنی بڑھتی عمر کے ساتھ ہی اب اس نے چرچرانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے بند آنکھیں کھولیں تو وہ سبز مدھم روشنی بھی سورج کی تیز کرنوں کی مانند چبھنے لگی۔ سر میں شدید درد کے باعث پنکھے کی چرچراہٹ اب ہتھوڑے کی مانند دماغ پر برسنے لگی۔

"میرا...... اٹھ جا بچے...... اٹھ کر پانی لا دے اور اس پنکھے کو بھی بند کر دے۔ کمبخت نے سر کھا لیا ہے۔ سارا جسم تھکاوٹ سے چور چور ہو رہا ہے۔"

میں نے سر پکڑتے ہوئے پاس لیٹی میرا کو پکارا۔ مگر سوائے پنکھے کی آواز کے مجھے اور کوئی آواز سنائی نہ دی۔

"میرا...... اٹھ جا بیٹا۔" میں نے کچھ توقف کے بعد پھر سے کراہتے ہوئے اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر کروٹ بدلی۔ کروٹ بدلتے ہی جب سامنے بچھی دوسری چارپائی پر نظر پڑی تو وہاں وہ تھی ہی نہیں۔ میں اسے چارپائی پر نہ پا کر دیوار کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی۔

"میرا، کہاں ہے تو؟" میں نے اردگرد نگاہ ڈالی اور چارپائی سے نیچے اتر کر چپل پیروں میں ڈالتے ہوئے باہر نکلی۔ باہر کا سارا منظر سیاہی میں لپٹا ہوا تھا۔

"میرا۔" میں نے دھیرے سے پکارا۔ میرے دل کو دھڑکا لگ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر برآمدے کی بتی جلا دی مگر میرا کہیں نظر نہ آئی۔ کچھ دیر پہلے مارے درد کے میرا برا حال ہو رہا تھا مگر اب جب عزت کا درد آڑے آیا تو میں فوراً بھاگتی ہوئی گلی کے دروازے تک آ پہنچی۔ وہاں کنڈی لگی دیکھ کر تھوڑی تسکین ہوئی۔ "میرا اندر ہے...... مگر کہاں؟" میں خودکلامی کرتی واپس پلٹی اور گھر میں چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھنے لگی پھر میری نگاہ چھت کو جاتی سیڑھیوں پر جا رکی۔ میں آہستہ آہستہ ڈگ بھرتی سیڑھیوں کی جانب چل پڑی ہلکے پیروں بغیر آہٹ نکالے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مومٹی کے دروازے تک پہنچی۔ میرے کانوں میں ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آوازیں پڑنے لگیں۔ وہ اوپر ہی تھی مگر اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ مگر کون؟

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" میرا دل کانپ اٹھا۔ ٹانگیں بےجان ہونے لگیں مگر میں ہمت کرتی ہوئی آگے بڑھی اور مومٹی میں نصب جالی کے دروازے سے کان لگا کر سننے لگی۔

"فراز! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اماں سے اب بات نہیں کر سکتی۔ تم...... میں جانتی ہوں وہ جو فیصلہ کر لیتی ہیں اس سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹتیں۔" میرا نے بےچینی سے کہا۔

"میں کیسے مان لوں یار؟ تم سے تو پوچھ کے ہی کیا ہوگا

فیصلہ۔" اس کے لہجے میں ناراضی عیاں تھی۔

میں آواز سے پہچان گئی۔ وہ ہماری پڑوسن رشیداں کا بیٹا تھا۔ چونکہ دونوں گھروں کی چھتیں برابر تھیں اس لیے اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ وہ اس وقت ہماری چھت پر موجود تھا۔

"نہیں فراز...... تم مجھ پر، میری محبت پر شک کر رہے ہو، میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اماں سنبل کی رخصتی کے ساتھ ساتھ میرا بھی رشتہ طے کر دیں گی۔ میری مرضی جانے بغیر......" وہ اسے یقین دلا رہی تھی۔

"مگر کبھی تو انہوں نے ذکر کیا ہوگا تم سے؟"

"نہیں کبھی نہیں کیا اور رہی بات مرضی کی تو انہوں نے سنبل سے بھی اس کی مرضی نہیں پوچھی تھی۔ اسے بھی شادی سے کچھ دن پہلے پتا چلا تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔"

وہ ابھی بھی خود کو ڈیفنڈ کر رہی تھی۔

"تو اس نے کچھ نہیں کہا تھا؟" اس نے مزید تصدیق چاہی۔

"نہیں وہ تو ہے ہی سدا کی سیدھی اور معصوم...... ہمیشہ سے قربانی دینا اور سمجھوتا کرنا اس کی گھٹی میں شامل رہا ہے۔"

"مگر ہر کوئی سنبل تو نہیں ہوتی نا آنٹی کو یہ بات سوچنی چاہیے تھی...... چلو چھوڑو ساری باتیں تم بتاؤ کہ کیا سوچا؟ اپنی اماں کے فیصلے کے سامنے سر جھکاؤ گی؟ یا میرا ساتھ دو گی؟"

"تمہارے لیے اماں کبھی نہیں مانیں گی۔ میں جانتی ہوں۔" میرا نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھو میری ماں بھی کبھی نہیں مانے گی۔ دونوں ایسے مخالف ہیں ایک دوسرے کی جیسے انڈیا اور پاکستان۔" اس نے سنجیدہ طنز کیا۔

"پھر کیا کیا جائے فراز؟" میرا نے اب بےچینی سے استفسار کیا۔

"پھر اگر تو میرے بغیر رہ سکتی ہے تو کر لے شادی۔ مان لے بات اماں کی۔" اس نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

"تو رہ لے گا میرے بغیر؟" میرا نے بےبسی سے پوچھا۔

"اگر تو میرے بغیر رہ سکتی ہے تو میں بھی رہ سکتا ہوں۔" اس نے کٹیلے لہجے میں کہا۔

"نہیں فراز میں مر جاؤں گی۔" میرا کی سسکی سنائی دی۔ اس کے نمناک لہجے میں بلا کا درد تھا۔ کچھ کھو دینے کا ڈر۔

"پھر ٹھیک ہے...... بس ایک ہی طریقہ ہے۔ ہم نکاح کر لیتے ہیں۔ بعد میں سب کو منا لیں گے۔ اگر تمہیں منظور ہے تو ٹھیک ورنہ کر لینا شادی اس کے ساتھ۔"

"ہاں ٹھیک ہے...... ویسے بھی اب یہی ایک راستہ ہے۔" وہ جذباتی انداز میں بولی۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی

بات تھی کہ میں چونک گئی۔ ایسے جیسے اس ارادے نے اس کے سارے دکھ ساری پریشانیاں ختم کردی ہوں۔

''نکاح...... گھر سے بھاگ کے نکاح۔''

میرے کانوں میں یہ بات پڑتے ہی ایسے لگا جیسے کسی نے میرے سارے جسم میں سوئیاں چبھودی ہوں۔ دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اب کھڑا رہنا عبث تھا۔ میں دروازے کو دھکا دے کر تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ دروازے کی آواز سن کر وہ دونوں ہی گھبرا گئے تھے۔

''ام...... امی۔ آپ......'' میرا نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

لیکن میرے زوردار طمانچے سے وہ لڑکھڑا گئی۔ ''بے شرم تو...... تو مجھے یہ دن بھی دکھائے گی؟ چل...... چل دفع ہو جا نیچے۔''

میں نے لب بھینچتے ہوئے کٹیلے لہجے میں کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔

''خا...... خالہ یہ آپ!''

''بکواس بند کرو اپنی اور دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ پولیس کے حوالے کردوں گی۔'' میں نے فراز کی بات کاٹی اور اس کے چہرے پر الٹا ہاتھ رسید کیا پھر اسے بازو سے پکڑتے ہوئے اس کی چھت کی طرف دھکیلا۔

''امی...... امی میری بات تو سنیں۔ یہ آپ کیا کررہی ہیں؟''

میرا نے آگے بڑھ کے تیزی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے مجھے روکا۔

''خاموش ہو جاؤ اور دفع ہو جا نیچے تو۔''

میں نے پھر سے دھکیلا اسے۔ فراز میرے کہتے ہی بغیر کچھ بولے فوراً ہی اپنی چھت کی دیوار پھلانگ گیا۔ جدید دور کے عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب مشکل وقت آئے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ وہ بھی بھاگ گیا تھا۔

''چل تو نیچے۔'' میں نے میرا کو بازو سے پکڑتے ہوئے نیچے کی طرف پھر دھکیلا اور وہ روتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ نیچے اتر کر وہ میری طرف پلٹی۔

''امی یہ آپ نے فراز کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا۔''

''خاموش...... بس...... ایک دم خاموش......''

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے دھیرے سے کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ بابا نہ جاگ جائیں۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے کی طرف لے گئی اور دھکیلتے ہوئے کمرے میں پھینکا۔ وہ اپنی چارپائی پر اوندھی لیٹ کر رونے لگی۔ میں چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔

''واہ میرے مولا، کیسا انصاف کرتا چلا جارہا ہے تو۔ جب اپنی سگی بیٹی اپنا خون ہی عزت کا جنازہ نکالے تو کس طرح انسان جیتے جی مرجاتا ہے، اس کا اندازہ مجھے اب ہو رہا ہے۔ میرے مالک، مجھ پر رحم کر۔ معاف کردے مجھے میرے مولا۔ میری بچی پر رحم کر، میرے مالک میں کیا کروں؟''

میں چارپائی پر نظریں جھکائے بیٹھی بڑبڑا رہی تھی۔ اپنی زندگی میں کیے گئے گناہ کی پوٹلی کھول رہی تھی۔

''امی یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا فراز کے ساتھ۔'' میرا جب رو رو کر تھک گئی تو فوراً اٹھ بیٹھی۔

میں نے جھکی نظریں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''امی میں بتا رہی ہوں۔ میں شادی کروں گی تو صرف فراز سے ورنہ......!'' وہ مجھے انگلی سے وارن کرتے ہوئے بولی۔

''ورنہ...... ورنہ کیا؟''

میں نے اسی طرح اسے دیکھتے ہوئے اسی کے انداز میں پوچھا۔

''ورنہ میں واقعی اس کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔''

اس نے دوٹوک الفاظ میں کہا اور کہتے ہی پہلو بدلنے لگی۔ میرے سارے وجود میں آگ بھڑکنے لگی۔ اس وقت غصہ اس قدر انتہا پر تھا کہ دل چاہا اٹھوں اور اس کا منہ توڑ دوں مگر میں کچھ نہ کرپائی اور اسی طرح برہنی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

تب میرے دماغ میں سوچ ابھری۔ ''نہیں رقیہ۔ زبردستی مار کٹائی یا سختی اسے باغی بنادے گی۔ تو خدا کا شکر ادا کر کہ تیری بروقت آنکھ کھل گئی۔ اس نے بروقت تجھے ہوشیار کردیا ورنہ تیری کیا مجال تھی کہ تو اسے روک پاتی۔ نہ جانے کب سے یہ سلسلہ چل رہا تھا اور تو آج بھی ایسے ہی سوئی رہتی اور یہ اندھیری رات میں ننگے سرویرانوں میں قدم رکھ دیتی مگر اب جب خدا نے تجھے بیدار کردیا ہے، تو خود اسے روکے گی مگر سختی سے نہیں پیار سے، اطمینان سے کیونکہ یہ وہ ہتھیار ہوتے ہیں جو بڑے بڑوں کا دل موم کرنے اور انہیں راہ راست پر لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تو ہے ہی تیری معصوم سی بھولی بھالی بچی جسے دور کے ڈھول سہانے دکھ رہے ہیں۔ جو چمکتے آتش فشاں کو روشنی سمجھ کر اس کی طرف قدم بڑھا رہی ہے مگر تو بتا سکتی ہے اس کو۔ تو بتائے گی۔ تو خود اس کو ٹھیک اور غلط کی پہچان کرائے گی۔''

میں ہمت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کو بند کرکے اندر سے کنڈی لگانے لگی۔

نہ جانے کیا وقت تھا مگر بابا روز تہجد کی نماز کے لیے جاگا کرتے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ان کے کانوں میں ایسی کسی بات کی بھنک بھی پڑے۔ میں کنڈی لگا کر واپس پلٹی تو میرا اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں آگے بڑھ کر آرام سے اس کی چارپائی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا پھر وہ خود ہی میرے سینے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ شاید وہ بھی سمجھی تھی کہ مجھے ترس آگیا ہے لیکن میں اسے ایک تلخ سچائی سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ آج کل کی محبت کا انجام بتانا چاہتی تھی۔

''نہ میری بچی روتی کیوں ہے۔ بس چپ کر جا۔'' میں نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔

''امی میں فراز سے بہت محبت کرتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ امی میں مر جاؤں گی۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔''

''کوئی نہیں مرتا کسی کے لیے میرا، یہ سب جذباتی باتیں ہوتی ہیں۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے، نہ پہلے نہ بعد میں۔ اس پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا مگر ایک بار عزت چلی جائے تو پھر کبھی واپس نہیں آتی میری بچی۔'' میں بھی رونے لگی۔

میں خاموش تھی۔ خاموشی کا یہ وقفہ طویل ہو گیا پھر اسے میرا کی آواز نے توڑا۔ ''امی! یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ مجھے اس وقت آپ کی کوئی مشکل بات نہیں سننی۔ میں نے بس بول دیا ہے کہ فراز سے شادی کروں گی تو بس کروں گی۔''

وہ ایسی ہی تھی، بے دھڑک کہہ دینے والی، کچھ میرے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ اس عمر میں ایسی باتیں سمجھنا مشکل ہی لگتی ہیں۔ مشکل ہی نہیں بے مقصد بے مطلب لگتی ہیں۔

''بچے زندگی اگر مشکل ہو جائے تو باتیں خود ہی زبان سے مشکل نکلتی ہیں پھر انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ میری یہ مشکل باتیں صرف میری ہی نہیں ہیں بلکہ تیری بھی ذات انہی باتوں سے جڑی ہے۔''

''کیا مطلب امی؟'' میری بات جونہی ختم ہوئی وہ چونک کر بولی۔

''بتاتی ہوں مطلب۔ مگر تو تحمل سے سن میری بات۔ اس کے بعد فیصلہ تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تو چاہے تو بھاگ کے کرلے شادی فراز کے ساتھ۔ اپنا یہ ارمان بھی پورا کرلینا پھر میں تجھے نہیں روکوں گی۔ میں بس کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ کوئی مشکل بات نہیں بولوں گی تجھ سے، کبھی رکاوٹ نہیں بنوں گی تیرے راستے میں بلکہ میں سمجھوں گی کہ میرے گناہوں کی سزا تھی یہ جو تیری صورت خدا نے اب مجھے دی ہے۔''

''امی کھل کے کریں بات آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''جو بات میں تجھ سے آج کہنے جارہی ہوں، وہ شاید میں تجھے کبھی نہ بتاتی مگر مجبوری ہے تجھے کنوئیں میں چھلانگ لگاتا نہیں دیکھ سکتی۔''

''کیا بات ہے اماں کھل کے بتائیں نا۔ پہیلیاں کیوں ڈال رہی ہیں؟'' وہ اب پریشان ہونے لگی تھی۔

''پہیلیاں نہیں سننا چاہتیں تم، تو پھر سنو...... تم ہمیشہ مجھ سے پوچھتی تھیں کہ تمہارا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اور میں ہمیشہ یہ کہہ کر بات ختم کردیتی تھی کہ وہ ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ مگر......'' میں بولتے بولتے ایک پل رکی۔ میری آواز میں اب لرزش طاری ہو چکی تھی۔

''مگر...... مگر کیا امی۔ بتائیں مجھے کون ہے باپ میرا، کہاں ہے وہ؟''

میرے چپ ہوتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''مگر وہ مرا نہیں تھا، وہ آج بھی کہیں نہ کہیں زندہ ہوگا۔ میرے دل سے پل پل نکلتی ان بددعاؤں کے حصار میں ہوگا۔ وہ جینا چاہے گا۔ زندگی اسے گلے نہیں لگائے گی، وہ موت مانگے گا اسے موت نہیں آئے گی۔ یہ بددعائیں میں اسے اپنے لیے نہیں دیتی۔ میں تو اس ہی دن مر گئی تھی جس دن اس نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ یہ بددعائیں تو میرے دل سے پل پل نکلتی ہیں کیونکہ تمہیں پیدا کرنے والا انسان، انسان ہوتے ہوئے بھی انسان کہلانے کے قابل نہیں ہے، جس نے تمہیں پیدا تو کردیا مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی تم نے اپنی ساری زندگی یتیموں کی طرح گزار دی۔'' میری آنکھوں سے آنسو موسلادھار بہنے لگے۔ میرے ایک ایک لفظ سے اس شخص کے لیے نفرت عیاں تھی اور وہ میرے سامنے مجسمۂ حیرت

بنی آنکھیں پھاڑے بے بسی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں، کیوں دی۔ طلاق کیوں دی، بتائیں مجھے؟"

میرا نے اپنا برف کی مانند ٹھنڈا پڑتا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ٹوٹے لفظوں میں پوچھا۔

پھر میں نے ماضی کی گرد آلود کتاب جھاڑی اور اس کے صفحات پلٹنے لگی جس کا ایک ایک لفظ محض پچھتاوا تھا۔

☆......☆......☆

"ہم اندرون شہر لاہور رہا کرتے تھے۔ میرے بابا چودھری قادر خاں بہت بڑے جاگیردار تھے۔ ایک نام تھا ان کا۔ ایک مقام تھا۔ میری ماں کا نام نزہت تھا۔ ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ دونوں ہی کو اماں بابا نے بہت چاہ و جتن کرکے پالا تھا مگر بابا مجھ سے بہت پیار کرتے تھے، بے تحاشا پیار۔ بچپن چاہ اور لاڈ اٹھواتے گزرا تو میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔ میں انتہائی شوخ و چنچل اور لا ابالی لڑکی تھی۔ انتہا درجے کی ضدی بھی بچپن سے لے کر جوانی تک میرے بابا نے میری ہر ضد پوری کی تھی۔ اپنی یہی ضد مجھے اس قدر باغی بنا دے گی، میں اپنی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنی عزت تک کا پاس نہ رکھوں گی، اس کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔ اگر بابا کے وہم و گمان میں یہ بات ہوتی، کبھی بھی مجھے اتنی محبت نہ دیتے۔"

میں بولتی جا رہی تھی۔ بچپن سے جوانی تک کے سارے حسین منظر میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی مانند چل رہے تھے۔ کہتے کہتے میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہوگئی۔ دل میں چبھن تھی۔ ایک کسک تھی۔ ایک گہرا پچھتاوا تھا جو اس وقت سب کچھ دہراتے ہوئے میری روح تک کو چھلنی کر رہا تھا۔

"پھر...... پھر کیا ہوا تھا؟" میرا نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پھر، ہماری حویلی میں ایک بہت خوبصورت باغ ہوا کرتا تھا جس کی دیکھ بھال راموں کاکا کیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے بہت پرانے مالی تھے مگر ان کی اچانک وفات ہو گئی۔ بابا نے ان کی جگہ باغ کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے ایک مالی رکھ لیا۔ میں روز صبح صبح باغ میں چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اس روز میں معمول کے مطابق باغ میں چہل قدمی کی غرض سے گئی۔ وہ مجھے ایک کیاری کے قریب بیٹھا دکھائی دیا۔ میرے علم میں یہ بات نہ تھی کہ بابا نے اس کو مالی کی جگہ پر رکھا ہے۔ میں تجسس میں اس کے قریب چلی گئی۔ وہ ایک خوب رو نوجوان تھا۔ جب قریب گئی تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ گہری سیاہ آنکھیں اور گھنے بال، سادہ سے لباس میں بھی انتہائی پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں وہ بہت بھلا لگا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ پائی کہ کون ہو تم؟ وہ پہلے تو مجھے دیکھ کر گھبرا گیا پھر بولا۔ "میں یوسف ہوں جی، باغ کی دیکھ بھال کے لیے مجھے چوہدری صاحب نے رکھا ہے۔"

یوسف، سحر انگیز آواز اور دلفریب شخصیت کو یہ نام بہت جچتا تھا۔ وہ مجھے اپنا نام اور کام بتانے کے بعد پھر سے کیاری کے قریب بیٹھ کر پودوں کو گوڈی کرنے لگا۔ میں سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتی اپنے کمرے میں واپس آ گئی مگر سارا دن اس کا خیال بہانے بہانے سے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ محبت ایسے ہی حملہ آور ہوتی ہے۔

اگر میں اپنے بارے میں یہ کہوں کہ میں اس وقت اٹھارہ سالہ پرکشش حسینہ تھی تو غلط نہ ہوگا۔ دودھ جیسی گوری رنگت، موٹی موٹی کالی آنکھوں پر گھنی لمبی پلکوں کی جھالر، تیکھے نین نقوش، لمبے بال اور سونے پر سہاگا میرے جاگیردار باپ کی کروڑوں کی دولت جس پر مجھے بہت گھمنڈ تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے دیکھ کر کوئی بھی شخص میرا دیوانہ ہوسکتا ہے مگر یہ گھمنڈ تب ٹوٹا جب میں ایک مالی کی محبت میں پور پور ڈوب گئی۔"

میں کہتے کہتے پھر سے رکی۔ میری آنکھوں سے پچھتاوا اشکوں کی صورت بہنے لگا تھا۔

میں نے ایک نظر میرا کو دیکھا اور پھر سے بولنے لگی۔ "شروع شروع میں تو میں اس پر اپنی اداؤں کے ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ مجھ سے ڈرا سہما رہتا تھا۔ اپنی اور میری حیثیت دیکھتے ہوئے وہ دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا مگر کب تک ایسا ممکن تھا۔ دھیرے دھیرے وہ میرے قریب ہونے لگا پھر رفتہ رفتہ لال حویلی میں محبت کا کھیل شروع ہوگیا۔

رات جب سب سو جاتے تھے۔ وہ اپنے کوارٹر سے نکل کر حویلی کی چھت پر آجایا کرتا تھا۔ جہاں میں بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہوتی تھی پھر تہہ رات کی تاریکی میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر عشق کی وادی میں کھو جاتی تھی۔

مسلسل چھ ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہم دونوں کے لیے ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہوگیا۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھالیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے لیے ہر حد تک جانے کے دعوے کرلیے پھر یہ وعدہ وفا کرنے کا وقت بھی جلد ہی آگیا۔ ایک روز میرے بابا نے میرے چچازاد سے میرا رشتہ طے کردیا۔ میری مرضی نہیں تھی اس میں، مگر جہاں مرضی تھی وہاں کی بھنک بھی اگر بابا کے کان

میں پڑ جاتی تو وہ یوسف کو مروا دیتے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتی تھی۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میری محبت بابا کی عزت شہرت نام اور مرتبے سے زیادہ طاقت ور اور مضبوط نہیں تھی۔ میں یوسف کے لیے ان سے لڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ میری شادی حویلی کے مالی سے ہرگز نہ کرتے۔ لہٰذا میں نے منگنی کی رات ان کی عزت کو پیروں تلے روند ڈالی۔ اس اونچی حویلی کی عزت اور جاہ و جلال کو اندھیروں کی نظر کرتے ہوئے یوسف کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلی۔

وہ مجھے لاہور سے دور ایک گاؤں میں لے آیا اور اپنے دوستوں کی موجودگی میں مجھ سے نکاح کرلیا پھر وہاں ہی اس کے دوست کے مکان میں کرائے پر رہنے لگے۔

شادی کا پہلا سال بہت حسین تھا۔ ایک دوسرے کی قربت اور محبت میں دن رات کیسے کٹے پتا ہی نہ چلا، میں نے کبھی پلٹ کر حویلی اور اس میں رہنے والوں کی خبر نہ لی کہ وہ کس حال میں ہیں۔ یقیناً بابا نے مجھے ڈھونڈا ہوگا۔ یوسف محنت مزدوری کرتا تھا۔ گزارہ ہو جاتا تھا۔ گزشتہ زندگی میں میرے ملبوسات ڈیزائنر سے تیار ہوکر آیا کرتے تھے مگر پھر میں نے خود سلائی سیکھ لی۔ نہ صرف اپنے بلکہ لوگوں کے کپڑے بھی سلائی کرکے اپنی چھوٹی موٹی گھریلو ضروریات پوری کرنے لگی۔

ڈیڑھ سال بعد سنبل پیدا ہوئی تو یوسف کے تیور بدلنا شروع ہوگئے۔ پہلے جیسی الفت رفتہ رفتہ گھٹنے لگی پھر مجھ پر یوسف کی ہی زبانی یہ انکشاف ہوا کہ اگر بیٹا ہوتا تو اسے زیادہ خوشی ہوتی کیونکہ اسے بیٹیاں پسند نہیں ہیں۔ سنبل سے وہ بالکل پیار نہ کرتا تھا۔ آئے روز وہ مجھے بھی روئی کی طرح دھنک دیتا تھا۔ میں مار کھا کے رو دھو کے چپ ہو جاتی تھی۔ سنبل ڈیڑھ سال کی ہوگئی مگر باپ کے ہوتے ہوئے بھی باپ کی محبت اور شفقت سے محروم ہی رہی۔ میں دوبارہ امید سے ہوئی تو یوسف نے سختی سے یہ بات کہہ دی کہ اسے بیٹی نہیں بیٹا چاہیے۔ اگر اس بار بھی بیٹی ہوئی تو وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ میں دن رات اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہتی اور گھنٹوں رب سے بیٹا مانگتی رہتی تھی مگر تب شاید میرے گناہوں کی سزا کا وقت شروع ہو چکا تھا پھر ایک رات تم پیدا ہوگئیں۔

اس رات یوسف نے مجھے بہت مارا۔ اتنا کہ میں لہولہان ہوگئی اور درندوں کی طرح مارتے پیٹتے ہوئے جب وہ مجھے ننگی گالیاں دے رہا تھا تب ہی اس نے یہ بھی کہا جیسے تو نے اپنے باپ کی عزت مٹی میں ملا دی تھی، ایسے ہی تیری بیٹیاں بھی ایک دن میری عزت کا جنازہ نکال دیں گی۔ وہ مجھے مکوں لاتوں اور گھونسوں سے مارتا تھا تو اتنی تکلیف نہ ہوتی تھی۔ جتنی مجھے اس بات نے دی تھی۔ وہ اس دن مجھے طلاق دے دیتا مگر مار مار کے اس نے میری اتنی بری حالت بنا دی تھی کہ اسے خود ہی مجھ پر رحم آ گیا اور میری مرہم پٹی کرنے لگا۔

کچھ مہینے یونہی گزر گئے۔ وہ مجھ سے زیادہ بات نہ کرتا تھا اور بچیوں پر اگر بھولے سے نگاہ پڑ بھی جاتی تو مجھے ننگی گالیاں بکنے لگتا تھا۔ میں چپ چاپ برداشت کرتی رہی اور اس کوشش میں رہتی کہ اس کی موجودگی میں تم دونوں اس کے سامنے نہ جاؤ مگر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایسا کب تک ممکن تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی الگ الگ کمروں میں سونے لگے۔ میاں، وہ میاں رہا ہی کب تھا۔ ہمارے بیچ تو بس ایک برائے نام تعلق بچا تھا۔ ایک کمزور سا کچا دھاگا جو میرے دل کو ہر وقت یہ دھڑکا سا لگائے رکھتا کہ نہ جانے کب کس پل یہ کچا دھاگا بھی ٹوٹ جائے۔ پھر بالآخر یہ دھاگا بھی ٹوٹ گیا۔"

میری آنکھوں کے سامنے یہ سارے منظر گردش کر رہے تھے۔ میں بجھے بجھے لفظوں میں اسے اپنی زندگی کی وہ کہانی سنا رہی تھی جس کا تصور ہی جگر میں خنجر گھونپ دینے کے لیے کافی تھا۔ میں کچھ لمحے بولتے بولتے چپ ہوئی اور پھر اپنی گود میں رکھی دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو سختی سے بند کرکے کھولنے کے بعد اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ "وہ میری زندگی کی اذیت ناک شام تھی جس نے مجھ سے میرے ایک غلط انتخاب کا وہ انجام لیا، جس کا تصور ہی ہر اس عورت کی روح تک میں آگ بھڑکا دیتا ہے جو دن رات چاہ و جتن کرکے اپنا خوب صورت گھر سجاتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے بھی بہت ارمانوں سے صرف اس کے ساتھ کی خاطر سب کچھ ٹھکرا کر وہ گھر سجایا تھا جسے اس نے توڑنے میں لمحہ بھی نہ لگایا۔"

"ایسا کیا ہوا تھا؟ مطلب اب ایسی کیا بات ہوگئی کہ اس نے آپ کو طلاق ہی دے دی؟"

میرا نے مجھے خاموش نظریں جھکائے دیکھ کر کپکپاتی آواز میں طلاق کی وجہ جاننا چاہی تھی۔

میں کچھ لمحے ایسے ہی خاموش رہی اور پھر سے بولنے لگی۔ "اس شام میں کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ تم دونوں میرے کمرے میں سو رہی تھیں۔ سنبل کی آنکھ کھلی تو وہ بیڈ سے نیچے اتر کر اپنے باپ کے کمرے میں چلی گئی۔ اپنے کمرے

میں اس معصوم کو دیکھ کر دو بری طرح دھاڑا اور اس کے گال پر طمانچہ رسید کردیا۔ وہ رونے لگی۔ اس کی آواز سن کر میں یوسف کے کمرے کی طرف بھاگی۔ سنبل دروازے کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ اس معصوم کے چہرے پر انگلیوں کے نشان جم گئے تھے۔ میں نے سنبل کو اٹھا کر سینے سے لگالیا اور اس کی ننھی گال پر انگلیوں کے نشان دیکھتے ہی میری زبان سے بیساختہ جاری ہوگیا کہ ظالم انسان بچی کو تو بخش دو۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ مجھے درندوں کی طرح پیٹنے لگا پھر پیٹتے ہوئے ہی تین جملے بول کر اس نے وہ برائے نام رشتہ بھی ختم کردیا۔ میرے پاس اس وقت ایک روپیا بھی نہ تھا۔ میں تم دونوں کو لے کر گاؤں سے پیدل چل پڑی۔ میں چلتے چلتے شہر کو جاتی سڑک تک پتا نہیں کیسے آ پہنچی مگر نہ ختم ہونے والی مسافت تو اب شروع ہوئی تھی۔ نہ جانے مجھے کتنا چلنا پڑا۔ کہاں کہاں سے گزرنا پڑا ہے۔" جو کچھ سامنے نظر آیا اسے سمیٹ کر ایک پوٹلی بنالی۔ جلد بازی میں یوسف کا پستول بھی پوٹلی میں بھرلیا۔

میں نے پھر سے ایک ٹھنڈی سانس لی اور میرا کے سرخ پڑتے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی دوبارہ بولنے لگی۔ "رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ گہری تاریکی چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ موسم کے تیور بھی کافی حد تک بگڑے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے بادلوں کی گرجدار آواز کسی دیو کی طرح دھاڑ کر پھر سے ہلکی پڑنے لگتی۔ آسمان پر بجلی کی سنہری لکیریں تیزی سے نمودار ہوتیں اور روح تک میں لرزش بھرتی ہوئی پھر سے غائب ہوجاتی تھیں۔

میں تم دونوں کو لیے تیز تیز ڈگ بھرتی بس اسٹینڈ پر آ رکی۔ میری نظریں سڑک پر کسی مسیحا کی راہ تکنے لگیں۔ رات کے اس پہر اکیلی عورت کا یوں بیچ چوراہے کھڑا ہونا ہمارے معاشرے میں انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے مگر میں کسی غلط ارادے کے تحت یہاں نہ کھڑی تھی بلکہ مجھے تو میری بدقسمتی نے یہاں لا پہنچا تھا۔

میری گود میں تم تھیں۔ تم نے بھوک کی شدت سے رونا شروع کردیا اور میں دونوں طرف نظریں دوڑاتی بھاری قدم لیے، بس اسٹینڈ میں نصب شدہ لوہے کی بینچ کی جانب چل پڑی۔ تمہیں اپنی چھاتی سے لگا کر بھوک مٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ قریب ہی بینچ پر بیٹھی بھوک سے نڈھال ہوتی دو سالہ سنبل پر نظر پڑی تو میرا کلیجا منہ کو آنے لگا۔

"خدایا رحم"، میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کپکپاتی آواز میں اللہ سے رحم کی فریاد کی۔

وقفے وقفے سے گرجتے بادلوں نے اب برسنا شروع کردیا تھا اور ہلکی ہوا نے طوفان کی شکل اختیار کرلی پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ آسمان سے چھاجوں پانی گر رہا تھا۔

بھوک مٹتے ہی تم سوگئیں۔ میں تمہیں سنبل کے سرہانے لوہے کی بنچ پر ڈال کر پھر سے سڑک پر منتظر نگاہیں ٹکائے کھڑی ہوگئی مگر اس وحشی رات کے اس پہر اس ویران سڑک پر شاید ہی کوئی سواری ملتی۔ رفتہ رفتہ طوفانی ہوائیں طول پکڑنے لگیں۔ آخر کار سڑک پر مجھے دور سے آتی گاڑی کی ہیڈلائٹس دکھائی دیں۔ اس سے پہلے کہ گاڑی تیزی سے وہاں سے گزر جاتی میں بھاگتی ہوئی بیچ سڑک میں کھڑی ہوگئی اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر گاڑی کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔

یقیناً ڈرائیور مجھے دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا قریب آ کر اس نے بریک لگادی۔ میں بھاگ کر دائیں جانب والے دروازے پر کھڑی ہوگئی اور گاڑی کا شیشہ کھٹکھٹانے لگی۔ چند سیکنڈ میں اس نے شیشہ نیچے کردیا۔

صاحب خدا کے لیے میری مدد کرو۔ میری بچیاں سردی سے مرجائیں گی۔ مجھے شہر تک چھوڑ دو۔ شیشہ نیچے ہوتے ہی میں نے اپنی بچیوں کی طرف سے اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ وہ بندہ دیکھنے میں بڑا ہی بھلے مانس معلوم ہوتا تھا۔ چہرے پر مٹھی بھر داڑھی اور پیشانی پر محراب دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خیال کیا تھا۔ شاید میری مدد کے لیے اللہ کی ذات نے رات کے اس پہر کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔

میں ابھی تک اپنی بوسیدہ گرم شال میں اپنا چہرہ چھپائے اس کے سامنے محو فریاد تھی۔ اسی انتظار میں کہ نہ جانے اب وہ کیا جواب دے۔

"ٹھیک ہے لے آؤ بچیوں کو۔" اس نے کہتے ہی شیشہ نیچے کرتے ہوئے گاڑی بس اسٹاپ کے قریب کھڑی کردی۔

میں نے بھاگتے ہوئے سنبل کو لا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا پھر اپنے سامان کی چھوٹی سی پوٹلی اور تمہیں اٹھا کر چادر ڈالتے ہی بھاگتی ہوئی گاڑی تک پہنچی۔ پیچھے کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"محترمہ سڑکوں پر جگہ جگہ ناکہ بندی لگی ہوتی ہے۔ آپ کو یوں پیچھے بیٹھا دیکھ کر پولیس کا کوئی بھی اہلکار مجھ

سے کسی بھی قسم کا سوال کرسکتا ہے۔ برائے مہربانی آپ آگے تشریف لے آئیں۔" اس نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

بارش کی وجہ سے سردی انتہائی شدید ہوچکی تھی۔ مجھے اس کی بات نے شش و پنج میں مبتلا کردیا تھا مگر اس وقت میں مرتی کیا نہ کرتی۔ سب کچھ اللہ پر چھوڑتے ہوئے میں نے آگے کا دروازہ کھولا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی پوٹلی کو دونوں سیٹوں کے درمیان میں رکھ کر تمہیں اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی۔

گاڑی سڑک پر پھر سے دوڑنے لگی۔ میں شیشے سے باہر نظریں ٹکائے مسلسل پیچھے کو بھاگتی سڑک کو گھورنے لگی۔ بارش کی وجہ سے میری چادر اور لباس کافی حد تک بھیگ چکا تھا۔ سردی کی شدت سے میرے پورے وجود میں کپکپی طاری ہونے لگی پھر کچھ ہی دیر میں دانت بھی بجنا شروع ہوگئے مگر میں چپ چاپ باہر نظریں ٹکائے مسلسل سڑک کو گھور رہی تھی۔

اس نے میری حالت زار پر نظر ڈالی اور گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے اپنی گرم مردانہ شال میری طرف بڑھا دی۔ "محترمہ آپ اپنی گیلی چادر اتار کر یہ اوڑھ لیجیے۔ اس سے سردی کی شدت قدرے کم ہوجائے گی ورنہ ایسا نہ ہو آپ بیمار پڑجائیں۔"

اگر میری گود میں تم نہ ہوتی تو میں شاید اس سے وہ شال کبھی نہ لیتی مگر مجھے خود سے زیادہ تمہاری فکر تھی۔ اس گیلی شال میں ٹھنڈ نہ برداشت کر پاؤں گی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے اس سے چادر لے لی۔ اپنے اردگرد اوڑھنے کے بعد اس طریقے سے نیچے کی گیلی چادر ہٹائی کہ اس کے سامنے میری بے پردگی نہ ہو پائے۔

"کون ہیں آپ اور اس تاریک رات میں اس پہر یہاں کیوں کھڑی تھیں؟"

اس نے گاڑی کے شیشے پر نظریں مرکوز کیے مجھ سے پوچھا۔

"صاحب میں، میرا نام رقیہ ہے۔ اس بھری دنیا میں میرا اب کوئی نہیں ہے۔ جسے اپنا سب کچھ مان کر پوری دنیا سے ناطہ توڑا تھا۔ آج اسی نے مجھے وہاں لا پھینکا، جہاں نہ کوئی راستہ ہے نہ منزل اور نہ ہی کوئی سائباں۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت میرے دماغ میں ماضی گردش کرنے لگا تھا۔ جب اس شخص نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا، تو بے دھیانی میں میری زبان سے خود ہی یہ جملے جاری ہونے لگے۔

"کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں؟" اس نے چادر کے پلو میں ڈھکے میرے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کے دیکھتے ہی میری موٹی موٹی آنکھوں سے بے ساختہ دو آنسو ڈھلک کر اونی چادر میں جذب ہوگئے۔ میں نے فوراً نظریں پھیر لیں۔

"چھوڑیے صاحب کیا کریں گے جان کر۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"صاحب نہیں، سراج، سراج گیلانی نام ہے میرا۔"

میرا بار بار صاحب کہنا شاید اسے برا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا نام بتایا۔

پچھلی سیٹ پر بھوک سے نڈھال پڑی سنبل اٹھ کے بیٹھ گئی۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ اسے بھوک سے تڑپتا دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ میں بھی برداشت نہ کر پائی اور میری آنکھوں سے آنسو آبشار کی طرح بہنے لگے پھر میں نے تمہیں ایک سائیڈ پر کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر سنبل کی طرف بازو پھیلا دیے۔ وہ لپک کر میرے سینے سے لگ گئی۔ "چپ ہوجاؤ بیٹا۔ ہم بازار جارہی ہیں نا۔ ابھی مما بازار سے اپنی گڑیا کو کھانا لے کر کھلائیں گی۔" میں سنبل کو بہلانے لگی۔ مسلسل شام سے میں اسے یہی تسلیاں دے رہی تھی۔ مگر اب شاید اسے سمجھ آگئی کہ امی جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ بچی تھی میری مجبوری نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میں اسے کھانا نہیں کھلا سکتی۔

ہم کافی آگے آچکے تھے۔ یہاں موسم قدرے بہتر تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دور دور تک بارش کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم آسمان پر بادل تھے جن سے کبھی کبھار چاند جھانک لیتا تھا۔

اتنے میں گاڑی مین روڈ کے ساتھ بنے پیٹرول پمپ پر جا رکی۔ سراج گیلانی ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کرکے بغیر کچھ کہے نیچے اتر گیا۔ سنبل رو رو کے نڈھال ہوچکی تھی۔ میں بے بسی سے بس اسے دیکھ رہی تھی۔ میری تقدیر نے مجھے زندگی کے اس دہانے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں میرے خالی ہاتھوں میں لپٹی بے بسی مجھ پر چیخ چیخ کے ہنس رہی تھی۔ میرا تماشا بنا رہی تھی۔ میں تنہا ذات ہوتی تو شاید وقت کی یہ بے رحمی مجھے اتنی تکلیف نہ دے پاتی مگر میرے ساتھ تو میری بے بس اور مجبور ممتا بھی لپٹی تھی جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی معصوم بچی کو بھوک سے تڑپتا دیکھ رہی تھی لیکن کچھ نہ کر پا رہی تھی۔ "کیا یہ اسی طرح بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرجائے گی؟" میں نے

سوچتے ہوئے جھرجھری لی ''نہیں بالکل نہیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔''

دماغ میں سوچ ابھری۔ اتنے میں سراج گیلانی نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک شاپر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ لیجیے اس میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں ہیں...... بچی کو کھلا دیجیے۔ فی الوقت مجھے یہاں سے یہی ملا ہے۔''

میری بے تاب مامتا نے لپک کر وہ شاپر اس سے پکڑا اور تیزی سے کھولتے ہوئے اس میں سے بسکٹ اور جوس کے ڈبے نکالنے لگی۔ سراج گیلانی نے ایک نظر مجھے دیکھا اور گاڑی پھر سے اسٹارٹ کر دی۔ میں نے جوس کھولتے ہی نڈھال پڑی سنبل کے خشک لبوں سے لگایا۔ جسے وہ ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گئی۔ جوس پیتے ہی سنبل کی سانسیں بحال ہوئیں تو میں نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا جسے وہ ندیدوں کی طرح کھانے لگی۔ ''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بے شک تو بہت بڑا رزاق ہے'' میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا پھر ساتھ بیٹھے اس فرشتہ صفت انسان پر نگاہ ٹھہری جس کی وجہ سے میری بچی کے بے جان پڑتے وجود میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ ''آپ کا بہت شکریہ سراج صاحب آپ نے میری مدد کی ورنہ میری معصوم بچی شاید آج بھوک سے تڑپ تڑپ کے مر جاتی۔'' میں نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ کی اس میں کوئی بات نہیں رقیہ صاحبہ، اللہ کی ذات وسیلہ کرتی ہے۔ تب ہی انسان بھی حیلہ کر پاتا ہے۔ بے شک زندگی اور موت بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ آپ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے مجھے آپ کا وسیلہ بنایا۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور میں بس چپ چاپ سر ہلانے لگی۔

''آپ نے کہاں جانا ہے مجھے بتا سمجھا دیں میں آپ کو وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ مجھے شہر میں اتار دیجیے گا۔'' میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت ذہن میں یہ خیال آیا۔ شہر میں میرا کون ہے؟ جس کے پاس جاؤں گی۔

اس نے ایک گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی ''دیکھیے آپ کے ساتھ اگر کوئی سنجیدہ مسئلہ ہے تو آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔ میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔''

''مدد'' لفظ مدد سنتے ہی مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ مسلسل ایک گھنٹے میں، میں شخص کی انتہائی احسان مند ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ ہو سکتا ہے اللہ نے اسے میری مدد کے لیے ہی بھیجا ہو۔

''ہاں مدد...... مگر آپ مجھے بتائیں گی نہیں کہ آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے تو میں کیسے آپ کی مدد کر پاؤں گا؟ بتائیں مجھے کیا ہوا آپ کے ساتھ۔'' وہ بول رہا تھا مجھ سے وجہ جاننا چاہتا تھا۔ میں بغیر کچھ کہے چپ چاپ سن رہی تھی۔ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کیا کروں۔ ''دیکھیے رقیہ صاحبہ مجھ سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں، باخدا میں کسی غلط ارادے کے تحت نہیں پوچھ رہا۔ آپ بتائیں مجھے آپ کے ساتھ کیا ہوا، آپ یقین کریں کہ میری شناسائی شہر کے بڑے بڑے لوگوں سے ہے۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے تو میں ضرور آپ کو انصاف دلاؤں گا۔''

''مگر آپ کیوں میری مدد کرنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پھر سے بے بسی کا لبادہ اوڑھا۔

''دیکھیں رقیہ صاحبہ مدد کسی مطلب کے تحت نہیں کی جاتی، پلیز آپ بتائیں مجھے......'' وہ ہمدردی سے کہہ رہا تھا۔ گویا میری دکھتی رگ پر اس نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ تاہم خاموش رہی۔ میرا ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔

''اچھا اب آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیں؟''

اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

کافی دیر میں ٹال مٹول سے کام لیتی رہی لیکن جب اس کا اصرار حد سے بڑھا تو اسے سب بتا دیا۔

''پھر کیا ہوا امی؟'' میرا جلدی سے بولی۔

میرے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔ میری نظریں اپنی خالی ہتھیلیوں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ میں میرا کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔ میں سراج کو اپنی کہانی سنا کر رونے لگی۔ اس وقت بے دھیانی میں مجھے پتا نہ چلا کہ کب چہرے سے نقاب سرکا۔ میرا سارا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے نقاب درست کیا اور شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے اچانک گاڑی روک دی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر جلدی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹیرنگ پر کہنی ٹکائے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تو میں نے درمیان میں رکھی پوٹلی اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لی۔

''گھبراؤ مت۔ ہم شہر پہنچنے والے ہیں۔ تمہاری کہانی

اتنی دردناک ہے کہ مجھے لگا، میں اپنا ضبط کھو بیٹھوں گا اور کہیں گاڑی ٹکرا دوں گا۔ میں نے بریک لگا دی۔'' اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے کہا۔ پھر سے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ مجھے صاف ظاہر ہونے لگا جیسے وہ اندر ہی اندر مجھ پر ہنس رہا ہو۔ میرا مذاق اڑا رہا ہو میں اس سہمی ہرنی کی مانند تھی جو کسی درندے کے رحم و کرم پر ہو۔

''ہم کتنی دیر میں شہر پہنچ جائیں گے؟'' میری گھبراہٹ واضح تھی۔

''بس پندرہ منٹ۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ لمحاتی توقف کے اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''رقیہ! مجھے یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا مگر اب تم پریشان مت ہونا۔ تم اکیلی نہیں ہو میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔''

کچھ لمحوں کے توقف کے بعد وہ پھر سے بولا۔ اس کی معنی خیز بات میں اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی۔ عورت کی چھٹی حس اس حوالے سے بہت تیز ہوتی ہے۔ میں جان گئی کہ اب کچھ غلط ہونے والا ہے۔ تاہم میں چپ رہی۔ ''ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں۔ تم بہت ہی حسین پرکشش اور دلکش ہو۔ تمہیں دیکھ کر کوئی بھی تمہارا دیوانہ ہو سکتا ہے۔ مطلب تم کسی کو بھی اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہو۔''

وہ اپنی انگلیوں کو گردش دیتے ہوئے مسکرانے لگا۔ جبکہ میں بجھی اور نہ سمجھی کی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔ خوف اس وقت میری آنکھوں سے عیاں تھا۔ ''تمہیں تو پتا نہیں ہوگا کہ تمہاری منزل کیا ہے۔ کہاں جاؤ گی تم اپنی بچیوں کو لے کر؟ مگر......'' وہ کہتے کہتے ایک پل رکا۔

''مگر؟'' میری آواز میں کپکپاہٹ عیاں تھی۔

''اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں تمہارے لیے وہ کر سکتا ہوں جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔''

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے مکروہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا۔ گویا بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی تھی۔ وہ انسان جسے میں فرشتہ سمجھ رہی تھی، وہ فرشتہ نہیں شیطان نکلا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے دھیرے دھیرے اپنی گود میں رکھی پوٹلی کی گرہیں کھولنی شروع کر دی تھیں۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔

''تمہیں اتنی بڑی ٹھوکر لگنے کے بعد اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی۔ سب ڈھونگ ہے زمانے کا...... انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں بھی اس شخص نے بس استعمال کیا اور جب اس کا دل بھرا تو پھینک دیا اور تم ہو کہ رو رہی ہو۔ تم بھی کھیلو۔ تم اپنی انگلیوں پہ نچاؤ زمانے کو اور جب تمہارا......'' وہ پرجوش لہجے میں مجھے طیش دلا رہا تھا۔ ابھی اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ میں نے پوٹلی میں بندھا پستول نکالتے ہی اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ وہ اس عمل کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا فوراً ہی بوکھلا گیا۔

''گاڑی روکو۔''

میں نے اپنا لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے یہ تم کیا کر رہی ہو ہٹ...... ہٹاؤ اسے یہ چل جائے گا۔''

مارے ڈر کے اس کے بدن پر کپکپی طاری ہونے لگی تھی۔

''میں نے کہا گاڑی روکو ورنہ جان سے مار دوں گی۔''

میں نے پستول کی نال کا دباؤ اس کی کنپٹی پر مزید بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً بریک لگا دی۔ ''اب اسے تو ہٹاؤ۔''

مگر میں نے بغیر پستول ہٹائے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ایک ہاتھ سے سوئی ہوئی سنبل کو اٹھا کر نیچے کھڑا کیا پھر اپنی گود میں رکھی پوٹلی زمین پر پھینکی۔

''اگر زندگی چاہیے تو پلٹ کر پیچھے مت دیکھنا۔ وہ جس نے مجھے شام طلاق دی تھی نا، اس پستول سے گولی اس کے بھی سینے میں اتارتی ہوئی آ رہی ہوں، سمجھے تم۔ اور ایک بات اور، رقیہ اکیلی ضرور ہے کمزور نہیں۔ وہ گھر سے بھاگی ضرور تھی مگر بکاؤ مال نہیں۔ نہ کبھی بک سکتی ہے۔''

یہ کہتے ہی میں نے اس کے چہرے پر تھوک کر گاڑی سے قدم نیچے رکھتے ہی دروازہ زور سے بند کر دیا۔ اس کا مارے ڈر کے ایسا حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میرے نیچے اترتے ہی اس نے فوراً گاڑی کو گیئر لگایا اور کچھ ہی لمحوں میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے زمین پر بکھری پوٹلی سمیٹی اور سنبل کا ہاتھ پکڑ کر فٹ پاتھ پر کھڑی ہو گئی پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے اس خراب پستول کو دیکھنے لگی جو میں نے گھر سے نکلتے ہوئے بے خیالی میں ساتھ رکھ لیا تھا۔

''کاش اس میں گولیاں ہوتیں تو سب سے پہلے اس بے حس کے سینے میں اتارتی پھر تم دونوں کو مارتی اور خود کو بھی جہاں کے سارے دکھوں سے آزاد کر لیتی۔''

تبھی فجر کی اذان کی صدا قریب ہی کسی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے گونجی۔ گویا ہم شہر کے قریب پہنچ چکے تھے یا پھر

نزدیک کوئی آبادی تھی۔ سنبل پھر سے رونے لگی تو میں اسے لے کر اسی فٹ پاتھ پر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ سنبل میری گود میں سر رکھتے ہی ٹھنڈی زمین پر سو گئی۔

آسمان پر ستاروں کی چمک ہلکی پڑنے لگی تھی۔ صبح ہو رہی تھی۔ مسلسل آسمان کو گھورتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر دیں اور اپنی زندگی میں کیے گئے خساروں کے بارے میں سوچنے لگی۔

”بیٹی۔ بیٹی اٹھو......“ میرے کانوں میں کسی کی آواز سنائی دی۔ کوئی مجھے بیٹی کہہ رہا تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

وہ ایک باباجی تھے۔ چہرے پر سفید داڑھی ان کی بزرگی کی گواہی دے رہی تھی۔ سر پر علاقائی گرم ٹوپی پہنے اپنے اردگرد گرم شال لپٹائے وہ میرے سامنے پیروں کے بل بیٹھے تھے۔ ان کے پُرنور چہرے پر نگاہ ٹھہری تو مجھے لگا، میرے بابا سامنے بیٹھے ہوں پھر بے ساختہ میرے لبوں سے جاری ہوا۔

”بابا......“

”ہاں میری بچی اس وقت یہاں اس ٹھنڈی زمین پر کیوں بیٹھی ہو؟ بچی کو بھی لٹا رکھا ہے ٹھنڈی زمین پر۔ بیمار پڑ جائے گی یہ۔“

انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا پھر آگے بڑھ کے سنبل کو اپنی گود میں اٹھا کر اس پر اپنی گرم شال اوڑھا دی۔

سنبل کو اس طرح اٹھانے پر میں گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہلکے سے مسکرا دیے۔

”گھبراؤ نہیں بیٹی، اگر میری نواسی ہوتی تو وہ بالکل اس جتنی ہوتی۔“ انہوں نے سنبل کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

ان کے پُرنور چہرے پر اب حسرت امنڈنے لگی تھی۔

”چلو اٹھو یہاں سے یہ جگہ تمہارے بیٹھنے کے لیے مناسب نہیں۔“ وہ سنبل کو اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور قریب ہی کھڑے رکشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

میں بھی تھیلی اٹھائے ان کے پیچھے چل پڑی۔ پوٹلی رکشے میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ انہوں نے سنبل کو میرے پاس لٹایا اور اپنی چادر اتار کر اس پر اوڑھا دی۔ رکشا ان کا اپنا ہی تھا۔ وہ آگے کی سیٹ سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئے۔

”کہاں جاؤ گی بیٹی؟ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ کرائے کی فکر نہ کرنا۔“ انہوں نے گردن پیچھے موڑتے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے دارالامان چھوڑ دیں مگر میرے پاس واقعی کرایہ نہیں ہے۔“

”دارالامان...... کیا تم وہاں رہتی ہو؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں بابا...... قسمت لے آئی ہے آج۔ بس وہی اس وقت آخری ٹھکانا ہے...... مہربانی ہوگی آپ وہاں تک کسی طرح پہنچا دیں مجھے۔“

میری آواز بھرا گئی۔

انہوں نے چپ چاپ رکشا اسٹارٹ کر لیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد انہوں نے ایک مکان کے پاس لے جا کر روک دیا۔ خود نیچے اتر کر سنبل کو اٹھانے لگے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

وہ بولے۔ ”آجاؤ بیٹی ڈرو مت۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔“ ان کے ایسا کہتے ہی میں سب کچھ اللہ کے حوالے کرتی نیچے اتر آئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر کے اندر لے گئے۔

”ارے نیک بخت دیکھ تو سہی کون آیا ہے؟“ انہوں نے پُرجوش آواز میں کسی کو پکارا۔

”کون آ گیا ہمارے گھر اتنی صبح صبح...... ابھی تو تو باہر نکلا تھا۔ کس کو لے آیا؟“ ایک بزرگ کمزور سی خاتون فوراً کمرے سے باہر نکلی تھیں۔

”ہماری بیٹی ہے کلثوم...... دیکھ کلثوم آئی ہے۔“ باباجی نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں خوشی سے بتایا۔

اماں جی اور میں صورت حال سمجھنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”چل تو چھوڑ ساری باتیں اس کو اندر لے کر چل، اسے چائے ناشتا دے۔“ باباجی نے ہاتھ سے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سنبل کو لے کر اندر چلے گئے۔ ”چلو آؤ بیٹی اندر چلو۔“

اماں بھی میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئیں۔ اندر لے جا کر کمرے میں بنے چھوٹے سے آتش دان کے قریب بٹھا دیا۔ آتش دان میں آگ ہلکی پڑ چکی تھی۔ کوئلے آدھے سے زیادہ جل کر راکھ بن چکے تھے۔ اماں مجھے بٹھاتے ہی اس میں مزید کوئلے ڈالنے لگیں۔

میں نے کل شام سے پانی بھی نہ پیا تھا۔ وہاں سکون سے بیٹھتے ہی مجھے شدت سے پانی کی طلب ہوئی۔ سارا جسم مارے درد کے چور چور ہو چکا تھا۔

”پانی......“

میرے خشک حلق سے ہلکی سی آواز نکلی۔

”ہاں، کیا، پانی...... میں ابھی لے کے آتی ہوں۔“

میری پکار پر اماں جی ایسے چونکیں جیسے ماں گہری نیند میں بھی اپنے بچے کی ایک آواز پہ اٹھ کے بیٹھ جائے۔ وہ ہاتھ سے کوئلے رکھتی تیزی سے باہر نکل گئیں۔ کچھ ہی دیر میں پانی سے بھرا کٹورا لا کر میرے خشک لبوں سے خود ہی لگانے لگیں۔ میں نے ایک ہی سانس میں وہ سارا کٹورا ختم کر دیا۔ انہوں نے میرے زرد پڑتے چہرے کو بغور دیکھا پھر کٹورا ایک سائیڈ پر رکھتے ہی میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب ہی مجھے بھی احساس ہوا کہ میرا سارا جسم بخار سے تپ رہا ہے۔

”بیٹی تجھے تو بہت تیز بخار ہے تو...... تو اٹھ چل اٹھ کے لیٹ جا بستر میں آرام کر۔“

وہ مجھے بازو سے پکڑ کر قریب بچھی چارپائی پر لٹانے لگیں۔ میرے لیٹتے ہی گرم لحاف میرے اوپر اوڑھنے لگیں۔

”کلثوم کے ابا، اس کو تو بہت تیز بخار ہے...... تو چھوڑ منی کو، تو جلدی سے جا کر ڈاکٹرنی کا پتا کر۔“

اماں باباجی سے کہنے لگیں۔ ان کی گھبراہٹ واضح تھی۔

باباجی سنبل کو چارپائی پر لٹانے کے بعد اس کے قریب ہی بیٹھ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگے تھے۔ وہ سو رہی تھی مگر بابا چھوٹی چھوٹی چھیڑ چھاڑ کرنے کے بعد اسے جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی ہلکے سے اس کی ناک دبا دیتے۔ کبھی اپنی انگلی کے پور سے اس کی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتے۔ میری تین چار مرتبہ ان پر نظر پڑی تو وہ یہ ہی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

”اس وقت تو کلینک بند ہوگا نیک بخت۔ ڈاکٹر تو نو بجے آتی ہے۔ تو ایسا کر جلدی سے اس کو چائے بنا کے دے اس کو ناشتا کرا۔ اس کو ٹھنڈا لگ گئی ہے۔“ انہوں نے اماں جی کو پریشانی سے کہا۔

”ہاں میں ابھی لے کے آتی ہوں۔“ اماں یہ کہتے ہی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ باباجی بھی ایک بار پھر سنبل کی پیشانی چومتے ہوئے اٹھ کر ان کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئے۔

کچھ دیر میں اماں ناشتا لے کر آ گئی تھیں۔ میں نے بہت مشکل سے دو نوالے حلق سے نیچے اتارے تھے۔ اتنے میں سنبل اور تو جاگ گئی تھیں۔ باباجی سنبل کو اپنے ہاتھوں سے پراٹھا چائے میں ڈبو ڈبو کے کھلانے لگے۔ ان کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ حسرت نما خوشی جس کے لیے وہ نہ جانے کب سے ترس رہے ہوں۔ میں تجھ کو صاف کرنے لگی تو اماں جی نے تمہیں میرے ہاتھ سے لے لیا اور خود تمہارے کپڑے بدلنے لگیں۔ میں اس وقت کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ لہٰذا چپ چاپ انہیں دیکھنے لگی۔

دل میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ گمان بھی ابھرتا کہ نہ جانے یہ بابا مجھے کس مقصد کے تحت یہاں لے کر آئے ہیں مگر جب ان کے چہروں پر حسرت نما خوشی دیکھتی تو شش و پنج میں مبتلا ہو جاتی۔

”بیٹی تو کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے؟ اور دارالامان کیوں جانا چاہتی ہو؟“ اماں جی نے میرا کے سر میں تیل ڈالتے ہوئے پوچھا۔ میں خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”بیٹی بتا...... تو گھبرا نہیں۔“ مجھے مسلسل خاموش دیکھ کر انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ماں باپ مر گئے تھے۔ میرا آخری سہارا میرا شوہر تھا۔ میری بچیوں کا باپ مگر......“ میں کہتے کہتے رکی۔

”مگر کیا بیٹی؟“

”مگر آج اس نے بھی مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔“

”طلاق دے دی۔ مگر کیوں؟ تیری تو دو معصوم بچیاں ہیں۔ اس ظالم انسان کو ان پر بھی ترس نہ آیا؟“ اماں جی نے دکھی دل سے کہا۔

”اسی وجہ سے تو اس نے طلاق دے دی مجھے۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ اسے بیٹیاں نہیں بیٹا چاہیے۔“ میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

”مگر بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتا؟ اللہ پہلی بیٹی اسے دیتا ہے جس سے وہ خوش ہوتا ہے۔ راضی ہوتا ہے۔“

”خوش ہی تو نہیں تھا وہ، راضی ہی تو نہیں تھا اسی لیے تو میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔“ میں پھر سے رونے لگی۔

”نا میری دھی ایسے نہیں کہتے۔ تو پریشان نہ ہو، ہم ہیں نا تیرے ساتھ۔ بس تو ہمت کر حوصلہ کر۔ اپنی بچیوں کے لیے حوصلہ کر۔ وہ انسان تو ہے ہی بدنصیب اللہ کی رحمت سے منہ موڑ رہا ہے مگر تو غم نہ کر میری بچی، اللہ ایک در بند کرتا ہے تو

دوسرا رکھول دیتا ہے۔آزمائش بھی تو اسی کی طرف سے ہوتی ہے نا۔اللہ کی آزمائش سمجھ کر قبول کر اس فیصلے کو......"
اماں جی خود بھی رونے لگی اور آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے تپتے صحرا میں آبلہ پا چلنے کے بعد کسی نخلستان میں پہنچ گئی ہوں۔

"یہ آزمائش ہی تو نہیں ہے اماں جی، یہ تو سزا ہے۔ میرے اس گناہ کی سزا جو میں نے ماں باپ کو دکھ دے کر کیا ہے۔ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ ان کی لاڈوں سے پلی رقیہ ان کی عزت پر وہ داغ لگائے گی جو مٹائے نہیں مٹتا۔ قبر تک ساتھ جاتا ہے۔ بلکہ قبر میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں نے اپنی خوشی کے لیے ایک بار بھی یہ نہ سوچا کہ ان کا کیا ہوگا۔ میں سب کچھ اندھیروں کی نذر کر کے خود روشن زندگی کے خواب دیکھنے لگی۔ میں نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں ماں باپ کو دکھ دے کر کبھی سکھی رہ پاؤں گی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے......ابا......ابا تو اسی روز مر گئے ہوں گے جب میں نے ان کی عزت کا جنازہ نکالا تھا اور بھائی...... بھائی پتا نہیں کہاں ہوگا۔ کاش میں ایک بار یہ سب سوچ لیتی تو آج بے یارومددگار نہ ہوتی یوں لوگوں کے در پر نہ پڑی ہوتی، سر پہ چھت ہوتی، کوئی سائبان ہوتا میرا بھی۔ آج میں عزت سے جی رہی ہوتی۔ اپنوں میں ہوتی مگر اب تو میرے ان خالی ہاتھوں میں پچھتاوا بسیرا ڈالے ہوئے ہے جو عمر بھر ساتھ رہے گا۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا مگر میں ایسا کچھ بھی اماں جی سے نہ کہہ پائی۔ کچھ گھنٹے پہلے سراج گیلانی کی باتوں نے مجھے یہ بات بخوبی سمجھا دی تھی کہ بھگوڑی لڑکی کی اس معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔

چاہے زمانہ اس پر کتنے ہی ظلم کیوں نہ کرے۔ کسی کو بھی اس پر ترس نہیں آتا بلکہ لوگ صرف اسے گندی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کوئی عزت سے نہیں دیکھتا کیونکہ عزت جیسی کسی شے کے قابل وہ رہتی ہی کہاں ہے۔ میں چپ چاپ سوچنے لگی۔ "اگر آج میں اماں جی کو اپنی اصلیت مکمل کے بتا دیتی ہوں تو اب تک اگر ان کے دل میں میرے لیے کوئی ہمدردی یا عزت ہے تو وہ ختم ہونے میں لمحہ بھی نہ لگے گا۔ میری خاموشی میں ہی میری بھلائی تھی اور تم دونوں کی بھی۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ اب کبھی کسی سے نہیں کہوں گی کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟ یا میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟

تم دونوں کو بھی نہیں بتاؤں گی لیکن مجھے مجبوری میں یہ سب بتانا پڑ رہا ہے۔" میں نے میرا کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ پھر سانس لے کر بولی۔ "اماں نے مجھے خود سے الگ کرتے ہوئے میرے آنسو صاف کیے۔"

"تجھے پتا ہے؟ میں اپنی کلثوم کو روتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی بھی تیرے جیسی آنکھیں تھیں بالکل...... موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ اور اب میں تجھے بھی روتا نہ دیکھوں......" وہ ذرا سا مسکرائی تھیں پھر فوراً ہی ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو دھڑا دھڑ بہنے لگے۔ یقیناً ان کا دکھ بڑا تھا۔ جس کے بارے میں میں متجسس تھی۔

میں نے سامنے بیٹھے بابا جی پر نگاہ ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ میں اس وقت معما سمجھنے کی کوشش میں، دونوں کو یک بارگی دیکھنے لگی پھر اماں خود ہی بول پڑیں۔ "تجھے پتا ہے کلثوم میری اکلوتی بیٹی تھی۔ غربت زدہ زندگی میں بھی ہم نے اسے بہت لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی اسے پڑھایا لکھایا۔ ہماری آنکھوں کا نور تھی وہ۔ اس گھر کی ساری خوشیاں اسی سے وابستہ تھیں مگر......"

اماں جی نے ایک گہری سانس لی اور دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرنے لگیں۔

"مگر؟" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مگر پھر اللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے اور اکبر کو ایسی آزمائش نے آ گھیرا کہ ہم اپنی بچی کے بغیر زندگی جی رہے ہیں لیکن اسی دن اس کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔"

"مگر کیسے اماں جی؟ وہ کیسے مر گئی تھی؟" میری اپنی آواز بھی بھر آئی۔ دل تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔

"ہائے...... میری بچی...... کسی کی نظر کھا گئی اسے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ ایسے چلی جائے گی، ہمیں چھوڑ کر تو میں ساری زندگی اسے سینے سے لگا کر رکھتی۔ اس پر کسی کی بری نظر پڑنے ہی نہ دیتی۔" اماں جی نے اسی طرح روتے ہوئے کہا۔

"اماں جی ایسا کیا ہوا تھا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کلثوم، جب جوان ہوئی تو ہم نے اس کا بیاہ رچانے کا سوچا۔ ہم تھے غریب مگر اکبر نے ساری عمر کی جمع پونجی اس کی شادی میں لگا دی۔ ہم نے اس کی شادی بہت دھوم دھڑکے سے کی تھی۔ اتنی اچھی کہ بیٹے والوں کے منہ بھی کھلے کے کھلے رہ گئے۔ میری بچی بہت خوش تھی۔ ہم نے اسے خوشی خوشی رخصت کر دیا تھا مگر اس کی خوشیوں کو بری نظر کھا گئی۔" اماں

جی بول رہی تھیں۔ وہ رو بھی رہی تھیں۔ جبکہ بابا جی اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کر پائے اور روتے ہوئے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرنے کے بعد وہ پھر سے بولیں۔ "کلثوم کی برأت کے اگلے دن میں اکبر اور کلثوم کی دوست عظمٰی اس کو ناشتا دینے گئے تھے۔ رسم کے مطابق اسے ناشتے کے بعد گھر لے آئے۔ اس کی ساری سہیلیاں جمع ہو گئی تھیں۔ میری بچی بہت خوش تھی۔ بالکل کھلے ہوئے گلاب جیسی لگ رہی تھی۔ ہم سب نے مل کے اس کے لیے دن کے کھانے کا اہتمام کیا۔ اس کی پسند کے سارے کھانے بنوائے۔ دسترخوان بچھوایا، کھانا لگوایا۔ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ میں کچن میں کام کر رہی تھی۔ اکبر صحن میں بیٹھا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ۔ اتنے میں عظمٰی کا چھوٹا بھائی اس کے پیچھے آ گیا۔ وہ کمرے میں جا کر اس سے پیسے مانگنے لگا۔ وہ لڑکا بارہ یا تیرا سال کا تھا۔ اس کی بہن عظمٰی کلثوم کی پکی سہیلی تھی۔ دونوں اکٹھی بیٹھی ایک ہی تھالی میں کھانا کھا رہی تھیں۔ بھائی نے اس سے پیسے مانگے تو کھانا کھاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے نہ اٹھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کو ٹالنے لگی کہ تو جا میں گھر آ کر دیتی ہوں پیسے۔ وہ لڑکا واپس پلٹا تو دیوار پر ٹنگی اکبر کی بندوق پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر وہ بندوق اتار لی اور واپس مڑ کر اپنی بہن پر شرارت سے بندوق تانتے ہوئے بولا۔ پیسے دے ورنہ گولی سے اڑا دوں گا۔ سب کو لگا کہ بندوق خالی ٹنگی ہوئی ہے اس لیے پورے کمرے میں اس بات پر قہقہے گونجنے لگے پھر اس کی بہن عظمٰی نے بھی ہنستے ہوئے اسے طیش دلایا کہ نہیں دوں گی پیسے چلا دے گولی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اس لڑکے نے بندوق چلا دی۔ گھوڑا چڑھا ہوا تھا۔ گولی تھی اس میں مگر نشانہ میری بیٹی کے سر پر تھا۔ میری کلثوم کا سر چھروں سے روشن دان بن گیا۔ خون کے چھینٹوں سے دیوار رنگین ہو گئی تھی۔ پورے کمرے میں خون ہی خون پھیل گیا۔ ساری لڑکیاں چیختی چلاتی کمرے سے باہر بھاگ آئیں۔ میں اور اکبر بھاگ کے کمرے میں آئے تو کلثوم کا مغز کھوپڑی سے نکل کر زمین پر پڑا تھا۔" اماں جی کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ روتے روتے پھر سے بولیں۔ "میری کلثوم مر گئی۔ شادی والے گھر میں چیخ و پکار اور ماتم کا سماں تھا۔ ایک دن پہلے میری بچی لال جوڑے میں دلہن بن کر رخصت ہوئی اور ٹھیک ایک دن بعد اس کا سفید کفن میں جنازہ اٹھا۔" اماں اب زاروقطار رونے لگی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں سینے سے لگا لیا۔ وہ کافی دیر ایسے ہی روتی رہیں۔ پھر خود ہی خاموش ہو گئیں۔ اندر کا دکھ آنسوؤں کی شکل میں بہہ کر قدرے کم ہو گیا تھا۔ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ پھر سے بولیں۔ "مگر اللہ کو شاید یہی منظور تھا اسی لیے اس نے ہمیں اتنی بڑی آزمائش سے دوچار کر دیا مگر تجھے دیکھ کر لگتا ہے۔ اس نے اب تیری صورت میں ہم سے ایک اور امتحان لینے کی ٹھانی ہے۔ میری دھی، تو پریشان نہ ہو۔ تو اب میرے پاس رہے گی۔ میری کلثوم بن کر رہے گی نا؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر میں سوچنے لگی کہ اللہ نے کتنے عظیم لوگ پیدا کر رکھے ہیں جو اس کی ہر مصلحت پر خاموش ہو جاتے ہیں۔ کوئی احتجاج نہیں کرتے۔ کوئی شکوہ نہیں کرتے۔ خوشی خوشی ہر غم گلے لگا کر وہ یہ سوچ کر ہر لمحہ بہ لمحہ زندگی کی گاڑی آگے بڑھاتے رہتے ہیں کہ اللہ ان سے امتحان لے رہا ہے۔ ان دونوں کا بھی جگر کتنا بڑا ہے کہ اپنی اکلوتی بیٹی کا سر گولی سے اڑ جانے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ اس فیصلے کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر قبول کیے ہوئے ہیں تو پھر میں...... میں تو ہوں ہی خطاکار، گناہ گار اور نافرمان۔

میرا ماضی ایک بار پھر میرے سامنے تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ میں سب کچھ اللہ کی رضا اور اپنی خطاؤں کی سزا تسلیم کرتے ہوئے اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیلنے لگی۔ اماں بابا نے مجھے بیٹی بنا لیا۔ میرے سر پر شفقت کا سایہ کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا۔ میں چاہ کر بھی کبھی ان کا وہ احسان نہ اتار سکی۔ زندگی لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھنے لگی۔ سنبل چار سال کی ہوئی تو میں نے اسے قریب ہی ایک سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔ بابا کی صحت بھی دن بدن خراب رہنے لگی تھی۔ بچیاں بڑی ہونے لگیں اور ان کے اخراجات بھی زیادہ ہو گئے۔ میں نے خود اپنا بوجھ اٹھانے کی ٹھان لی۔ چونکہ میں سلائی کڑھائی کا کام جانتی تھی۔ لہٰذا قریب ہی ایک دستکاری اسکول میں، میں نے ملازمت کر لی۔ سلائی سینٹر میں پہلے میں شادی بیاہ کے کپڑے سیتی تھی پھر ساتھ ساتھ میں نے بوتیک اور گارمنٹس کے کپڑوں کے ٹھیکے لینا شروع کر دیے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹیاں آنے والی زندگی میں کسی چیز کو ترسیں۔ یا کبھی باپ کی کمی محسوس کریں۔ میں ایک ہی وقت میں اپنی بچیوں کو ماں اور باپ دونوں بن کے پالنے لگی۔ جلد

ہی انہیں سرکاری اسکول سے ہٹا کر یہ سوچتے ہوئے انگلش میڈیم میں داخلہ دلوا دیا کہ وہ لوگوں کے بچوں سے پیچھے نہ رہیں۔

اسی دوران ایک دن اماں چل بسی۔ جس دن ان کی وفات ہوئی مجھے لگا کہ حقیقی معنوں میں ایک ماں پھر سے دور ہوگئی ہے۔ اپنی جنت تو میں پیچھے چھوڑ آئی تھی مگر میری دوسری جنت بھی چل بسی۔ ان کے بعد میرے سر پر صرف بابا کا ہی ایک مضبوط سہارا رہ گیا تھا۔ اماں کے بعد بابا بھی بہت بیمار رہنے لگے تھے لیکن باپ بوڑھا بھی ہو تو سائبان کے مانند ہوتا ہے۔ ایک بوڑھے برگد کی گھنی چھاؤں جیسا۔ میں ہر لمحہ ان کی زندگی کی دعا کرتی تھی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تم اور سنبل اپنے گھر کی نہ ہو جائیں۔

تم دونوں بھی بہت خوبصورت، پُرکشش، باصلاحیت اور باکردار شخصیت کی مالک تھیں۔ شاید میری دن رات کی محنت اور تربیت کا بھی نتیجہ تھا کہ لوگ ان کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ تربیت ایسے ہو کہ کسی بات سے یہ ثابت نہ ہو کہ تم دونوں مجھ جیسی ماں کی بیٹیاں ہیں۔

سنبل کی گریجویشن مکمل ہوئی تو اس کے اچھے اچھے گھرانوں سے رشتے آنا شروع ہو گئے مگر میں نے اور بابا نے اپنی حیثیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے سینئر کی ایک دوست کے بیٹے سے اس کی بات پکی کردی۔ ریحانہ بہت اچھی خاتون تھی۔ اس کا بیٹا اجمل بھی گورنمنٹ کالج میں لیکچرار کے عہدے پر فائز تھا۔ ریحانہ نہ صرف سنبل بلکہ تم کو بھی اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے پسند کر چکی تھی بلکہ اس کی تو یہ خواہش تھی کہ اپنے دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادی کرے۔ میری دونوں بچیاں ایک ہی دن اپنے گھر بیاہ کر لے جائے۔ ہمیں فی الحال کوئی اعتراض نہیں تھا مگر بابا نے یہ سوچ کر اس وقت تمہاری شادی کے لیے انکار کر دیا، نہ جانے ریحانہ ساس کے روپ میں کیسی ثابت ہو۔ اگر سنبل ان کے گھر خوش ہوئی تو تم کو بھی ان کے چھوٹے بیٹے سے بیاہنے میں کوئی اعتراض نہیں کیونکہ اس کے دونوں ہی بیٹے انتہائی لائق باصلاحیت اور پُروقار شخصیت کے مالک تھے۔

تم دونوں نے کبھی میرے کسی فیصلے سے انکار نہیں کیا تھا۔ تم کبھی کبھار ضد کر لیا کرتی تھی۔ تاہم سنبل ہمیشہ ہی ہر بات خوش دلی سے مان لیا کرتی تھی۔ اب رشتے کی بات بھی میرے، بابا اور ریحانہ کے درمیان طے پا گئی تھی۔ جلد ہی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔ میں نے شادی سے کچھ دن قبل ہی سنبل کو بتایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا اور ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ ہر ماں اپنی بیٹی کو جانتی ہے۔ سنبل نے خوشی سے میرا فیصلہ قبول کر لیا تھا پھر میں جلد ہی سنبل کی شادی کر کے اس کے فرض سے سبکدوش ہوگئی۔ شادی کے دن ہی باتوں باتوں میں ریحانہ نے تم کو بھی مذاق سے بہو کہہ کر بلایا تھا۔ تب بظاہر تو تم نے برا نہ مانا تھا، مگر تمہارے دل میں کیا تھا؟ یہ میں نہ جان پائی۔ میں جو بھی اس بات پر مطمئن تھی کہ اپنی بچیوں کی ایک مثالی تربیت کی ہے۔ ایسی کہ وہ کبھی کسی برائی کے قریب بھی نہیں بھٹکیں گی مگر آج مجھ پر جو انکشاف ہوا تھا بلکہ جو کچھ دیکھا اور سن لیا۔ اس نے مجھے یہ بات سمجھا دی کہ میں تمہاری اچھی ماں نہ بن سکی تھی مجھے میری قسمت نے نہ اچھی بیوی بننا نصیب کیا اور نہ ہی میں ایک اچھی ماں ثابت ہوئی۔ وقت نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔ میں نے آج اپنی زندگی کا وہ باب تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا جسے میں اپنے اندر بھی کب کی بند کر چکی تھی۔ میں بھولی تو نہیں تھی۔ مگر یاد بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی جو ہو گیا سو ہو گیا۔ وقت بھی واپس نہیں آئے گا بلکہ اس وقت کو بھی بھولتے ہوئے مجھے اپنا حال اور اپنی بچیوں کا مستقبل بہتر بنانا ہوگا مگر تاریخ نے کیسے خود کو دہرایا تھا یہ میں نے آج جانا تھا۔

جو کتاب میں بند کر چکی تھی وہ آج مجھے اپنی بچی کے سامنے کھول کر رکھنا پڑی۔ صرف یہ سوچ کر کہ وقت اور قسمت نے جو پچھتاوا میرے حصے میں لکھا۔ وہ تمہارے .... حصے میں نہ آئے۔

میں مسلسل بول رہی تھی۔ اپنی زندگی کی اس پوشیدہ کتاب کا ایک ایک ورق پلٹ کر میرا کو سنا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سنتی چلی جا رہی تھی۔ بغیر کوئی سوال کیے بغیر کوئی دلیل چاہے۔ شاید میرے لہجے کی سچائی نے اسے میری ہر بات کا یقین دلا دیا تھا۔

مسلسل چپ چپ وہ نظریں جھکائے مجسمۂ حیرت بنی بیٹھی تھی۔ یوں جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا ہوا ہے۔

”میرا...... اگر وہ تجھ سے واقعی محبت کرتا ہے تو تجھے دن دہاڑے اس گھر سے سب کے سامنے رخصت کر کے لے کے جائے گا۔“ میں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یاد رکھنا میری بچی...... جو عاشق اندھیری رات میں چوروں کی طرح دیواریں پھلانگ کر آتے ہیں وہ سوائے عزت پر ڈاکا ڈالنے کے اور کچھ نہیں کرتے۔“

میں اس کی آنکھوں میں بغور دیکھ رہی تھی۔ جبکہ اس نے فوراً ہی نظریں جھکالی تھیں پھر وہ بلک بلک کر میرے سینے سے لگتے ہی رونے لگی تھی۔ میں نے اسے رونے دیا کیونکہ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں۔ اس کے رونے کی وجہ فراز نہیں بلکہ اس کا وہ نام نہاد باپ تھا۔ جس کے ہوتے ہوئے بھی اپنی ساری زندگی یتیموں کی طرح گزار دی تھی۔

سنبل نے تو مجھ سے کبھی بھی اپنے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھا تھا کیونکہ جب میں اس طوفانی رات میں سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھی تب سنبل تین سال کی تھی۔ اب بھی شاید کہیں نہ کہیں سنبل کے دماغ میں بچپن کی اس بھیانک رات کا کوئی نہ کوئی دھندلا سا منظر قید تھا مگر تم مجھ سے ہمیشہ پوچھا کرتی تھیں کہ ہمارا باپ کون ہے۔ کہاں ہے اور میں ہمیشہ یہ کہہ کر بات ختم کر دیا کرتی تھی کہ تمہارا باپ ایک حادثے میں مارا گیا تھا مگر انہیں پھر بھی تسلی نہ ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ میں سوائے خاموش رہنے کے کوئی جواب نہ دے پاتی تھی۔ میں چاہ کر بھی اسے تمہارے باپ کی اصلیت نہ بتا پائی تھی۔

مجھے یاد ہے۔ ایک بار تمہارے اسکول کی سہیلی ہمارے گھر آئی تھی۔ تم نے اس کو میرا تعارف انتہائی گرم جوشی سے کروایا تھا کہ یہ میری امی ہیں اور پھر جب اس کی دوست نے پوچھا تھا تمہارے بابا کہاں ہیں تو تمہاری ساری گرم جوشی ماند پڑ گئی تھی۔ تم نے ہلکی سی آواز میں بس اپنی دوست سے اتنا کہا تھا کہ میرے بابا کی ڈیتھ ہو گئی تھی بہت پہلے۔ تمہاری دوست پھر معذرت اور افسوس کرنے لگی تھی۔ تب بھی۔ تب بھی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اور باپ کی کمی کا شدید احساس میں نے خود دیکھا تھا۔ آج تمہیں بلک بلک کر روتا دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ کاش میں اپنی بچی کو شروع دن سے ہی اس بات سے آگاہ رکھتی تو آج تمہارے دل میں بنا اپنے نام نہاد باپ کا عظیم مرتبہ یوں گر کر پاش پاش تو نہ ہوتا۔ جس کی کرچیاں تمہیں بھی اندر سے چھلنی کر رہی ہیں۔ بہت دیر تک میں ایسے ہی روتی رہی اور پھر خود ہی خاموش ہو گئی۔

”اماں...... مجھے معاف کر دیں اماں، جانے انجانے میں، میں کیا کر گزرتی مجھے معاف کر دیں پلیز۔“ میرا کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”کوئی بات نہیں میری بچی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے وقت پر میری آنکھ کھول دی۔ شکر ہے خدا کا کہ مجھ گناہ گار کی کوئی نیکی سامنے آ گئی یا پھر شاید خدا نے میرے برسوں پرانے کیے گئے گناہ کو بخش دیا جو تو بھٹکنے سے پہلے ہی سنبھل گئی ورنہ میری تو گزر گئی تھی۔ باقی کی بھی کٹ جاتی مگر تیری قسمت میں کس قدر ذلت اور خسارے آتے اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں۔ میری یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھنا۔ ہر بار خدا کلثوم کے ماں باپ کو فرشتہ بنا کر سائبان نہیں بھیجتا بیٹا بلکہ آج کل کے دور میں تو چپے چپے پر سراج گیلانی جیسے بھیڑیے مکھیوں کی طرح منڈلا رہے ہوتے ہیں۔ بظاہر صاف ستھرے مگر اندر سے اتنے ہی کریہہ اور غلیظ۔“

میں نے پھر سے اس کی آنسوؤں سے تر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ چپ چاپ میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی۔ میں بھی دیوار سے کمر ٹکائے نیم دراز ہو گئی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ وہ یونہی روتے روتے نجانے کب سو گئی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اب وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گی۔

☆.....☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ ویسے ہی میری گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ بخار سے تپ رہی تھی۔

میں اسے چارپائی پر ٹھیک طریقے سے لٹانے کے بعد اس کے لیے گولیاں اور ناشتا بنا کر لے آئی مگر اس نے بہت مشکل سے دو تین نوالے کھائے اور چائے کے ساتھ گولیاں پھانک لیں۔ وہ پھر سے چارپائی پر لیٹ کر چپ چاپ چھت کو گھورنے لگی۔ میں نے گھر کے قریب ہی بنے کلینک والے ڈاکٹر کو بلوا لیا۔ ڈپریشن کی وجہ سے بخار تھا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد سکون کے لیے اسے انجکشن لگایا اور دوا دے کر چلا گیا۔ شام تک وہ سوئی رہی۔ میں اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر وہ شام کو جاگی مگر بغیر کوئی بات کیے چپ چاپ خلا کو گھورتی رہی۔ مسلسل اسے خاموش دیکھ کے میرا دل پریشان ہو رہا تھا۔ میری پھول سی بچی ایک ہی رات میں کس قدر مرجھا گئی تھی۔

میرا دل چاہتا وہ کوئی بات کرے۔ وہ کچھ بولے۔ کچھ پوچھے مگر اس کی چپ مجھے بہت بے چین کرنے لگی تھی۔

”میرا بیٹی...... مجھے تجھ سے بات کرنی ہے۔“ مسلسل اسے خاموش دیکھتے ہوئے میں نے بالآخر اس سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''جی بولیں امی۔'' اس نے اسی طرح چھت پر نظریں لگائے دیر سے جواب دیا۔

''بیٹا میں نے ایک بات سوچی ہے۔ تم فراز کو بولو اپنی ماں کو بھیجے۔ یا اگر تم کہو تو میں چلی جاتی ہوں۔ تیرے اور اس کے رشتے کی بات کروں گی۔ بس تو پریشان نہ ہو۔ میری بچی سب ٹھیک ہو جائے گا......''

میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے یہی بہتر لگا تھا۔

''نہیں امی...... آپ کسی کے پاس نہیں جائیں گی۔ ایک طرف آپ میری عزت وار زندگی کی بات کرتی ہیں دوسری طرف خود ہی ان لوگوں کے در پر بے عزت ہونے جانا چاہتی ہیں کیونکہ بقول فراز کے اس کی ماں میرے لیے راضی نہیں۔'' اس کے لہجے میں خود اعتمادی کی جھلک تھی۔

''مگر بیٹا، ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے نا۔'' میں نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ سب سمجھ چکی تھی۔

''اگر مگر کچھ نہیں امی...... میں نے کہہ دیا ہے آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ بس جتنی تکلیفیں آپ نے ہماری وجہ سے برداشت کرنی تھیں کرلیں، اب بس۔ اگر اس کو مجھ سے محبت ہوتی تو وہ خود آئے گا۔ اپنی ماں کو بھی لائے گا۔ میرا رشتہ لینے ہمارے گھر...... آپ اس کے گھر جا کر میرے لیے اس کی ماں سے بھیک نہیں مانگیں گی۔ اب آپ فکر نہ کریں مجھے فراز سے دوری پر کوئی غم نہیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اندھیری رات میں عاشق نہیں، میرے باپ کے جیسے عزت کے لٹیرے آیا کرتے ہیں۔ اگر وہ دن میں آسکتا ہے عزت سے تو ٹھیک ورنہ میری بھی شادی آپ سنبل کی طرح اپنی مرضی سے کیجیے گا۔'' اس کی آواز میں اب لرزش تھی۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔

میرا کی آنکھوں میں اعتماد تھا۔ ایک ہی دن میں میری میرا کتنی بڑی ہوگئی تھی۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ میں نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے اپنے آنسو صاف کیے پھر آگے بڑھ کر میرا کو گلے لگالیا۔

☆......☆

ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میرا میں اب لاابالی پن ختم ہو چکا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بات نہ کرتی تھی۔ اگر کرتی تھی تو ایسی ہی کوئی بات کرتی کہ میں دنگ رہ جاتی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔ تاہم ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ دنیا جہاں کا درد سینے میں چھپا کر جیتے رہتے ہیں، اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مرتے رہتے ہیں۔

میری میرا جو سوئی چبھنے پر بھی چیخ اٹھتی تھی۔ اب اپنے اندر اتنے بڑے بڑے درد چھپائے بیٹھی تھی۔

میں نے بہت انتظار کیا کہ فراز کی ماں رشتہ لے کر آجائے مگر وہ رشتہ لے کر تو نہ آئی۔ ایک دن فراز کی شادی کا دعوت نامہ لے آئی۔ اس کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ تھی۔ تب میرا دل خون کے آنسو رویا تھا اپنی میرا کے لیے میرا کا راستہ غلط تھا مگر محبت تو اس نے بھی کی تھی فراز سے۔ محبت کیسے خون بہتی ہے جگر کا۔ کس طرح ماس کھاتی ہے۔ اس کا اندازہ تھا مجھے مگر میرا، میرا میں انتہا کا ضبط تھا۔ اس نے یہ درد بھی چپ چاپ اندر ہی اندر سہہ لیا تھا۔

زندگی آگے بڑھنے لگی۔ سنبل اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ ڈیڑھ سال بعد اللہ نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ سنبل کے گھر بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ مجھے جب خبر ملی کہ سنبل کے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو دل کو عجیب سا دھڑکا لگا۔ بیٹی کی خبر نے دل بہت بے چین کر دیا تھا۔ میں بابا اور میرا کو لے کر فوراً سے پہلے سنبل کے گھر پہنچی مگر وہاں پہنچتے ہی میری ساری بے چینی یوں رفو چکر ہوگئی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔

سنبل کے گھر میں عید کا سماں تھا۔ اس کی ساس اور شوہر خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ کھڑے کھڑے صدقے کے بکرے منگوائے گئے، جشن شکرانے کے نفل اور نہ جانے کتنی منتیں ان لوگوں نے مان رکھی تھیں۔ جو وہ خوشی خوشی پوری کر رہے تھے۔ سب کے اصرار پر میں نے خود بچی کا نام ''نوید سحر'' رکھا تھا۔ وہ واقعی سب کے لیے نوید بن کے آئی تھی کیونکہ اسی دن میرا اور امتیاز کی بھی شادی کی بات پکی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ بھی طے ہوئی تھی۔

اس دن ایک ساتھ ہمیں اتنی خوشیاں دکھائی تھیں رب نے۔ گھر میں خوشی کا سماں دیکھ کر مجھے اماں کی کہی بات شدت سے یاد آئی تھی۔

''بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔'' کاش میں بھی اپنے والدین کے لیے رحمت ثابت ہوتی۔

کاش......!

مگر یہ پچھتاوا ہمیشہ میری رگوں میں خون کی طرح دوڑے گا۔ قبر تک ساتھ جائے گا۔ اللہ کل جہاں کی بچیوں کی عزت پردے میں رکھے...... اور والدین کے لیے فخر کا باعث بنائے...... آمین!!

شکست

محترم عذرا رسول

السلام علیکم

لوگ دوسروں کی سچ بیانی لکھتے ہیں لیکن میں اپنی خود بیتی بھیج رہی ہوں۔ یہ میری آپ بیتی ہے جو ہر لڑکی کے لیے سبق ہے۔ میری گزارش ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے تاکہ کوئی اور میری غلطی کو دہرا نہ دے کہ عورت کا اصل گھر کون سا ہے۔

شائستہ

(لاڑکانہ)

میں بچپن سے ہی ضدی اور خود سر واقع ہوئی ہوں۔ ہمیشہ اپنی من مانی کی جو دل نے کہا وہی کیا جو چیز پسند آگئی اسے ہر قیمت پر حاصل کیا اگر مجھ سے کبھی کوئی غلطی ہوتی تو کبھی اس پر ندامت یا پشیمانی کا اظہار نہیں کیا۔ ہمیشہ یہی سمجھا کہ جو کر رہی ہوں، وہی ٹھیک ہے اور مجھے اپنے کسی بھی عمل کا جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میری پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں کے لاڈ پیار نے مجھے ضدی، مغرور اور سرکش بنا دیا

تھا۔ میں اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں دولت، اختیار اور اقتدار کا راج تھا۔ میرے والد علاقے کے بہت بڑے جاگیردار تھے اور دور دور تک ان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ حکومت کوئی بھی ہو۔ وہ ہمیشہ اقتدار میں رہتے۔ انہوں نے ہمیشہ حکمراں پارٹی کا ساتھ دیا۔ وہ چڑھتے سورج کے پجاری تھے اور ہمیشہ برسر اقتدار پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی کے رکن منتخب ہو جاتے۔ عام طور پر یہ لوگ پارٹی ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے لابنگ کرتے ہیں لیکن ان کا معاملہ مختلف تھا۔ سیاسی پارٹیاں انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں کرتی تھیں کیونکہ سب یہی سمجھتے تھے کہ ان کے مقابلے پر اس حلقے سے کوئی دوسرا امیدوار منتخب نہیں ہو سکتا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ دراصل یہ ہماری خاندانی نشست تھی اس سے پہلے میرے دادا یہاں سے منتخب ہوتے رہے۔ غیر جمہوری دور میں بھی بابا کی حکمرانی قائم رہتی۔ ضلع اور تحصیل کے اعلیٰ افسران ان کی دہلیز پر سجدہ کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے۔ ان افسروں کو ملازمت کے سلسلے میں کوئی بھی مشکل پیش آتی تو وہ دوڑے دوڑے بابا کے پاس ہی آتے اور وہ بھی ان کے مسائل حل کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔

ایسا نہیں کہ وہ صرف بڑے لوگوں اور سرکاری افسروں سے تعلقات بنانے کو ترجیح دیتے تھے بلکہ ان کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ خاص طور پر علاقے کے غریب لوگوں اور اپنی زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہی لوگوں کی محنت سے ہمارے کھیت سرسبز اور ہمارے گھر میں خوش حالی ہے اس لیے ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ان کی ہر طرح سے مدد کریں۔ گاؤں کے سب لوگ جانتے تھے کہ ان کے دروازے سے کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا اس لیے ہر کوئی اپنی ضرورت کے لیے ان کی طرف دیکھتا۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہو، علاج کروانا ہو یا کچے مکان کی مرمت کرنی ہو۔ بابا اس کی ضرورت کے مطابق اس کی مدد کرتے۔ قرض دینے کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں تھا جو دے دیا سو دے دیا۔

میں اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ اس کے بعد چار بھائی تھے۔ کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ ایک تو میں پہلوٹھی کی اولاد تھی، دوسرے چار بھائیوں کی اکلوتی بہن، ماں باپ تو صدقے واری تھے ہی لیکن بھائی بھی میرے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ میرا ہر کام دوڑ دوڑ کر کرتے۔ اس طرح مجھے شروع سے ہی حکم چلانے کی عادت پڑ گئی۔

ہمارے علاقے میں پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ لڑکے بس یونہی واجبی سی تعلیم حاصل کرلیا کرتے تھے حالانکہ بابا نے کوشش کر کے گاؤں میں پرائمری اسکول کھلوایا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ گاؤں کے بچے تعلیم حاصل کریں تاکہ انہیں زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع میسر ہوں لیکن گاؤں کے لوگوں کی موٹی عقل میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف پانچ جماعتیں پڑھ لینے سے ان کے لڑکے عالم فاضل نہیں بن جائیں گے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے قصبہ کے ہائی اسکول جانا پڑتا جو گاؤں سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا اور ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ لڑکوں کو وہاں بھیج سکیں۔ وہ وقت گزاری کے لیے انہیں پرائمری اسکول میں داخل تو کرواتے لیکن جونہی وہ دس بارہ سال کے ہوتے انہیں کسی کام پر لگا دیا جاتا۔

ان حالات میں لڑکیوں کے اسکول جانے یا پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب میں نے شعور کی منزل میں قدم رکھا تو میرے لیے ایک استانی صاحبہ کا بندوبست کر دیا گیا جو مجھے گھر پر قرآن شریف پڑھانے آتی تھیں۔ مجھ سے چھوٹا نوید تھا۔ اسے بھی سیپارہ پڑھانے کے لیے مولوی صاحب آنے لگے۔

بابا اپنے چاروں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے اور انہوں نے ابھی سے ہی ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے منصوبے کے مطابق ایک بیٹا فوج، دوسرا سول سروس اور تیسرا کوئی کاروبار یا انڈسٹری لگاتا جب کہ چوتھا بیٹا زمین دار بن کر علاقہ پر حکمرانی کرتا اسی لیے وہ اپنے بیٹوں کو بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھانا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور چچا سے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ نوید کو پڑھنے کے لیے لاہور کے ایچی سن یا مری کے پبلک اسکول بھیج دیا جائے۔ امی انہیں اپنی نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اس فیصلے کی دبی زبان میں مخالفت کی لیکن بابا نے انہیں سمجھایا کہ گاؤں کا اسکول صرف پرائمری تک ہے اور اس کا معیار بھی کچھ اچھا نہیں۔ اسے بعد میں کسی دوسرے اسکول میں جانا ہوگا۔ مجبوراً امی نے خاموشی اختیار کر لی اور نوید کو مری

بھیج دیا گیا۔

اس سے پہلے میں نے کبھی اسکول جانے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا لیکن جب نوید کو اسکول میں داخل کرایا گیا تو میں نے بھی ضد شروع کر دی۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ مجھ سے چھوٹا نوید اسکول چلا جائے اور میں گھر میں بیٹھی رہوں۔ بابا نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ انہوں نے ہمیشہ میری ہر خواہش پوری کی تھی چنانچہ اس بار بھی انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اب سوال یہ تھا کہ میری فرمائش کیسے پوری کی جائے۔ مجبوراً انہوں نے مجھے قصبہ کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ میرے لیے ایک گاڑی مخصوص کر دی گئی۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک ملازمہ اور دو گارڈز میرے ساتھ ہوتے۔ ڈرائیور اور گارڈز تو گاڑی میں بیٹھے رہتے جب کہ ملازمہ میرے ساتھ اسکول کے کمپاؤنڈ میں جاتی اور کلاس روم کے باہر ایک بینچ پر بیٹھی میری کلاس ختم ہونے کا انتظار کرتی۔

اسکول میں میری کوئی سہیلی نہ بن سکی۔ وہاں سب غریب اور متوسط گھرانوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ان میں حد درجہ احساس کمتری تھا اس لیے وہ میرے قریب آنے سے بھی ڈرتی تھیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ میرے شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے مرعوب تھیں۔ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میری کوئی سہیلی ہو۔ اس کے ساتھ ہاف ٹائم میں اسکول کے گیٹ پر جاؤں اور باہر کھڑے ہوئے ٹھیلے سے دہی بھلے کی چاٹ کھاؤں لیکن امی نے مجھے سختی سے باہر کی کوئی چیز کھانے سے منع کیا تھا اور ملازمہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ میرے ریفریشمنٹ کے لیے گھر کی بنی ہوئی چیزیں اور پانی کی بوتل ساتھ لے جایا کرے۔ ہاف ٹائم کے دوران وہ کلاس روم میں ہی میری ڈیسک پر سب چیزیں رکھ دیتی اور خود بھی ہاتھ باندھے دروازے میں کھڑی رہتی۔

ایک دن یوں ہوا کہ ہاف ٹائم میں سب لڑکیاں کلاس سے باہر چلی گئیں لیکن فرزانہ وہیں بیٹھی رہی۔ جب ملازمہ میری ڈیسک پر پلیٹیں لگانے لگی تو وہ باہر جا کر کھڑی ہو گئی میں نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ ”یہاں کیوں کھڑی ہو۔ کچھ کھاؤ گی نہیں؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسائل حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
[illegible]
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
[illegible]
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس فون نمبر 0301-2454188
سرکولیشن منیجر سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

میں لاکھ مغرور، ضدی اور خودسر سہی لیکن بابا کا اثر مجھ میں بھی آیا تھا اور لوگوں کو پریشان دیکھ کر میرے اندر ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ فرزانہ کا جواب سن کر میرا دل اندر سے کٹ گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں آلو بھرے پراٹھے اور انڈوں کا آملیٹ کھاؤں اور میری کلاس فیلو بھوکی کھڑی رہے۔

میں نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''تم میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن میرے اصرار پر اس نے چند لقمے لے لیے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے ابا کسی دفتر میں کلرک ہیں۔ چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ امی محلے کے لوگوں کے کپڑے سیتی ہیں تب کہیں مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔

اس وقت میں بہت چھوٹی تھی اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ غربت کیا ہوتی ہے۔ فرزانہ سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے پاس پیسے نہ ہوں، وہ غریب ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے بچے چھولوں کی پلیٹ بھی نہیں خرید سکتے۔ میں نے گھر آکر بابا سے کہا کہ غربت کیسے دور کی جا سکتی ہے؟

وہ میرا سوال سن کر چونک گئے اور حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ''تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

اس پر میں نے انہیں صبح کا واقعہ سنایا تو وہ بولے۔ ''یہ قدرت کا نظام ہے۔ ہم اس میں کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا پتا آج وہ لوگ غریب ہیں۔ کل ان کے پاس بھی پیسا آجائے۔ تم ان باتوں میں سر مت کھپاؤ۔''

''لیکن میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھوکی رہے۔''

''ٹھیک ہے تم اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلیا کرو۔''

دوسرے دن پھر یہی ہوا۔ وہ کلاس روم کے باہر جاکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اسے دعوت دی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ''امی نے منع کر دیا ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہیں کہ امیر لوگوں سے دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ آج تم اس کی لائی ہوئی چیزیں کھا رہی ہو۔ کل تمہیں بھی اسے کچھ کھلانا پڑے گا۔''

''امی کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ کون سا دیکھنے آرہی ہیں۔''

''میں اپنے گھر والوں سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔''

دن یونہی گزرتے رہے۔ اس کے بعد اس نے کبھی میرے ساتھ کھانا نہیں کھایا۔ جب اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ ہاف ٹائم میں گیٹ پر جاکر اپنے لیے کھانے کی کوئی چیز خرید لیتی ورنہ کلاس سے باہر نکل کر برآمدے میں ٹہلتی رہتی۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ وہ بھی میری طرح مغرور ہے لیکن جب تھوڑی سی بڑی ہوئی تو مجھے بہت سی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مغرور نہیں بلکہ خوددار ہے۔ نہ جانے غریبوں میں اتنی خودداری کیوں ہوتی ہے۔

اس دن کے بعد مجھے اس سے چڑ سی ہوگئی اور میں نے اسے منہ لگانا چھوڑ دیا۔ بس رسمی بات چیت ہو جاتی تھی۔ دراصل مجھے ایسے لوگ اچھے نہیں لگتے جو اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں۔ فرزانہ بھی انہی میں سے تھی۔ شاید اسے اپنی ذہانت اور قابلیت پر ناز تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کلاس کی سب سے ذہین لڑکی تھی اور ہمیشہ ہر امتحان میں اوّل آتی تھی۔ اس وجہ سے بھی میں اس سے جلنے لگی تھی کو کہ میرے نمبر بھی اچھے آتے تھے لیکن میں کبھی کلاس میں پوزیشن نہ لے سکی۔

بابا کا خیال تھا کہ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد میرا شوق پورا ہو گیا لیکن جب میں نے ہائی اسکول میں داخلہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ سٹپٹا گئے اور پہلے کی طرح انہوں نے رٹے رٹائے جملے بولنا شروع کر دیے۔ ''کیا کرو گی اتنا پڑھ کر، تم نے کون سا نوکری کرنی ہے۔ آرام سے گھر پر بیٹھو۔ کیوں اپنے دماغ کو تھکاتی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔''

ان کے کہنے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میں نے آگے پڑھنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اگر ان کی بات مان کر اپنا تعلیمی سلسلہ ختم کر دیتی تو چاروں چھوٹے بھائی پڑھائی میں مجھ سے آگے نکل جاتے جو مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا اس لیے میں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ مجبوراً بابا کو ایک بار پھر میری بات ماننا پڑی اور انہوں نے میرا چھٹی جماعت میں داخلہ کروا دیا۔ یہاں بھی ملازمہ میرے ساتھ ہوتی تھی لیکن فرزانہ کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ اس کے ابو کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا اور وہ بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

میں بڑے شوق اور لگن سے پڑھتی گئی۔ ہائی اسکول میں بھی میری کسی لڑکی سے دوستی نہ ہو سکی کیونکہ وہ سب وڈیرے کی بیٹی سمجھ کر مجھ سے دور رہتی تھیں۔ خدا جانے وہ مجھ سے ڈرتی تھیں یا احساس کمتری کا شکار تھیں۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میری کوئی سہیلی ہو جس سے میں خوب باتیں کروں۔ اس کے ساتھ اسکول کے برآمدہ اور میدان کا چکر لگاؤں، میں نے خود ایک دو لڑکیوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے قریب آنے سے کتراتی تھیں چنانچہ کسی لڑکی سے بھی میرا تعلق سلام دعا سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تو پورے علاقے میں دھوم مچ گئی۔ اس روز گاؤں میں جشن کا سماں تھا۔ دور دور سے جاگیردار، زمین دار اور بڑے بڑے سرکاری افسر بابا کو مبارک باد دینے ہماری حویلی پر آتے رہے۔ حویلی پر زبردست چراغاں کیا گیا تھا۔ بابا نے اپنے دوستوں کی تواضع کے لیے لاہور سے مشہور ڈانسرز بلائی تھیں۔ رات بھر مجرا ہوتا رہا۔ لاکھوں روپے لٹا دیے گئے۔ اس خوشی کے موقع پر بابا اپنے غریب مزارعوں اور گاؤں والوں کو نہیں بھولے انہوں نے ٹوکرے بھر بھر کر مٹھائی تقسیم کی۔ تین دن تک حویلی پر لنگر بنتا رہا۔ لوگ پتیلیاں اور دیگچے بھر بھر کر کھانا لے جاتے اور بابا کو ہاتھ پھیلا کر دعائیں دیتے۔

اب بابا نے میری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ہمارے خاندان میں چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا رواج تھا لیکن میری پلاننگ کچھ اور تھی۔ میں نے اس پر عمل کرتے ہوئے کالج میں داخلہ لینے کا اعلان کر دیا لیکن بابا نے اس بار بھرپور مخالفت کی اور صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی مجھے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں بھی ان ہی کی بیٹی تھی، سرکش، ضدی اور اپنی بات منوانے والی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی راضی نہیں ہو رہے تو میں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ بابا یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی چہیتی بیٹی ایک وقت بھی بھوکی رہے۔ انہوں نے مجھے کمرے سے نکالنے اور کھانا کھلانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ دھمکیاں دیں، خوشامد کی، طرح طرح کی ترغیبات دیں لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی اور صاف کہہ دیا کہ جب تک وہ میرا مطالبہ تسلیم نہیں کرتے میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

ایک بار پھر بابا کو ہار ماننا پڑی۔ انہوں نے میرا لاہور

''لاہور کی سب سے بڑی پیداوار یہاں کے طلباء ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ طلباء کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں، قسم اوّل جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلباء خاص طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں۔ بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں لیکن سب کی تصویر ایک البم میں جمع کر کے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک خط لکھتے رہتے ہیں، دوسری قسم جلالی طلباء کی ہے، ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس لیے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے ہوئے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی اس لیے ہاسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلباء کی ہے یہ اکثر روپ، اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر با آواز بلند تبادلہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے ہیں۔ جسمانی صحت کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے علی الصباح پانچ چھ ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہاسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلباء کی ہے یہ طلباء کی خالص ترین قسم ہے ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا، کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اس قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے۔ تعلیم، نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔''

(اقتباس لاہور کا جغرافیہ)

کے کالج میں داخلہ کرادیا لیکن ساتھ ہی شرط رکھ دی کہ جیسے ہی میرا رشتہ طے ہوا میں سب کچھ چھوڑ کر گاؤں واپس آجاؤں گی۔ میں نے یہ شرط قبول کرلی کیونکہ میں جانتی تھی کہ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ میری شادی اپنے ہم پلہ لوگوں میں کرنا چاہتے تھے جب کہ ان کے جاننے والے جاگیرداروں اور بڑے زمین داروں میں کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جس سے میری شادی ہوسکتی جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ ان کی شادیاں ہوچکی تھیں اور باقی مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ یہی صورتِ حال خاندان میں بھی تھی کیونکہ امی اور بابا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور میں ان کی پہلی اولاد تھی اس لیے خاندان میں بھی سب لڑکے مجھ سے چھوٹے تھے۔

لاہور میں رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہاں ہماری اپنی کوٹھی تھی جس میں چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ انہیں زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ کافی عرصہ قبل کاروبار کی غرض سے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہوں نے پہلے چھوٹے موٹے ٹھیکے لینا شروع کیے پھر انہیں ایک موقع کی جگہ مل گئی۔ وہاں انہوں نے پیٹرول پمپ بنالیا۔ اس کام میں انہیں بہت فائدہ ہوا پھر انہوں نے کنسٹرکشن کا کام شروع کردیا اور فلیٹ، بنگلے دکانیں بنا کر لوگوں کو قسطوں پر دینے لگے۔ جب میں لاہور گئی تو وہ ایک معروف بلڈر بن چکے تھے اور تعمیراتی کمپنی کے علاوہ ایک سپر اسٹور اور دو پیٹرول پمپ کے مالک تھے۔ ان کا ایک لڑکا مقصود اور دو بیٹیاں روذینہ اور شبانہ تھیں یہ تینوں مجھ سے بہت چھوٹے تھے اور میرا بہت ادب کرتے تھے۔

چچا نے میرے لیے اوپر کی منزل پر ایک کمرا تیار کروایا اور اس میں ضرورت کی ہر چیز یعنی اے سی، بیڈ روم فرنیچ، ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر اور ٹیلی فون وغیرہ مہیا کردی۔ چچا نے کالج آنے جانے کے لیے ایک گاڑی بمع ڈرائیور میرے لیے وقف کردی تھی۔ جمعہ کی شام کو میں اسی گاڑی میں گاؤں جاتی اور اتوار کی شام واپس آجاتی۔ یہاں بھی ایک ملازمہ میرے لیے مخصوص کردی گئی تھی لیکن اب وہ میرے ساتھ کالج نہیں جاتی تھی بلکہ گھر پر ہی رہ کر میرے کام کیا کرتی۔

کالج کا ماحول اسکول سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں امیری اور غریبی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کالج میں امیر گھرانوں کی لڑکیاں بھی پڑھ رہی تھیں اور متوسط گھرانوں کی لڑکیاں بھی ملازمت کے حصول یا رشتوں کے انتظار میں وقت گزارنے کے لیے داخلہ لینے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ سب لڑکیوں نے اپنے اپنے مزاج اور حیثیت کے مطابق گروپ بنا رکھے تھے لیکن میں کسی گروپ میں فٹ نہیں ہورہی تھی۔ ویسے بھی میری نظر میں گروپ بنانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ اس طرح آدمی پابند ہوجاتا ہے اور اسے وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو گروپ کے دوسرے لوگ چاہتے ہیں۔ میں آزاد فطرت کی مالک تھی اور آزاد رہنا پسند کرتی تھی اس لیے کسی گروپ میں شامل نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ لڑکیوں سے دوستی ہوگئی تھی۔ انہی کے ساتھ فارغ وقت گزارتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ چار سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے اور میں نے بی اے کرلیا۔ ابھی تک میرے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میں ابھی بیس کی تھی لیکن امی مجھے دیکھ کر یوں ٹھنڈی آہیں بھرتیں جیسے میری شادی کی عمر نکلی جارہی ہو۔ بابا بھی میرے رشتے کے لیے بہت پریشان تھے۔ چچا نے انہیں سمجھایا کہ ضروری نہیں، میری شادی کسی جاگیردار کے بیٹے سے ہو۔ اگر کوئی کھاتے پیتے گھر کا رشتہ آجائے تو اس پر بھی غور کیا جاسکتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ میں فی الحال لاہور میں ہی رہوں کیونکہ وہاں کسی اچھے لڑکے سے میرا رشتہ ہونے کا زیادہ امکان تھا۔

بابا کہہ چکے تھے کہ رشتہ ہونے تک میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہوں۔ میں نے بھی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس بار خلاف توقع بابا نے مخالفت نہیں کی۔ شاید وہ بھی حالات سے سمجھوتا کرچکے تھے۔ انہوں نے یہی سوچا ہوگا کہ گھر میں فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرلوں۔ دوسرے یہ کہ اس طرح میرے لاہور میں رہنے کا جواز بھی بن جائے گا۔

پہلے دن ہی مجھے یونیورسٹی میں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں جونہی اپنے ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو مجھے کوریڈور میں فرزانہ کھڑی ہوئی نظر آئی گو کہ میں اسے تقریباً نو سال بعد دیکھ رہی تھی اور وہ پہلے کے مقابلے میں خاصی بدل گئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ شاید اسے بھی میرا چہرہ شناسا لگا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچی تو اس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''تم.....تم شائستہ ہونا۔''

''اور تم فرزانہ؟''

''سو فیصد۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم بالکل نہیں بدلیں۔ ویسی کی ویسی ہی ہو۔ گوری چٹی، نازک اور اسمارٹ۔''

''لیکن تم بہت بدل گئی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے باوجود میں نے تمہیں پہچان لیا۔''

''ہاں۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''وقت بہت کچھ بدل دیتا ہے۔ پہلے دو پیریڈ فری ہیں۔ آؤ کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

اس کا حلیہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ خود تو بدل گئی لیکن اس کے حالات نہیں بدلے بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئے ہیں۔ اس نے معمولی کاٹن کا سوٹ اور سفید دوپٹا سر پر لے رکھا تھا۔ میک اپ کے بغیر بھی اس کے چہرے میں ایک کشش تھی۔

ہم چونکہ جلدی آگئے تھے اس لیے کینٹین میں زیادہ رش نہیں تھا۔ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ کیا لو گی۔ چائے یا کولڈ ڈرنک؟''

''چائے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ایک شرط پر بل میں دوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ہی دے دینا۔'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا لیکن دل میں سوچنے لگی کہ یہ آج بھی پہلے کی طرح خود دار ہے اور اسے کسی کا احسان لینا پسند نہیں۔ شاید اس کے باپ کی ترقی ہوگئی ہے اور اسے اتنا جیب خرچ ملنے لگا ہے کہ یہ اپنے دوستوں کو چائے پلا سکے۔ میں اس کے حالات جاننے کے لیے بے چین تھی اس لیے میں نے پوچھ ہی لیا۔

''اور سناؤ فرزانہ، کیسی گزر رہی ہے۔ تمہارے گھر کے حالات کچھ بہتر ہوئے یا نہیں؟''

وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہوگئے ہیں۔ کہنے کو تو ابو کی ترقی ہوگئی اور وہ کلرک سے ہیڈ کلرک بن گئے لیکن ان کی تنخواہ میں جو اضافہ ہوا وہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اوپر سے ہم بہن بھائیوں کی پڑھائی کا خرچ۔ میں نے میٹرک کے بعد ہی ٹیوشن شروع کردی اور اسی سے اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہوں۔ جب تک دونوں بھائی کمانے کے قابل نہیں ہوجاتے۔ ہمارے حالات ایسے ہی رہیں گے۔''

مجھے اس کے حالات جان کر بہت افسوس ہوا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ رکھو فرزانہ تم ماسٹرز کرلو گی تو تمہیں بھی کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔''

''ہاں یہی سوچ کر میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے ورنہ میری اتنی استطاعت نہیں تھی۔''

وہ میری ہی کلاس میں تھی اس کے باوجود ہماری بہت کم ملاقات ہوتی۔ وہ کوئی بھی پیریڈ نہیں چھوڑتی تھی اور کلاسیں ختم ہونے کے بعد وہ فوراً گھر چلی جاتی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے مزید دو ٹیوشنز مل گئی ہیں اس لیے وہ سہ پہر تین بجے سے رات آٹھ بجے تک ٹیوشنز پڑھاتی ہے۔

یونیورسٹی میں ہی میری ملاقات کاشف سے ہوئی۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں بھا گیا اور یہ بات تو میری فطرت میں شامل تھی کہ جو چیز مجھے اچھی لگتی میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرلیتی تھی۔ میں نے کاشف کو بھی ایک چیز ہی سمجھا اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن میری ہر کوشش ناکام رہی۔ میں جتنا اس کی طرف بڑھتی وہ اسی قدر مجھ سے دور بھاگنے لگتا۔ بہت جلد مجھے اس کے گریز کی وجہ معلوم ہوگئی۔

ایک دن میں کوئی کتاب ایشو کروانے لائبریری گئی تو وہاں ریڈنگ روم میں کاشف اور فرزانہ کو سرگوشیاں کرتے دیکھا۔ وہ کتابوں کے پیچھے والی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اس لیے ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ البتہ میں انہیں دیکھ چکی تھی۔ بظاہر وہ کتابیں کھولے نوٹس بنا رہے تھے لیکن ان کی توجہ کام سے زیادہ باتوں پر تھی۔ میں تقریباً پانچ منٹ کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ فرزانہ کے چہرے پر حیا کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اور وہ مسکرا مسکرا کر کاشف سے باتیں کررہی تھی۔ اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کاشف کی شخصیت کے سحر میں مبتلا ہوچکی ہے اور ان کے درمیان ایک خاص تعلق قائم ہوگیا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کاشف میری پسند تھا اور میری جاگیردارانہ فطرت یہ کیسے گوارا کرسکتی تھی کہ اس پر کوئی اور نظریں جمائے لیکن میں ٹھنڈا کر کے کھانے کی عادی تھی۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی اور سوچنے لگی کہ ہوسکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی جو میں سوچ رہی ہوں اور وہ بات نہ ہو اس لیے میں نے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

فرزانہ کی کلاس میں کسی سے دوستی نہیں تھی۔ مجھ سے

بھی اس کا تعلق سلام دعا تک محدود تھا۔ میں نے کئی مرتبہ خالی پیریڈ میں اسے اپنے ساتھ کینٹین چلنے کی دعوت دی لیکن وہ ہر بار ٹال جاتی۔ ایک دن میں نے بہت اصرار کیا تو وہ بولی۔ ”میں افورڈ نہیں کرسکتی اور مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ ہر بار تم ہی بل ادا کرو۔“

اس کے بعد میں نے کچھ نہیں کہا۔ میری کئی لڑکیوں سے دوستی ہوگئی تھی۔ ان میں زیادہ تر متوسط طبقے سے تھیں لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ میرے ساتھ رہیں۔ میری ہاں میں ہاں ملائیں۔ اس کے عوض میں ان پر دل کھول کر خرچ کرتی۔ ایک طرح سے وہ میری زرخرید سہیلیاں تھیں۔

میں دیکھ رہی تھی کہ فرزانہ اور کاشف کے درمیان قربت بڑھتی جا رہی ہے۔ میرے ساتھ کینٹین جانے میں اس کی خودداری آڑے آتی تھی لیکن اب وہ اکثر کاشف کے ہمراہ کینٹین میں نظر آنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے انہیں کئی مرتبہ لائبریری میں بھی سر جوڑے سرگوشیاں کرتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے پورا یقین ہوگیا کہ ان دونوں کے درمیان ایک خاص تعلق قائم ہو چکا ہے۔

یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت تھی اس لیے میں نے فرزانہ اور کاشف کے درمیان خلیج پیدا کرنے کے لیے کام شروع کردیا۔ اس کے لیے میں نے اپنی زرخرید سہیلیوں کی خدمات حاصل کیں۔ وہ غریب گھروں کی لڑکیاں تھیں۔ میں نے انہیں قیمتی تحائف دے کر اپنے ساتھ ملایا اور انہیں اچھی طرح سکھا پڑھا کر فرزانہ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ دونوں لڑکیاں روزانہ اسے کاشف کے بارے میں نت نئی من گھڑت باتیں بتاتیں اور اس کی دل کھول کر برائیاں کرتیں۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ کاشف ایک دل پھینک شخص ہے اور خوب صورت لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ فائنل ایئر کی نورین میں انٹرسٹڈ ہے۔“ سیما نے اپنی طرف سے بہت بڑا انکشاف کیا۔

”وہ تو میرے پیچھے بھی لگ گیا تھا لیکن میں نے ہی اسے منہ نہیں لگایا۔“ نادرہ بولی۔

فرزانہ کو کاشف پر پورا بھروسا تھا اس لیے اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور یہ کوششیں رائیگاں گئیں۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ میں گھر جانے کے لیے ڈیپارٹمنٹ کے باہر کھڑی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی کہ میں نے فرزانہ کو کاشف کے ساتھ اسکوٹر پر جاتے دیکھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اس کے ساتھ چپکی ہوئی بیٹھی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ کاشف کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ گویا نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے درمیان تمام فاصلے ختم ہو چکے ہیں۔ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے میں نے براہ راست کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن میں نے چھٹی کے بعد فرزانہ سے کہا کہ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ لہٰذا وہ میرے ساتھ چلے۔ وہ حیران ہوکر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”کیا وہ باتیں یہاں نہیں ہوسکتیں۔“

”نہیں کسی جگہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ تم فکر مت کرو۔ میں تمہیں گھر پر ڈراپ کردوں گی۔“

وہ ہچکچاتے ہوئے میری گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے ڈرائیور کو ایک ریستوران پر رکنے کے لیے کہا اور فرزانہ کو لے کر اندر چلی گئی۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے یہاں کیوں لے آئیں۔ میں تو گھر جا کر کھانا کھاتی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں آج میرے ساتھ سہی۔“

کھانے کے دوران میں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب بیرا برتن لے کر چلا گیا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اور کاشف ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئے ہو۔ یہاں تک کہ تم اس کے ساتھ اسکوٹر پر بھی گھومنے لگی ہو؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔“

”اس لیے کہ تم میری بچپن کی دوست ہو اور تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔“

”ذرا میں بھی تو سنوں کہ وہ حقیقت کیا ہے؟“ وہ تنک کر بولی۔

”پہلے یہ بتاؤ، کیا تم واقعی کاشف سے محبت کرتی ہو؟“

”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”ہے کوئی بات اسی لیے پوچھ رہی ہوں۔“

”ہاں۔“ اس نے بلا جھجکے جواب دیا۔ ”ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”میں یہی جاننا چاہ رہی تھی۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں بھی اسے پسند کرتی ہوں اور جو مجھے پسند آجائے

اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتی ہوں۔“

”وہ بازار میں بکنے والی شے نہیں ہے جسے تم منہ مانگی قیمت پر خرید لو۔ یہ دل کا سودا ہے۔ یہاں تمہارا پیسا کام نہیں آئے گا۔“

”ہر انسان کی ایک قیمت ہوتی ہے اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم سے ایک سودا کرلوں۔“

”کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ میں کچھ بھی نہیں۔“ وہ الجھتے ہوئے بولی۔

”تم میرے اور کاشف کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ اس کے بدلے میں تمہاری ہر ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”اور اگر میں انکار کردوں۔“

”یہ سودا تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔ انکار کی صورت میں تمہیں ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تم تو میرے بیک گراؤنڈ سے واقف ہو۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے بھائی کسی ناکردہ جرم کی پاداش میں جیل کی ہوا کھائیں اور تم خود کیا یہ چاہو گی کہ دن دہاڑے تمہیں اغوا کرلیا جائے اور لاپتا افراد کی فہرست میں ایک کا اور اضافہ ہو جائے۔“

وہ جانتی تھی کہ میں محض خالی خولی دھمکیاں نہیں دے رہی۔ ان پر عمل بھی کرسکتی ہوں وہ بری طرح خوفزدہ ہوگئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ میرے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ”اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔ میں اپنی عزت کی خاطر کاشف سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے تم جو کہو گی میں وہی کروں گی۔“

”کاشف سے ملنا چھوڑ دو اور اسے بتا دو کہ تمہارا رشتہ کسی اور جگہ ہوگیا ہے ورنہ اپنے نقصان کی تم خود ذمے دار ہوگی۔“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بے فکر رہو، وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔“

”گڈ اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو میں تمہاری مدد کروں گی۔ تم مجھے اپنے باپ اور بھائیوں کے کوائف دے دو۔ انشاء اللہ ایک مہینے میں تمہارے ابا کی ترقی ہو جائے گی اور بھائیوں کی ملازمت کا بندوبست ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہاری شادی کا پورا جہیز میں بناؤں گی۔ میں اس وقت بھی تمہیں ایک بڑی رقم نقد دے سکتی ہوں لیکن تمہارے لیے اسے چھپانا مشکل ہو جائے

نخشب جارچوی (1920-1967)

جارچہ ضلع بلند شہر میں 1920 میں جنم لینے والے اختر عباس اردو شاعر اور فلم ساز و فلمی نغمہ نگار کا پہلا شعری مجموعہ ”مشعل راہ“ 1945 میں شائع ہوا تھا۔ اساتذہ کے مصرعوں کو بطور ”مکھڑا“ فلمی نغموں کا حصہ بنانے کا گر جانتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور اور کراچی میں قیام رہا۔ وفات 24 اگست 1967 کراچی میں ہوئی اور یہیں آسودۂ خاک ہو رہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں انہیں نخشب جارچوی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

یکتا امروہوی (1911-2003)

سید واحد علی یکتا امروہوی جیسا کہ ان کے نام میں لاحقہ موجود ہے۔ 1911 میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم برصغیر کے موقع پر 1947 میں جو ہندو مسلم فسادات ہوئے ان پر یکتا امروہوی نے ”خونی ہے ہندوستان“ لکھی۔ نامور مصنفین مولانا ارشد تھانوی، شوکت تھانوی، نیاز فتح پوری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ساغر نظامی اتر پردیش کے وزیراعظم گوبند ولبھ نے اسے مبنی بر حقیقت قرار دیتے ہوئے ستائشی خطوط سے نوازا۔ جب ہندوستان میں رہنا ناگزیر ہوگیا تو سید واحد علی یکتا امروہوی ہجرت کر کے کراچی آگئے اور ”خاتون پاکستان“ کے ادارتی شعبے سے وابستہ رہتے ہوئے صحافتی علمی و ادبی خدمات انجام دینے لگے۔ 1948 میں شہید کربلا امام حسین کے سفر کربلا کی بنیاد پر مثنوی ”شاہنامۂ کربلا“ لکھ کر معتبر نقادوں اور شعراء سے خراج تحسین حاصل کیا۔ کراچی میں مختصر قیام کے بعد خیرپور میرس چلے گئے جہاں والی خیرپور میرس میر علی تالپور کے اتالیق مقرر کیے گئے۔ سہ روزہ ”مراد“ میں مدیر رہے۔ بچوں کے لیے رسالہ نکالا جس کا نام ”کہانی“ رکھا۔ بچوں کے لیے شاعری بھی کی۔ ”درودان پر“ نعتوں کا مجموعہ اور ”سلام ان پر“ مجموعہ مناقب اہل بیت ہے۔ 14 جولائی 2003ء کو نئی کراچی میں انتقال کر جانے والے سید واحد علی یکتا امروہوی کو بہشت زہراء قبرستان (سیون ایل) میں سپرد خاک کردیا گیا۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم ابا کی ترقی کروا دو۔"

"آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تم کم از کم ایک ہفتہ تک یونیورسٹی نہ آنا۔ میں ہر ایک سے یہی کہوں گی کہ تمہاری منگنی ہوگئی ہے۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور یونیورسٹی سے غائب ہوگئی۔ کاشف اس کے نہ آنے سے سخت پریشان تھا۔ اس نے دو تین لڑکیوں سے اس کے بارے میں پوچھا لیکن وہ اسے کچھ نہ بتا سکیں کیونکہ فرزانہ کی کسی لڑکی سے دوستی نہیں تھی اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ سب جگہ سے مایوس ہو کر وہ میرے پاس آیا اور بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ فرزانہ یونیورسٹی کیوں نہیں آرہی؟"

"اوہ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا؟" میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا نہیں بتایا؟"

"یہی کہ اس کی منگنی ہوگئی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو مجھے معلوم ہے۔"

ایک ہفتہ بعد وہ یونیورسٹی آئی تو اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ اس دوران میں ویک اینڈ پر گاؤں گئی تو میں نے بابا کو اس کے باپ اور بھائیوں کے کوائف دیے اور کہا کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ کام جلد از جلد کروا دیں۔ بابا کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد یہ دونوں کام کروا دیں گے۔ میں نے یہ بات فرزانہ کو بتائی تو وہ مطمئن ہوگئی اور بولی۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

کاشف اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن وہ اس سے کترا رہی تھی۔ بالآخر وہ اس سے بات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ جیسے ہی کلاس سے باہر آئی تو وہ اسے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہاری منگنی ہوگئی؟"

"ہاں تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔" وہ بے رخی سے بولی۔

"لیکن میں اور تم......"

"کیا میں اور تم۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم مجھے پسند کرتے ہو لیکن تم نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا پھر میں کس برتے پر اس رشتے سے انکار کر دیتی۔ تم جانتے ہو کہ آج کل اچھے رشتے مشکل سے ملتے ہیں اس لیے میں نے والدین کی پسند کے آگے سر جھکا دیا۔"

کاشف کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ خاموشی سے اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ میں جانتی تھی کہ فرزانہ جھوٹ بول رہی ہے اور اس نے میری ہدایت کے مطابق کاشف سے جان چھڑانے کے لیے یہ ناٹک رچایا تھا۔ پندرہ دن بعد اس کے والد کی پروموشن کا لیٹر آگیا اور اس کے بھائیوں کو بھی اچھی ملازمت مل گئی۔ اس روز وہ بہت خوش تھی وہ مجھے اپنے ساتھ کینٹین لے گئی اور بولی۔ "تم نے میرے اوپر اتنا بڑا احسان کیا ہے جو میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ میں کیا کچھ کر سکتی ہوں۔ تم نے میری بات مان کر عقل مندی کا ثبوت دیا ورنہ نقصان میں رہتیں۔"

"ہاں۔" وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "میرا جو نقصان ہوا۔ وہ اس فائدے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔"

میں فرزانہ اور کاشف کو جدا کرنے میں تو کامیاب ہوگئی لیکن اب کاشف کو اپنی جانب مائل کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ فرزانہ سے الگ ہونے کے بعد وہ کافی گم صم رہنے لگا تھا۔ اس نے لائبریری اور کینٹین کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ نہ ہی وہ کسی سے بات کرتا۔ بس کلاس اٹینڈ کر کے گھر چلا جاتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ چوٹ کھایا ہوا انسان ہے اور ہمدردی کے دو بول ہی اس کے لیے کافی ہوں گے۔ بس موقع ملنے کی دیر تھی اور ایک دن وہ موقع مجھے مل ہی گیا۔

ایک روز تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں گھر جانے کے لیے ڈیپارٹمنٹ کے برآمدوں میں کھڑی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی کہ کاشف بھی میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ "بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اب تو بس کے پوائنٹ تک جانا بھی مشکل ہے۔"

"کیوں؟ آج تم اسکوٹر پر نہیں آئے؟"

"نہیں اس میں کچھ خرابی ہوگئی تھی۔ مکینک کے یہاں کھڑی ہے۔"

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ میری گاڑی آگئی۔ میں نے کہا۔ "اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔

جہاں کہو گے چھوڑ دوں گی۔"

"رہنے دو، خوامخواہ تمہیں تکلیف ہوگی۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"کیسے جاؤ گے۔ ابھی تم نے خود ہی کہا تھا کہ پوائنٹ تک پہنچنا بھی مشکل ہوگیا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے اسٹاپ پر چھوڑ دینا۔ وہاں سے کوئی بس مل جائے گی۔"

جب ہم بس پوائنٹ پر آئے تو وہاں ہو کا عالم تھا اور دور دور تک کسی بس کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے کہا۔ "کاشف بس میں جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ میں تمہیں گھر پر چھوڑ دوں گی۔"

اس کا گھر میرے راستے میں ہی پڑتا تھا اس لیے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے گھر کے نزدیک اتر گیا۔ میں نے ازراہ مذاق کہا۔ "کرایہ تو دیتے جاؤ۔"

اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "کل لے لینا۔ اس وقت کھلے پیسے نہیں ہیں۔"

اگلے روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ پہلے دو پیریڈ فری تھے۔ میں کینٹین جا رہی تھی کہ راستے میں کاشف مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "کہاں تھیں میں اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"کیوں خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ تمہیں کرایہ دینا تھا۔" وہ شوخ لہجے میں بولا۔

"ارے میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔ تم دل پر لے گئے۔"

"میں بھی مذاق ہی کر رہا ہوں۔ چلو کینٹین چلتے ہیں۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں تو دل سے چاہتی تھی کہ اس کا ساتھ مل جائے۔ وہ بھی شاید فرزانہ سے جدا ہونے کے بعد خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا اور اسے کسی سہارے کی تلاش تھی۔

میرا بیشتر وقت اس کے ساتھ گزرنے لگا۔ ہم لائبریری اور کینٹین ساتھ ہی جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لڑکیوں نے دبے دبے الفاظ میں ہمارے بارے میں تبصرے کرنا شروع کر دیے لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

مجرد شخص کی جب شادی ہوتی ہے تو اسے ابتدا اپنی زندگی میں تبدیلی دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ یہ حالت زائل ہو جاتی ہے اور پھر وہ وہی تنہائی اور بے لگامی پسند کرنے لگتا ہے چنانچہ اس متاہلانہ زندگی میں کوئی وقفہ بیوی سے تھوڑی بہت عارضی دوری کا مل جائے تو فوراً خوش ہو جاتا اور بڑی مسرت کا اظہار کرنے لگتا ہے مگر صرف چند گھنٹوں تک اس کے بعد پھر ردعمل شروع ہوتا ہے اور تنہائی بری طرح ستانے لگتی ہے۔ چنانچہ پطرس نے بھی اسی تجربے کو بڑی ہی سادگی سے لکھ دیا ہے۔ وہ بیوی کے جانے کے بعد جتنے خوش تھے ایک رات گزرتے ہی اتنے ہی مغموم ہو گئے اور نہ صرف مغموم ہوئے بلکہ بیوی کو تار تک دے دیا کہ "فوراً آجاؤ۔" گھر خالی ہو اور بے تکلف احباب جمع ہو جائیں تو جوانی میں بالکل یہی کیفیت ہوتی ہے جو تاش کھیلنے میں پطرس کی ہوئی چنانچہ چور بنے ہوئے چلم بدست کلاہ کاغذی برسر روسیاہی کے عالم میں بیوی نے دیکھ لیا۔ اس کے بعد کی کیفیت پطرس ہی سے سنیے۔ "روح منجمد ہوگئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا روشن آرا۔ کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی...... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔"

(اقتباس: پطرس کے مضامین)

میرے لیے یہی بہت تھا کہ جسے چاہا وہ میرے قریب آرہا تھا پھر اچانک ہی فرزانہ نے یونیورسٹی آنا چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے مبارک باد دی اور کہا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ اسے جس چیز کی ضرورت ہو وہ بتا دے میں اس کا انتظام کر دوں گا۔

اس کی شادی کی خبر سن کر میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا۔ اب میرے لیے میدان صاف تھا۔ کاشف مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا اور اکثر اوقات اپنی ذاتی باتیں بھی کر لیا کرتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے لیکن ابھی تک اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا اور میں منتظر تھی کہ وہ یہ بات اپنی زبان پر لائے تو میں اسے گھر بلا کر چچا سے ملوا دوں البتہ ایک بات مجھے پریشان

کر رہی تھی کہ اس کا تعلق کسی امیر گھرانے سے نہیں تھا۔ اس کے والد کسی کالج کے پرنسپل تھے اور بہن بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن گھر میں دولت کی فراوانی نہیں تھی جب کہ بابا میری شادی اپنے ہم پلہ خاندان میں کرنے کے خواہش مند تھے اور اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ بابا اس کی کم حیثیت کی وجہ سے اسے قبول نہیں کریں گے۔

ایک دن ہم دونوں لائبریری میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اس سے یونہی پوچھ لیا۔ ”کاشف تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ ماسٹرز کرنے کے بعد کیا کرو گے؟“

”میرا ارادہ تو باہر جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا لیکن شاید یہ ممکن نہ ہو۔“

”پھر؟“

”صرف ماسٹرز کر لینا ہی کافی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ لیکچرار کی جاب مل جائے گی۔ سوچ رہا ہوں کہ سی ایس ایس کے امتحان میں بیٹھ جاؤں۔“

میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔ تمہارا مستقبل بن جائے گا۔“

اس کی ذہانت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ وہ پہلی ہی کوشش میں یہ امتحان پاس کر لے گا۔ بابا سرکاری افسروں کو بہت پسند کرتے تھے۔ اگر کاشف بھی سرکاری افسر بن جاتا تو شاید بابا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ بن جاتا۔ میری دعائیں رنگ لائیں اور کاشف نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کر لیا۔ اتفاق سے اس کی پوسٹنگ بھی ہمارے علاقے میں ہی ہوگئی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں بھی گاؤں واپس آگئی لیکن کاشف سے میرا رابطہ فون کے ذریعے قائم تھا۔ جب وہ دو چار دن کی چھٹی لے کر اپنے والدین سے ملنے لاہور آتا تو میں بھی کسی نہ کسی بہانے پہنچ جاتی۔ میں ملازمت کرنا چاہ رہی تھی لیکن بابا نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ وہ کافی ناراض ہوئے اور انہوں نے سختی سے کہہ دیا کہ میں ملازمت کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔ ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور وہ جلد از جلد میری شادی کرنا چاہ رہے تھے لیکن موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ چند ماہ بعد ہی انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔

اس وقت میری عمر بائیس سال تھی۔ مجھ سے چھوٹا بھائی نوید گریجویشن کر چکا تھا اور بابا کی وصیت کے مطابق اسے ہی جاگیرداری کا کام سنبھالنا تھا لیکن ابھی اس کی عمر کم تھی اس لیے میں بھی اس کی مدد کرنے لگی۔ بابا کی وفات پر کاشف بھی مجھ سے تعزیت کرنے آیا۔ میرے ماموں، چچا اور بھائی اس سے مل کر بہت مرعوب ہوئے اور اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اگر ان لوگوں کو کاشف کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں معلوم ہو جائے تو ان کا ردعمل کیا ہوگا۔

بابا کے چہلم کے بعد ایک بار پھر میری شادی کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ سب بزرگوں کی رائے تھی کہ میری شادی جلد از جلد ہو جانی چاہیے۔ ان دنوں میرے لیے ایک رشتہ آیا ہوا تھا لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں۔ ایک تو وہ لوگ ہمارے ہم پلہ نہیں تھے اور دوسرے ان کی نظریں میرے حصے کی زمین اور جائیداد پر تھیں لیکن ہمارے خاندان میں پشتوں سے زمین کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا بلکہ نسل در نسل اس میں اضافہ ہوتا رہا اس لیے چچا نے ان لوگوں کو بھی صاف جواب دے دیا کہ زمین کا بٹوارہ کسی قیمت پر نہیں ہوگا لیکن اس کی آمدنی میں سے میرا حصہ مجھے ملتا رہے گا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے اس رشتہ پر اصرار نہیں کیا۔

میں نے موقع غنیمت جان کر امی کو کاشف کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ پہلے ہی میری شادی نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ فوراً انکار کر دیتیں کہ وہ گھر کے مردوں سے مشورہ کر کے بتائیں گی۔ میرے چچا اور بھائیوں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ کاشف کی کم حیثیت کی وجہ سے ہچکچا رہے تھے لیکن جب میں نے امی کو یقین دلایا کہ کاشف بہت خوددار انسان ہے اور وہ میرے حصے کی زمین و جائیداد کا مطالبہ نہیں کرے گا تو وہ اس رشتے پر تیار ہو گئے۔ ویسے بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی مخالفت بے کار ہے، ہوگا وہی جو میں چاہوں گی۔

میں نے چچا کے کہنے پر کاشف کو فون کر دیا کہ وہ اپنے والدین کو لے کر چچا کی لاہور والی کوٹھی پر آجائے۔ وہیں ان کی ملاقات میری امی، ماموں اور بھائیوں سے بھی ہو جائے گی۔ مقررہ وقت پر وہ لوگ آ گئے۔ کاشف کی والدہ سیدھی سادی خاتون تھیں۔ وہ بھی مجھ جیسی امیر زادی سے رشتہ جوڑنے پر ہچکچا رہی تھیں لیکن کاشف کے کہنے پر چلی آئیں۔ انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے امی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ چاہتی ہیں شادی

سادگی سے ہو کیونکہ ان کی اتنی استطاعت نہیں کہ وہ ہماری طرح دھوم دھڑکا کریں۔

امی ان کی صاف گوئی اور شرافت سے بہت متاثر ہوئیں اور انہیں یقین دلایا کہ جیسا وہ چاہتی ہیں وہی ہوگا۔ چنانچہ شادی کی تمام رسومات بڑی سادگی سے انجام پائیں۔ البتہ رخصتی کے موقع پر گاؤں کے تمام لوگوں اور علاقے کے معززین کو مدعو کیا گیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ لوگ کاشف کی کم حیثیت پر باتیں بنائیں گے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ سرکاری افسر ہے تو اس سے مرعوب ہو گئے۔

شادی کے بعد کاشف مجھے اس مکان میں لے گیا جو سرکار کی طرف سے اسے ملا ہوا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مکان میری لاہور والی کوٹھی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے کام کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے میں نے گاؤں سے ملازموں کو بلوا لیا۔ کاشف کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی تھی۔ جس میں بٹھا کر وہ مجھے شام کی سیر کے لیے نکلتا تو مجھے اپنے آپ پر رونا آنے لگتا۔ میں لاکھوں کروڑوں کی مالک تھی۔ دنیا جہاں کی آسائشیں میرے قدموں تلے تھیں لیکن کاشف کی خودداری نے مجھے ان نعمتوں سے محروم کر دیا تھا۔

میرا پہلا جھگڑا اس وقت ہوا جب میں نے شادی کے دو تین ماہ بعد گاؤں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں چاہتی تھی کہ کاشف بھی میرے ساتھ چلے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کوئی کورس شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”شاید مجھے زیادہ دن وہاں رہنا پڑے۔ زمین کے معاملات دیکھنے ہیں۔ نوید ابھی چھوٹا ہے۔ وہ اکیلا یہ سب نہیں سنبھال سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم جتنے دن چاہو وہاں رہ سکتی ہو۔“

”میرا تو خیال ہے کہ تم بھی یہ ملازمت چھوڑ دو اور میرے ساتھ چل کر حویلی میں رہو۔“

”معاف کرو، مجھے حویلی میں رہنے کا کوئی شوق نہیں۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”اور یہ ملازمت تو میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیا رکھا ہے اس ملازمت میں۔ وہاں رہ کر تم راج کرو گے۔ پورے گاؤں پر تمہاری حکومت ہوگی۔ سب لوگ تمہارے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔“

اس نے میری بات سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”یہ بھی بتا دو کہ میں کس حیثیت سے وہاں رہوں گا۔ میں اس حویلی اور زمین و جائیداد کا مالک تو ہوں نہیں۔ مجھے تمہارا ملازم یا منیجر بن کر رہنا ہوگا اور دنیا مجھے گھر داماد کے نام سے پہچانے گی پھر تمہارے بھائیوں کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔“

”بھائیوں کو بیچ میں مت لاؤ۔ وہ تمہاری بہت عزت کرتے ہیں۔“

”وہ میری نہیں۔ اپنے بہنوئی کی عزت کرتے ہیں جو سی ایس پی افسر ہے اور کسی وقت بھی ان کے علاقے کا ڈپٹی کمشنر لگ سکتا ہے لیکن اگر میں تمہارا منشی بن گیا تو دو کوڑی کی عزت نہیں رہے گی۔“

”تم ہر بات کا غلط مطلب لیتے ہو۔ میں نے یہ کب کہا کہ میرے منشی یا منیجر بن جاؤ۔ تم صرف میرے ساتھ رہنا اور ضرورت پڑنے پر میری مدد کرتے رہنا۔“

”تمہیں جاگیردارنی بننے کا بہت شوق ہے تو جاؤ اپنی جاگیر سنبھالو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا لیکن جس طرح میں تمہارے معاملے میں مداخلت نہیں کر رہا اسی طرح تم بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

میں نے واقعی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور کچھ دنوں کا کہہ کر گاؤں چلی آئی۔ وہاں کے حالات بہت خراب تھے۔ نوید کو زمین داری کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے تمام معاملات سنبھال لیے۔ سب سے پہلے میں نے بابا کے قابل اعتماد آدمیوں کو جمع کیا اور انہیں مختلف ذمے داریاں سونپ کر نوید کو ان کا نگراں بنا دیا۔ یہ مینجمنٹ کا پہلا سبق ہے کہ ایک آدمی سارے کام نہیں کر سکتا۔ اسے اپنی ٹیم بنانی پڑتی ہے۔ میں نے بھی اسی اصول پر عمل کیا جس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور چند ہی دنوں میں حالات ہمارے قابو میں آ گئے۔

میں آہستہ آہستہ نوید کی ذمے داریوں میں اضافہ کر رہی تھی کیونکہ ساری عمر تو میں گاؤں میں نہیں رہ سکتی تھی۔ چند دنوں بعد مجھے واپس اپنے گھر چلے جانا تھا اس لیے میں چاہتی تھی کہ نوید جلد از جلد سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اقتدار اور طاقت کے نشے میں آدمی رشتوں کو بھول جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں شروع شروع میں کاشف کے پاس جاتی رہی پھر حویلی کی مصروفیات نے مجھے اس سے دور کر دیا۔ میں پورے مہینے اس کے پاس نہ جاتی لیکن وہ کوئی شکوہ نہ کرتا۔ اس کے آئے دن ٹرانسفر ہوتے رہتے تھے۔ جب بھی وہ کسی نئی جگہ جاتا

میں اس سے ملنے چلی جاتی اور چند روز رہ کر گاؤں واپس آجاتی۔

میں بڑی جاگیرنی کی حیثیت سے حویلی پر راج کررہی تھی۔ اپنے بابا کی طرح سخت گیر، ضدی اور ہٹ دھرم۔ دور دور تک میرے رعب اور دبدبے کے چرچے تھے لیکن کاشف پر میرا زور نہیں چلا۔ میں مسلسل اسے گاؤں آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ الٹا مجھے مشورہ دیتا کہ اب میں سب کچھ نوید کے سپرد کر کے اپنے گھر واپس آجاؤں۔ ''وہ حویلی تمہارے باپ کی ہے اور ان کے وارث تمہارے بھائی ہیں۔ جس دن ان کی بیویاں آگئیں تو تمہارا وہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔''

میں جواب میں کہتی۔ ''ان کی یہ مجال کہ وہ میرے سامنے سر اٹھا کر بات کرسکیں زبان گدی سے کھینچ کر ان کے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔''

میں سمجھ رہی تھی کہ ساری عمر یونہی حویلی پر راج کرتی رہوں گی اور چاروں بھائی میرے اشاروں پر چلتے رہیں گے لیکن بہت جلد میرا یہ خواب چکنا چور ہو گیا۔ امی کے انتقال کے بعد بھائیوں کی نظریں بھی بدل گئیں اور نوید کی شادی کے بعد میرے اقتدار کا سنگھاسن بری طرح ڈولنے لگا۔ نوید سے چھوٹے تینوں بھائی بابا کی خواہش کے مطابق مختلف شعبوں میں چلے گئے تھے۔ ایک فوج میں، دوسرا سول سروس اور تیسرے نے لاہور میں کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اب حویلی میں نوید اور اس کی بیوی شلمی رہ گئی تھی۔

شلمی نے نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ نوید بھی آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہونے لگا۔ اس نے سب معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے اور اب وہ مجھے کچھ بتاتا اور نہ ہی مجھ سے مشورہ کرتا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ نوید اور اس کی بیوی کو میرا وجود ناگوار گزرنے لگا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے گھر واپس چلی جاؤں لیکن میں اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ بابا کی زمین اور جائداد میں میرا بھی حصہ تھا اور سب سے بڑی ہونے کی حیثیت سے میں ان کی سرپرست بھی تھی اس لیے میں نے نوید کی بیوی کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ باتوں باتوں میں اسے جتا دیا کہ وہ اپنی حد عبور نہ کرے، اس حویلی میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔

کاشف کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تھا۔ میں اس سے ملنے گئی تو وہ کافی غصے میں تھا۔ اسے شاید معلوم ہو گیا تھا کہ نوید نے مجھے عضو معطل بنا دیا ہے اور سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اس نے طنزیہ انداز میں مجھ سے کہا۔ ''اب تم وہاں کیا کررہی ہو انہیں تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ بہتر یہی ہے کہ عزت سے اپنے گھر واپس آجاؤ۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ اب میری وہاں ضرورت نہیں رہی۔ میری پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا اور میں پہلے کی طرح حویلی پر راج کررہی ہوں۔''

''یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ صرف بڑی بہن ہونے کی وجہ سے تمہیں برداشت کررہا ہے۔''

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا اگر تم میرے ساتھ آکر رہنے لگو تو میری پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو جائے گی پھر نوید یا اس کی بیوی کی ہمت نہیں ہوگی کہ میرے سامنے زبان کھولے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ مجھے اپنی عزت اور خودداری بہت عزیز ہے اور میں بھی تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ واپس آکر اپنا گھر سنبھالو۔ شادی کے بعد بیوی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے اس لیے تمہیں بھی میرے ساتھ رہنا ہوگا۔''

اس کے لہجے کی مضبوطی نے مجھے ڈرا دیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اس وقت وہ مجھے ایک بالکل بدلا ہوا کاشف نظر آیا۔ میرا سارا رعب اور دبدبہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے ساری عمر اپنی من مانی کی تھی۔ بابا جیسے سخت گیر انسان سے بھی اپنی بات منوالیتی تھی لیکن میں کاشف پر قابو نہ پاسکی۔ میرا اقتدار، طاقت اور دولت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ شادی کے بعد اس نے میری ایک بات نہیں مانی، مجھے نہیں سننے کی عادت نہیں ہے لیکن وہ میری ہر بات کی نفی کرتا ہے اس لیے کہ وہ میرا شوہر ہے۔ جانتا ہے کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن اس کی زبان سے نکلے ہوئے تین لفظ میری زندگی ویران کر سکتے ہیں اس لیے میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی شکست تسلیم کرلوں۔ اس سے پہلے کہ نوید کی نظریں بدل جائیں اور مجھے حویلی سے بے عزت ہو کر نکلنا پڑے۔ اس شکست میں بھی میری جیت تھی کیونکہ میرے شوہر نے مجھے ممکنہ بے عزتی سے بچا لیا تھا۔ اب میں اپنے گھر میں حکمرانی کررہی ہوں۔ ہر شادی شدہ لڑکی کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شادی کے بعد بھائی کی حویلی نہیں بلکہ شوہر کی جھونپڑی ہی اس کا اصل گھر ہے۔ جہاں وہ صحیح معنوں میں راج کر سکتی ہے۔

اس پار

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلام مسنون
گزشتہ دنوں میں آزاد کشمیر کے ٹور پر گیا تھا۔ وہاں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جو رات کی تاریکی میں زور زور سے دو نام پکارتا تھا۔ ہوٹل والے سے اس سلسلے میں پوچھا تو اس نے اس شخص سے ملاقات کرا دی جو تقریباً ایک دہائی سے رات کے اندھیرے میں دو نام پکارا کرتا ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی آپ بھی پڑھ کر حیران رہ جائیں گے۔

اصغر علی
(فیصل آباد)

رات میں بہت سردی تھی۔

میری آنکھ دو بجے کے قریب کھل گئی تھی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید سگریٹ کی طلب نے بے چین کر دیا تھا۔ میں نے سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھایا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑکی کھول دی۔

ہوا کا سرد تھپیڑا مجھے چھوتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

میں اس وقت آزاد کشمیر کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔

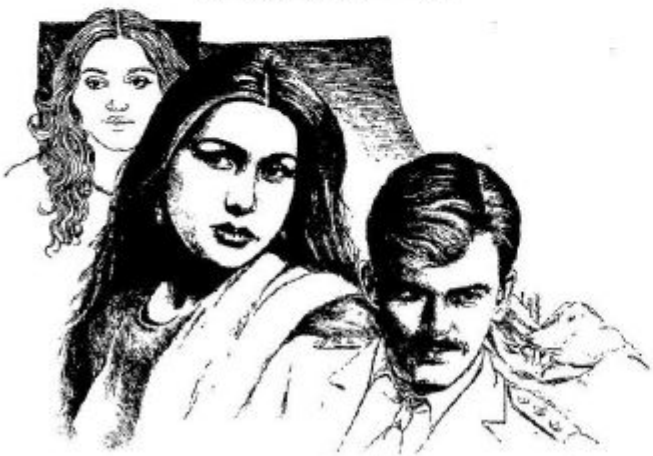

آزادی نام تھا اس ہوٹل کا۔ یہ ہوٹل دریائے نیلم کے کنارے تھا۔ اس دریا کے دوسرے کنارے پر مقبوضہ کشمیر تھا۔

دور دور تک گہری خاموشی تھی۔ دونوں طرف چنار کے اونچے اونچے درخت تھے جن کے درمیان سے سرد ہوائیں تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے آواز پیدا کررہی تھیں۔

دن کے وقت یہاں کا منظر بہت حسین ہوتا تھا لیکن رات کے اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے بھوتوں کی نگری ہو۔

اس رات چاند بھی نہیں تھا ورنہ اس کی کرنیں نیلم کے پانی میں روشنیوں کی چادر بچھا دیتی ہیں اور بھوتوں کا نگر پریوں کے دیس میں بدل جاتا ہے۔

میں نے اپنی سگریٹ سلگائی۔ اس طرح ایسے ماحول اور ایسے پس منظر میں سگریٹ نوشی کا اپنا الگ وصف ہوا کرتا ہے۔

میں نے اندھیرے میں اپنی نگاہیں جمادیں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ رات کے اس وقت کون ہوگا۔

لیکن نہیں، کوئی تھا کوئی آواز دے رہا تھا۔ اگرچہ آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن کوئی کسی کو پکار رہا تھا۔

پھر جب ہوا کا ایک جھونکا اس پکارنے والے کی طرف ہوتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا تو سمجھ میں آگیا۔ پکارنے والا کسی صغریٰ کو آواز دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی پکارنے والے نے کہا۔ ''صغریٰ میں کھڑا ہوا ہوں، گھبرانا نہیں۔ شاباش۔ چلی آؤ۔ سیدھی چلی جاؤ۔''

پھر وہ آواز آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی یا تو پکارنے والا جس صغریٰ کو پکار رہا تھا وہ اس کے پاس چلی آئی تھی یا کوئی اور بات ہوگئی تھی۔ بہر حال آواز آنا بند ہوگئی اس طرف میری سگریٹ بھی ختم ہوگئی تھی۔

میں نے کھڑکی بند کی اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک وہ آواز ذہن میں گونجتی رہی تھی پھر میں گہری نیند سوگیا تھا۔

صبح ضروریات سے فارغ ہوکر ہوٹل کے لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔

یہ لاؤنج میں گویا ڈائننگ روم ہی تھا۔

چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اندازاً بیس پچیس کمروں والا۔ نیچے ایک لاؤنج اس میں ریسپشن بھی تھا۔ ساتھ ہی کچھ سیڑھیاں اوپر چلی گئی تھیں۔ کچھ کمرے نیچے بنے ہوئے تھے۔ کچھ اوپری منزل پر تھے۔

میں نے اس ہوٹل کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ کمرے کی کھڑکی سے باہر کے خوب صورت مناظر بہت واضح دکھائی دیتے تھے جن کو دیکھ کر روح میں سرشاری کی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔

میں یہ سوچتا کہ قدرت نے تو پوری زمین کو اپنی صناعی کے حسن سے بھر دیا تھا۔ یہ انسان ہی ہے جس نے سرحدیں بنا کر حسن کو بھی تقسیم کردیا۔

مالک نے تو بنائی تھی فقط ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں تبت کہیں ایران بنا!

لاؤنج میں اس وقت میرے علاوہ چھ سات افراد اور بھی تھے۔ جو ناشتا کررہے تھے۔ ایک میز پر ایک بوڑھا بھی تھا جو چائے پی رہا تھا۔

کشمیری چائے جس کا بھرپور ذائقہ صرف کشمیر میں ہی کھلتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔ میں نے اس فارمولے کے تحت یہی چائے دوسری جگہوں پر بھی پی ہے لیکن جو ذائقہ کشمیر میں آکر ملا وہ کہیں نہیں مل سکا۔

اس ہوٹل کا منیجر گل زمان ایک باتونی اور خوش مزاج شخص تھا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔

اس وقت ویٹر نے میری میز پر میرا منگوایا ہوا ناشتا لا کر رکھ دیا۔ میں ناشتا کرنے میں مصروف تھا کہ گل زمان میرے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ہونٹوں پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی جو ہوا کرتی تھی۔

''کیا حال ہیں بابر ندیم صاحب۔'' اس نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک، خدا کا شکر ہے۔'' پھر اچانک مجھے رات والی بات یاد آگئی۔ میں نے پوچھا۔ ''یار گل زمان، رات ایک عجیب سی بات ہوئی۔''

''وہ کیا؟''

''پتا نہیں کیا ہے۔ کوئی شخص رات دو بجے کے قریب کسی صغریٰ کو آوازیں دے رہا تھا۔ دریا کنارے پر ہوگا۔''

''ہاں وہ جو بوڑھا شخص بیٹھا ہے۔'' گل زمان نے ایک بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ جو اپنی چائے ختم کرکے کسی سوچ میں گم تھا۔ ''یہی آوازیں دیتا ہے۔''

''کیا! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''میں پندرہ سال سے دیکھ رہا ہوں صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''کبھی کبھی ناغہ بھی کردیتا ہے۔ روز یہ اس کا معمول ہے۔''

''لیکن کیوں! کون ہے یہ صغریٰ اور پندرہ برسوں والی بات بھی سمجھ میں نہیں آئی۔''

بابر صاحب آپ آئیں میرے ساتھ۔ میں آپ کو اس سے ملوا دیتا ہوں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کہانیاں لکھتے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''تو آئیں ایک سچی کہانی سن لیں۔ یہ کہانی آپ کو ضرور متاثر کرے گی آجائیں۔''

گل زمان مجھے اپنے ساتھ اس بوڑھے کی میز پر لے آیا۔

''کیا حال ہیں کاکا؟'' گل زمان نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بیٹا۔''

''کاکا یہ بابو ندیم ہیں۔'' گل زمان نے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ شہر سے آئے ہیں، کراچی سے۔''

''ہاں، گھومنے آئے ہوں گے۔''

''کاکا یہ کہانیوں کی تلاش میں آئے ہیں۔'' گل زمان نے بتایا۔ ''کہانیاں لکھتے ہیں۔''

''واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''کاکا انہوں نے کل رات تم کو آوازیں دیتے ہوئے سنا تھا۔ اب تم انہیں بتاؤ کہ تم کس کو اور کیوں آوازیں دیتے ہو پھر یہ اس پر کہانی لکھیں گے۔''

اب میں نے اس بوڑھے سے کہا۔ ''بابا آپ مجھے اپنی کہانی سنائیں گے نا؟''

''کیوں نہیں، ضرور سناؤں گا۔''

گل زمان نے ویٹر کو اشارہ کیا کہ وہ ہماری میز پر چائے لے آئے۔

☆.....☆

بابا نے کہانی سنائی۔

لیکن یہ کہانی اس نے ایک نشست میں نہیں سنائی تھی بلکہ اس کے ساتھ مجھے کئی بار بیٹھنا پڑا تھا تب جا کر اس کی کہانی مکمل ہوئی تھی۔

لیکن میں نہیں جانتا کہ اس کی کہانی مکمل ہے یا ادھوری یا شاید اس کہانی کا کوئی انجام ہی نہیں ہے۔ ایسی کہانیوں کا کوئی انجام نہیں ہوتا یہ بہت ادھوری رہتی ہیں۔

جو کچھ بابا نے بتایا وہ میں ان ہی کی زبانی تحریر کررہا ہوں۔

بہت خوب صورت گاؤں تھا ہمارا۔ میں تو یہ کہتا تھا کہ قدرت نے کشمیر کے سو حصے حسن میں سے پچاس حصے صرف ہمارے گاؤں کو دے دیا تھا۔

ساٹھ ستر گھر تھے اس گاؤں میں لکڑی کے بنے ہوئے پھولوں اور چناروں کے درمیان۔ ایک طرف نیلم بہتا تھا جو ہمارے لیے بہت کچھ تھا۔

ہم اس کا پانی پیتے تھے۔ اس میں نہاتے تھے۔ اس میں سے مچھلیاں پکڑتے تھے۔ اس پر بنے ہوئے رسے کے پل کو عبور کرکے دوسری طرف نکل جایا کرتے۔ اس زمانے میں سختی بھی نہیں تھی۔ آنا جانا بہت آسان ہوا کرتا تھا۔

اس گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ میرے ابا جو اس مسجد کے امام بھی تھے اور گاؤں کے بچوں کو قرآن کی تعلیم بھی دیا کرتے۔

چھوٹی سی مسجد کا صحن کچا تھا۔ جب بارش ہوتی تو مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل جایا کرتی۔ اس صحن میں دریاں بچھادی جاتیں اور بہت سے بچے مل کر قرآن پڑھا کرتے۔

ان کی آواز میں کشمیر کی ہواؤں بھی شامل ہوکر دور دور تک سفر کرجاتیں۔ ہمارے گاؤں میں نوے فیصد مسلمان تھے۔ کچھ ہندو برہمنوں کے بھی گھر تھے لیکن وہ ہم سے کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔

ویسے ہم ایک ساتھ رہا کرتے۔ ایک دوسرے کی تقریبات اور تہواروں میں شریک ہوا کرتے۔ ہندوستانی فوجی وہاں موجود تو تھے کیونکہ دریائے نیلم کے اس پار پاکستان کا علاقہ آزاد کشمیر تھا۔

ہے نا تماشے کی بات۔ سرحد کے اس پار والے اس پار کو مقبوضہ کہتے اور اس پار والے اس پار کو۔

کیا سیاست ہے۔ سیاست تو ذہنوں کے ساتھ ساتھ دلوں اور تہذیبوں کو بھی تقسیم کردیتی ہے۔

اب یہاں پر میں چونک پڑا تھا، اس بوڑھے نے بہت گہری بات کہہ دی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''بابا! کیا آپ نے تعلیم بھی حاصل کی ہے؟''

''بیٹا علم تو تجربے اور مشاہدے کی قوت کا نام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بظاہر میں نے ڈگری بھی لے رکھی ہے۔ جموں کشمیر یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے۔''

تب ہی اس کی باتوں میں اتنی گہرائی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''ہم

ساتھ مل کر کھیلا کرتے۔ میرا مطلب ہے ہندو برہمنوں کے لڑکے لڑکیاں بھی شام کے وقت ہمارے پاس آکر ہمارے کھیلوں میں شریک ہو جاتے۔ اس زمانے کے کھیل بھی بہت سیدھے سادے ہوا کرتے تھے۔ چونکہ زندگی اتنی پیچیدہ نہیں تھی اس لیے کھیلوں میں بھی سادگی تھی۔"

اب اس کی باتوں میں مجھے لطف آنے لگا تھا۔ اس کی باتیں تو یاد رکھے جانے کے قابل تھیں۔ اس سے اجازت لے کر میں اپنے کمرے سے چھوٹا ٹیپ ریکارڈر اٹھا لایا۔ میں ٹیپ ریکارڈر سفر میں اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔

میں یہاں یہ بھی بتا دوں کہ اس نشست کے بعد میں نے ریکارڈر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور بابا کی باتیں ریکارڈ کر لیتا۔

شہر واپس آکر میں نے اس ٹیپ ریکارڈر سے بابا نظیر کی باتیں سنیں اور انہیں ترتیب میں لاکر ایک کہانی لکھ ڈالی۔ وہی کہانی جو اس وقت آپ پڑھ رہے ہیں۔

"ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "اس زمانے میں زندگی میں اتنا الجھاؤ نہیں تھا۔ ہم سب سیدھے سادے کھیل کھیلتے۔ کھو کھو..... میرا سمندر گوپی چند..... بول میری مچھلی یا آنکھ مچولی وغیرہ۔"

"بہت سے دوست تھے۔ ہندو بھی مسلمان بھی۔ ان ہی میں برہمنوں کے خاندان کی ایک لڑکی تھی کملا۔ جو مجھ سے دو تین برس چھوٹی ہوگی۔ ایک تو کشمیر کی فضاؤں میں پروان چڑھنے والے۔ دوسرے برہمنوں کے اعلیٰ خاندان سے تعلق۔ یعنی وہ کملا نہیں بلکہ کنول تھی۔ ویسے تو اور بھی بہت سے بچے تھے لیکن وہ خاص طور پر مجھ سے بہت مانوس تھی بلکہ اس کی دوستی ہی مجھ سے تھی۔

ہم مدرسے میں پڑھا کرتے اور ہندوؤں کے بچوں کے لیے کچھ فاصلے پر ایک پاٹھ شالا تھا۔ ہم اپنی دینی تعلیم مسجد والے مدرسے میں حاصل کرتے اور وہ اپنے دھرم کی تعلیم اپنی پاٹھ شالا میں لیا کرتے۔

جب میں سات یا آٹھ برس کا تھا تو ہمارے یہاں ایک اسکول کھل گیا تھا۔ نندن پور پرائمری اور ہائی اسکول۔

اس اسکول میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی جایا کرتے۔ اس اسکول میں مذہب اور دھرم کی کوئی تفریق نہیں تھی۔

کملا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم ایک ہی کلاس میں تھے۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اس کا حساب بہت اچھا تھا اور میری انگریزی۔ ہندو برہمنوں کا حساب ویسے بھی بہت اچھا ہوا کرتا ہے۔ ہندوؤں میں بڑے بڑے ریاضی داں گزرے ہیں چکرورتی، وغیرہ۔

گوپال بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ بھی برہمنوں کے خاندان کا ایک لڑکا تھا لیکن اس میں شرارت اور خباثت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وہ کملا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے آگے پیچھے ہوا کرتا لیکن کملا صرف میری دوست تھی۔ اس کو کسی اور کی پرواہ نہیں تھی۔

ایک بار میں نے گوپال کو کملا سے کہتے ہوئے سنا۔

"کملا تو کیوں اس میاں جی کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ مجھ سے دوستی کر لے۔"

"گوپال آئندہ ایسی بکواس مت کرنا۔" کملا نے اسے جھڑک دیا۔

"یعنی گوپال تمہاری کہانی کا رقیب بن گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں بیٹا۔" بوڑھے نظیر نے ایک گہری سانس لی۔ "کاش اس وقت مجھے احساس ہو جاتا کہ میری اور کملا کی دوستی کیا گل کھلانے والی ہے تو میں کبھی اس کے قریب نہیں جاتا۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ محبت تو ایک بے اختیار جذبہ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہے لیکن سینے پر پتھر بھی تو رکھا جا سکتا ہے نا؟" بابا دھیرے سے بولا۔ انسان کی بڑائی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ خدا کی رضا کے آگے سر جھکا دے۔ بہرحال ہوا یہ کہ میری اور کملا کی محبت پروان چڑھتی چلی گئی۔ ہم بڑے ہوتے گئے۔"

"کیا وہ گوپال اس وقت بھی آپ کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اس کی کہانی میں ساتھ ساتھ بتاتا جاؤں گا۔" بوڑھے نظیر نے کہا۔ "ایک بار ایسا موقع آیا جب گوپال کھل کر میرے اور کملا کے درمیان آگیا۔ میرے اور گوپال کے درمیان رقابت کا سلسلہ تو شروع ہو چکا تھا لیکن وہ ابھی تک ہمارے گروپ سے وابستہ تھا۔ ہم اس وقت کالج پہنچ چکے تھے۔ نندن پور سے تعلق رکھنے والے لڑکے لڑکیوں نے اپنا الگ گروپ بنا رکھا تھا۔ میں کملا اور گوپال وغیرہ بھی اسی گروپ میں تھے۔"

پھر ایک دن ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ہمارا گروپ کالج

کے لان میں بیٹھا ہوا آئندہ ہونے والے فنکشن کے بارے میں باتیں کر رہا تھا کہ کملا نے گوپال کو مخاطب کیا۔ "گوپال میں تمہارے لیے کچھ لے کر آئی ہوں۔ ایک تحفہ کیا تم قبول کر لوگے؟"

"کیوں نہیں۔" گوپال خوش ہو گیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم کوئی تحفہ دو اور میں قبول نہ کروں۔"

کملا نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک راکھی نکال کر گوپال کی طرف بڑھا دی "یہ لو۔ یہ میں تمہیں باندھنا چاہتی ہوں۔"

"اوہو، ایک قیامت ہی آگئی تھی۔ گوپال کے تاثرات دیکھنے کے قابل تھے۔ وہ بہت ہی غصے میں بولا۔ "کملا تم اپنا یہ قیمتی تحفہ نظیر کو کیوں نہیں دیتیں۔"

"کیوں نہیں میں نظیر کے لیے ایک اور تحفہ لائی ہوں۔" اس نے اپنے بیگ کے پلاسٹک کا بنا ہوا ایک بہت خوب صورت گلاب کا پھول میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو یہ تمہارے لیے ہے۔ یہ ہمیشہ اسی طرح تروتازہ رہے گا۔"

کملا نے اپنی محبت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ پورا گروپ چہ میگوئیاں کرنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ہندو لڑکے لڑکیوں کے تاثرات بھی کچھ دوستانہ نہ ہوں۔ لیکن گوپال تو غصے سے آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

خود مجھے کملا کی اس جسارت پر حیرت ہو رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بھی اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا لیکن اس طرح کا اظہار میرے بس کی بھی بات نہیں تھی۔

بہرحال اس کے بعد ہم دونوں پورے کالج میں بدنام یا مشہور ہو گئے تھے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ ایک دن کملا نے کہا۔ "نظیر گوپال سے ہوشیار رہنا۔ اس سے میری اور تمہاری یہ محبت ہضم نہیں ہو رہی ہے۔"

"لیکن کملا تم نے بھی تو کمال کر دیا نا۔ آخر کیا ضرورت تھی اس طرح اظہار کرنے کی۔"

"ایک تو گوپال کو میں یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ آپ کو میں اپنا بھائی تو بنا سکتی ہوں لیکن محبوب نہیں اور دوسری طرف سب پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں تمہاری ہو چکی ہوں کیونکہ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ گوپال کے علاوہ بھی بہت سے میرے امیدوار بنے ہوئے ہیں۔"

"ظاہر ہے تم میں بات ہی کچھ ایسی ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"بہت سے اندیشے بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا۔"

"دیکھو کملا مذہب کی دیواریں محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتیں۔ ابھی تو یہ کالج لائف ہے۔ ہنستے کھیلتے ہوئے زندگی گزر رہی ہے۔ اس کے بعد جب زندگی کے تلخ حقائق سامنے آئیں گے تو اس وقت وہی ہندو لڑکے اور لڑکیاں جو میری اور تمہاری دوستی کو یوں ہی سرسری نگاہوں سے دیکھتی ہیں ایک ایشو بنا دیں گی۔ ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا۔"

"میں سب طوفانوں کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔" اس نے کہا۔ "اور جہاں تک مذہب کا سوال ہے تو میں وہ بھی بدل رہی ہوں۔"

"کیا مطلب!" میں چونک اٹھا۔ "بدل رہی ہو؟"

"ہاں میں مسلمان ہو رہی ہوں۔" اس نے انکشاف کیا۔ "اور یہ تبدیلی تمہارے لیے نہیں تمہارے مذہب یعنی اسلام کے لیے ہے۔ چاہے تم مجھے ملو یا نہ ملو۔"

پھر اس نے جو کچھ بتایا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ اس

اشتیاق اظہر (1999-1924)

صحافی، شاعر، تحریک پاکستان کے کارکن، سابق سینیٹر سید اشتیاق اظہر کان پور میں مولانا حسرت موہانی کے رفقاء میں شامل رہے۔ 3 مئی 1924ء کان پور میں ہی سید ذوالفقار حسین رضوی کے گھر پیدا ہوئے۔ 1990 کی دہائی میں صوبہ سندھ کے نگران وزیر رہے۔ 1991 میں سندھی اخبار "خبروں کے آئینے میں" ہفتہ واری کالم برسوں مرتب کیا۔ سندھ بلوچستان میں ڈائریکٹر اطلاعات رہے۔ تاریخ کان پور، مقالات حسرت موہانی، سید الاحرار (سوانح حسرت موہانی)، دانائے اعظم، شعری مجموعہ "شعر و نغمہ" (1959) اور لال شہباز قلندر ان کی تالیفات و تصانیف ہیں۔ دوسرا شعری مجموعہ "وادی گنگ و جمن سے وادی مہران تک" 1980 میں کراچی سے شائع ہوا۔ کراچی میں حسرت موہانی ہال اور نعیمہ بیگم لائبریری نارتھ ناظم آباد میں آپ کی ہی کوششوں سے قائم ہوئی۔ کانپور اکیڈمی کراچی کے سرپرست اور صدر بھی رہے۔ روزنامہ جنگ میں وہ مسلسل لکھتے رہے۔ 4 فروری 1999 میں کراچی میں وفات پائی۔ پاپوش نگر قبرستان میں آخری آرام گاہ ہے۔

مرسلہ: نزہت جبیں۔ چنیوٹ

کی دوستوں میں ایک مسلمان لڑکی تھی زینب۔ وہ ایک اسلامی اسکالر نصیر اللہ کاشمیری کی بیٹی تھی۔ اس نے کملا کو اسلام کے بارے میں بتایا تھا۔ کملا کی فرمائش پر اسے کتابیں لا کر دیتی تھی اور کملا کی آنکھیں کھلتی چلی گئی تھیں اب وہ مذہب بدلنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ اس نے مذہب کی تبدیلی کی وجہ مجھے یا میری محبت کو قرار نہیں دیا تھا بلکہ خود ہمارا دین اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

کملا نے اپنا مذہب تبدیل بھی کرلیا۔ اس کی اطلاع ہم صرف چند لوگوں کو تھی۔ یعنی میں خود زینب اور دو چار بھروسے کے قابل مسلمان دوست۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔

اگر کوئی ہندو اپنا مذہب تبدیل کرلے تو ہندو اس بات پر آگ بگولا نہیں ہوتے کہ فلاں نے اپنا مذہب بدل لیا ہے۔ بلکہ اس لیے نفرت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ان کی انا کو چیلنج کیا ہے۔

''بابا آپ نے گوپال کے بارے میں نہیں بتایا وہ کہاں تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ گوپال اچانک کہیں چلا گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''کہاں یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے گھر یا خاندان والے جانتے ہوں لیکن میں نے معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔''

''بعد میں تو آیا ہوگا۔''

''وہی بتا رہا ہوں۔ وہ ہماری شادی کے بعد آیا تھا۔''

''شادی کے بعد؟''

''ہاں ہم نے شادی کرلی تھی۔ مذہب کا معاملہ تو ختم ہو چکا تھا۔ کملا اب صغریٰ ہوگئی تھی۔ اس نے تحریک دلائی اور ہم نے شادی کرلی۔ اس شادی نے نندن پور میں ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ برہمنوں کا خاندان میرے اور صغریٰ کے خلاف ایک محاذ بنا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ پھر میں ہنگاموں سے بچنے کے لیے صغریٰ کو نندن پور سے دہلی لے گیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ ہم نے وہاں ملازمتیں کرلیں۔ زندگی بظاہر بڑی پُرسکون گزرنے لگی۔''

''بظاہر کیوں؟''

''اس لیے کہ برہمن ہمیں معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''کشمیر میں کہنے کو تو حکومت مسلمانوں کی تھی لیکن سارا انتظام ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہر طرف فوجی دندناتے پھرتے تھے۔ ان کی بے شمار خفیہ ایجنسیاں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کررہی تھیں۔ برہمنوں نے ان سے رابطہ کرلیا تھا۔ لہٰذا دہلی میں بھی ہمیں سکون نہیں مل سکا۔ ایک سال کے بعد ہماری ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام ہم نے فاطمہ رکھا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی بالکل صغریٰ کی طرح۔''

بولتے بولتے بوڑھے بابا کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ شاید اسے اپنی بچی اور صغریٰ یاد آنے لگی تھی جن پر نہ جانے کیا گزری ہوگی۔ اس کا پتا اس کی کہانی ختم ہونے کے بعد ہوتا۔

''جب بچی ایک سال کی ہوئی تو پتا چلا کہ میرے بابا پر ہندوستان سے غداری کا الزام لگا دیا گیا۔'' اس نے آگے بتایا۔ ''کہا گیا کہ وہ اپنی مسجد میں دہشت گردوں کو تربیت دیتے ہیں۔ ان کو قید کردیا گیا۔''

''یہ تو بہت ظلم ہوا تھا بابا۔''

''ہاں بہت ظلم لیکن یہ تو صرف ایک شخص کی کہانی ہے۔ ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں وہاں کی ہر گلی کوچے میں ہے۔ بہرحال پھر یہ پتا چلا کہ ماں بہت بیمار ہے، وہ بے چاری دہرا صدمہ برداشت نہیں کر پائی تھی ایک تو میری جدائی کا صدمہ پھر بابا کی سزا کا صدمہ۔ وہ بستر سے لگ گئی۔ یہ سب خبریں مجھ تک آتی رہتی تھیں۔ اب مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوا۔ ایک دن میں خاموشی کے ساتھ ماں کو دیکھنے وہاں سے نندن پور پہنچ گیا۔ صغریٰ اور فاطمہ بھی میرے ساتھ تھیں۔''

''ہم رات کے وقت چھپ چھپا کر داخل ہوئے تھے۔ کیسی بات تھی کہ اپنے ہی گاؤں اپنے ہی محلے اور اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح داخل ہونا پڑا تھا۔''

''کیسی عجیب داستان ہے بابا آپ کی۔''

''ہاں بیٹا میری اس کہانی میں دکھ کا عنصر اب شامل ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ماں واقعی بستر سے لگ گئی تھی۔ وہ بہت دیر تک مجھے، صغریٰ اور فاطمہ کو سینے سے لگائے روتی رہی اور انتقال کر گئی۔ شاید اس نے موت سے اتنی مہلت مانگ لی تھی کہ ہم لوگوں کو ایک نظر دیکھ سکے۔ ایک نظر دیکھا اور مر گئی۔''

بابا رونے لگا تھا۔ میرے پاس ایسے الفاظ کہاں تھے کہ اس کی تسلی کر سکتا۔ خاموش دیکھتا رہا۔ البتہ پانی کا گلاس اس کی طرف ضرور بڑھا دیا تھا۔

بہت دیر بعد جب بابا کے اوسان اس کے قابو میں آئے تو اس نے بتانا شروع کیا۔ ''نندن پور کا قبرستان دریا کے ساتھ ہی ہے۔ ہم نے رات کو اسے دفن کردیا اور فاتحہ پڑھ کر گھر واپس آگئے۔ ابھی میں دم بھی نہیں لینے پایا تھا کہ پرکاش ہمارے گھر آگیا۔''

''یہ پرکاش کون تھا بابا؟''

''ہمارا ایک ہندو دوست۔ لیکن گوپال کی فطرت کے بالکل برعکس ایک خاموش نوجوان۔ ایک صاف دل کا انسان۔ انسان، انسان میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ خود وہ بھی برہمنوں کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کا مزاج بالکل الگ تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔ ''نظیر تم جتنی جلدی یہاں سے بیوی اور بچی کو لے کر نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ۔''

''کیوں؟ خیریت تو ہے ناں؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ گوپال فوجیوں کو لے کر آگیا ہے۔ نندن پور کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا گیا ہے تاکہ تم بھاگ نہ سکو۔''

''یار! اب یہ گوپال کہاں سے ٹپک پڑا؟''

''کیا تم کو نہیں معلوم کہ وہ اب ہندوستان فوج میں میجر ہے۔'' پرکاش نے بتایا۔ ''وہ تمہاری تلاش میں تھا۔ آج اسے اطلاع مل گئی کہ تم اپنی ماں سے ملنے آئے ہوئے ہو۔ پھر اس نے گھیرا ڈال دیا۔''

''پرکاش یہ بتاؤ میں اس گھیرے کو توڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟''

''اب ایک ہی راستہ ہے تم پاکستانی کشمیر کی طرف نکل جاؤ۔ دریا کے اس پار۔ جلدی کرو۔ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔''

میں نے جلدی جلدی صغریٰ کو صورتِ حال بتائی۔ اس نے بچی کو گود میں لیا اور ہم نے دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔ فوجیوں کی گاڑیوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اس زمانے میں دریا کو کراس کرنے کے لیے رسی کا ایک پل یا جھولا ہوا کرتا تھا۔ ہم کشمیری عام طور پر اس جھولے کے ذریعے اس پار سے اُس پار اور اُس پار سے اس پار آیا جایا کرتے تھے۔''

''رات کا وقت تھا۔ ویسے تو ہر طرف اندھیرا تھا لیکن فوجی گاڑیوں کی روشنیوں نے اجالا کردیا۔ دریا کا کنارہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بنا ہوا جھولا بھی سامنے تھا۔ ہم نے دریا کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ پرکاش کا مشورہ بالکل درست تھا۔ ہم پاکستان کے علاوہ کہیں نہیں جا سکتے تھے۔

دریا پر دو جھولے تھے۔ بس ایک بار ہم دریا کراس کر لیتے تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ میں ایک جھولے سے لٹک گیا۔ صغریٰ نے بچی کو گود میں بھینچ کر دوسرا جھولا پکڑ لیا اور اسی وقت ہم پر تیز روشنیاں پڑنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی مائیک پر ایک آواز گونجی۔ ہم نے یہ آواز پہچان لی تھی۔ یہ گوپال کی آواز تھی۔ ''رک جاؤ نظیر۔ رک جاؤ کملا۔ رک جاؤ۔''

لیکن ہم رک نہیں سکتے تھے۔ ہم نے جھولے کو حرکت دی اور تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اس وقت گولیاں چلنی شروع ہوگئیں۔ نیچے نیلم دریا کا تیز بہاؤ۔ آس پاس میں گولیاں برستی ہوئیں۔ میرے خدا کیسا بھیانک منظر تھا۔ گولیاں چلیں۔ صغریٰ کی دردناک چیخ اور وہ بچی سمیت دریا کے تیز بہاؤ میں جا گری۔ ایک پل میں اس کی کہانی ختم ہوگئی تھی۔ گولیاں اس کے بعد بھی چلتی رہیں لیکن میں صحیح و سالم اس کنارے پر آگیا لیکن کیا میں صحیح و سالم ہوں۔ بتاؤ کیا میں زندہ ہوں۔ میں تو صغریٰ اور اپنی بچی کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔''

بابا اس بار بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ بہت دیر تک میں نے بھی چپ کرانے کی کوشش کی۔ اچھا ہے غبار جتنا دھل جائے بہتر ہوتا ہے۔

جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''بابا اس واقعے کو کتنے سال ہوگئے۔''

''پینتیس سال۔'' اس نے بتایا۔

''تو آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کی صغریٰ اور بچی اب تک زندہ ہوں گی۔ آپ کی آواز سن کر چلی آئیں گی۔''

''نہیں بیٹا میں یہ جانتا ہوں کہ وہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ آوازیں ان کے لیے نہیں لگاتا ہوں بلکہ اپنے آپ کو یقین دلاتا رہتا ہوں کہ میں انہیں بھولا نہیں ہوں۔ ابھی بھی میں اس کنارے ان کی آمد کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ ابھی بھی میرے سینے میں وہی الاؤ روشن ہے جو برسوں پہلے تھا۔ اچھا بیٹا بہت دیر ہوگئی ہے میں اپنے کام پر جا رہا ہوں۔ میری کہانی یاد سے لکھ لینا۔''

اس نے اپنی کہانی ختم کردی تھی۔

لیکن کیا واقعی اس کی کہانی ختم ہوگئی تھی۔ نہیں میں جب تک زندہ ہوں میرے ذہن میں صغریٰ کو بلانے کی آواز گونجتی رہے گی اور شاید اس کنارے بھی گونجتی رہے گی۔

▲▲▲

خالہ خالدہ

مکرمی مدیراعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم
سرگزشت کے لیے یہ میری پہلی تحریر ہے گو کہ بہت چھوٹی ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں۔ خالہ خالدہ کا کردار اس پوری تحریر میں عجب سا ہے لیکن دلچسپ ہے۔ قارئین بہت پسند کریں گے

فہمی فردوس
(گوجرانوالہ)

آج تک آپ نے یہی سنا ہوگا یا دیکھا ہوگا کہ فلاں مرد نے دو شادیاں کی ہیں کیونکہ یہ تو بڑے ہے یہ فلاں مرد کی دو بیویاں تھیں مگر یہ کبھی کسی نے دیکھا یا سنا نہ ہوگا کہ فلاں عورت نے دو شوہر کیے ہیں مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک ایسی عورت دیکھی ہے جو دو شوہروں کے ساتھ ایک گھر میں ایک ہی چھت تلے زندگی گزار رہی ہے۔ یہ دلچسپ واقعہ خالہ خالدہ کی زندگی سے جڑا ہے۔

خالہ ایک تو پہلے ہماری گلی میں جو کرائے دار تھی

تھیں۔ ساٹھ باسٹھ سال کی خالہ بڑی چست اور ایکٹو دکھائی دیتی تھیں۔ بات بے بات اونچی آواز میں قہقہہ لگانا، ان کی زندہ دلی کو ظاہر کرتا تھا۔ کپڑے فٹنگ والے پہنتی اور بالوں کو ہر وقت خضاب سے کالے کیے رکھتیں اور سگریٹ بھی سب کے سامنے بیٹھ کر دھڑلے سے پیتیں۔ ان ساری خامیوں کے باوجود خالہ ایک اچھی عورت تھیں۔ یہ میرا دل کہتا تھا حالانکہ میرے بچے ہمیشہ ان کی آمد پر ناک بھوں چڑھایا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ خالہ گندی عورت ہیں۔ مردوں کی طرح سگریٹ پیتی ہیں مگر میں گھنٹوں خالہ کے پاس بیٹھ کر ان کی دلچسپ باتیں سنا کرتی جس دن خالہ نہ آتیں مجھے بے رونق سی محسوس نہ ہوتی۔ خالہ کی باتیں بھی خالہ کی طرح بڑی رنگین ہوتیں۔ اکثر خالہ اپنی جوانی کے قصے چٹخارے لے کر سناتیں۔

میرا ابھی تک خالہ کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کیونکہ خالہ خود ہی ہر دوسرے تیسرے دن آ موجود ہوتی تھیں اس لیے مجھے کبھی جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ خالہ کی زبانی یہ جان چکی تھی کہ خالہ دو بچوں کی شادیاں کر چکی ہیں اور تیسرے بیٹے کے لیے بہو ڈھونڈ رہی ہیں۔

ایک دن میرا بیٹا بوکھلایا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ”امی آپ کو کچھ پتا چلا۔“

”نہیں کیوں کیا ہوا۔“ میں پریشان ہوگئی۔

”وہ خالہ... خالہ......“

”کیا ہوا خالہ کو۔“ میں کھڑی ہوگئی۔

”خالہ کو کچھ نہیں ہوا اس کا شوہر مر گیا۔“

”کیا... ! خالہ کا شوہر مر گیا۔“ میرا دل صدمے سے پھٹنے والا ہو گیا۔

”مر گیا...؟ کیا ہوا تھا خالہ کے شوہر کو... وہ تو ہر وقت اپنے شوہر کی اتنی تعریفیں کرتی تھیں۔“

”تو کیا جن کی تعریفیں کی جائیں ان کو موت نہیں آتی۔“ ذیشان استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

”شرم کرو ذیشان۔“

”میں کیوں شرم کروں۔ میں نے خالہ کا شوہر تھوڑی مارا ہے۔“

”اچھا تم اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا۔ میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں۔“ میں نے چادر اوڑھ لی۔

”اب کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو جنازہ بھی چلا گیا۔“

”کیا... اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔“ میں چڑ گئی۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

میں نے چادر اوڑھی اور تیز تیز قدموں سے خالہ کے گھر کی طرف چل دی۔

راستے بھر میں یہی سوچتی رہی بے چاری خالہ اس بڑھاپے میں بیوہ ہو گئیں۔ اتنے جوان جوان بچوں کو لے کر کہاں جائیں گی۔ انہی سوچوں میں خالہ کا گھر آ گیا۔ خالہ صحن میں بچھی دری پر بیٹھی گریہ زاری کر رہی تھیں۔ ان کے پاس محلے کی پانچ چھ عورتیں بیٹھی تسلیاں دے رہی تھیں۔ خالہ نے کپڑے سے سر باندھ رکھا تھا۔ میں خالہ کے پاس جا کر بیٹھی تھی تو خالہ مجھ سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔

”حوصلہ کریں خالہ...... جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔“ میں نے بمشکل خالہ کو خود سے الگ کیا۔

”بیٹی تم نہیں سمجھ سکتیں کہ وہ میرے لیے کیا تھا۔ وہ میرے دل کا جانی تھا۔ ساری زندگی کانٹا چبھنے جتنی تکلیف بھی مجھے نہ ہونے دی۔“

میں خالہ کی شوہر سے بے مثال محبت دیکھ کر اشک بار ہو گئی۔ خالہ کے جوان بچے بھی صحن میں ادھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں گھر واپس آ گئی۔

اگلے دن گھر کے ضروری کام نمٹائے اور پھر سے خالہ کے پاس پہنچ گئی۔

آج خالہ کی حالت کل کی نسبت بہتر تھی۔ وہ عورتوں میں گھری شوہر کی والہانہ محبت کا ذکر کر رہی تھیں۔ عورتیں خالہ کی باتوں سے مرعوب ہو کر سر دھنے جا رہی تھیں۔ میں بھی پاس جا کر بیٹھ گئی۔ خالہ کے قصے توجہ سے سننے لگی۔

عورتیں ایک ایک دو دو کر کے جانے لگیں۔ اب خالہ کے پاس میں اور ایک دو عورتیں رہ گئیں۔ اتنے میں باہر سے ایک قیم شحیم بابا اندر آیا۔ دیکھنے میں بزرگ تھا مگر صحت اور تن و توش قابل رشک۔ وہ ہمارے پاس سے گزر کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

”یہ کون ہے خالہ؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”یہ تمہارا خالو ہے۔“ خالہ نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”میں کچھ نہیں خالہ!“ میں ہونق چہرہ لیے خالہ کی طرف دیکھنے لگی۔

”مطلب یہ میرا شوہر ہے۔“ خالہ نے وضاحت کی۔

”شش... شوہر... خالہ کیا کہہ رہی ہو۔ آپ کا دماغ تو نہیں پھر گیا، اگر یہ آپ کا شوہر ہے تو... پھر وہ کون تھا جو کل فوت ہوا ہے۔“ غصے سے میری آواز بھی قدرے اونچی

مجنوں گورکھپوری

(1904-1988)

احمد صدیق مجنوں 10 مئی 1904 کو یوپی کے شہر گورکھ پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جناب محمد فاروق دیوانہ تخلص کرتے تھے اور وضع قطع سے بھی دیوانوں جیسے ہی لگتے تھے۔ حالانکہ علی گڑھ میں ریاضی کے پروفیسر اسی طرح رہے جیسے سر ضیاء الدین جو بعد میں وائس چانسلر بھی بنے۔ مجنوں گورکھ پوری نے درس نظامی کے ساتھ گورکھ پور لکھنو اور علی گڑھ سے ادب میں 1934 میں ایم اے کیا۔ 1935 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی اور اردو ادب میں ماسٹرز کی ڈگری لی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ مجنوں نے شاعری ترک کردی تھی ان کی تصانیف میں ادب اور زندگی ہم رکاب نظر آتی ہیں۔ 4 جون 1988ء میں کراچی میں انتقال ہوا سخی حسن قبرستان کراچی میں تدفین ہوئی۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

ہوگئی تھی۔

''وہ بھی شوہر تھا۔'' خالہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

''خالہ خدا کا خوف کرو۔ دو دو شوہر۔ ایک کیا اسٹپنی کے طور پر رکھا ہوا تھا۔'' میں نے سارا لحاظ اور تمیز سائیڈ پر رکھی۔

''کیا اول فول بک رہی ہو لڑکی۔ میں کیا ایسی ویسی عورت ہوں۔'' خالہ جی اب پورے جلال میں آچکی تھیں۔

خالہ کو غصے میں دیکھ کر میں نے اپنا غصہ کنٹرول کیا اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''مگر خالہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کا شوہر تو وہ تھا نا جو کل فوت ہوا ہے۔ تو پھر یہ کون ہے جو ابھی ابھی اندر گیا ہے۔'' میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''وہ بھی میرا شوہر تھا۔ یہ بھی میرا شوہر ہے۔''

''تو کیا خالہ.....'' میرے اوسان پھر سے خطا ہونے لگے۔ دروپدی اور پانڈوؤں کا قصہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ ہندوؤں کی لوک داستان جس میں ایک عورت کے 5 شوہر تھے۔

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے سر جھٹکا۔ ''خالہ ایسا نہیں کرسکتیں۔ خالہ ہندو نہیں مسلمان ہیں۔ اللہ معاف کرے، یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔''

''خالہ میں ابھی بھی نہیں سمجھی اگر دونوں آپ کے شوہر ہیں تو ان میں اصلی کون ہے اور نقلی کون۔''

''آئے ہائے یہ کیسا سوال ہے۔ دونوں اصلی ہیں۔'' خالہ نے منہ بسورا۔

''دیکھیے خالہ میں شاید آپ کو سمجھا نہیں پا رہی۔ ایک عورت ایک وقت میں صرف ایک ہی شوہر رکھ سکتی ہے میرا مطلب ہے نکاح میں...... اب یہ بتائیں کہ ان دونوں میں سے آپ کے نکاح میں کون سے والا ہے۔''

''نکاح تو دونوں سے کیا تھا۔ باری...... باری۔''

خالہ نے ایک لمبا ہوکا بھرا۔

''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں ہکلائی۔ ''بغیر طلاق لیے آپ نے دوسرا نکاح کیسے کرلیا۔ خالہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔'' میں نے صدائے احتجاج بلند کیا۔

''میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ بغیر طلاق کے میں نے دوسرا نکاح کرلیا۔'' خالہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''تو پھر......!'' خالہ میرے لیے ایک نہ حل ہونے والا معما ثابت ہو رہی تھیں۔

''یہ جو اندر گیا ہے اس سے تب نکاح کیا تھا جب پہلے والے نے طلاق دی تھی۔''

''یعنی جو فوت ہوا وہ آپ کا پہلا شوہر تھا۔'' میں نے سکون بھری گہری سانس خارج کی۔

''ہاں پہلا تھا تو کیا ہوا...... تھا تو شوہر۔ اس کی یادیں بھلا کیسے دل سے بھلا سکتی ہوں۔''

''مگر خالہ وہ یہاں کیسے؟ آپ طلاق لے کر اسے چھوڑ کر آگئیں۔ آپ نے دوسری شادی بھی کرلی۔ تو پھر وہ یہاں کیسے آگیا۔'' میرے دل کی بات زبان پر آگئی۔

''ہاں چھوڑ کر تو آگئی۔ دوسری شادی بھی کرلی مگر یہ بچے تو پہلے والے کے ہیں نا۔ وہ بھی بچوں کے پیچھے پیچھے آگیا۔ اب کچھ بھی ہو، تھا تو میرے بچوں کا باپ کیسے نکال دیتی اسے گھر سے۔''

''تو کیا آپ ایک ہی گھر میں...... دونوں شوہروں کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی تھیں۔'' حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔

''تو کیا ہوا۔'' خالہ بے پروائی سے بولیں۔ ''وہ اوپر کی منزل میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور میں نچلی منزل میں اپنے شوہر کے ساتھ۔ بچے بھی خوش۔ ان کا باپ بھی خوش اور میں بھی خوش۔ کیوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں خالہ کی فہم و فراست کی قائل ہوگئی۔

نوحہ

جناب معراج رسول

سلام تہنیت

عرصہ بعد حاضر ہورہا ہوں. اُمید ہے کہ یہ سچ بیانی قارئین کو بہت زیادہ پسند آئے گی کیونکہ ایسے واقعات بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں. والدین کی اہمیت کو بھلایا جارہا ہے اور اس کی وجہ تعلیم سے دوری ہے جس کے ہم خود ذمّے دار ہیں کہ اسلام نے والدین کی جو اہمیت بیان کی ہے اسے بھلاتے جارہے ہیں.

نوشاد عادل

(کراچی)

میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص پُرجوش انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس کی آواز معدوم ہوتے ہوتے بند ہوتی چلی جارہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی کنویں میں بیٹھا بول رہا ہے۔

میری نظریں اس پر تھیں اس لیے وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں بغور اس کی بات سن رہا ہوں لیکن آواز غائب ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی دھندلا ہوتا چلا گیا۔ اب اس کی جگہ مجھے اپنی بیوی حمیرا کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ پریشانی کے عالم

میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے پھر مجھے اس کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”کچھ کیا بندوبست پیسوں کا۔ وہ روز بے عزتی کر کے جاتی ہیں شمع خالہ۔ کب تک بہانے بناتی رہوں۔ روز آج کل آج کل ہو رہی ہے۔ اتنی مشکلوں سے تو گھر کا کرایہ جمع کر کے دیا تھا پچھلے مہینے اب پھر اس مہینے کا کرایہ آنے والا ہے۔ باقی ہزاروں خرچے اپنی جگہ ہیں۔ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ آپ کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے؟“

حمیرا کا چہرہ غائب ہوا تو اس کی جگہ میرے والد کی شکل ابھر آئی۔ ان کا چہرہ آس و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا، جس پر جھجک اور موہوم سی امید کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

”ڈاکٹر کے ہاں کب چلنا ہے بیٹا۔ اس نے دس دن بعد آنے کا کہا تھا۔ اب تو مہینے سے اوپر ہو گیا ہے۔ سانس کی تکلیف ختم ہی نہیں ہو رہی ہے۔ بڑی مصیبت میں ہوں بیٹا۔ اللہ کے بعد تیرا ہی آسرا ہے۔ تجھ سے نہیں بولوں گا تو پھر اور کسے بولوں؟“ بولتے بولتے ان کی سانسیں اکھڑنے لگیں پھر وہ بری طرح کھانسنے لگے۔ ایسا لگا کہ دم ہی الٹ جائے گا۔ ان کے کھانسنے کی آواز میرے کانوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی اور لگ رہا تھا کہ پردۂ سماعت پھٹ جائے گا۔

”بس یہاں تک اسٹوری لکھی ہے۔ اس کا اینڈ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“ اچانک سامنے کا منظر چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ میرے والد صاحب ایک دم غائب ہو گئے۔ اب دوبارہ مجھے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ستار صاحب دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

ستار صاحب بغور مجھے دیکھنے لگے۔ ”ظفر صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں...... ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے اور زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا لی۔

”تو کیسی لگی آپ کو میری کہانی۔ دم ہے اس میں یا نہیں؟“ ستار صاحب نے میری رائے جاننا چاہی۔

میں بھلا کیا رائے دیتا، جب کہ میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا مگر میں نے یہ بات ان پر ظاہر ہونے نہیں دی۔ ”کہانی تو ٹھیک ہے۔ یہ آپ لکھ کر بھی لائے ہیں نا؟“

”جی جی۔“ ستار صاحب نے میز پر رکھے بیگ میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ”یہ رہی اسکرپٹ۔ ذرا جلدی کا کام ہے۔ آگے دینا ہے مجھے۔ سب لکھ لیا مگر بس اینڈ کیا کرنا ہے یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زوردار قسم کا اینڈ ہو۔ میں کل لے لوں آپ سے گھر آ کر؟“

”کل تو نہیں۔ ایک دو دن لگیں گے۔ میں آپ کو کال کر کے بتا دوں گا۔ آپ ادھر ہی آجانا آرٹس کونسل میں۔ میرا دفتر یہاں سے قریب ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر آجاؤں گا۔ آنے سے پہلے آپ کو کال کر دوں گا۔“ میں نے لفافہ لے کر اپنے پرانے بیگ میں ڈال لیا۔

”بہت شکریہ...... جیسا آپ کہیں ارے...... یہ...... آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ پی بھی نہیں آپ نے...... اوہو...... اصل میں...... میں نے ہی آپ کو کہانی پر لگا لیا تھا۔ میں دوسری چائے منگوا لیتا ہوں گرم گرم۔“ ستار صاحب چائے والے لڑکے کو اشارہ کرنے لگے۔

”ارے نہیں کوئی بات نہیں۔“ میں نے انہیں منع کیا۔ ”میں ویسے بھی ٹھنڈی کر کے ہی پیتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”سچی بات ہے؟“

”بالکل سچی...... گرم چائے پی نہیں جاتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

چائے والا لڑکا وہاں آگیا تھا۔ ستار صاحب نے اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تم جاؤ اچھا رکو آ گئے ہو تو پیسے لے جاؤ چائے کے۔“ انہوں نے جیب سے بٹوہ نکالا اور سو کا نوٹ کھینچ کر اس کے حوالے کر دیا۔

☆......☆

مرزا ظفر احمد کا نام ادبی حلقے میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ جی ہاں میں ملک کے نامور قلم کاروں میں سے ایک ہوں۔ کوئی ایسا میگزین، رسالہ اور ڈائجسٹ نہیں جہاں میں نے لکھا نہ ہو۔ سال ہا سال بیت گئے تھے اس دشت کی سیاحی میں۔ شناخت بنانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی تھی لیکن میں نے محنت کے ساتھ ساتھ بہت سی قربانیاں بھی دی تھیں۔ رسالے پڑھنے کی لت بچپن سے پڑ گئی تھی۔ میرے والد صاحب نے صرف چند ہی جماعتیں پڑھی تھیں اتنا کہ اٹک اٹک کر اخبار پڑھ لیتے تھے مگر انہیں تعلیم سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میرا مطالعہ کا شوق والدہ کے مرہون منت تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھیں۔ اللہ جانے ان دونوں کا رشتہ کس طرح ہوا تھا۔ والدہ رسالے میگزینز پڑھا کرتی تھیں۔ مجھے بھی تب ہی

کہانیوں کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ والد صاحب تو چاہتے تھے کہ میں تعلیم کے بجائے کوئی ہنر سیکھ لوں۔ مجھ سے بڑا بھائی شاکر والد صاحب پر گیا تھا۔ ابا کی طرح چند جماعتیں پڑھ کر اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور ایک درزی کی دکان پر کام سیکھنے لگا۔ ابا نے چاہا کہ میں بھی کسی مستری یا ویلڈر کے پاس لگ جاؤں مگر اماں آڑے آ گئی تھیں۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظفر پڑھے گا اور بڑا آدمی بنے گا۔ آپ نے شاکر کو تو اپنے جیسا ہی بنانا ہے نا۔ اب میں دوسرے کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

”میرے جیسا کیا مطلب!“ ابا کی بھنویں ٹیڑھی ہو گئیں۔ انہوں نے گھور کر اماں کو دیکھا تھا۔ ”میں کوئی نکھٹو ہوں؟ ہڈحرام ہوں؟ پال رہا ہوں نا تم سب کو۔ کوئی کمی رہ گئی ہو تو بتاؤ۔ اچھا کھلا رہا ہوں، پلا رہا ہوں، سارے خرچے اور کون اٹھاتا ہے؟ ہزاروں لوگ آتے ہیں میری دکان پر۔ کتنے ہی ایسے بندے بھی آتے ہیں جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں مگر کیا ہے کہ زیرو بٹا زیرو۔ نوکری ہی نہیں ملتی۔ ان سے لاکھ درجے اچھا کما لیتا ہوں میں۔“

”اچھا کمانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔“ اماں دلیل دینے لگیں۔ ”زندگی گزارنے کے طریقے بھی ہوتے ہیں۔ تعلیم ہر چیز کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔ گزارنے کو تو بے ڈھنگی اور بے تکی زندگی گزر ہی جاتی ہے۔“

”میری زندگی میں کون سا بے ڈھنگا پن نظر آ گیا تجھے؟“

ابا بدستور برہم دکھائی دے رہے تھے۔ ”ماشاء اللہ اپنی دکان ہے۔ مارکیٹ میں نام ہے میرا۔ صابر بھائی سینیٹری والے کا، کاروبار کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بڑے ڈھنگ سے کرنا پڑتا ہے۔ گھر پر بھی طریقے سے ہی رہتا ہوں اور بھلا کیسے گزارتے ہیں زندگی۔“

”آپ سے بحث کرنا بے کار ہے۔ بس میں نے کہہ دیا ہے۔ شاکر کو آپ نے کام پر بٹھا دیا ہے۔ میں ظفر کو پڑھانا چاہتی ہوں۔“ اماں نے تکرار سمیٹتے ہوئے کہا۔

ابا بھی خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی ایک بڑی خوبی تھی۔ غصہ حد سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔ بحث کو جھگڑے میں بدلنے سے پہلے ختم کر دیتے تھے۔ اماں کی بھی یہ خوبی تھی۔ اس لیے دونوں کی اچھی نبھ گئی تھی۔

اس کے بعد ایک طرح سے اماں اور ابا میں ایک معاہدہ طے پا گیا کہ شاکر ہنر حاصل کرتا رہے گا اور ظفر یعنی میں پڑھوں گا۔ دوبارہ میں نے ابا کے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں سنی کہ انہوں نے میری تعلیم پر کوئی اعتراض کیا ہو۔ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ میرے مطالعہ کا شوق بھی فزوں تر ہوتا چلا گیا۔ چونکہ اماں خود کتابوں رسالوں کی دلدادہ تھیں۔ لہٰذا انہوں نے بھی مجھے منع نہیں کیا۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ پہلے اپنی تعلیم کو ترجیح دو اس سے وقت ملے تو پھر رسالے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے ایم اے صحافت کر لیا۔ اس دوران پڑھنے کے ساتھ لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ کئی اخبارات میں نوکریاں بھی کیں مگر بہت زیادہ پیسے نہ کما سکا۔ البتہ لکھنے کے میدان میں خوب نام کما رہا تھا۔ شاکر بھائی نے درزی کا کام سیکھ لیا تھا۔ ابا اب خاصا بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کی سینیٹری کی دکان اب بھی تھی۔ انہوں نے شاکر بھائی کو ایک دکان کروا دی تھی۔ شاکر بھائی ٹیلر ماسٹر بن گئے تھے اور ان کی دکان بھی خوب چل رہی تھی۔ ان کی شادی ہو گئی تھی اور دو بچے بھی تھے۔ اماں میری طرف سے بہت فکرمند رہتی تھیں کیونکہ میری کمائی شاکر بھائی کی کمائی سے آدھی بھی نہ تھی۔ اخبارات میں ملتا بھی کیا تھا۔ وہ تو میں میگزینز میں کہانیاں، افسانے لکھ کر مزید کچھ کما لیتا تھا۔

کئی بار ابا طنزیہ بول چکے تھے۔ ”بولا تھا نا، کوئی ہنر سیکھ لے، کیا کر لیا اتنا پڑھ لکھ کے۔ تجھ سے زیادہ تو شاکر کما لیتا ہے مزے سے اور پھر کسی کی ملازمت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اپنا کاروبار ہے اپنی بادشاہت ہے۔ تیری ماں کو بڑا سمجھایا تھا مگر اس کی عقل میں ہی کبھی نہیں آئی۔ لگتا ہے اب آ گئی ہو گی۔“

”قسمت کی بات ہے۔ انشاء اللہ اچھی ملازمت بھی مل جائے گی۔ اب بھی کما تو رہا ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلا رہا ہے نا۔“ اماں میری وکالت پر اتر آئیں۔

”ہونہہ۔“ ابا نے گردن جھٹکی۔ ”اسے کمانا کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ تو ایک رکشے والا کما لیتا ہے۔ کبھی مانا نہیں میری بات اپنا جھنڈا ہی اونچا رکھنا۔“

میں کمرے میں سے ان کی تکرار سن رہا تھا لیکن کیا کرتا کہیں ابا ٹھیک تھے تو کسی جگہ اماں کا کہنا درست تھا۔

میں بہتر سے بہترین ملازمت کے لیے دھکے کھاتا رہا۔ کبھی کہیں قسمت سے کوئی ملازمت ملتی تو اس وقت تک مہنگائی بھی بڑھ چکی ہوتی تھی اور یوں میں گھوم پھر کر اس مقام پر آ کھڑا ہوتا جہاں سے چلا تھا۔

اماں کی ضد کے آگے میں نے سر تسلیم خم کر لیا اور میری

شادی حمیرا سے ہوگئی۔ ابھی تو ہم دو ہی تھے لہٰذا گزارہ ہو رہا تھا مگر فکر اس بات کی تھی کہ اولاد کے بعد اخراجات میں اضافہ ہوگا تب کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا کہ جب اللہ اولاد سے نوازے گا تو اس کے رزق کا بندوبست بھی کردے گا۔

میری بیوی قناعت پسند اور معتدل مزاج تھی۔ شوہر کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ کم از کم یہ میرے لیے اطمینان کا باعث تھا کہ بیوی اچھی ملی تھی۔ صابر شاکر اور دھیمے مزاج کی بیوی کا ملنا بھی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ دوسری طرف میری بھابی یعنی شاکر بھائی کی بیوی تھی۔ انہوں نے اپنے شوہر کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ حالانکہ شاکر بھائی ان کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ اچھا کھلانے پلانے اور بہترین کپڑے لتے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، اس کے باوجود بھابی ان کے خوب لتے لیتی تھیں۔ شاکر بھائی خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہتے تھے۔ ابا جی کو تو زیادہ پروا نہ تھی۔ ان کا سارا دن دکان پر گزر جاتا تھا۔ رات کو آتے اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سو جاتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سب سے زیادہ کرب میں اماں ہیں۔ انہیں دونوں بیٹوں کی فکر تھی۔ ایک طرف میری اچھی ملازمت اور معاشی حالت تھی تو دوسری جانب شاکر بھائی کی بدمزاج بیوی نے انہیں سپرد اضطراب کیا ہوا تھا۔

اب تو بھابی نے یہاں تک کہنا شروع کردیا تھا کہ انہیں الگ گھر چاہیے یا پھر اپنے بھائی اور بھابی کو ان کا حصہ دے کر چلتا کرو۔

ہم اپنے کمرے میں ہوتے تھے اس کے باوجود بھابی کی اونچی پھٹی پھٹی آواز بالکل صاف سنائی دیتی تھی۔

”بس بہت کرلیا اس ڈربے میں گزارا۔ اب ساری زندگی تو ان چھوٹے چھوٹے خانوں میں نہیں گزار سکتی میں۔ اتنے بڑے گھر کو چھوڑ کر آئی ہوں۔ کب تک اس ایک کمرے میں سڑتی رہوں گی۔ بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ تم بات کیوں نہیں کرتے اپنے بھائی اور اماں ابا سے۔ ڈرتے ہو کیا۔ اگر تم بات نہیں کرو گے تو مجھے ہی کرنا پڑے گی۔“

”اچھا اچھا بس بس اب خاموش ہو جاؤ۔ رات کا نیم ہے۔ سب سو رہے ہوں گے۔ بچے بھی اٹھ کر چیں چیں کریں گے۔ میں کرلوں گا بات اب آرام کرنے دو مجھے۔“ شاکر بھائی کی دبی دبی آواز سنائی دی۔

”کب کرلو گے۔ دو سال سے سن رہی ہوں کرلوں گا۔ کرلوں گا۔ ہمت ہوتی تو کب کا کرلیتے۔ کون سا وہ لوگ تمہیں کھا جائیں گے۔“

”اے یار اچھا بس......اب بس بھی کردو۔ صبح کام پر بھی جانا ہے۔ تھوڑی دیر آرام بھی کرنے دو۔ تھوڑا سکون کا سانس تو لینے دیا کرو۔ میں کرلوں گا بات ظفر سے اور ہاں تم کسی سے کچھ نہیں بولنا۔ میں اپنے طریقے سے بات کرلوں گا۔“ شاکر بھائی کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

”اور یہ بات بھی سن لو۔ اپنی اماں ابا کے زیادہ پیچھے نہیں پڑنا کہ ہمارے ساتھ رہ لو۔ ویسے بھی تمہاری اماں جان مجھے اچھا نہیں سمجھتی ہیں۔ وہ نہیں رہیں گی میرے ساتھ۔ انہیں تو چھوٹی بہو پسند ہے۔ حمیرا بیگم......ہونہہ۔“ بھابی کی زبان مسلسل زہر اگل رہی تھی۔

”او خدا کے لیے بس بھی کردو۔ صبح بھی ہوگی۔ صبح بول لینا جی بھر کے۔ تھوڑا منہ کو آرام بھی دے دیا کرو۔“ شاکر بھائی کی ضبط کے دھاگے ٹوٹ رہے تھے۔ ”سالے ایک تو دن بھر گدھوں کی طرح محنت کرکے گھر آؤ کہ آدمی کو سکون مل جائے گا یہاں تو سکون سے ایک پل بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔“

”تو باہر ہی سو جایا کرو کہیں۔ اگر گھر اتنا ہی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں کون سا یہاں شہزادیوں کی طرح رہ رہی ہوں۔ دو وقت کی روٹی دے کر احسان نہیں کر رہے ہو مجھ پر۔ فرض ہے تمہارا۔ نکاح کرکے لائے تھے۔ ذمہ داری لی ہے تو پھر پوری بھی کرنا تمہارا فرض ہے۔“ بھابی کی آواز آتی رہی مگر شاید بھائی سو گئے تھے۔

یہ ڈائیلاگ بازی کافی دنوں سے چل رہی تھی۔ اب اس میں شدت آگئی تھی۔ دن بہ دن بھابی آپے سے باہر ہوتی جارہی تھیں۔ حمیرا بتاتی تھی کہ وہ سارا دن بڑبڑاتی رہتی ہیں۔ کچھ نہیں ملتا تو اپنے ہی بچوں کو مارنا شروع کردیتی تھیں۔

اس ایک عورت کی بداخلاقی اور بدزبانی نے گھر بھر کو عذاب مسلسل میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میرے لیے الگ ہونا اتنا آسان ثابت نہ ہوتا۔ گھر اپنا ہو تو کم تنخواہ میں بھی گزارا کیا جاسکتا تھا۔ کرائے کے مکان میں رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس کرب واذیت میں رہتے ہوئے میرا لکھنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے علاوہ میں بہتر سے بہتر نوکری کی تلاش میں رہتا تھا۔ میری پہلی کوشش تھی کہ جلد از جلد کوئی اچھی نوکری مل جائے۔ تاکہ میں اور حمیرا اماں کو لے کر کسی الگ مکان میں شفٹ ہو جائیں۔ کرائے کا ہی سہی مگر وہاں روز روز کی چک چک سے تو جان چھوٹے گی۔

ایک روز میں تھکا ہارا گھر پہنچا۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ ساتھ میں مجھے ایک میگزین کے لیے افسانہ بھی لکھنا تھا۔ اس میگزین کے ایڈیٹر نے کافی دنوں سے فرمائش کی ہوئی تھی مگر میں لکھ نہیں پا رہا تھا آج دوپہر میں وہ میرے آفس آگئے تھے۔ تب مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ ایک دو دن بعد آکر تازہ تحریر لے جائیں۔ گھر پہنچا تو ماحول میں کچھ زیادہ ہی کشیدگی محسوس ہوئی۔

حمیرا کھانا بنا رہی تھی۔ میں اماں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی ساکت نظروں سے پنکھے کو گھور رہی تھیں۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بھی نہ دیا اور نہ ان کے جسم میں کوئی حرکت ہوئی۔ سچی بات ہے میں اس لمحے گھبرا گیا تھا۔

”اماں!“ میں تیزی سے ان کے پاس پہنچا۔

جب ان کی آنکھوں کے ڈیلے متحرک ہوئے اور وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ میری جان میں جان آئی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟“

”ہاں ہاں بس ایسی ہی ہے۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں نے انہیں دوبارہ لٹا دیا۔

”لیٹ جائیں، آرام کریں آپ۔ بس میں سلام کرنے آیا تھا آرام کریں۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

اماں چند لمحے مجھے دیکھتی رہیں پھر خفیف سا سر ہلا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ جب کھانا کھانے بیٹھا تو حمیرا نے بتایا۔

”آج بھابی نے اماں سے بہت بدتمیزی کی ہے۔“

میرا ہاتھ رک گیا۔ ”کیا......بدتمیزی؟“

”کچن میں اماں سے کانچ کی ڈش ٹوٹ گئی۔ وہ جو بھابی کے جہیز کی تھی۔“ حمیرا دبی دبی آواز میں بتا رہی تھی۔

”تو پھر......پھر کیا ہوا؟“

”بھابی نے تو ایک طوفان کھڑا کردیا۔ کچن میں آکر اماں کو خوب سنائیں۔ بے چاری اماں کچھ بول بھی نہ سکیں۔ ایک لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلا۔ پتا نہیں بھابی کو کیا ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کو خاموش نہیں ہو رہی تھیں۔ اماں بے چاری رونے لگیں۔ تو میں پہنچ گئی۔ میں نے اماں کی حمایت لینی چاہی تو بھابی نے مجھے بھی جی بھر کر باتیں سنائیں۔“

نوالہ میرے حلق میں پھنسنے لگا۔ ایسا لگا کہ کوئی گولا حلق میں اٹک گیا ہے۔ ایک عجیب سی بے بسی تھی۔ بڑی بھابی تھیں میں کیا کہتا۔ انہیں خود احساس ہونا چاہیے تھا۔ ہم سے لاکھ بدتمیزی کرلیں اور کر بھی چکی ہیں مگر ہم نے درگزر اور صبر سے کام لیا تھا لیکن اماں سے بدتمیزی کا سن کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے وجود میں خلا ہوگئی ہے اور میں بالکل کھوکھلا ہو چکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں؟ ایک جانب اماں کی حالت نظروں میں گھوم رہی تھی تو دوسری جانب بڑے بھائی کا احترام مانع تھا۔ میں ویسے ہی صلح جو اور لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والا انسان تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر حمیرا بولی۔

”کم از کم اس معاملے پر تو آپ کو بھائی صاحب سے بولنا چاہیے۔ وہ ان کی بھی تو ماں ہیں۔ انہیں جا کر احساس تو دلائیں۔ ایک بار بھابی کا منہ کھل گیا ہے اب یہ روز کا چکر ہو جائے گا۔“

”میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔“

”کیا؟“

”شاید بھائی سے کچھ کہنا فضول ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”تم بھی جانتی ہو کہ وہ بھابی سے خائف رہتے ہیں۔ ان کے آگے شاکر بھائی کی ایک نہیں چلتی ہے۔“

”تو کیا سوچا آپ نے؟“ حمیرا نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”مجھ سے اماں کی یہ تذلیل برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ وہ بے چاری تب سے اپنے کمرے میں جاکر لیٹی ہوئی ہیں۔ وہ تو میں نے زبردستی چند نوالے کھلا دیے ورنہ وہ تو بھوکی سو جاتیں۔“

”کیوں نا ہم اماں ابا کو لے کر الگ ہو جائیں۔“ میں نے ایک جھٹکے سے کہا۔

حمیرا میری شکل دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ”میرے دماغ میں بھی یہی بات تھی...... لیکن......“

”لیکن کیا؟“ میں نے بھنویں اچکائیں۔ ”گزارا مشکل ہوگا نا۔ ہو جائے......کرلیں گے......اس روز روز کی دردسری سے تو نجات ملے گی۔ ذہنی سکون سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے حمیرا۔ سوچ لو۔ کیا چاہتی ہو تم؟“

”میں بھلا کیا چاہوں گی۔ جو آپ چاہیں گے وہی میرا فیصلہ ہوگا۔“ حمیرا نے اختتامی جملہ کہہ کر یہ موضوع ختم کردیا پھر میں لکھنے بیٹھ گیا تھا۔

اگلے روز میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا کہ کس طرح شاکر بھائی سے بات کرنی ہے کہ انہیں برا بھی نہ لگے اور میرا مقصد بھی پورا ہو جائے۔ رات میں گھر پر کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دھیمی سی دستک ہوئی۔ حمیرا نے سر

پر دوپٹا ڈال لیا۔ اتنے میں باہر سے شاکر بھائی کی آواز آئی۔ ''ظفر......سوگیا کیا؟''

''نہیں بھائی جان...... آجائیں۔'' میں نے تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

شاکر بھائی اندر داخل ہوئے۔ ہمارے سلام کا انہوں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ میں نے انہیں کرسی پیش کی۔ وہ بیٹھ گئے پھر خیر خیریت اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی اصل مدعا بیان کر ڈالا۔

''یار دیکھ بھئی...... میں دراصل یہ کہنے آیا تھا کہ اب ہو رہے ہیں میرے بچے بڑے۔ کل کلاں کو تیری بھی اولاد ہو گی۔ اب یہ مکان چھوٹا پڑنے لگا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ برتن کھڑکنے سے پہلے ہی ہم دونوں بھائی کوئی ایسا بندوبست کرلیں کہ معاملہ ہنسی خوشی طے ہو جائے۔'' شاکر بھائی نے کھنکار کر کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں بھائی جان۔'' میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ''اور اتفاق کی بات ہے کہ میں بھی آپ سے یہی بات کرنے والا تھا۔''

''کون سی بات؟'' شاکر بھائی چونکے۔

''یہ کہ...... اب ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''نجی بات ہے بھائی جان میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں آپ کو دے سکوں تاکہ آپ اپنا الگ مکان لے لیں۔''

''ہاں تو میرے پاس ہیں نا۔'' شاکر بھائی کھٹ سے بولے۔ ''میں تجھے دے دیتا ہوں۔ فی الحال کرائے پر تو جا سکتا ہے مگر یہ دیکھ کہ اس طرح ہم دونوں کی فیملی آرام میں آجائے گی۔''

''میں تیار ہوں بھائی جان اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اماں ابا میرے ساتھ رہیں۔'' میں نے شاکر بھائی کی مشکل کو آسان کر دیا۔

وہ منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگے جو مرحلہ وہ سب سے دشوار سمجھ رہے تھے وہ میں نے ایک جملے میں ہی حل کر دیا تھا۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے خوش ہو رہے ہیں لیکن انہوں نے اسے جبراً دبایا ہوا تھا۔ وہ بات گھما کر کہنے لگے۔

''لیکن یار...... دنیا والے کیا بولیں گے۔ چھوٹا بھائی ماں باپ کی خدمت کر رہا ہے اور بڑے کو کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ سب مجھ پر تھو تھو کریں گے۔''

''بولنے دیں بھائی جان۔ لوگ تو کسی حال میں خوش نہیں ہوتے۔ آپ پروا نہ کریں۔ مجھ سے کسی نے پوچھا تو بتا دوں گا کہ اماں ابا اپنی مرضی سے میرے ساتھ رہ رہے ہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

انہوں نے زیادہ بحث نہیں کی مگر پھر بھی بولے۔ ''چل ٹھیک ہے۔ دیکھ جس چیز کی ضرورت ہو کال کر کے بتا دینا۔ ویسے میں چکر لگاتا رہوں گا تیرے پاس۔ خرچا دے جایا کروں گا اماں ابا کا۔''

معاملہ طے پا گیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ شاکر بھائی نے پھرتی اور بھاگ دوڑ دکھائی۔ لازماً ان میں چابی بھرنے والی بھابی جان تھیں۔ میں الگ مکان میں شفٹ ہو گیا۔ اماں کے چہرے پر مسرت کے آثار ہویدا تھے۔ سب سے زیادہ خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ بھابی سے ان کی جان چھوٹ گئی۔ کرائے کا مکان تھا۔ خوشی کے ساتھ فکرات نے بھی میرا دامن تھام لیا کہ اب ماچس سے لے کر گھر کے کرائے تک ہر شے کا بندوبست میں نے ہی کرنا ہے۔

گھر کی گاڑی چلانے کے لیے میں نے ڈبل ڈیوٹی کرنا شروع کر دی تھی۔ دن میں ایک میگزین کے آفس جاتا تھا اور شام کے بعد ایک روزنامہ میں جاب کرتا۔ ان دو نوکریوں کے بعد رات کو لکھنے بھی بیٹھ جاتا۔ ملک کے بڑے رسالوں میں میری کہانیاں اور افسانے شائع ہوتے تھے۔

ادب میں میرا نام چوٹی کے قلم کاروں میں لیا جانے لگا تھا۔ اس دوران اللہ نے مجھے بیٹے سے نواز دیا۔ نعمان کے گھر آنے سے رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ابا بے کار ہو کر رہ گئے تھے۔ شاکر بھائی نے بٹوارے کے لیے ان کی دکان فروخت کروادی تھی کہ ان کی زندگی میں ہی یہ کام ہو جائے ورنہ بعد میں دکان وجہ فساد نہ بن جائے۔ نعمان ابھی چند ماہ کا تھا کہ ایک روز خاموشی سے اماں چل بسیں۔ شاکر بھائی مع اہل و عیال غیروں کی طرح آئے تھے اور کھا پی کر واپسی کی راہ لی۔ اماں کے مرنے کے بعد ابا نے چارپائی پکڑ لی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

''کاش میں علم کی اہمیت کو سمجھتا۔ شاکر کو بھی میں نے تعلیم دلوادی ہوتی تو یہ وقت نہ آتا۔''

میں اور حمیرا انہیں تسلیاں دیتے اور ہر ممکن دل جوئی کرنے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ میری مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا، میں خود کو مصائب کی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ جتنے ہاتھ پیر مارتا۔ مزید دھنستا ہی چلا

جا رہا تھا۔ قرضے بڑھتے جا رہے تھے آمدنی کا ذریعہ ایک تھا اور اخراجات کے ہزارہا چھید تھے۔ ابا کے علاج معالجے نے بھی میری کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ نعمان کے خرچے بھی الگ تھے۔ یہ مسائل اپنی جگہ جوں کے توں تھے مگر میری شہرت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ اس شعبے کو ہر سطح پر اور خاص طور پر سرکاری سطح پر بھی کوئی خاطر خواہ پذیرائی نہیں مل سکی تھی۔ یہ دیکھ کر دل الگ کڑھتا تھا کہ ناچنے گانے والے اور کھلاڑیوں، اداکاروں کو ہر جگہ ہر فورم پر نوازا جاتا ہے۔ راہ چلتے لوگ انہیں پہچان کر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں مگر قلم کاروں کی قدردانی ناپید ہے۔ میں بس میں سفر کرتا تھا۔ ایک شخص بھی مجھے نہیں پہچانتا تھا کہ میں اس ملک کے چوٹی کے قلم کاروں میں شمار ہوتا ہوں۔

تب میں نے قلم بیچنا شروع کر دیا۔ یعنی اپنی تخلیقات فروخت کرنے لگا۔ بعض ایسے صاحب حیثیت افراد مجھ سے تخلیقات خرید لیتے تھے جنہیں ادب کا شوق تھا۔ یا یوں کہنا مناسب ہو گا کہ ان کو شہرت کی بھوک تھی۔ بعض لوگوں کی کہانیاں تصحیح کے بعد دے دیتا تھا۔ اب چینلز بھی کافی آگئے تھے۔ میں ڈرامے بھی لکھ لیتا تھا اور لوگ مجھ سے خرید کر اپنے ناموں سے چلوا دیتے تھے۔ مجھے اپنی ضروریات پوری کرنا تھیں۔ نام کی پروا نہ تھی۔ پیسے ملتے تھے مگر بہت زیادہ نہیں صرف کچھ دنوں کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ برساتی مینڈکوں کی طرح نکلنے والے قلم کار دکھاوے کے مخلص تھے مگر درحقیقت وہ بہت مطلبی تھے۔ ہنس ہنس کر اپنا کام نکلواتے اور اونے پونے پیسے دے کر چلے جاتے۔ میں سمجھتا سب تھا مگر جان کر سیدھا بن جاتا تھا۔

مصائب تھے کہ ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ ابا بیمار رہنے لگے تھے۔ ایک دم ہی ان کی صحت گر گئی تھی۔ وجہ یقیناً یہ تھی کہ ساری زندگی وہ محنت کرتے رہے۔ ایک معمول کی زندگی تھی۔ اس میں چلنا پھرنا، دوستی یاری، بھاگ دوڑ جیسی مصروفیات تھیں۔ جن کی وجہ سے انہیں بیمار ہونے کی فرصت بھی کہیں ملتی تھی۔ سب کچھ ختم ہوا تو بیماریاں حملہ آور ہو گئیں۔ اخراجات میں بے اندازہ اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ گھر کے اخراجات، کرایہ، آنے جانے کے خرچے، مہمان داری، بچے کا خرچا، دکھ بیماری اور ایک جانب صرف ایک کمانے والا۔

ایک روز میں آرٹ کونسل میں بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا کہ اتنے میں دو افراد میرے پاس آئے۔ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ اجازت لے کر بیٹھ گئے۔ وہ مجھے پہچانتے تھے۔

بہزاد لکھنوی (1900-1974)

موج طہور، کرم بالائے کرم، موج نور، بستانِ بہزاد، نغمہ روح، ارمان حرم، درمانِ غم، آہِ ناتمام، چراغ طور، کیف و سرور، نغمہ طور، نعت رسول'' (صلی اللہ علیہ وسلم)، ثنائے حبیب اور ذکرِ حضور جیسے نعتیہ حمدیہ منقبتی مجموعوں کے شاعر سردار حسین خان کے بیٹے انور بہزاد ریڈیو پاکستان کے نیوز ریڈر افسر اور ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے پروڈیوسر رہے۔ یکم جنوری 1900 نئی صدی کا آغاز کروانے والے سرزمین اودھ (لکھنو) میں آنکھ کھولنے والے بہزاد لکھنوی آل انڈیا مشاعروں کے حوالے سے بھی مشہور تھے۔ 10 اکتوبر 1974 کو آپ کی وفات ہوئی۔ سخی حسن مرکزی سڑک سے ملحقہ احاطے میں آپ کا مزار اور مسجد بہزاد عقیدت مندوں کو بہزاد لکھنوی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقرا سٹی، کراچی

''ظفر صاحب! ہمارا تعلق ایک ملک گیر رائٹرز ایسوسی ایشن سے ہے۔ ہم لوگ آپ جیسے قلم کاروں کی پذیرائی کے لیے تقریبات کرواتے ہیں تاکہ ان کے فن کو سراہا جا سکے۔ اس بار ہم نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ ہم بڑے پیمانے پر تقریب کریں گے۔''

سچی بات ہے مجھے اندر سے خوشی ہوئی۔ ہر قلم کار کا یہ یکساں معاملہ تھا کہ حوصلہ افزائی سے اسے لگاؤ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا اصل معاوضہ یہی صلہ اور ستائش ہے۔

''بس جناب! آپ کی اجازت چاہیے تھی۔'' دوسرے صاحب نے کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔ وقتی طور پر میں اپنے مصائب اور پریشانیاں فراموش کر بیٹھا تھا۔ ان دونوں آدمیوں نے اپنے نام مشتاق اور ناصر بتائے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اسی مہینے کے آخر میں آرٹ کونسل میں تقریب پذیرائی ہو گی۔ میں بہت خوش تھا۔ اپنے اعزاز میں ایک بڑی تقریب ہونا قلم کار کے لیے باعث فخر و انبساط تھا۔

میں گن گن کر دن گزارنے لگا تھا۔ مشتاق اور ناصر

صاحب سے فون پر رابطہ تھا۔ تقریب کے لیے ان کی ایسوسی ایشن خاصی بھاگ دوڑ اور سرگرمیاں دکھا رہی تھی۔ کئی اخبارات میں خبریں بھی لگوا دی تھیں۔ دوسری طرف ابا کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ دواؤں سے چلنے والی مشین بن گئے تھے۔ دوائیں بھی خاصی مہنگی ملتی تھیں، مجبوراً کسی نہ کسی طرح خرید لاتا تھا۔ باقی اخراجات جوں کے توں تھے۔ جب خود کو مشکلات کے ایسے کنویں میں محسوس کرتا تھا جس کی سپاٹ دیوار پر چڑھنا ناممکن تھا۔ گھر کا کرایہ بھی چڑھتا جا رہا تھا۔ دماغ ہی کام نہ کر رہا ہو تو لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح لکھتا رہتا تھا۔ کمانا تو تھا نا۔ گھر تو میں نے ہی چلانا تھا۔ اس کے علاوہ حمیرا نے میری مشکلات محسوس کرتے ہوئے گھر میں محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ اس علاقے میں زیادہ تر مڈل کلاس اور غریب لوگ رہتے تھے۔ لہٰذا بہت کم پیسوں پر بچے ٹیوشن کے لیے آ رہے تھے۔ کافی بچے آ جاتے تھے اس لیے مل ملا کر معقول پیسے بن جاتے تھے۔ میں نے اللہ کا شکریہ ادا کیا کہ آمدنی کا ایک اور ذریعہ پیدا ہو گیا۔ اس کے ساتھ حمیرا کا دل بھی بچوں کے ساتھ لگ گیا تھا۔ تقریب پذیرائی کا وقت نزدیک آ گیا تھا۔ وہ بڑا عجیب و غریب وقت تھا۔ خوشی کا موقع بھی تھا اور ساتھ ہی گھریلو پریشانیاں بھی بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ ابا کے علاج اور دواؤں پر اس ماہ بہت خرچا ہو گیا تھا۔ بس ٹیوشن سے ملنے والے پیسوں سے کھانے پینے کے اخراجات چل رہے تھے۔ مالک مکان تو پھر بھی شریف آدمی تھا۔ البتہ اس کی بیوی بہت تیز طرار تھی۔ وہ روز کرائے کے لیے پہنچ جاتی تھی اور حمیرا کو بے عزت کر کے جاتی تھی۔ حمیرا نے ایک کمیٹی ڈالی ہوئی تھی، جس کے پیسے مل چکے تھے مگر ابھی سال بھر تک پیسے بھرنے تھے۔ کمیٹی والی شمع خالہ پیسوں کے لیے الگ ستا کر جاتی تھیں۔

آخر وہ دن آ پہنچا جب آرٹ کونسل میں تقریب پذیرائی ہونا تھی۔ دل تو عجیب سا ہو رہا تھا۔ گھر میں ابا کی طبیعت خراب تھی لیکن حمیرا نے میری حوصلہ افزائی کی کہ مجھے جانا چاہیے۔ تب میں تقریب میں پہنچ گیا۔ آج دن بھر مجھے مشتاق اور ناصر کی کالز آتی رہیں، دونوں میری جانب سے بہت فکرمند تھے۔

تقریب میں بہت لوگ آئے تھے۔ بڑے بڑے نامور قلم کار اور سرکاری لوگ بھی تھے۔ ساتھ ہی تاجر برادری بھی موجود تھی، جن کا لکھنے پڑھنے سے دور کا واسطہ نہ تھا۔

تقریب میں میرے فن کے بارے میں تقاریر ہوئیں۔ خوب تعریفیں کی گئیں۔ آخر میں، میں نے بھی خطاب کیا۔ لوگوں نے بہت تالیاں بجائیں۔ آٹوگراف اور سیلفیاں لی گئیں۔ کھانے کا بھی زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔ بلاشبہ مشتاق اور ناصر نے بہت پیسے خرچ کیے تھے۔ تقریب کے بعد سب اپنی اپنی گاڑیوں میں .... گھروں کو روانہ ہو گئے اور میں بس اسٹاپ کی جانب چل پڑا۔ بوجھل بوجھل قدموں سے بس میں سوار ہونے کے بعد خیال آیا کہ میں نے تقریر سے پہلے اپنا موبائل سائلنٹ پر کر دیا تھا۔ جلدی سے موبائل نکالا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس میں حمیرا کی بہت ساری مس بیلز تھیں۔ میں نے اسی وقت کال ملائی۔

"ہیلو...... ہیلو...... کہاں ہیں آپ؟" رابطہ ہوتے ہی دوسری جانب سے حمیرا کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ "کب سے کال کر رہی تھی میں۔"

"کیا ہو گیا؟" میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ابا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ ابھی الٹیاں بھی ہوئی ہیں۔ آپ جلدی سے آ جائیں۔"

"بس...... میں...... میں آ رہا ہوں۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

باقی کا سفر کس طرح گزارا، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ تقریب کا نشہ ایک دم ہرن ہو گیا تھا۔ ابا کی صورت کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتا نہیں حمیرا نے شاکر بھائی کو اطلاع دی تھی یا نہیں۔ مجھے گھر پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ابا کی حالت بالکل غیر ہو چکی تھی۔ اسی وقت میں نے شاکر بھائی کو کال کر دی۔ مگر ان کا موبائل بند جا رہا تھا۔

"تم نے شاکر بھائی کو کال کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کی تھی...... دو بار کی تھی مگر وہ اب تک نہیں آئے۔" حمیرا نے بتایا۔

میں ابا کو سنبھالنے لگا۔ گھر میں اتنے پیسے نہ تھے کہ ابا کو کسی اسپتال لے جاؤں۔ اسپتال والے تو پہلے پیسے لیتے اور بعد میں مریض کو دیکھتے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ کاش شاکر بھائی آ جائیں لیکن وہ نہیں آئے۔ موبائل بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے مشتاق اور ناصر کا خیال آیا۔ میں نے مشتاق کو کال کر دی۔

"جی...... جی سر...... حکم......؟" دوسری جانب سے مشتاق کی آواز سنائی دی۔

تب میں نے بے کم و کاست تمام صورتِ حال سے

آگاہ کر دیا۔

"اوہ...... سر جی بڑا دکھ ہوا۔ ایمان سے میرا بس چلے تو آپ کی ہر پریشانی دور کر دوں...... مگر سر...... ابھی اتنا خرچا ہو گیا ہے۔ تقریب سے جیبیں جھاڑ کر نکلے ہیں۔ ابھی تو کھانے کے پیسے بھی دینے ہیں پھر بھی میں منع نہیں کر رہا۔ اگر کوئی بندوبست ہوا تو حاضر ہو جاؤں گا۔" مشتاق نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

میں نے مایوسی کے عالم میں فون بند کر دیا۔

رات ایک بجے تک ابا کا انتقال ہو گیا۔ انہیں اسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ جن لوگوں کے لیے میں معاوضے پر لکھتا تھا میں نے انہیں بھی فون کیے مگر سب نے اپنی مجبوریاں بیان کر دیں۔ پاس پڑوس والے گھر میں جمع ہو گئے تھے۔ شاکر بھائی صبح ہی پہنچ سکے تھے۔ اب ان سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

☆......☆

دو مہینے بعد میں آرٹ کونسل میں بیٹھا تھا۔ ایک صاحب نے ٹیلی فلم لکھوائی تھی۔ وہ ساتھ لایا تھا۔ ان سے معاوضہ بھی لینا تھا۔ ابھی ان صاحب کی کال آئی تھی کہ وہ ٹریفک میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں اکیلا بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اردگرد کی کرسیوں پر اور بھی لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ معاً میرے کانوں سے مانوس سی آواز ٹکرائی۔

"سر آپ بے فکر رہیں۔ ایسی شاندار تقریب ہوگی کہ آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ ہمارے لیے بھی یہ اعزاز کی بات ہوگی۔"

یہ آواز سن کر میں نے دھیرے سے گردن گھما کر سرسری انداز میں دیکھا۔ میرے عقب میں ناصر اور مشتاق بیٹھے تھے اور ان کے سامنے ایک مشہور شاعر براجمان تھے۔ ان دونوں کو میری موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ ان کے جملے وہی تھے جو وہ کم و بیش مجھ سے کہہ چکے تھے۔ وہی جگہ تھی۔ وہی ڈائیلاگز وہی دونوں بس اس بار میرے بجائے کوئی اور ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو معلوم ہو کہ مجھے کیا ملے گا؟" شاعر صاحب نے ان کی باتیں تسلی سے سن کر کہا۔ دونوں ایک دوسرے کی شکلیں تکنے لگے۔

"آپ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ وضاحت کریں گے آپ؟" ناصر نے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے اور میں یہ سب دھندے جانتا ہوں۔ یہ جو آپ لوگ تقریبات کے نام پر کمائی کا دھندا کرتے ہو یہ میں برسوں سے دیکھتا آیا ہوں۔ ایک ایک تقریب پر کئی کئی لاکھ روپے کماتے ہو آپ۔ مجھ جیسے شاعروں اور قلم کاروں کا نام کیش کروا کر اپنی جیبیں بھرتے ہو۔ ایک تقریب پر خرچا ہی کتنا ہوتا ہے۔ لاکھ دو لاکھ اور کماتے کتنا ہو۔ پانچ چھ لاکھ اسی لیے تو ادبی تقریبات میں تاجروں اور سرکاری لوگوں کو بلواتے ہو تاکہ ان سے لمبی لمبی رقمیں حاصل کی جائیں۔ معاف کرنا بھئی، منہ پھٹ آدمی ہوں مگر بڑے دھوکے کھا کر عقل آئی ہے۔" شاعر بولتا چلا گیا۔ وہ دونوں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"ہاں...... اگر مجھے بھی نفع میں سے تیسرا حصہ دیتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ چائے کا شکریہ۔"

مشتاق اور ناصر چپ چاپ اٹھ کر چلتے بنے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہاں ان کی چال بازی کام میں نہیں آئے گی۔

شاعر صاحب مجھے جانتے تھے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد اٹھ کر میرے پاس آ گئے۔

"یہ میں نے آپ کو سنانے کے لیے کہا تھا۔" انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دو ماہ پہلے ان دونوں حضرات نے آپ کے لیے تقریب سجائی تھی۔ پتا ہے آپ کو ظفر صاحب ان لوگوں نے چار لاکھ روپے بچائے تھے اور آپ کے گلے میں سو پچاس کے پھول ڈال کر رخصت کر دیا تھا۔"

میں سر جھکائے سنتا رہا۔

"مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ آپ معاشی طور پر بہت زیادہ پریشان تھے۔ ان خبیثوں نے آپ کو ایک روپیا نہیں دیا تھا۔" وہ بولتے جا رہے تھے۔

میں سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت مشتاق اور ناصر میری تھوڑی مدد کر دیتے تو شاید ابا کا علاج ہو سکتا تھا۔ موت کو تو ٹالا نہیں جا سکتا تھا لیکن دل کو تسلی ہو جاتی کہ میں نے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

اپنا یہ واقعہ لکھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مجھ جیسے لوگ نوسر بازوں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ لوگ ہم جیسوں سے فائدہ اٹھا کر آگے کسی اور فنکار کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ قلم کاروں کی مالی مدد کے لیے حکومت کو سرکاری طور پر اقدام کی ضرورت بھی ہے تاکہ تخلیق کار معاشی طور پر بے فکر ہو کر اپنے کاموں میں مشغول رہیں۔

گناہِ بے لذت

محترم مدیر
سلام مسنون
ایک سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ یہ سچ بیانی فوزیہ اور منال کی ہے، فارس کی ہے اور اس پھوپی کی ہے جس نے آگ بھڑکائی کہ فوزیہ کا بھرا پرا گھر تباہ ہو گیا۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ میزانِ عدل سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ ببول کے پیڑ سے آم نہیں اترتے، کانٹے ہی ملتے ہیں۔

عذرا احمد
(کراچی)

''فوزیہ جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔ افوہ، یہ منال کہاں رہ گئی؟'' کلثوم بڑی عجلت میں تھی آج اس کے بیٹے کی برات جو تھی۔

کلثوم کے چھ بچے تھے، تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ سب سے بڑا احماد اس سے چھوٹی فوزیہ پھر منال پھر فہد اس کے بعد سارا اور سب سے چھوٹا احد۔ کلثوم اور اس کا شوہر حیدر رضا سے کھاتے پیتے لوگ تھے، اس لیے وہ آج دل کھول کر اپنے ارمان پورے کر رہے تھے۔

حیدر کو سامنے سے آتا دیکھ کر کلثوم کو پھر یاد آ گیا کہ بیٹیاں اب تک تیار نہیں ہوئیں جبکہ انہیں وقت پر شادی ہال پہنچنا تھا۔ اس کے چلاّنے کے جواب میں فوزیہ کی آواز آئی۔
''امی ہم ابھی آتے ہیں، آپ پلیز ایان کو دیکھ لیں۔''

ایان فوزیہ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، اس کی عمر تین سال تھی۔ اس سے بڑا سات سالہ زیان اور سب سے بڑا گیارہ سالہ صوبان۔

فوزیہ کے جواب پر کلثوم ایان کو تیار کرنے لگی۔

فوزیہ نے آئینہ پر نظر ڈالی پھر اپنے پیچھے بیٹھی آنٹی سے پوچھا۔ ''آنٹی میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''ماشاء اللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو، ویسے یہ بات تمہیں مجھ سے نہیں فارس سے پوچھنی چاہیے۔''

فارس فوزیہ کا شوہر تھا آنٹی اس کے نام پر فوزیہ کو چھیڑ رہی تھیں۔

فوزیہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''آنٹی فارس کو تو میں ہر حال میں اچھی لگتی ہوں، وہ تو میری برائی کر ہی نہیں سکتا۔''

''افوہ فوزی ایک تو تمہارے بچے میری ناک میں دم کر دیتے ہیں۔'' منال نے خود سے لپٹنے کی کوشش کرتے زیان کو پرے دھکیلتے ہوئے تنک کر کہا۔

''خبردار میرے بچوں کو کچھ مت کہو اور منال تم تو اب عادی ہو جاؤ تو اچھا ہے کیونکہ میں اپنے بچے تمہارے پاس ہی چھوڑ کر جانے والی ہوں۔'' فوزیہ شرارت سے ہنسی دباتے ہوئے بولی۔

''جی نہیں، میں تو تمہارے بچوں کو ایک پل بھی نہ رکھوں اور ویسے تم جا کہاں رہی ہو جو ان بلاؤں کو میرے سر ڈالنے کا کہہ رہی ہو۔''

''بس تم بیاہ کر آ جاؤ، پھر میں اور فارس آزادی سے گھومیں گے، تم اور حارث ہمارے بچے سنبھالنا۔''

''ہاں بھئی، اب یہی کام تو رہ گیا ہے میرا کہ تمہارے بچے سنبھالوں اسی لیے تم میری شادی اپنے دیور سے کروا رہی ہو نا۔'' منال روہانسی سی ہو گئی۔

اب فوزیہ کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا وہ ایک قہقہہ لگا کر بولی۔ ''بس بس اب پلیز ملکۂ جذبات بن کر رونا مت شروع کر دینا، اگر میک اپ خراب ہو گیا تو حارث ڈر کر بھاگ جائے گا کہ بھابی نے کیسی چڑیل میرے سر منڈھ دی ہے۔''

اس بات پر منال کو بھی ہنسی آ گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بڑی بہن اس سے مذاق کر رہی ہے۔ اسے اپنی خوبصورتی کا

پورا پورا احساس تھا اور ہوتا بھی کیوں نہیں وہ تھی بھی اتنی پیاری گوری رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، پُرکشش چہرہ۔ منال اور فوزیہ میں پانچ سال کا فرق تھا۔ فوزیہ اس وقت اٹھائیس کی تھی اور منال تیئس کی۔

فوزیہ کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ ابھی وہ سولہ سال کی تھی کہ اس کی ماں کو اس کی شادی کی فکر لگ گئی۔ وجہ تھی اس کی عجیب حرکتیں۔ وہ ہر وقت بنی سنوری رہتی اور گھنٹوں کبھی کھڑکی تو کبھی بالکونی میں کھڑی رہتی۔ یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر ماں کا دل ہولتا تھا کہ وہ ابھی بچی ہے، نا سمجھ ہے زمانے کی نیرنگیوں کو نہیں جانتی کہیں کسی چکر میں نہ پھنس جائے۔ اوپر سے جو کمی تھی وہ انڈین فلموں اور سٹار پلس کے ڈراموں نے پوری کر دی تھی۔ وہ تصور میں خود کو ان ڈراموں کی ہیروئن سمجھنے لگی تھی۔ ہر وقت بن سنور کر کھڑکی میں کھڑے ہونے کا کوئی تو نتیجہ نکلنا ہی تھا۔ ایک روز سامنے والی بلڈنگ میں کھڑکی میں کھڑے خرم کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پہلی نظر میں ہی وہ گھائل ہو گیا۔ ادھر جب فوزیہ کی نظر خرم پر پڑی تو اس کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ خرم اسے گھور رہا ہے مگر وہ ہٹنے کے بجائے انجان بنی وہیں کھڑی رہی اور کنکھیوں سے خرم کو دیکھتی رہی۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ روزانہ فوزیہ تیار ہو کر کھڑکی میں آ جاتی اور اسی وقت خرم بھی اپنی کھڑکی میں آ جاتا۔ پہلے پہل ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے پھر اشاروں کی زبان میں باتیں ہونے لگیں۔

فوزیہ کے ابا نے پانچویں کے بعد اسے اسکول سے روک دیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے اتنا پڑھنا کافی ہے ان کو چولہا چوکی ہی کرنا ہے مگر وہ ایک انسٹیٹیوٹ میں سلائی کڑھائی سیکھنے جاتی تھی۔ یہی موقع ہوتا تھا جب وہ باہر نکلتی تھی۔ خرم نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جب وہ سلائی سیکھنے جاتی تو خرم راستے میں کھڑا ہوتا اور موقع پاتے ہی اس کے ہاتھ میں خط پکڑا دیتا یا وصول کر لیتا۔ یوں ان کی محبت پروان چڑھتی رہی۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہی مثال ان پر بھی صادق آ گئی۔ لاکھ احتیاط کے باوجود خطوط کا یہ تبادلہ محلے والوں کی نظر میں آ گیا۔ انہوں نے جا کر دونوں کے والدین سے شکایت کر دی۔

خرم کے ابا نے جب اس سے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ ''ہاں میں فوزیہ سے محبت کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' مگر دوسری طرف جب فوزیہ کے گھر

میں پتا چلا تو انہوں نے اس پر سختی کی اور اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی مگر فوزیہ اس موقع پر ڈٹ گئی اور اس نے بھی صاف کہہ دیا ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اس بات پر اس کے والد غصے سے بے قابو ہو گئے، انہوں نے کہا۔ ''آج سے تمہارا باہر نکلنا بند تمہارا اسلامی سینٹر جانا بھی بند۔''

فوزیہ ان سختیوں کو برداشت نہ کر سکی اور بیمار رہنے لگی۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی اور وقت گزرتا گیا پھر ایک عجیب بات ہوگئی۔ اس پر دورے پڑنے لگے۔ دورے کے دوران وہ چیختی چلاتی اور خود کو اذیتیں دینے کی کوشش کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنی کلائی کی نسیں کاٹ کر خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی مگر بروقت اسپتال کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔ اسپتال سے واپس آنے کے بعد اس میں ایک تبدیلی آ گئی اب اس کو چپ لگ گئی تھی۔ اس دوران خرم کی ماں، بیٹے کے مجبور کرنے پر ان کے گھر رشتہ لے کر آئی مگر کلثوم نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ''ہم شریف لوگ ہیں اور اپنے جیسے ہی لوگوں سے رشتہ جوڑتے ہیں۔''

''بہن خاندان تو ہمارا اور تمہارا ایک ہی ہے۔''

''دیکھو شمع، تم نے بھاگ کر خاندان سے باہر شادی کی ہے، اس کے بعد تمہارا خاندان سے کوئی تعلق نہیں رہا اور رہی بات میری بیٹی کی تو میں اسے کبھی ایسے گھر میں نہیں بیاہوں گی جہاں تم جیسی بدکردار عورت ہو۔'' کلثوم نے کاٹ دار لہجے میں زہر اگلا۔

خرم کی ماں شمع کو بھی غصہ آگیا۔ ''میں نے شادی کی تھی کوئی غلط کام نہیں کیا، سمجھیں۔ خبردار جو میرے کردار پر کیچڑ اچھالا۔ تم تو بہت پاکباز اور باکردار ہو نا، تم نے اپنی بیٹی کی ایسی پرورش کیوں کی کہ وہ میرے بیٹے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میرے بیٹے نے اس کی وجہ سے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی، اللہ کا شکر ہے اس کی جان بچ گئی۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے، مجھے اس کی خوشی عزیز ہے ورنہ میں تم جیسے لوگوں میں کبھی رشتہ لے کر نہ آتی اور نہ اب کبھی آؤں گی۔''

یہ کہہ کر شمع چلی گئی۔ اب کلثوم کو اپنے رویے پر افسوس ہونے لگا۔ وہ اب تک یہ سمجھ رہی تھی کہ فوزیہ سنجیدہ ہے اور خرم محض وقت گزاری کر رہا ہے مگر آج اسے پتا چلا کہ خرم بھی سنجیدہ ہے جبھی اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے شمع کو جو جلی کٹی سنائی تھی اس کے بعد تو وہ اب کبھی بھی رشتہ لے کر نہ آتی۔

فوزیہ کی نانی کو اس ساری کہانی کا پتا چلا تو اس نے بھاگ دوڑ شروع کر دی کہ جلد از جلد کہیں رشتہ کر کے فوزیہ کو عزت سے رخصت کر دیا جائے۔ کچھ دنوں بعد ہی نانی کلثوم کے پاس پہنچی اور آتے ہی کہا۔ ''جلدی سے مٹھائی منگواؤ بہت اچھی خبر لائی ہوں۔''

کلثوم نے حیرت بھری نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا تو وہ بولی۔ ''ارے اب بھی نہیں سمجھی؟ فوزیہ کے لیے بہت اچھا رشتہ لائی ہوں۔ لڑکا بہت امیر ہے اپنا کاروبار ہے۔ ہماری فوزیہ لاکھوں میں کھیلے گی۔ سونے سے پیلا کر دے گا وہ اسے۔ فوزیہ کو رانی بنا کر رکھے گا۔ تم بس ہاں کہہ دو۔''

''مگر امی حیدر کو تو آنے دو۔ میں ان سے پوچھ کر ہی ہاں کر سکتی ہوں نا؟ پھر لڑکے کے بارے میں چھان بین بھی تو کرنی ہوگی اس کے بغیر ہاں کرنا مناسب نہیں ہوگا نا؟''

''ارے بھئی پوری چھان بین کر کے آئی ہوں۔ لڑکے کا نام فارس ہے۔ اس کے علاوہ گھر میں اس کا ایک چھوٹا بھائی حارث ہے۔ ایک بہن ہے جس کی شادی ہو چکی ہے وہ افریقہ میں رہتی ہے۔ لڑکے کے ماں باپ ہیں اور ایک معذور پھوپی ہے۔ بس مختصر سی فیملی ہے اس پر بھی سوچنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟''

اتنے میں حیدر بھی آ گیا۔ ساس سے ساری تفصیل سن کر وہ نیم رضامند ہو گیا۔ اس نے رسماً فارس اور اس کے گھر والوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر ہاں کر دی۔

فوزیہ کو چپ لگی ہوئی تھی مگر جب اسے معلوم ہوا کہ گھر والے اس کا رشتہ طے کر رہے ہیں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ حیدر اور اس کی نانی نے مل کر اسے سمجھایا۔ ''فوزیہ اب تمہارے باپ کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم چاہو تو ہمارا مان رکھ کر ہاں کر دو ورنہ تمہاری مرضی ہمیں سارے خاندان میں ذلیل و رسوا کر دو مگر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سمجھ لو کہ اگر تم نے ہاں نہیں کی تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو گی۔''

اس بات پر فوزیہ تڑپ گئی اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ یہ وہی تھا جس نے اسے پیار سے پالا تھا۔ اس کے لاڈ اٹھائے تھے، آج وہ بے بسی اور مجبوری کی تصویر بنا اس کے سامنے کھڑا امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور اپنی عزت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس لمحے اسے باپ پر بہت ترس آیا اور وہ مجبور ہو گئی۔ اس نے حیدر کے ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیے اور انہیں چومتے ہوئے بلک پڑی۔ اس نے روتے روتے ہاں کر کے باپ کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔

فارس خود ایک پینتیس سالہ دبلا پتلا شخص تھا اس کے گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں باہر کو ابلتی ہوئی تھیں۔ اس کی شخصیت میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ اس نے جب فوزیہ کو دیکھا تو وہ دیوانہ ہو گیا۔ شادی کے لیے ایک مہینے کا وقت لیا گیا۔ وہ واقعی بہت خوش قسمت تھا کہ اسے فوزیہ جیسی خوبصورت بیوی ملی تھی۔

جس دن فوزیہ کی بارات تھی اس دن خرم کو چین نہیں تھا وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس امید پر کہ شاید فوزیہ اسے کہے کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ فوزیہ کو نہ آنا تھا نہ وہ آئی۔ فوزیہ کو دیکھے بنا اسے ایک دن چین نہیں آتا تھا آج اسے دیکھے چار مہینے ہو چکے تھے جس کی آواز سنے بنا اسے نیند نہیں آتی تھی اس سے فون پر رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ سارا دن جلے پاؤں کی بلی کی طرح بالکونی سے کھڑکی اور کھڑکی سے بالکونی میں دوڑتا پھر رہا تھا۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ دلہن کے گھر والے شادی ہال چلے گئے صرف حیدر اور فوزیہ گھر میں رہ گئے جنہیں بعد میں جانا تھا۔ دوسری طرف حیدر بھی پریشان تھا کیونکہ ایک دن پہلے اسے خرم کا پیغام ملا تھا کہ انکل آپ نے فوزیہ کی شادی کہیں اور کی تو میں اسے اغوا کر لوں گا۔ حیدر نے پولیس کو تو ملوث نہ کیا مگر خود اس سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ جب سب گھر والے چلے گئے تو حیدر فوزیہ کے ساتھ اترا۔ جب وہ گیٹ کے پاس پہنچے تو چونک کر رک گئے۔ خرم اچانک گیٹ میں گھس آیا اس کے چہرے پر اس وقت سنگین تاثرات تھے۔ اسے دیکھ کر دونوں باپ بیٹی پریشان ہو گئے۔ خرم بولا۔ ''انکل یہ آپ نے اچھا نہیں کیا، آپ نے نہ صرف میرے ساتھ بلکہ اپنی بیٹی کے ساتھ بھی زیادتی کی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا آپ فوزیہ کی شادی مجھ سے کر دیں۔''

حیدر نے خرم کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے اور کہا۔ ''بیٹا ہمیں جانے دو۔ مہربانی کر کے کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کرو ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ فوزیہ بھی رسوا ہو جائے گی۔ تم اگر اس سے سچی محبت کرتے ہو تو میں تمہیں اس محبت کا واسطہ دیتا ہوں کہ ہمیں جانے دو۔''

فوزیہ نے بھی گھونگھٹ کی آڑ سے کہا۔ ''خرم پلیز ہمیں جانے دو۔ یہ شادی میری خوشی اور مرضی سے ہو رہی ہے۔''

''لیکن فوزیہ تمہاری خوشی تمہاری محبت میں ہوں۔''

فوزیہ نے غمگین آواز میں کہا۔ ''نہیں خرم تم میری خوشی تھے مگر اب میری خوشی اور محبت سب میرا شوہر فارس ہے۔''

فوزیہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر خرم کو لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ اسے فوزیہ سے ایسی بے رخی کی امید ہرگز نہیں تھی۔ وہ روتے ہوئے ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ اب اس کے وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ یہ وہ فوزیہ نہیں تھی جس نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں، یہ تو ایک مجبور بیٹی تھی جو اب ایک باوفا بیوی بننے جا رہی تھی۔

جب تک نکاح نہ ہو گیا تب تک حیدر پریشان رہا کہ کہیں کچھ انہونی نہ ہو جائے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا شادی بخیر و عافیت نمٹ گئی اور فوزیہ رخصت ہو کر فارس کے گھر آ گئی۔

فوزیہ کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ دلہن بن کر وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے اب تک فارس کو دیکھا نہیں تھا مگر اسے دل و جان سے قبول کر چکی تھی۔ وہ صدق دل سے فیصلہ کر چکی تھی کہ خرم اب بھولا ہوا ماضی تھا اور فارس اس کا حال اور مستقبل تھا۔ وہ اپنی نئی زندگی کی شروعات دھوکے سے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ فارس کو اپنے ماضی کے بارے میں سب کچھ سچائی سے بتا دینا چاہتی تھی۔ فارس نے جب اسے دلہن کے روپ میں دیکھا تو اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے پہلے تو فوزیہ کے حسن کی بہت تعریف کی پھر کہا۔ ''آج تم اتنی حسین لگ رہی ہو کہ تمہیں سات خون بھی معاف ہیں۔''

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' فوزیہ نے سوالیہ نگاہوں سے فارس کو دیکھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ پتا ہے فوزیہ تم سے پہلے میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ میں نے اپنی محبت اپنے جذبات صرف اپنی بیوی کے لیے ہی سنبھالے ہوئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے جو مجھے اللہ نے تم جیسی حسین بیوی دی ہے۔''

اس وقت فوزیہ کو وہ بہت بلندیوں پر محسوس ہوا۔ فارس کا بدصورت چہرہ اس کے دل کی خوبصورتی کے آگے ماند پڑ چکا تھا۔ وہ فوزیہ کو اس وقت دنیا کا حسین ترین انسان لگا۔ جس نے اپنی امانت میں کوئی خیانت نہیں کی تھی اور پوری ایمانداری کے ساتھ اسے ملا تھا۔ جس کے خیالات بھی اس کی طرح پاک اور بلند تھے جبکہ فوزیہ نے فارس سے پہلے خرم کو چاہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے اپنا آپ فارس کے سامنے بہت چھوٹا محسوس ہوا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ فارس پریشان ہو گیا۔

''کیوں رو رہی ہو فوزیہ، کیا بات ہے؟''

فوزیہ نے روتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ابھی کہا تھا نا مجھے سات خون معاف ہیں؟ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میں اپنے اور آپ کے رشتے کی ابتدا سچائی اور ایمانداری سے کرنا چاہتی ہوں۔ وعدہ کریں ہمیشہ میرا ساتھ دیں گے اور مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں پگلی۔ تم تو میری زندگی ہو بھلا زندگی کو بھی کوئی چھوڑتا ہے؟“

”پلیز، آپ میری بات سن لیں اور وعدہ کریں مجھے معاف کردیں گے۔“

فارس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم میاں بیوی ہی نہیں دوست بھی ہیں، جو کہنا ہے اپنا دوست سمجھ کر بلا جھجک کہہ دو۔“

فوزیہ کو اس کی بات سے کچھ حوصلہ ملا تو اس نے اپنے اور خرم کے بارے میں اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور آخر میں کہا۔ ”فارس، خرم میرا گزرا ہوا کل تھا اور آپ میرا آج اور آیندہ کل ہیں۔ میں ہر پل آپ کی ہو کر جینا چاہتی ہوں۔“

فارس نے بڑے تحمل سے فوزیہ کی بات سنی اور پھر مسکرانے لگا۔ ”کہا تھا نا کہ آج سب معاف ہے، یہی غلطی یا کچھ اور بھی؟“

فوزیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اسے لگا اس کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہے اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

شادی کے بعد کے تین مہینے تو گھومنے پھرنے اور دعوتوں وغیرہ میں گزر گئے۔ فوزیہ فارس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ فارس اس کا بہت خیال رکھتا اور ہمیشہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی محبت میں فوزیہ خرم کو بھول ہی گئی تھی۔

ایک دن اچانک فوزیہ کے موبائل پر خرم کی بہن کی کال آئی۔ اس کی منگنی ہو رہی تھی اور وہ اس میں فوزیہ کو بلانا چاہ رہی تھی۔ فارس وہیں بیٹھا تھا اور چونکہ اسپیکر آن تھا تو وہ سب کچھ سن رہا تھا۔ فوزیہ نے اس وقت تو مختصراً بات کر کے کال کاٹ دی مگر فارس اس کے پیچھے پڑ گیا کہ ”تمہیں جانا چاہیے آخر خرم تمہارا دوست بھی تو تھا۔“

”فارس آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں؟“

”کیوں؟ کیوں نہیں جا سکتیں؟ ضرور جاؤ گی اور رہی بات کہ کیسے جاؤ گی تو تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

فارس کے مجبور کرنے پر فوزیہ اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔ فارس دراصل خرم سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسا دکھتا ہے کیسے اٹھتا بیٹھتا ہے کیسی باتیں کرتا ہے وغیرہ۔

جب وہ تقریب میں پہنچے تو خرم پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ فوزیہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ آج بھی ویسی ہی حسین اور معصوم لگ رہی تھی جیسی شادی سے پہلے لگتی تھی مگر فارس کو دیکھ کر اسے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ فوزیہ کے ساتھ ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ انہیں ساتھ دیکھ کر اسے پہلوئے حور میں لنگور والا مصرعہ یاد آ گیا تھا۔ دوسری طرف فارس نے جو خرم کو دیکھا تو دل ہی دل میں جل گیا خرم ایک اسمارٹ اور خوبصورت نوجوان تھا اس پر اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ نشست و برخاست میں شائستگی تھی ہر موضوع پر بلا تکلف بول سکتا تھا۔

خرم ان کے قریب آیا۔ اس نے فوزیہ کو سلام کیا اور فارس سے ہاتھ ملایا۔ ان کے درمیان گفتگو شروع ہوئی تو جلد ہی فارس احساس کمتری میں جتلا ہونے لگا۔ اس کی تعلیم واجبی سی تھی اور وہ ایک پکا کاروباری ذہنیت رکھنے والا شخص تھا اس لیے خرم کی طرح خوبصورت گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ عمر میں بھی وہ خرم سے بارہ تیرہ سال بڑا تھا اس لیے کچھ ہی دیر بعد اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا اور فوزیہ کو لے کر گھر روانہ ہو گیا۔

وہ جب سے واپس آیا تھا خرم ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار فوزیہ کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں کہ کہیں وہاں کوئی ملال یا پچھتاوا تو نظر نہیں آ رہا مگر اسے وہاں ایسی کوئی کیفیت نظر نہ آئی۔ وہ جیسی مطمئن گئی تھی واپس آ کر بھی ویسی ہی مطمئن تھی۔ اس بات نے فارس کو بے چین کر دیا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور وہ فوزیہ سے پوچھ بیٹھا۔ ”خرم تو بہت خوبصورت اور جوان لڑکا ہے۔ آج تمہیں اس سے مل کر کیسا لگا؟“

فوزیہ اس سوال کے لیے تیار نہ تھی اس لیے چونک کر بولی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

اس وقت فارس کا چہرہ اس کے اندرونی جذبات کی چغلی کھا رہا تھا وہاں کچھ کھونے کا ڈر چھایا ہوا تھا۔

فوزیہ نے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”خرم کیسا ہے، کیا ہے اب مجھے اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہے میرے تو سب کچھ آپ ہیں۔ میری دنیا میری محبت سب کچھ آپ ہی ہیں۔“

فوزیہ کی بات سن کر فارس مسکرا دیا مگر شاید اندر سے وہ اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ اسے بار بار پچھتاوا ہو رہا تھا کہ فوزیہ کو لے کر خرم سے ملنا اس کی حماقت تھی۔ خرم سوچ رہا ہوگا کہ یہ ہے فوزیہ کا شوہر۔ اتنا بدصورت اور اجیڈ۔ اس کے ذہن میں شک کے سانپ کلبلانے لگے۔ اب خرم ضرور فوزیہ سے ملنے کی کوشش کرے گا اور یہ بھی بڑی وفادار بنتی ہے ضرور اس سے راہ و رسم بڑھائے گی مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ سوچ کر وہ کچھ مطمئن ہو گیا۔

دوسرے دن وہ اپنی فیکٹری سے واپس آیا اور فوزیہ کو ڈنر کرانے باہر لے گیا۔ فوزیہ بہت خوش تھی کہ اس کا شوہر اسے کتنا چاہتا ہے اور اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ فوزیہ سے جدائی کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح ہے۔

گھر واپس آتے ہی اس نے فوزیہ کا موبائل لے کر ایک نمبر ڈائل کیا جو عینی کے نام سے سیو تھا۔ عینی خرم کی بہن تھی۔ فارس نے موبائل فوزیہ کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”عینی سے خرم کا نمبر لو۔“

فوزیہ پریشان ہو گئی۔ ”کیوں آپ کو اس کے نمبر کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”مجھے وہ اچھا لگا ہے اس لیے میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“

”پاگل ہو گئے ہیں آپ۔“ فوزیہ چلائی۔ ”میں یہ نہیں کر سکتی۔“

”ٹھیک ہے تم نہ کرو وہ کرے گا بات تو ایک ہی ہے نا؟ اس کی بہن کے پاس تمہارا نیا نمبر ہے تو یقیناً اس کے پاس بھی ہوگا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے فارس، عینی نے وہ نمبر میری ایک دوست سے لیا تھا۔ ہم اسکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے اس لیے دوستی بھی تھی۔ وہ دعوت دینے کے لیے میرا نمبر...“

”فوزیہ“ فارس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا حافظہ بہت اچھا ہے نا؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تم خرم کا نمبر بھول چکی ہو۔ تمہیں میری قسم نمبر بتاؤ یقین کرو میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں بلکہ سچ پوچھو تو تم لوگوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا اس لیے اب اور تو کچھ نہیں ہو سکتا مگر میں اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں تمہارا کھویا ہوا دوست ملا دوں مگر یاد رہے صرف دوست اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ دوستی میں کوئی حرج نہیں میں تنگ نظر نہیں ہوں۔“

اس نے اپنی باتوں سے مجبور کر کے فوزیہ کو خرم سے دوستی پر آمادہ کر لیا۔ فوزیہ کو خرم کا نمبر یاد تھا اس نے پہلی کال فارس کے سامنے ہی کی۔ اس نے خرم کو بتایا کہ ”میرے شوہر نے خود اجازت دی ہے کہ ہم دوستی کر سکتے ہیں۔“

خرم خوشی سے جھوم اٹھا۔ یوں ان کی کالز کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کے باوجود وہ جب بھی خرم سے بات کرتی اس کے دل پر ایک بوجھ سا آ جاتا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ اپنی ذات پر تو اسے پورا بھروسا تھا کہ وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی مگر خرم کا کیا کرتی۔ اس کی تو امیدیں پھر سے زندہ ہونے لگی تھیں۔ وہ کئی بار یہ بات فوزیہ کو بتا بھی چکا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا فوزیہ کی شادی کو دس ماہ ہو چکے تھے جب ان کے ہاں ایک پیارا سا بیٹا پیدا ہوا۔

فارس اب اس کی طرف سے پوری طرح سے مطمئن ہو چکا تھا کہ اگر وہ اسے چھوڑنا چاہتی تو کب کا چھوڑ کر جا چکی ہوتی۔ حالانکہ اس نے تو ان کو خوب موقع فراہم کیا تھا مگر ان کی بات صرف کالز تک ہی محدود تھی۔ نہ تو وہ اس دوران خرم سے ملی نہ اسے دیکھا۔ جس وقت نرس نے صوبان کو اس کی گود میں دیا تو اس وقت فوزیہ نے ایک فیصلہ کیا، خرم سے کبھی بات نہ کرنے کا۔ اب وہ ایک ماں بن گئی تھی۔ وہ ایک اچھی ماں بننا چاہتی تھی جس کی اولاد کو اس پر فخر ہو۔ وہ اپنے شوہر کا غرور تھی اور وہ اس مان و غرور کو کبھی توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

خرم نے جب مبارک باد دینے کے لیے کال کی تو اس نے اسے سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے آیندہ کال کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے لیے فوزیہ نے اپنا موبائل نمبر بھی تبدیل کروا لیا یوں خرم کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ شادی کو چھ سال ہوئے تو ذیان پیدا ہوا۔ اس کے دو سال بعد ایان پیدا ہوا۔ یوں فوزیہ اپنے گھر اور بچوں میں کھو گئی اور بارہ سال کا عرصہ گزر گیا۔ فوزیہ کا شوہر اب اس کا پہلے کی طرح ہی خیال رکھتا اور جان چھڑکتا تھا۔ ساس سسر بھی اسے بہت چاہتے تھے۔ وہ خود بھی سب سے پیار کرنے والی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی معذور پھوپی کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی وقت پر دوائیں دیتی۔ ہر طرح سے ان کا خیال رکھتی جس دن ان کی صفائی پر معمور ملازمہ چھٹی کرتی اس دن وہ انہیں نہلاتی، ان کا ڈائپر بدلتی اور ڈھیروں دعائیں لیتی۔ وہ پھوپو بھی کافی امیر تھیں اس لیے کبھی اسے چوڑیاں پہنا دیتیں، کبھی کنگن دے دیتیں۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ فارس بھی اس کے لیے سونے کی چیزیں تحفے میں لاتا رہتا تھا۔ غرض اس کی نانی نے شادی سے پہلے جو کہا تھا کہ فوزیہ سونے سے پیلی ہو جائے گی تو وہ سچ ہو رہا تھا۔ فوزیہ

جب بج سنور کر میکے آتی تو سب لوگ جس میں اس کی چچیاں بھی شامل تھیں اس کی آؤ بھگت میں لگ جاتیں۔ اس کی چار چچیاں تھیں جن میں سے تین تو ایک ہی فلور پر الگ الگ فلیٹوں میں رہتی تھیں جبکہ چوتھی چچی دوسری بلڈنگ میں رہتی تھیں۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اسے بیٹے کی بہت چاہ تھی مگر اس کی قسمت میں بیٹا تو کجا دوسری بیٹی بھی نہ تھی۔ یہ چچی فوزیہ سے بہت حسد کرتی تھیں۔ ایک تو اس کی عیش و عشرت والی زندگی دوسرے تین بیٹوں کی ماں ہونے کا اعزاز جو ایسے جاہلوں کے لیے بہت بڑی بات ہے ورنہ بیٹی ہو یا بیٹا سب اللہ کی دین ہے۔ وہ جب بھی فوزیہ کو خوش دیکھتیں تو اسس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ فوزیہ بہت بھولی بھی تھی اس لیے وہ اس چچی کی فطرت کو سمجھ نہ سکی اور اس سے اپنی ہر بات کہہ دیتی تھی یہاں تک کہ اس نے اسے خرم اور فارس کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا کہ فارس سب کچھ جانتا ہے پھر بھی اس نے فوزیہ کو معاف کر دیا ہے اور اس کی محبت میں کوئی فرق بھی نہیں آیا۔ یہ سب سن کر چچی کے دل میں اک آگ سی بھڑک اٹھی اور وہ فوزیہ کے جانے کے بعد کہنے لگی دیکھو میں کیا کرتی ہوں تمہارے ساتھ پھر وہ اس کام میں لگ گئیں۔

ادھر انجان فوزیہ نے اپنے دیور حارث کے لیے منال کا رشتہ مانگا جو حیدر اور کلثوم نے منظور کر لیا۔ یوں حارث کی منگنی منال کے ساتھ ہو گئی۔ فوزیہ اتنی اچھی بہو ثابت ہوئی تھی کہ اس کے ساس سسر کو اسی گھر سے دوسری لڑکی لینے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ منگنی کے چار ماہ بعد شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ فوزیہ اپنے اور منال کے لیے شادی کے کپڑے وغیرہ خریدنے جاتی تو واپسی پر انہی حاسد چچی کے پاس دم لینے رک جاتی جو بظاہر اس کی بہت اچھی دوست بنی ہوئی تھیں۔ وہ فوزیہ سے باتوں ہی باتوں سب کچھ اگلوا لیتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

ایسے ہی ایک دن فوزیہ میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کی منال سے ویسے بھی خوب بنتی تھی اور اب تو منال اسی گھر میں جانے والی تھی اس لیے وہ اور بھی قریب آ گئی تھی۔ وہ باتوں میں مصروف تھیں کہ منال کے موبائل پر ایک انجان نمبر سے کال آئی تو منال ذرا گھبرا گئی۔

فوزیہ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ کس کی کال ہے؟“

”فوزی مجھے پچھلے کچھ دنوں سے انجان نمبر سے کال آتی ہے کوئی آدمی ہے جو مجھے تنگ کرتا ہے۔“

”ڈرو مت میں خود بات کرتی ہوں۔ اب کے کال آئی تو اسے چھوڑوں گی نہیں۔“

اتنے میں پھر سے کال آ گئی۔ فوزیہ نے کال ریسیو کر کے اسے خوب لتاڑا خوب سنائیں۔ وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا، ڈھٹائی سے سب کچھ سنتا رہا۔ جب وہ چپ ہوئی تو بولا۔

”آواز تو آپ کی بھی بہت پیاری ہے۔ آپ اپنا نمبر مجھے دیں۔ میں اب آپ کی بہن کو نہیں، آپ کو کال کیا کروں گا۔“

فوزیہ نے گھبرا کر کال کاٹ دی اور منال سے کہا۔

”کوئی بہت ہی ڈھیٹ اور بدتمیز آدمی ہے۔“

اس کے بعد شادی کی تیاریوں میں فوزیہ کبھی اپنی امی تو کبھی چچی کے ہاں آتی جاتی رہی اس دوران وہ اس کال کو فراموش کر چکی تھی۔ اس دن بھی وہ اپنی امی کے ہاں آئی ہوئی تھی کہ منال کے موبائل پر پھر سے اسی کی کال آ گئی۔ فوزیہ نے غصے سے کہا ”افوہ ابھی تک اس منحوس سے پیچھا نہیں چھوٹا لاؤ مجھے دو میں اسے ٹھیک کرتی ہوں۔“

فوزیہ کی آواز سنتے ہی وہ بڑی بدتمیزی سے بولا۔

”ارے آپ کہاں تھیں؟ آپ کیا جانو ہم نے آپ کو کتنا مس کیا ہے۔“

فوزیہ کا غصے سے برا حال ہو گیا وہ چلائی۔ ”بکواس بند کرو میں تمہیں......“

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ہاں کیا کر لوگی میرا؟ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں مگر میں تمہارا بہت کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔“ اس نے فوزیہ کے گھر کا درست پتا بتاتے ہوئے کہا۔ ”تم اسی جگہ رہتی ہو نا؟ جہاں تم رہتی ہو میں وہاں نیچے ہوٹل میں روز آتا ہوں۔ میں تمہیں دیکھ بھی چکا ہوں۔ تم مجھے اچھی لگی ہو۔ میری مانو تو مجھ سے دوستی کر لو ورنہ تمہارے شوہر کو بتا دوں گا کہ تم نے مجھے کال کی تھی۔“

فوزیہ پر سکتہ سا چھا گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ تو اس کے گھر کا پتا بھی جانتا تھا۔ اگر وہ اس کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا فارس کو بتاتا تو کیا پتا فارس اس کی بات کا یقین کر ہی لے کیونکہ وہ خرم والے معاملے سے بھی واقف تھا۔ پچھلے سالوں میں ویسے تو سب کچھ نارمل تھا مگر کبھی کبھی فارس اسے اس حوالے سے کوئی طعنہ دے دیتا تھا یا کبھی اس کے والدین کی تربیت پر سوال اٹھا دیتا تھا۔ فوزیہ سب مسکرا کر برداشت کر لیتی تھی اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی جاتی تھی۔

اب وہ تین بچوں کی ماں تھی گھر میں سب اس سے پیار کرتے تھے تو وہ اس ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ فارس سے سچے دل سے پیار کرتی تھی اور اسے

ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک سلجھی ہوئی مگر کم عقل لڑکی تھی ورنہ وہ خود ہی فارس سے یہ بات کر دیتی مگر اس نے غلطی کی کہ یہ سب فارس سے چھپایا۔

اس کی چچی اسے اچھی طرح سے جانتی تھی اسی لیے اس نے یہ چال چلی تھی کہ اس کے بارے میں کسی کو بتا کر اس سے کالز کروا رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی پلاننگ کے تحت پہلے منال کے فون پر کالز کروائیں پھر فوزیہ کو نشانہ بنایا اس کا منصوبہ تھا کہ دونوں بہنوں کا گھر برباد ہو۔

فوزیہ اس کی دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ وہ جب اپنے گھر پہنچی تب بھی پریشان تھی اسے طرح طرح کے وسوسے تنگ کر رہے تھے۔ ہر دستک پر اس کا دل رک سا جاتا تھا کہ کہیں وہ تو نہیں آ پہنچا۔ کہیں وہ فارس سے مل کر اسے کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دے۔ اچانک موبائل کی بیل بجی اس نے دیکھا منال کی کال تھی۔ اس نے ریسیو کی تو منال کی پریشان آواز سنائی دی۔ ”فوزی ابھی اس منحوس کی کال آئی تھی وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ابھی تمہارے گھر جا رہا ہے۔“

فوزیہ کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ اس نے منال سے اس کا نمبر لیا اور خود اسے کال کر کے اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ وہ اس کے ساتھ ایسا ظلم نہ کرے۔ کچھ دیر بحث کے بعد فوزیہ نے روتے ہوئے اس سے کہا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو مجھ پر رحم کرو میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں پلیز میرا گھر برباد مت کرو۔“

اس آدمی نے اتنا سن کر کال کاٹ دی اور میسج بھیجنے لگا۔ پرسوں تم نے فلاں رنگ کے کپڑے پہنے تھے بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ میں تو مرمٹا ہوں تم پر وغیرہ وغیرہ۔ فوزیہ اس قدر پریشان ہوئی کہ فون ایک طرف رکھ کر بیٹھ گئی وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ میسج اور کال کی ٹونز بج رہی تھیں مگر وہ موبائل کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ شام کو فارس آیا تو اس سے پہلے ہی اس نے موبائل بند کر کے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ فارس نے پوچھا۔ ”میں کب سے کال لگا رہا ہوں تم کہاں تھیں فون بھی نہیں اٹھایا؟“

”وہ میں سو گئی تھی۔“

”مگر بعد میں فون بند کیوں جا رہا تھا۔“

”وہ میں چارج کرنا بھول گئی تھی۔“

خیر کھانا کھا کر فارس سو گیا مگر فوزیہ کو کافی دیر تک نیند نہ آئی، مگر بالآخر وہ بھی سو گئی۔

اچانک فارس کے چلانے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی۔ دیکھا تو صبح ہو چکی تھی اور فارس لال بھبوکا چہرے کے ساتھ بستر پر بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا فارس؟ کچھ چاہیے آپ کو؟“ وہ بستر سے اترتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

فارس نے زبان سے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اس کا موبائل اس کے سامنے کر دیا۔ اس کا ایس ایم ایس انباکس کھلا ہوا تھا۔ فارس نے انجانے نمبر سے آئے ایک میسج پر انگلی رکھی اور دھاڑ کر بولا۔ ”بتاؤ کون ہے یہ؟ کون ہے یہ؟ خرم ہے نا؟“

”نن نہیں فارس، میں قسم کھا کر کہتی ہوں یہ خرم نہیں ہے۔ میں تو اسے جانتی تک نہیں۔“

”جھوٹ بول رہی ہو تم، میں تم پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور تم مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔“ فارس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”نہیں فارس ایسا کچھ نہیں ہے آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنی صفائی کیسے پیش کرے کہ فارس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

”اب بھی تم جھوٹ بول رہی ہو فوزیہ، میں نے تمہارا موبائل چیک کیا تو پتا چلا کل شام کو تم نے اسے کال بھی کی تھی اور اس کا دورانیہ دس منٹ کا تھا، دس منٹ کسی اجنبی سے گفتگو نہیں ہو سکتی۔ ضرور تم اسے اچھی طرح جانتی ہو۔ اب بھی سچ سچ بتا دو ورنہ میری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں اب تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”فارس ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس نے ایک اور کوشش کی مگر تڑاخ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پر ایک تھپڑ پڑا، اس کے بعد گویا فارس پر دورہ سا پڑ گیا۔ وہ اندھا دھند اسے پیٹنے لگا تھپڑ، مکے، لاتیں، بیلٹ لکڑی غرض جو شے ہاتھ آئی اس سے فوزیہ کو دھنک کر رکھ دیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ بارہ سال سے اس کے دل میں جو لاوا پک رہا تھا وہ آج ابل پڑا تھا۔ فوزیہ کی ساس جو نیچے والے فلیٹ میں رہتی تھیں وہ شور شرابا سن کر بھاگتی ہوئی آ گئیں۔ اس نے بہت کوشش کر کے فارس کو روکا اور پوچھا۔ ”کیا ہوا کیوں اس کو ایسے مار رہے ہو؟“

فارس نے غصے کے عالم میں اپنی ماں کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ یہ سب سن کر ساس بھی غصے سے اکڑ گئی اور اس نے بھی فوزیہ کو خوب کھری کھری سنا دیں۔ بچے خوف کے عالم میں ایک جانب دبکے ہوئے رو رہے تھے، ان کے چہرے خوف

سے پیلے پڑ گئے تھے اور جسم سوکھے پتے کی طرح لرزیدہ تھے۔

ساس نے روتے ہوئے بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور نیچے اپنے فلیٹ میں آگئی۔

ادھر فارس فوزیہ کو مارتے مارتے تھک چکا تھا اس لیے اسے ایک زوردار دھکا دے کر باہر نکل گیا۔ گرتے ہوئے اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ کافی دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس کا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا، اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹتی کراہتی روتی وہ اپنے بستر تک پہنچی اور اس پر لیٹتے ہی پھر سے بے ہوش ہو گئی۔

شام کو فارس واپس گھر پہنچا تو اس نے دیکھا فوزیہ یونہی بے سدھ پڑی ہے۔ وہ اس پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے نیچے اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اب رات ہو رہی تھی تو فوزیہ کی ساس بچوں کو چھوڑنے اوپر آئی، اس نے فوزیہ کو آوازیں دیں مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں فارس بھی اوپر آ گیا۔

''فارس یہ جواب نہیں دے رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی ساس نے جیسے ہی اسے چھوا تو اس کا بدن بخار کی حدت سے تپ رہا تھا، کسی کے لمس کا احساس ہوتے ہی اس نے اسی عالم میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ''اماں، بابا، اماں بابا میں نے کچھ نہیں کیا میں اسے نہیں جانتی۔''

وہ بار بار یہی دہرا رہی تھی۔ ساس نے بچوں کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھا اور انہیں تاکید کی۔

''خبردار تم لوگ اپنے نانا نانی سے کچھ نہیں کہو گے، اگر تم نے کسی کو بھی کچھ بتانے کی کوشش کی تو فارس تم لوگوں کو بھی ایسے ہی مارے گا۔ سمجھ گئے تم لوگ؟''

بچے یہ سن کر اور سہم گئے اور روتے ہوئے کہنے لگے۔

''ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے دادی پلیز ابو سے کہیں ہمیں نہ ماریں۔''

اس نے بچوں کو چپ کرایا اور فارس سے کہنے لگی۔

''سنو بیٹا، فوزیہ کے ماں باپ کو بلا لو۔ کہہ دینا شدید بخار ہے، ورنہ کچھ ہو گیا تو ہمارے گلے پڑ جائیں گے کہ تم لوگوں نے اس کا خیال نہیں رکھا۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا، آپ کو بلانا ہے تو بلا لیں۔''

فوزیہ کی ساس نے فوزیہ کی امی کو فون کر کے اس کی بیماری کی اطلاع دی۔ کلثوم ایک جاہل اور ضعیف الاعتقاد عورت تھی۔ یہ بات فارس کی ماں اچھی طرح جانتی تھی اس لیے جب وہ آئی تو فارس کی ماں نے رونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں فوزیہ کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ شاید سایہ ہو گیا ہے کیونکہ یہ عجیب عجیب باتیں کر رہی تھی۔ جیسے مجھے مت مارو، میں اسے نہیں جانتی وغیرہ وغیرہ شاید جنات کا اثر ہو گیا ہے۔''

کلثوم جب پہنچی تو فوزیہ خاموش پڑی تھی۔ اپنی ماں کو دیکھ کر بھی خلاف معمول اس نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اتنے میں منال کی کال کلثوم کے موبائل پر آئی۔ وہ فوزیہ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ کلثوم نے موبائل فوزیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو منال سے بات کرو۔''

مگر موبائل دیکھتے ہی فوزیہ کی حالت غیر ہونے لگی جیسے اس نے واقعی کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھ سے موبائل چھین کر دور پھینک دیا اور ہسٹیریائی انداز میں چلانے لگی۔ ''نہیں اس منحوس چیز کو مجھ سے دور رکھو، میں اسے نہیں جانتی، پلیز مجھے مت مارو مجھے مت مارو، مجھے کیوں مار رہے ہو۔''

''فوزی تمہیں کیا ہو گیا ہے، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' کلثوم نے پریشان ہو کر کہا پھر پیار سے اس کے بال سہلانے لگی۔ ''اچانک کیوں بیمار پڑ گئی ہو، ضرور کسی کی نظر لگ گئی ہے۔''

فوزیہ کی ساس بولی۔ ''نہیں بہن مجھے تو یہ سایہ لگ رہا ہے۔ کتنی بار اسے منع کیا تھا کہ بن سنور کر خوشبو لگا کر شام ڈھلے باہر نہ نکلا کرو مگر میری بات کوئی سنے تب نا؟ اب دیکھو کسی چکر میں آ ہی گئی نا؟''

کلثوم جب تک بیٹھی رہی فوزیہ وقفے وقفے سے چلاتی رہی۔ ''مجھے مت مارو، میں اسے نہیں جانتی، مجھے مت مارو۔''

وہ کافی دیر بیٹھی رہی پھر اٹھ گئی۔ گھر پہنچ کر اس نے حیدر سے کہا۔ ''فوزیہ پر یقیناً جنات کا سایہ ہو گیا ہے۔ امی ایک بابا کو جانتی ہیں کل میں اسے امی کے ساتھ وہاں لے جاؤں گی۔ بیٹھے بٹھائے میری بچی بیمار ہو گئی ہے۔ اوپر سے منال کی شادی، گرچہ ساری تیاریاں مکمل ہیں مگر بس میری فوزی جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔''

ادھر صبح ہوتے ہی فوزیہ کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے فارس سے کہا۔ ''فارس کیا آپ ابو کو بلا دیں گے؟ اس کے بعد میں آپ سے کبھی کوئی کام نہیں کہوں گی۔''

فارس نے اس کی طرف دیکھا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔

فارس کی آنکھوں سے ٹپکتی نفرت اور اس کی بے اعتنائی اس سے برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ نہ اسے صفائی کا موقع دے رہا تھا نہ اس کی بات سن رہا تھا۔ اس کے سامنے جو کچھ آیا تھا اس نے اسی کو سب سے بڑا سچ سمجھ لیا تھا اب وہ اس سے ہٹ کر کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔

فوزیہ اب تک شدید بخار میں پھنک رہی تھی۔ فارس کے سسر نے کہا۔ ''فارس بیٹا، یا تو ڈاکٹر کو بلا کر اسے دکھا دو یا سامنے والے اسپتال میں اسے لے جاؤ۔ اس کا بخار تو کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔''

مگر اس کی ساس نے فارس کو منع کر دیا۔ ''خبردار اسے اسپتال لے جاؤ گے تو یہ راز کھل جائے گا کہ اسے کسی نے مارا ہے۔ پولیس کیس بن جائے گا اور اگر ڈاکٹر گھر آیا تو اسے بھی سب پتا چل جائے گا، ایسی غلطی مت کرنا۔''

''جی امی جیسا آپ کہہ رہی ہیں ویسا ہی ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ بچوں کا انتظار کرنے لگا جو اسکول کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ فوزیہ کی ساس نے غضبناک نگاہوں سے فوزیہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سا بخار کیا آ گیا، مہارانی جی بستر ہی پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں، اٹھو اور بچوں کو تیار کرو، اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے۔''

''امی، میری ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں ہے میں اٹھ نہیں پا رہی۔'' فوزیہ نے بدقت جواب دیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی، اٹھو اور بچوں کو اسکول بھیجو۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان نہیں کہ ان شیطانوں کو تیار کر سکوں۔'' ساس نے غصے سے کہا۔ تو فوزیہ اپنے آپ پر جبر کر کے کسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی مگر اس کے منہ سے سسکیاں اور کراہیں مسلسل نکل رہی تھیں۔ اس نے بمشکل بچوں کو تیار کر کے اسکول بھیجا پھر ساس سے کہا۔ ''امی پلیز میری امی اور ابو کو بلا دیں۔ پلیز انہیں بلا دیں۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز ڈوب گئی اور وہ بے ہوش کر فرش پر گر گئی۔ ساس گھبرا گئی اس وقت گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے فوراً حیدر کو کال کر کے بلا لیا۔

حیدر آیا تو فوزیہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ برسوں کی مریضہ لگ رہی تھی۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا، بال الجھے ہوئے تھے۔ جو جوڑا وہ پہنے ہوئے تھی وہ بری طرح مسلا اور پھٹا ہوا تھا اور اس پر شکنوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ یہ وہ فوزیہ تو کہیں سے نہیں لگ رہی تھی جو ہمیشہ نک سک سے تیار بنی سنوری رہتی تھی۔ وہ آنکھیں جو زندگی سے بھرپور ہوا کرتی تھیں اب خالی خالی اور اداس تھیں۔ اپنے ابو کو دیکھ کر اس کے سوکھے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ابو، آپ آ گئے؟''

''ہاں بیٹا میں آ گیا ہوں۔'' حیدر نے اس کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا تھا۔

''ابو مجھے اپنی گود میں سلائیں گے؟ مجھے آپ کی گود میں سونا ہے۔'' فوزیہ نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

حیدر کا دل بھر آیا مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کا سر اپنی گود میں رکھا تو وہ بڑی معصومیت سے حیدر کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا دی۔ اس کے ساتھ ہی حیدر کے ضبط کا بندھن جواب دے گیا اور وہ زار و قطار رونے لگا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے فوزی؟ میں ابھی ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔''

''نہیں ابو، اب اس کی ضرورت نہیں اب ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکے گا۔ آپ پلیز مجھے چھوڑ کر مت جانا، مجھے آپ کی گود میں سونا ہے۔ بہت گہری اور پُرسکون نیند۔ مجھے بہت سارا سونا ہے۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ حیدر نے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر اسے جھنجوڑنے لگا اور آوازیں دینے لگا مگر وہ اب اتنی دور جا چکی تھی جہاں اس تک کوئی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اس کی جواں مرگی پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ غسالہ نے لاش کو غسل دینے کے بعد فوزیہ کی ساس سے پوچھا کہ۔ ''یہ کیا معاملہ ہے اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس کے تو پورے جسم پر نیل پڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو پولیس کیس لگتا ہے۔''

فارس کی ماں نے جلدی سے اس کی مٹھی گرم کر دی اور زبان بند رکھنے کو کہا۔ کلثوم اس وقت بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ فوزیہ کو جنات نے مارا ہے اسی وجہ سے نشان نظر آ رہے ہیں۔ جب میت تیار ہو گئی تو سب کو آخری دیدار کے لیے بلایا گیا۔ سب وہاں جمع ہو گئے ان میں وہ آنٹی بھی تھی جسے فوزیہ اکثر تیار ہو کر پوچھا کرتی تھی۔ ''آنٹی میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' فوزیہ کی میت پر اس کی شادی والا کامدار دوپٹا ڈالا گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ گہری اور پُرسکون نیند سو رہی ہے اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی اٹھ کر آنٹی سے پوچھے گی ''آنٹی میں کیسی لگ رہی ہوں۔'' آنٹی کے کانوں میں یہ جملہ گونج رہا تھا اور اس آنٹی

کے بین نہیں رک رہے تھے۔ فوزیہ کی وہ معذور پھوپی ساس بھی بہت رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو، اب میرا خیال کون رکھے گا۔''

جب جنازہ اٹھا تو ایک قیامت سی برپا ہوگئی ہر طرف آہ و بکا کا شور تھا مگر فارس سپاٹ چہرہ لیے ایک طرف بیٹھا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح سب کچھ نمٹا رہا تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ''فوزیہ جیسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے اچھا ہوا میری جان اس سے چھوٹ گئی۔'' فوزیہ کی ایک غلطی وہ تھی جو اس نے خرم کے ساتھ تعلقات کی ابتدا کی تھی اور دوسری غلطی یہ تھی کہ سب کچھ فارس کو بتا دیا تھا۔ اگرچہ اس نے سب کچھ خلوص نیت سے کیا تھا مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ فارس چاہے خود کو کچھ بھی ظاہر کر رہا تھا مگر اندر ہی اندر وہ بارہ سال تک حسد اور رشک کی آگ میں جلتا رہا تھا۔

فوزیہ کی موت کے چودہ ماہ بعد ایک بہت زبردست طوفان باد و باراں آیا۔ بارش انتہائی شدید تھی جس کی وجہ سے قبرستان میں بہت سی قبریں کھل گئی تھیں۔ فوزیہ کا بھائی فہد اکثر اپنی بہن کی قبر پر جاتا رہتا تھا اور گورکن کو پیسے وغیرہ دیتا رہتا تھا تاکہ وہ قبر کا خصوصی خیال رکھے۔ اس نے گورکن کو اپنا موبائل نمبر بھی دے رکھا تھا۔

طوفان کے دوسرے روز اسے گورکن نے کال کی کہ تمہاری بہن کی قبر کھل گئی ہے جلدی آؤ اور اسے ٹھیک کرواؤ۔ فہد فوراً قبرستان پہنچا تو دیکھا قبر کافی حد تک کھلی ہوئی تھی۔ لاش نظر آ رہی تھی کفن تھوڑا سر سے ہٹ گیا تھا جہاں سے بال نظر آ رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور اس نے فارس کو کال کی۔ ''فارس بھائی آپ جلدی قبرستان آئیں میں یہیں فوزیہ کی قبر کے پاس ہوں۔''

فوزیہ کی موت کو اب چودہ ماہ ہو چکے تھے فارس کا غصہ بھی اتر چکا تھا اس لیے وہ اس کال پر قبرستان چلا گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو حیدر بھی اسی وقت وہاں آ چکا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسی قبر کو دوبارہ سے ٹھیک کروا دیتے ہیں مگر کسی کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ قبر میں اتر کر کفن وغیرہ کو درست کر دے جس کے بعد قبر بند کی جاسکے۔ بالآخر فارس نے ہمت کی وہ قبر میں اترا۔ میت کے منہ پر کپڑا پڑا تھا مگر سر سے ہٹ گیا تھا جہاں سے بال نظر آ رہے تھے۔ فارس نے ذرا سا کپڑا ہٹا کر چہرہ دیکھا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے سر پر کفن درست کیا پھر بازو پکڑ کو اس کی پوزیشن درست کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ فوزیہ کا جسم بھی اکڑا ہوا نہیں تھا بلکہ نرم تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ اسے گزرے چودہ مہینے ہو چکے ہیں وہ تو بالکل تازہ میت لگ رہی تھی جس کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ اپنا کام نمٹا کر جب فارس باہر آیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ جس نے اس کی موت پر ایک آنسو نہیں بہایا تھا آج اس کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔ آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ فوزیہ سچی تھی اور وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ جبھی اللہ پاک نے اس کے جسم کو محفوظ رکھا تھا اور چودہ مہینے بعد اسے دکھا دیا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب وقت گزر چکا تھا۔ اب دائمی پچھتاوا اس کا مقدر تھا۔

دوسری طرف اس کی وہ آنٹی جس نے سازش تیار کی تھی۔ ان کی بیٹی کو اس کے شوہر نے ایک ذرا سی بات پر طلاق دے کر تینوں بچوں کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بیٹی اور نواسیوں کا بوجھ پڑا تو وہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ گھر کی دال روٹی چلانے کے لیے انہیں اپنا گھر بیچنا پڑا۔ اب وہ خدا کی بستی میں ایک جھگی بنا کر رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مکافات عمل بھگت رہی ہیں۔ فارس کی زندگی بھی عبرت ناک ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نے بچوں کی وجہ سے ایک مطلقہ سے دوسری شادی کر لی تھی جس کی ایک بیٹی بھی تھی مگر اب وہ ہر وقت فوزیہ کی تصویریں دیکھتا رہتا تھا اس سے باتیں کرتا تھا اور معافیاں مانگتا رہتا تھا۔ یہ سب اس کی دوسری بیوی کی برداشت سے باہر تھا ویسے بھی وہ سوتیلے بچوں سے نفرت کرتی تھی اس لیے ایک دن اپنے سر پر دوسری بار طلاق کا داغ سجا کر چلی گئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد فارس نے ایک ادھیڑ عمر لاولد بیوہ سے شادی کر لی۔ اب وہ اسی کے ساتھ رہتا ہے مگر وہ آج بھی فوزیہ کو نہیں بھول سکا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''فوزیہ جیسی تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' وہ خود کو کوستا ہے، پچھتاتا ہے، روتا ہے اور فوزیہ کی روح سے اور اللہ پاک سے معافیاں مانگتا ہے۔

فوزیہ کی اچانک موت کی وجہ سے وقتی طور پر منال اور حارث کی شادی ٹل گئی تھی جو ڈیڑھ سال پورا ہونے پر ہوگئی۔ فوزیہ کے بچوں کو اب منال ہی سنبھالتی ہے۔ فوزیہ نے جو بات مذاق میں کہی تھی وہ سچ ہو گئی ہے۔ ''منال تم تو اب عادی ہو جاؤ تو اچھا ہے کیونکہ میں اپنے بچے تمہارے پاس ہی چھوڑ کر جانے والی ہوں۔'' کسے پتا تھا کہ واقعی ایسا ہی ہوگا۔ اللہ فوزیہ کی مغفرت کرے۔

▲▲▲

اقتدار

محترم مدیر

السلام علیکم

رہبری کے لیے لوگ سیاست میں آتے ہیں، عوامی خدمت کرنا ہی سیاست ہے لیکن ہمارے ہاں اصل سیاست اس کلیہ کے الٹ ہے۔ صرف اور صرف مفاد حاصل کرنے آتے ہیں۔ اسی لیے سیاست ایک دوشنام بن گیا ہے۔

ہلال شیخ

گھر کے باہر گاڑی کھڑی ہوئی، عاطف اور افضل دونوں گاڑی سے باہر نکلے اور بھاگتے ہوئے ماں کے پاس پہنچے۔

''امی امی!'' عاطف اور افضل زور زور سے بول رہے تھے۔

''کیا ہوا خیریت تو ہے؟'' مریم بولی۔

''آج ہمارا رزلٹ آیا ہے۔'' افضل بولا اور رزلٹ کارڈ دکھانے لگا۔ دونوں کی کوشش تھی کہ پہلے اس کا کارڈ دیکھا

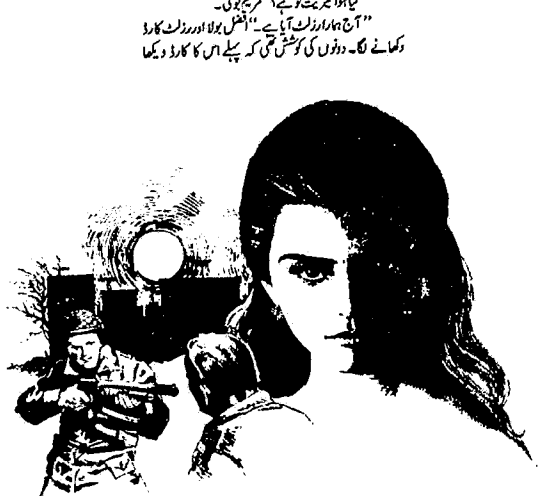

جائے۔"

"ٹھہرو ایک ایک کر کے دیکھوں گی ناں۔" مریم نے دونوں کا رزلٹ کارڈ تھاما۔

"ارے واہ دونوں کے ہی نمبر اچھے آئے ہیں پر اس دفعہ افضل نے عاطف کے مقابلے میں زیادہ اچھے نمبر لیے ہیں۔" مریم نے عاطف کی طرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی اس دفعہ دانش بھائی کی شادی کی وجہ سے تیاری نہیں ہو سکی پر اگلی دفعہ زیادہ نمبر لے کر اس دفعہ کی کسر پوری کر دوں گا آپ کو پتا تو ہے میں کسی سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوں۔"

"چلو چھوڑو اس رزلٹ کارڈ کو اور جا کر منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگا رہی ہوں۔" مریم نے کہا۔

دونوں اپنے کمرے کی طرف چل دیے اور مریم نے باورچن کو کھانا لگوانے کا حکم دیا۔ مریم طلال کے پاس سب کچھ تھا اگر کچھ نہ تھا تو اپنے بچوں کے لیے وقت۔ مختلف قسم کی پارٹیز میں شمولیت کے بعد جو وقت بچتا وہ اپنی بوتیک کو دیتی تھی۔ اس کے بعد جو وقت بچ جاتا وہ شاپنگ کی نذر ہو جاتا۔ بہت مصروف زندگی تھی مریم طلال کی۔ مزاج کی بہت سخت تھی۔ اپنے سامنے اونچی آواز اور اٹھتی ہوئی نگاہ اسے بالکل پسند نہ تھی۔

مریم رخسانہ کو جو کہ اس کی باورچن ہے اسے نصیحت کر رہی تھی "سنو رخسانہ بچوں کو کھانا کھلا دینا اور ان کو زیادہ شرارتیں نہ کرنے دینا کچھ دیر کے لیے سونے دینا اور شام کو ان کے ٹیچر آئے تو ان کو وقت پر تیار کرا کر اسٹڈی روم میں بھیج دینا اوکے۔" مریم نے بیگ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"جی بیگم صاحبہ!" رخسانہ نے کہا۔

مریم کہہ کر چلی گئی اور اب رات تک اس کی مصروفیت تھی۔

☆.....☆

کمرے میں بہت خاموشی تھی ملک طلال اور ان کے علاوہ چار افراد بیٹھے تھے جو کہ ملک طلال کے خاص بندے تھے۔ ملک طلال سگریٹ سلگا رہا تھا اور باقی چار بھی خاموش بیٹھے تھے کافی دیر کی خاموشی کے بعد ولید نے خاموشی توڑی۔

"ملک صاحب آگے الیکشن ہے اور چوہدری امجد کافی اچھا جا رہا ہے اس دفعہ لوگ اس کی حمایت بھی کر رہے ہیں ہمیں اپنی روزمرہ کے معاملات کو بدلنے ہوں گے۔" ولید نے کہا۔

سلیم نے ولید کی بات سنی تو بولا "صرف جلسوں سے کام نہیں چلے گا ولید صاحب ہماری پوزیشن کوئی اچھی نہیں رہی ہم نے اس دفعہ اس علاقے میں کیا ہی کیا ہے؟ لوگ اس دفعہ چوہدری کو بہت سپورٹ کر رہے ہیں۔"

ملک طلال ایک دم سیدھا ہو گیا اور اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں دبا کر بجھا دیا پھر بولا "ولید تم بھول رہے ہو ملک طلال نے کبھی ہار نہیں دیکھی ہے۔ ہار کے لفظ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے اور جہاں ہار ہوتی ہے وہاں ملک طلال نہیں ہوتا۔ ہم الیکشن لڑیں گے اور چوہدری امجد کو ہرائیں گے چاہے ہمیں لاشوں کا قالین ہی کیوں نہ بچھانا پڑے ہفتے کے دن گراؤنڈ میں جلسہ رکھو ہم جلسہ کریں گے اور جلسے میں گولی بھی چلنی چاہیے۔"

ملک طلال نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ٹیک لگائی۔

گولی کا لفظ سن کر چاروں ایک دم حیران ہو گئے۔

"گولی۔"

"ہاں جلسے میں ایک کارکن اُڑا دیا جائے گا اور اس طرح لوگوں کی ہمدردی بھی مل جائے گی اور چوہدری بھی ڈر جائے گا۔" طلال نے بات مکمل کی اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد چاروں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

دولت اور سیاست ملک طلال کو وراثت میں ملی تھی۔ ملک طلال ایک دفعہ ارادہ کر لیتا تو پھر دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے اس کا فیصلہ نہیں بدلتا تھا۔ اگر فیصلہ بدلتا تو صرف بیٹوں کی وجہ سے۔ اپنے بیٹے بہت عزیز تھے۔ بچوں کے معاملے میں وہ کسی کی سنتا نہیں تھا۔ رات کو جب طلال گھر پہنچا تو بچے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ جب ان دونوں نے طلال کو آتے دیکھا تو وہ دونوں بھاگے بھاگے آئے۔

"ڈیڈی ڈیڈی۔" بچوں نے آواز لگائی اور اور اس سے لپٹ گئے۔

"میری جان، کیسے ہو بچو؟" طلال نے افضل کو گود میں اُٹھا لیا اور عاطف کے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ "تمہاری امی کہاں ہیں؟" طلال نے بچوں سے پوچھا۔

"پتا نہیں کہاں مصروف ہیں آپ کو تو پتا ہے ان کو کتنے کام ہوتے ہے۔" عاطف نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے کھانا کھا لیا؟" طلال نے پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں۔" عاطف نے کہا۔

"چلو کھانا کھاتے ہیں۔" طلال کہتا ہوا کمرے میں فریش ہونے چلا گیا۔

طلال نے کمرے میں آتے ہی اپنا موبائل نکالا اور مریم کو فون کیا۔ مریم اس وقت ایک ہوٹل میں کچھ دوستوں کے

ساتھ میٹنگ میں مصروف تھی جن میں خواتین کے ساتھ مرد بھی موجود تھے۔ مریم خوش گپیوں میں مصروف تھی کہ اس کے موبائل پر رنگ ہوئی۔ مریم نے فون کان کو لگایا۔ "ہیلو۔" مریم بولی۔

"کہاں ہو؟" طلال نے پوچھا۔

"میں اِدھر کچھ فرینڈز کے ساتھ ہوں خیریت ہے؟" مریم نے کہا۔

"تمہیں بچوں کی کچھ پرواہ ہے کہ نہیں۔ گھر سے باہر جاتی ہو تو گھر کو ہی بھول جاتی ہو۔ تمہارے بچوں نے کھانا کھایا یا نہیں تمہیں کسی چیز کی پرواہ ہی نہیں۔" طلال کو غصہ آ گیا تھا۔

مریم نے جب طلال کی غصے میں آواز سنی تو وہ بولی۔

"کچھ ہی دیر میں آ رہی ہوں بابا۔ میں گھر میں رخسانہ کو سب سمجھا آئی تھی وہ کھلا دے گی۔" مریم نے صفائی پیش کی۔

"وہ تمہارے بچے ہیں رخسانہ کے نہیں۔" طلال نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مریم کو طلال کی بات ناگوار گزری مگر وہ ماحول خراب کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کو سب چیزوں سے زیادہ اپنی لائف عزیز تھی۔ اس نے سب باتوں کو نظر انداز کر دیا اور دوبارہ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔

طلال نے کھانا بچوں کے ساتھ کھایا اور پھر ان کے ساتھ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ طلال ایک بارعب شخص تھا اس کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں تھا مگر عاطف اور افضل کے لیے وہ غلام بن جاتا تھا۔ اس نے بچوں سے کہا۔ "چلو بچوں اب آپ دونوں لیٹ جاؤ اور آنکھیں بند کر لو شاباش۔"

"ابو آپ بھی ہمارے ساتھ لیٹ جاؤ نا پلیز۔" افضل نے معصومانہ انداز میں کہا اور طلال کو اس پر پیار آ گیا اور وہ کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ لیٹ گیا۔ ایک طرف عاطف تھا اور دوسری طرف افضل۔

"ڈیڈی کل میں نے آپ کا انٹرویو دیکھا تھا نیوز چینل پر، آپ بہت اچھے لگ رہے تھے۔" عاطف نے کہا۔

"اچھا۔" طلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈیڈی میں بھی آپ کی طرح سیاست داں بنوں گا اور ٹی وی پر انٹرویو دیا کروں گا۔" عاطف نے کہا۔

"اور آپ کیا بننا چاہو گے افضل بیٹا۔" طلال نے افضل سے پوچھا۔

"میں ڈاکٹر بنوں گا۔" افضل نے کہا۔

"کیوں آپ سیاست داں نہیں بننا چاہتے۔" طلال نے پوچھا۔

"نہیں مجھے سیاست دان نہیں بننا مگر میں سیاست دانوں کو فائدہ پہنچاؤں گا۔" افضل نے کہا۔

"وہ کیسے۔" طلال نے افضل کے سر کو ہاتھ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"روز ٹی وی میں دیکھتا ہوں، جلسوں میں خون خرابا ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی مر جاتا ہے۔ میں ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کیا کروں گا۔" افضل نے بڑی معصومیت سے کہا۔

افضل کی بات سن کر طلال خاموش ہو گیا اور کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

کچھ دیر بعد دونوں سو گئے۔ طلال اُٹھ کر باہر چلا گیا اور لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔

آج جمعہ کا دن تھا اور جلسہ بھی تھا۔ تیاریاں اپنے عروج پر تھیں میڈیا والے ملک طلال کو پورا دن ٹی وی پر دکھاتے رہے ملک طلال سیاست میں ایک نمایاں نام تھا اور اس دفعہ جو مقابلے میں کھڑا تھا وہ بھی ملک طلال کی ٹکر کا آدمی تھا۔

ملک طلال نے تقریر تیار کی ہوئی تھی اور اس کا ماننا تھا کہ وہ عوام میں جوش بھر دے گا۔ آج کا دن اس کے لیے اہم تھا۔ ملک طلال کے آدمی بھی ایکٹیو تھے۔ ملک طلال نے آدھے گھنٹے کی ہنگامی میٹنگ بلائی اور اس میٹنگ میں ولید، اسلم، احمد اور اجمل موجود تھے۔ طلال نے ولید سے کہا۔

"کام مکمل ہے یہ کام بہت صفائی کے ساتھ ہونا چاہیے کسی قسم کی بات بھی لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ بے فکر ہیں ملک صاحب۔ کام اتنی صفائی سے ہوگا کہ کسی کے باپ کو بھی نہیں پتا چلے گا۔" ولید نے کہا۔

"چلو پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جاؤ اور جس کو جو کہا گیا ہے وہی کرے۔" طلال نے کہا۔

میٹنگ ختم ہوئی اور سب کمرے سے باہر چلے گئے۔

رات کے آٹھ بج گئے تھے اور تیاریاں مکمل تھیں۔ پورا علاقہ روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر طرف ملک طلال کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ طلال نے جلسے کے لیے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور اوپر کالا ویسٹ کوٹ جو اس کی شخصیت کو اور بہتر کر رہا تھا۔

طلال اسٹیج پر بیٹھا ہوا تھا کہ مقرر نے پُر جوش انداز میں طلال کو تقریر کرنے کے لیے بلایا۔ طلال بڑے پُر جوش انداز میں اُٹھا اور مائک کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

میرے پیارے ہم وطنو السلام علیکم!

میرے پیارے بھائیوں اور بہنوں، آپ کا اس جلسے میں تشریف لانا اور اس لمحے کو خوشگوار بنانا مجھ پر اعتماد کا اظہار

ہے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ کو بھی اتنی خوشی ہوگی جتنی آج مجھے ہے۔ میں فضول باتیں کرکے آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ وقت باتوں کا نہیں کام کرنے کا ہے اور آپ جانتے ہیں پچھلے سال ہم نے اس علاقے پر کتنی محنت کی ہے اور ہم نے جو وعدے کیے وہ بخوبی پورے کر دکھائے۔ عوام کا اعتماد حاصل کرنے اور اس علاقے کو بہترین علاقہ بنانے میں، میں نے دن رات محنت کی ہے۔ میں بالکل نہیں چاہوں گا کہ میرے علاقے کو کل کا بندہ جس نے ابھی سیاست کی الف ب نہیں پڑھتی وہ میرے علاقے کے لوگوں کو بیوقوف بنائے۔ یہ چوہدری امجد جو اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے یہ دیہاڑی باز سیاست دان۔

ابھی ملک طلال تقریر کر رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی اور ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ سیکیورٹی گارڈ آئے اور طلال کو اسٹیج کی بیک سائیڈ پر لے گئے اور گاڑی میں بٹھا دیا۔ افراتفری مچ گئی تھی۔ جلسہ گاہ میں لوگوں کا شور وغل بڑھتا جا رہا تھا اور ہر شخص ایک دوسرے کو دھکے دے کر جلسہ گاہ سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ ہر چینل پر اس جلسے کی ویڈیو بن رہی تھی۔

مریم نے جب ٹی وی پر دیکھا تو اس نے فوراً طلال کو فون کیا۔ ''آپ ٹھیک ہیں ناں میں نے ٹی وی پر دیکھا تو میں ڈر گئی تھی آپ خیریت سے تو ہیں نا۔'' مریم نے کہا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں تم فکر نہ کرو میں گھر ہی آ رہا ہوں۔'' طلال بولا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا اور سکون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

نیوز چینلز پر جلسے میں چلنے والی گولی اور جاں بحق ہونے والے شخص کی تصویر بار بار دکھائی جا رہی تھی اور ملک طلال کے حامیوں نے سارا ملبا چوہدری امجد پر ڈال دیا اور مشہور کر دیا کہ یہ سازش اپوزیشن نے کی ہے۔

صبح اُٹھتے ہی طلال نے پریس کانفرنس بلائی اور تمام چینلز والے اس کے گھر میں تھے۔ اس نے میڈیا والوں کو بتایا۔ ''ہمیں ڈرایا گیا ہے میں اس حلقے میں پچھلے دو الیکشن لگاتار جیت چکا ہوں میری اس محنت پر پانی پھیرنے کے لیے اپوزیشن نے خون کی سیاست شروع کر دی ہے جو کہ ہم نہیں ہونے دیں گے ہم معصوم عوام کا خون نہیں بہنے دیں گے۔'' کچھ باتیں کر کے ملک طلال نے کانفرنس ختم کر دی۔

جو شخص رات کو جلسے میں مارا گیا تھا اس کا نام علی تھا اور علی کے گھر میں قیامت کا منظر تھا۔ ملک طلال اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس گھر میں پہنچا ملک طلال کو دیکھ کر اس کے گھر والے سب الرٹ ہو گئے اور اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ علی کے ابو بھی وہاں موجود تھے جو کہ شروع سے طلال کی پارٹی کے سپورٹر رہے تھے۔

علی کے ابو نے ملک طلال کو بٹھایا ان کی آنکھیں رو رو کر لال ہو چکی تھیں اور ملک طلال ان آنکھوں میں درد صاف دیکھ سکتا تھا۔ ''ہمیں بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا آپ کو آپ کا بیٹا ہماری پارٹی کا بہت اچھا کارکن تھا اس بات کا بھی ہمیں بہت فخر ہے۔ اس نے اس ملک اور اس پارٹی کی خاطر جان دی ہے وہ شہید ہے۔'' ملک طلال نے علی کے ابو کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''جی بس اللہ کو جو منظور وہ ہمارا اکلوتا بیٹا تھا۔ علی کی امی نے رو رو کر اپنا حال ہی برا کر لیا ہے۔'' علی کے ابو احمد بول رہے تھے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جہاں طلال بیٹھا تھا وہاں ایک عورت چیختی چلاتی آئی۔ ''میرا بیٹا میرا بیٹا ارے اللہ اس کو دردناک موت دے جس نے میرے جوان بیٹے کو مار دیا وہ بھی نہیں بچے گا وہ بھی کتے کی موت مرے گا۔'' وہ چیخ رہی تھی۔

طلال نے جب اسے چیختے ہوئے دیکھا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگ گیا۔ اس نے اپنے سیکریٹری سے چیک بک نکالنے کو کہا۔ اس نے چیک بک پر دس لاکھ روپے کا چیک کاٹ دیا اور احمد کو پکڑا دیا۔

''نہیں جی اس کو رہنے دیں ان پیسوں سے کون سا علی واپس آجائے گا۔'' احمد بولا۔

''یہ میری طرف سے ہے، مہربانی کر کے منع مت کیجیے گا اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' طلال کہتا ہوا اٹھا اس نے مصافحہ کیا اور باہر جانے لگا وہ عورت طلال کو غصے سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں لال تھیں۔ طلال کو اس کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا اس لیے وہ تیز قدموں کے ساتھ باہر آ گیا۔

کچھ دیر بعد نیوز چینل پر ایک ہیڈ لائن چلی۔ ''علی کے لواحقین کو دس لاکھ کا چیک دے دیا گیا۔''

جلسے میں حادثے کے بعد طلال کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ چوہدری امجد کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور طلال کافی بھاری ووٹوں سے جیت گیا۔

چوہدری امجد ایک بھاری جسم کا مالک تھا اور کافی بارعب تھا اس میں ایک اچھے سیاست داں کی تمام خوبیاں موجود تھیں اس کا بہت نام تھا۔ وہ ملک طلال کی طرح بے پرواہ نہیں تھا۔ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا باتوں میں مصروف تھا۔

''اس دفعہ طلال کی یہ تکنیک کامیاب ہو گئی۔'' زبیر

بولا۔

''ہاں زبیر تم سچ کہہ رہے ہو۔'' چوہدری مایوس لہجے میں بولا۔

''ملک کو کافی داؤ آتے ہیں الیکشن جیتنے کے لیے وہ نئی نئی تکنیک آزماتا ہے۔ وہ اتنا ظالم داؤ کھیلے گا امید نہیں تھی۔'' محمود علی بولا۔

''کوئی بات نہیں یار، ملک کتنی دیر تک اس دھوکے کے ساتھ عوام کو بیوقوف بناتا پھرے گا۔ ایک دن یہی دھوکا اس کو ڈھونڈ نکالے گا اور کوئی داؤ نہیں کھیل سکے گا۔'' امجد نے مونچھوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ سب خاموش ہو گئے اور امجد کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

اس دفعہ بھی الیکشن جیت کر طلال اسلام آباد چلا گیا تھا علاقے کی حالت ویسی کی ویسی ہی رہی۔ ملک طلال علاقے سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی میں مصروف رہا۔ وقت گزرتا رہا اور پانچ سال ہو گئے۔

☆......☆

طلال اور اس کے کچھ ساتھیوں کی میٹنگ جاری تھی۔

''ملک صاحب اس دفعہ تو بہت مشکل لگتا ہے کہ خدا ہی ہمیں الیکشن جیتا دے ورنہ کچھ نظر نہیں آتا۔ میڈیا والوں نے تو ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے۔'' ولید بڑے ادب کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

ولید ملک طلال کا فرماں بردار ساتھی تھا مگر آج ولید کو دیکھ کر طلال کی آنکھوں میں چمک آ رہی تھی۔ ''ایسا کرو ولید علاقے میں کچھ کام کراؤ اس دفعہ تم لوگوں میں کچھ نمایاں ہونے کی کوشش کرو میں چاہتا ہوں لوگوں کو ایک نیا چہرہ دکھایا جائے۔ اس دفعہ میں تمہیں الیکشن میں کھڑا کراؤں گا۔'' طلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ولید نے جب یہ بات سنی تو اس کا خوشی سے دل جھومنے لگا ''ملک صاحب، آپ میرے لیے یہ سوچ رہے ہیں میں تو آپ کا غلام ہوں۔'' ولید نے کہا۔

''تم الیکشن جیتو یا میں جیتوں بات تو ایک ہی ہے۔ اس میں کیا فرق پڑتا ہے؟ آخر ہم نے بازی جیتنی ہے اور عوام کے سامنے ایک نیا لیڈر ہو گا تو شاید وہ خوش ہو جائے۔'' طلال نے ولید کی حوصلہ افزائی کی۔

''جی میں آج سے ذمہ داریاں سنبھال لوں گا اور علاقے میں کام کروانا شروع کرتا ہوں لیکن آپ کے نام پر کام کراؤں گا۔'' ولید خوشی سے بات کر رہا تھا۔

''سیوریج کا نظام بہت خراب ہے علاقے میں تم پہلے وہ کرواؤ اور پیسوں کی فکر مت کرنا۔'' طلال کہتا ہوا اٹھ گیا۔

طلال تین الیکشن جیت چکا تھا۔ عاطف اب بڑا ہو چکا تھا۔ او لیولز کے بعد اب وہ اے لیولز میں تھا اور افضل او لیولز میں گیا تھا۔ اب ان کی ایکٹوٹیز بدل چکی تھیں۔ عاطف زیادہ پولیٹیکل سبجیکٹ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کی شکل اور عادات اپنے باپ سے بہت ملتی تھی اور اس کے برعکس افضل ذرا درویش صفت ہی رہا۔ اس کو جانوروں کا شوق تھا اس نے پرندے اور دو کتے پالے ہوئے تھے اور ان کی دیکھ بھال خود کرتا تھا۔

اس رات کھانے کی ٹیبل پر سب گھر والے موجود تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ طلال کھانا کھاتے ہوئے عاطف کی طرف دیکھ کر بولا۔

''عاطف بیٹا کیسی پڑھائی جا رہی ہے؟''

عاطف نے کہا۔ ''اعلیٰ۔''

''اور افضل بیٹا تم بتاؤ میں نے سنا ہے آج تم نے پھر ایک طوطا خریدا ہے۔ یہ تم کیسے شوق پالتے ہو۔'' طلال نے ذرا ناک چڑا کر کہا۔

''ڈیڈی وہ مجھے اچھے لگتے ہیں ان کی دیکھ بھال کرنا اچھا لگتا ہے۔''

''بیگم تمہارا یہ بیٹا چڑیا گھر کھولنے کے موڈ میں لگتا ہے۔'' طلال نے مریم سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی آپ کا بیٹا ہے آپ ہی جانیں میری تو ایک نہیں سنتے دونوں۔ عاطف اس دفعہ آپ کے ساتھ پولیٹیکل کمپین کرنے کی سوچ رہا ہے۔'' مریم نے عاطف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

طلال نے سنا تو اس کو تعجب ہوا اس نے عاطف سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی تمہیں سیاست میں آنا ہے کیا۔''

''جی ابو میں سوچ رہا تھا کہ آپ کی تھوڑی سی ہیلپ کروں۔'' عاطف نے کہا۔

''تم ابھی پڑھائی کی طرف توجہ دو ان کاموں میں ابھی نہ پڑو۔'' طلال کا لہجہ ذرا سخت محسوس ہوا عاطف کو۔

کھانا کھا کر سب فارغ ہو گئے تھے۔ عاطف کو اپنے باپ کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا کیونکہ طلال نے کبھی عاطف کو کسی بات سے منع نہیں کیا تھا۔

الیکشن کے دن چل رہے تھے انتخابات میں ایک مہینا رہ گیا تھا۔ ولید کے پوسٹر چھپے تھے۔ وہ ایم این اے کی کرسی کے لیے الیکشن لڑ رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ علاقے میں طلال کا

جانشین بنا ہوا تھا اور دوسری طرف طلال کے گیت بھی گا رہا تھا۔ ان پانچ سالوں میں بھی کارکردگی صفر تھی، اس وجہ سے ولید کے سپورٹر بھی اتنے زیادہ نہیں تھے۔

آج جلسہ تھا اور لائٹوں سے علاقہ روشن کیا گیا تھا۔ ولید نے تقریر کی بھرپور تیاری کی ہوئی تھی اور ملک طلال مہمان خصوصی کے طور پر آیا تھا۔ میڈیا والے صبح سے ملک طلال اور ولید کے جلسے کی کوریج کرنے پہنچ گئے تھے۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے جلسہ میں بہت رونق تھی پہلے کی نسبت بھیڑ کافی کم تھی مگر تھی۔ کچھ لوگ پیسے دے کر منگوائے گئے تھے۔ جلسہ شروع ہوگیا اسٹیج پر ملک طلال اور ولید کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملک طلال نے فون نکالا ایک نمبر ڈائل کیا اور کان کو لگایا پھر ادھر کی بات سن کر طلال نے فون پر کہا۔ ”کام بہترین طریقے سے ہونا چاہیے۔“

ولید نے دیکھا تو پوچھا۔ ”ملک صاحب خیریت ہے نا۔“

”ہاں سب خیریت ہے تم فکر نہ کرو۔“ طلال نے کہا۔

ولید کو عجیب سا لگا پر وہ خاموش ہوگیا۔ ”کیا محسوس کر رہے ہو آج اپنے آپ کو اس جگہ دیکھ کر۔“ طلال نے ولید سے پوچھا۔

”جی یہ سب آپ کا ہی ہے آپ کی دعائیں ہیں کہ آپ نے اپنے ملازم کو اس لائق سمجھا۔“ ولید نے کہا۔

”تم ہمارا سرمایہ ہو ولید اور ہمیشہ یاد رہو گے ہمیں۔ کل میں تمہارے حق میں بیٹھنے کا اعلان کروں گا۔“ طلال نے ولید کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

اتنے میں ولید کو اسٹیج پر تقریر کرنے کو بلایا گیا اور وہ اپنی کرسی پر سے اٹھ کر ڈیسک پر پہنچا یہ اس الیکشن کا سب سے بڑا جلسہ تھا اور کافی رونق تھی۔ ولید کے سپورٹر بھی ولید کے لیے نعرہ لگاتے اور کبھی طلال کے لیے ولید ڈیسک پر گیا اور اس نے مائک سیدھا کیا اور تقریر شروع کی۔

ولید تقریر کر رہا تھا۔ اس کی تقریر کے دوران کبھی نعرے گونجتے اور کبھی خاموشی چھا جاتی ولید تقریر کر رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی اور سارا جلسہ عجیب و غریب شکل اختیار کر گیا۔ سب ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بالکل پچھلی بار کی طرح جیسے طلال کی دفعہ ہوا تھا اسٹیج پر طلال اٹھا اور اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے قدم رکے اور ڈیسک کے پاس پڑی ولید کی لاش کو دیکھا اور آگے نکل گیا۔ ولید کے سر پر گولی لگی تھی اور موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔

ولید کو اسپتال کے لیے لے جایا جا رہا تھا اور میڈیا والوں کا گروپ ولید کی لاش کی کوریج کر رہا تھا۔ گولی کیسے چلی اور کہاں سے چلی میڈیا والے اور پولیس والے دونوں ہی جاننے میں ناکام رہے تھے۔

پچھلے بار کی طرح اس بار بھی الیکشن طلال جیت گیا کیونکہ اس نے کاغذات واپس نہیں لیے تھے ولید کا سوگ بھی منایا گیا۔ عاطف تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلا گیا۔ افضل ابھی یہیں پڑھ رہا تھا۔ دو سال بعد اسے بھی باہر جانا تھا۔ مریم اپنے ہی کاموں میں مصروف رہتی تھی۔ اس کو کسی کام کا پتا نہیں تھا۔ سیاست سے وہ ویسے ہی سخت نفرت کرتی تھی اسے بس فیشن اور اپنی بوتیک کی فکر رہتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ طلال سیاست میں زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ کرپشن کے باوجود کامیاب جا رہا تھا اور امجد عوام کا خیر خواہ ہونے کے باوجود ہار رہا تھا۔

چوہدری امجد اپنی جھولتی کرسی پر بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کا دوست زبیر اس کے پاس موجود تھا۔

”چوہدری صاحب ملک کو ہرانا مشکل کام ہے، دیکھتے نہیں کہ وہ کس طرح الیکشن جیت رہا ہے۔“ زبیر نے کہا۔

”وہ اپنی جان کا نقصان کر رہا ہے۔ وہ اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے اپنے ہی پیادے مار رہا ہے۔ ایک دن ووٹر ہوں گے اور وہ ہوگا پھر خود ہی شکار بن جائے گا۔“ چوہدری امجد نے اپنی مونچھوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

وقت اپنی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ عاطف نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور اب وہ اپنے والد کا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ کاروبار میں بھی عاطف طلال کی طرح کام کر رہا تھا۔ وقت آگے کی طرف دوڑ رہا تھا افضل بھی تعلیم مکمل کرنے کے قریب تھا اور مریم اب پہلے سے تھوڑا سادہ ہو چکی تھی پر ان کا مزاج آج بھی ویسا ہی تھا۔

گھر میں عاطف کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شادی بھی عاطف کی پسند سے ہو رہی تھی۔ گھر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ طلال کے سر کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو چکے تھے۔ شلوار قمیص پر ویس کوٹ پہنے کافی بارعب لگ رہا تھا اور اس کے مزاج میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ پہلے کے مقابلے اس کے مزاج میں شائستگی بڑھ گئی تھی۔ سیاست میں بھی اس کی پوزیشن کافی اچھی ہو چکی تھی۔ اب وہ وزیر تھا۔

شادی میں کافی بڑے لوگوں کی آمد تھی۔ میڈیا والے بھی آئے ہوئے تھے۔ چوہدری امجد بھی موجود تھا۔

”میں نے سنا ہے عاطف بھی سیاست میں دلچسپی رکھتا ہے مگر طلال کی بات ہی کچھ اور ہے اس نے تو اپنی جان پر کھیل کر یہ پوزیشن حاصل کی ہے۔“ بیرسٹر نجم بولا۔

”کھیلتے کھیلتے بازیاں کھینی آ ہی جاتی ہیں بیرسٹر صاحب۔“ امجد نے آواز میں گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”جی چوہدری صاحب مگر آج کل بچے کہاں اس قابل ہیں اور ویسے بھی ملک طلال عاطف کو سیاست سے دور رکھتا ہے اور اس کو سیاست میں لانے کے خلاف بھی ہے۔“ بیرسٹر نجم نے کہا۔

چوہدری امجد کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی ”اچھا بیرسٹر صاحب ایسا کیوں؟“

”جی آپ کو تو پتا ہے آج کل کی سیاست میں خون خرابا عام ہے۔“ نجم نے کہا۔

”جی نجم صاحب۔“ امجد نے کہا اور امجد اسٹیج پر بیٹھے دولہا بنے عاطف کو دیکھ رہا تھا۔

☆......☆

عاطف کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور عاطف کے گھر ایک چھوٹا عاطف آ چکا تھا۔ گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مریم بھی اب گھر میں وقت دیتی تھی اور گھر کے ہر کام میں اپنی دلچسپی پیدا کر لی تھیں۔ الیکشن قریب تھے اور ملک طلال کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ اقتدار کے نشے میں طلال گم تھا اور اس نشے میں اکیلے جھومنے کا لطف ہی اور ہے۔ وہ اس میں کسی کو شریک کرنا شاید اپنی توہین سمجھتا تھا۔ جیسے ہی الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو گھر میں عاطف نے بھی ریسرچ شروع کر دی وہ سیاست میں نہیں آیا تھا کیونکہ اس کے والد طلال کی مرضی نہیں تھی پر وہ اپنے باپ کی طرح ضدی تھا حکمرانی کرنے کا شوق وراثت میں لے کر آیا تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے اور طلال لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا آج وہ جلدی گھر آ گیا تھا اور عاطف اس ٹائم اکثر گھر ہوتا تھا اس نے آج موقع پا کر اپنے باپ سے بات کرنا چاہی اتنے مصروف شیڈول میں اس گھر میں کسی کو کسی کے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں تھا مگر عاطف کے دل جو بات تھی وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔ عاطف لاؤنج میں پہنچا تو اس وقت طلال موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا اور اس نے عاطف کو دیکھ موبائل بند کر دیا۔

”آؤ عاطف بیٹا بیٹھو۔“ طلال نے پیار سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی ڈیڈی۔“ عاطف بیٹھ گیا۔

ظریف جبل پوری

(1913-1964)

سید حامد رضا نقوی 30 دسمبر 1913 کو جبل پور (سی پی بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے تمام مدارج تقسیم ہند سے پہلے مکمل ہو چکے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر 34 سال کے قریب تھی۔ تخلیق پاکستان ہجرت پاکستان اور قیام پاکستان کے تمام مناظر کو اپنی ہوش مین آنکھوں سے دیکھا اور اس کرب کی شدت کو اپنی ذات کا حصہ سمجھا جسے ان کی شعری کتب ”فرمان ظرافت“ (1952) اور ”تلافی مافات (1961) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ظریف جبل پوری یکم مارچ 1964 میں راہی ملک عدم ہوئے، عمل تدفین قبرستان باغ خراساں کراچی میں ہوئی۔ بعد انتقال 1989 میں شائع ہونے والے شعری مجموعے ”نشاط تماشا“ کو بھی اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”اور سناؤ کاروبار میں کوئی تنگی تو نہیں ہے؟“ طلال نے عاطف سے پوچھا۔

”جی ڈیڈی آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“ عاطف نے کہا۔

”ہاں بولو۔“ طلال نے موبائل ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

”ڈیڈی میں سیاست میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“ عاطف نے کہا۔

طلال نے سنا تو اس کے ماتھے سے بل غائب ہو گئے وہ ذرا سیدھا ہو گیا۔

”دیکھیے ڈیڈی آپ کے زیر سایہ مجھے تنگی بھی نہیں ہوگی اور مجھے شوق بھی ہے آپ جانتے ہیں۔“ عاطف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بیٹا ابھی تم کاروبار کی طرف توجہ دو۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ میں تمہاری جان کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا اور تمہیں پتا تو ہے میرے پیچھے دشمن لگے ہوئے ہیں۔“ طلال نے کہا۔

”پر ڈیڈی میں آپ کے ساتھ رہوں گا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہوگی اور جہاں تک کاروبار کی بات ہے آپ اس کی فکر مت کریں وہ میں مینج کر لوں گا۔“ عاطف کوشش کر رہا تھا کہ طلال کسی طرح مان جائے۔

"دیکھو بیٹا تم ابھی سیاست کی طرف توجہ نہ دو تو بہتر رہے گا یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور میڈیا والے ہر وقت گلے کا پھندہ بنے رہتے ہیں، تمہاری ابھی عمر نہیں کہ تم سیاست میں آؤ اس کا وقت میں تمہیں خود دوں گا۔" طلال اُٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مگر عاطف وہیں بیٹھا رہا اس کے اندر عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی وہ سوچ میں پڑ گیا پتا نہیں شروع سے ہی ابو مجھے سیاست سے پیچھے رکھتے ہیں شاید وہ مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے مگر کیوں؟ لگتا ہے اپنی راہ خود بنانی ہوگی۔

☆......☆

پورا گراؤنڈ سجا ہوا تھا ہر بار کی طرح اس بار بھی ملک طلال کے پوسٹر ہر جگہ لگے ہوئے تھے۔ طلال سیاسی طور پر بہت مضبوط ہو چکا تھا۔ نعروں کی گونج تھی اور لوگوں کا سمندر اکٹھا تھا اس دفعہ بھی پیسا پانی کی طرح بہایا ہوا تھا۔ طلال کی گاڑی پورے پروٹوکول کے ساتھ علاقے میں داخل ہوئی۔ سیکیورٹی بہت سخت تھی کہ پرندہ بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

طلال گاڑی سے باہر نکلا تو لوگوں کا طوفان طلال کی طرف بڑھا طلال اس دفعہ کے جلسے کو دیکھ کر بہت خوش تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی کیونکہ اس دفعہ کا جلسہ پہلے کے مقابلے بہت اعلیٰ تھا یہ جلسہ شاید طلال کی زندگی کی محنت کا نچوڑ بھی تھا۔

☆......☆

افضل آج بہت خوش تھا اس کا اسپتال میں پہلا دن تھا اور اس کا بچپن کا خواب آج پورا ہو گیا تھا اس کی آج پہلے دن ہونے کی وجہ سے صرف ٹریننگ تھی اور وہ سینئرز ڈاکٹرز کے ارد گرد گھوم رہا تھا کبھی کسی مریض کبھی کسی مریض کو دیکھتا، کبھی کہتا اس کو لوگوں کی خدمت کرنے میں بہت سکون ملتا تھا۔

☆......☆

طلال اسٹیج کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک جلسے میں کچھ نا معلوم افراد کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ لوگ بھاگنا شروع ہو گئے۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد فائرنگ رکی تو اس افراتفری میں کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دو سیکیورٹی گارڈز موقع پر ہلاک ہو گئے اور باقی سیکیورٹی گارڈز طلال کو اٹھائے ایمبولنس میں رکھ رہے تھے۔

☆......☆

افضل ایک مریض کی فائل دیکھنے میں مصروف تھا کہ اچانک اسپتال میں تھرتھری مچ گئی۔ میڈیا والوں نے اسپتال کے باہر رش لگا دیا تھا۔ افضل کو جلدی ایمرجنسی روم میں بلایا گیا۔ افضل بھاگتا ہوا ایمرجنسی روم میں پہنچا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر طلال کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد مریم اور عاطف بھی اسپتال پہنچ گئے۔ افضل باہر ہی بیٹھا تھا مریم بے چینی میں تھی۔ "بیٹا کیسے ہیں تمہارے ڈیڈی؟" مریم کی سانس پھول رہی تھی۔

افضل کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور آواز ختم ہو چکی تھی۔

"بولتے کیوں نہیں کیسے ہیں طلال؟" مریم نے دوبارہ پوچھا۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے امی وہ انتقال کر گئے ہیں۔" افضل نے بھیگی آنکھوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مریم ایک دم زمین پر گر گئی عاطف اور افضل اپنی ماں کو سنبھالتے ہوئے نیچے بیٹھ گئے عاطف کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ کتنی ہی دیر وہ اس حالت میں وہاں بیٹھے رہے۔

طلال کے حادثے کو سات دن گزر چکے تھے۔ ریسٹورنٹ میں اے سی کی ٹھنڈک تھی۔

ویٹر ٹیبل پر دو کپ چائے رکھ کر چلا گیا۔ عاطف چوہدری نے امجد سے پوچھا۔ "کتنے چمچ شوگر لیں گے چوہدری صاحب۔"

"ایک چمچ۔" امجد نے کہا۔

عاطف نے ایک کپ امجد کے آگے کیا اور ایک کپ اپنے سامنے رکھتے ہوئے اس میں شوگر مکس کرنے لگا۔ "دیکھیے چوہدری صاحب آگے جلسہ ہے آپ اور ہم مل کر کام کریں گے تو آپ کو بھی فائدہ ہوگا اور ہمیں بھی۔ میں لڑائیوں سے سخت نفرت کرتا ہوں اور آپ کے ساتھ پارٹی کو چلانے میں خوشی ہو گی۔" عاطف نے چائے کی سپ لی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں اب شطرنج کے دونوں طرف ہم ہی ہیں، اب چال اپنی مرضی سے ہی چلے کی چاہے اس طرف سے چلے یا اس طرف سے۔" امجد نے کہا۔

"جو غلطیاں ڈیڈی جی نے کی تھیں میں چاہتا ہوں وہ غلطیاں اور بیوقوفیاں ہم نہ کریں۔" عاطف نے کہا۔

"جی بیٹا جی۔" امجد نے چائے کی سپ لی اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ریسٹورنٹ میں لگے ٹی وی پر ملک عاطف کی تصویر اور اگلے جلسے کی تیاریوں کی خبر چل رہی تھی اور یہ مقام خود اس نے بنایا تھا۔ سیاست میں کوئی کسی کا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اس پر صادق آ رہی تھی۔

شجرِ عشق

جناب مدیر اعلی
السلام علیکم
پھر ایک سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ میری گزشتہ تحریر کو سرگزشت میں جگہ دے کر آپ نے مجھے حوصلہ دیا ہے اسی لیے ایک اور سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں اُمید ہے یہ سرگزشت بھی آپ کو پسند آئے گی۔

سید سخاوت
(یو کے)

چھوٹی چھوٹی داستانیں مل کر ایک زندگی بناتی ہیں۔ کچھ تلخ اور کچھ دلکش داستانیں مگر چند ایک ایسی ہوتی ہیں جو مرتے دم تک دل کی دنیا نہیں چھوڑتیں۔ کچھ ہوک بن کر اور کچھ نغمہ بن کر اپنی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

میری زندگی کے تمام قصے ختم بھی کر دیئے جائیں مگر یہ کہانی میری سانسوں سے ایسی جڑ گئی ہے کہ مر کر بھی نہ بھول سکوں گا۔

ان دنوں میں زمانے سے نبرد آزما ہوتے ہوتے

یونیورسٹی میں ماسٹر ڈگری لینے پہنچ چکا تھا۔ مجھے آگے ایک شاندار مستقبل دکھائی دے رہا تھا۔ میں ایک بڑے شہر کی بڑی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ دو سال ابھی ڈگری مکمل کرنے میں لگنے تھے کہ اچانک شہر کے کچھ لوگ ظالم بن گئے۔ مجھے وہ شہر چھوڑنا پڑ گیا اور نسبتاً ایک چھوٹے شہر کی یونیورسٹی میں اپنا ٹرانسفر کروالیا۔ شہر چھوڑنے کی وجوہات متعدد تھیں جن میں پڑنا میری کہانی کو کسی اور جانب لے جائے گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ جس شہر کو میں نے دل دیا اس نے میرے دل کو چیر کر رکھ دیا۔ میں نے اس شہر کا تو کچھ نہیں بگاڑا تھا مگر وہ مجھے چرکے لگا گیا تھا۔

میرے والدین چند سال پہلے اچانک وفات پا چکے تھے۔ جب میں انٹر کر کے آگے بڑھنے کی سعی کر رہا تھا۔ بہن بھائی تھے مگر میں ان پر بوجھ ڈالے بغیر اپنے راستے خود متعین کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں اپنا چھوٹا سا شہر چھوڑ کر ایک بڑے شہر میں جا بسا تھا مگر مجھے اسے بھی چھوڑنا پڑا۔

میں اپنی فطرت میں ایک مسافر تھا اور کہیں ٹک کر رہنا میری سرشت میں نہ تھا۔ اسی لیے میں اس شہر کی یونیورسٹی میں دو سال گزارنے آیا جہاں آموں اور مالٹوں کے باغات تھے۔ جہاں بہار کے موسم میں آموں کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کے ساتھ نتھنوں سے ٹکراتی تو نشہ دل و دماغ پر چھا جاتا تھا۔ جاڑوں میں مالٹوں کے درختوں کے خنک سایوں سے ذرا ہٹ کر دھوپ میں چارپائی بچھا کر مالٹے کھانا کسی کو بھی سہانے لمحوں میں لے جاتا تھا۔ سنا تھا کہ اس شہر کے لوگ بھی میری طرح کے ہیں۔ اپنی طرح کے لوگوں کی تلاش مجھے اس شہر میں کھینچ لائی تھی۔

نوے کی دھائی آدھی گزر چکی تھی تب میں اس شہر کے ریلوے اسٹیشن پر اترا اس وقت صبح کی بلند ہو رہی تھیں۔ اپنے سامان کے علاوہ میں ایک موٹر بائیک ساتھ لایا تھا اور جیب میں پندرہ ہزار روپے تھے۔ نو ہزار روپے مجھے یونیورسٹی اور ہاسٹل کی فیس ادا کرنی تھی۔ ہاسٹل کے میس کے لیے دو ہزار علیحدہ سے ایڈوانس جمع کروانے تھے۔ یہ ادائیگیاں کر کے میرے پاس صرف دو مہینے کے اخراجات رہ جانے تھے۔ اس کے بعد کیا ہونا تھا مجھے اس کا کچھ ادراک نہ تھا۔ شہر بھی اجنبی تھا اور یونیورسٹی بھی۔ ہاسٹل میں ایک دوست تھا امتیاز جس کے بھروسے پر میں آیا تھا۔ وہ جو مجھے فون کر کے تسلی دیتا رہا تھا کہ یہاں کچھ نہ کچھ جاب یا ٹیوشن تمہیں مل جائے گی اور تم ہر ماہ تین چار ہزار روپے با آسانی کما لو گے مجھے اس سے زیادہ کی خواہش بھی نہ تھی کیونکہ میرے اخراجات انہی میں پورے ہو جانے تھے اسی لیے میں آگیا تھا۔

میں نے رکشے میں اپنا سامان رکھا اور اپنی موٹر بائیک پر صبح سویرے ہاسٹل آ پہنچا۔ جاڑے شروع ہو چکے تھے اور نئے تعمیر شدہ خوب صورت ہاسٹل کے اردگرد سبز باغیچوں میں گھاس اور پھولوں کی کیاریوں پر دھند چھائی تھی۔

میرا وہ دوست امتیاز تھا جس نے اپنے کمرے میں ایک دوسری چارپائی بچھا کر عارضی طور پر میرے رہنے کی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ اسی دن میں اور امتیاز فیکلٹی گئے۔ اپنے داخلے کے کاغذات لے کر بینک میں فیس جمع کروائی۔ ہاسٹل کے کلرک آفس میں اپنے داخلے کے کاغذات دکھا کر ان سے بینک سلپ بنوائیں ہاسٹل کی فیس اور میس کی ایک ماہ ایڈوانس کا خرچا بینک میں جمع کروا دیا۔ اب میرے پاس صرف دو ماہ کے اخراجات رہ گئے تھے۔

ہاسٹل کی لابی میں طالب علم آ جا رہے تھے۔ کچھ کھڑے تھے۔ سب ہنستے مسکراتے اور قہقہے لگاتے نظر آ رہے تھے مگر میں خاموش تھا۔ نہ کسی سے بات کر رہا تھا اور نہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ میرے ہدف صرف دو تھے۔ میری ڈگری اور جاب۔

ہاسٹل میں آئے تیسرا روز تھا کہ امتیاز نے پوچھا۔ ''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت دوستوں میں گھرے رہتے تھے، تمہارے قہقہے کبھی تھمتے نہ تھے اور اب تم اتنے سنجیدہ ہو گئے ہو۔ ہر وقت خاموش رہتے ہو۔ مطلب کی بات کسی سے کر لی اور پھر خاموش۔'' جواب میں اکتا کر میں نے کہا۔

''تم کسی طرح سے میری جاب کا انتظام کر دو۔ اگلے دو ماہ کے بعد میرے پاس خرچا کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''کسی سے ادھار مانگ لو۔''

میں نے جواب دیا۔ ''میں کبھی نہیں مانگوں گا جو بھی کرنا ہے اپنی قوت بازو پر کرنا ہے۔ تم بس جاب کے لیے کہیں بات کرو۔''

وہ میری مالی حالت اور میرے مزاج کو سمجھتا تھا۔ بولا۔ ''آج رات دوستوں کی طرف سے دعوت ہے۔ تم بھی چلو، وہیں کسی سے بات کرتے ہیں۔''

ہمارا ہاسٹل یونیورسٹی کیمپس میں تھا۔ اس کے اردگرد خوب صورت لان تھے جن میں کناروں پر پھول کھلے تھے۔ ہاسٹل کے دائیں جانب کینٹین تھی جس کے آگے لان تھے۔

جہاں لوہے کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کینٹین کے عقب میں سفیدے کے درختوں کے جھنڈ تھے اور درختوں تلے چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بعد میں ان چارپائیوں پر شام کے بعد جب سناٹا ہوتا تو میں اکثر دیر تک لیٹا رہتا تھا۔ ہاسٹل سے کیمپس جانے کے لیے پیدل دس منٹ لگتے تھے۔ ان دس منٹوں میں کئی دوسرے ڈپارٹمنٹ آتے۔ ہماری فیکلٹی سب سے آخر میں تھی۔ فیکلٹی سے پہلے راستے کے دائیں جانب ایک وسیع لان تھا اور لان کے بیچ میں بہت بڑا ایک گھنا درخت تھا جس کو ''لور ٹری'' یعنی شجر عشق کہتے تھے۔ اس درخت تلے لڑکے لڑکیاں کسی ہجوم کی صورت اور کبھی جوڑوں میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ''پیار کا درخت'' اپنے سائے میں محبت کرنے والوں اور ایک دوسرے کا خیال کرنے والوں کو سمیٹے رکھتا۔ میں نے اس درخت کو شام اور دن میں ہر زاویے سے دور کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ اس کے دو خوبصورت مناظر مجھے نظر آئے تھے۔ ایک جب اس کے نیچے مسکراتے چہرے بیٹھے ہوتے اور دوسرا تب جب سورج ڈوب رہا ہوتا اور شفق کے رنگ اس کی چوٹی پر چمک رہے ہوتے۔ اس دن میں بھی وہیں کھڑا شفق کی سرخی دیکھ رہا تھا کہ امتیاز آگیا۔

''دعوت میں چلنا نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''چلو۔'' کہہ کر میں ساتھ ہولیا۔

وہاں دس پندرہ لڑکے جمع تھے۔ ایک لڑکا جو کسی کمپنی میں ملازمت کر رہا تھا وہ اکیلے کرائے کے گھر میں رہ رہا تھا۔ چند لڑکوں نے اس کے گھر میں مل کر کھانا تیار کیا تھا۔ کھانے کے بعد سب آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کچھ میری کلاس کے بھی تھے۔ وہ سب پچھلے چار سالوں سے کلاس فیلوز ہونے کی وجہ سے بے تکلف تھے۔ میں ان کے ساتھ لیٹ شامل ہوا تھا اور اسی لیے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ ویسے ہی مجھے یہ سب ہنگامہ آرائی پسند نہ تھی۔ میرے دو کلاس فیلوز عارف اور شہزاد بھی وہاں موجود تھے۔ عارف پہلے کسی ایم پی اے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ جب اسے کسی کمپنی کی طرف سے شام کی جاب ملی تو اس نے ٹیوشن چھوڑ دی۔

میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ شہزاد... میرے قریب آگیا۔ تعارف کے بعد بولا۔ ''آپ اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہیں؟''

جواب امتیاز نے دیا اور کہا۔ ''یہ ایسے ہی رہتا ہے۔ کام کی بات کی اور بس۔''

شہزاد قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اس کا خاموش رہنا اسی کے کام آئے گا۔ فرح کے شر سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ بندہ اپنے ہونٹوں کو سی کر رکھے۔''

میں اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ سب لڑکے یہ سن کر ہنس رہے تھے۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ فرح کون ہے اور کم بولنے پر میں اس کے شر سے کس طرح بچ سکتا ہوں۔

ایک لڑکے نے بتایا۔ ''فرح تمہاری کلاس کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔ اب تک دو لڑکوں کو فیکلٹی سے نکلوا چکی ہے۔ ایک نے خط لکھا تھا اور دوسرے نے زبانی اظہار محبت کر کے کچھ تحائف بھی دیئے تھے۔ اس نے ڈین سے شکایت کی اور ڈین نے انہیں یونیورسٹی سے خارج کر دیا اور اب وہ ڈین صاحب کی بیٹی بنی ہوئی ہے۔''

''میں اس قسم کے معاملات میں نہیں پڑتا۔ مجھے تو جلد سے جلد اپنی ڈگری لینی ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کسی سے کوئی لینا دینا نہیں۔'' میں نے کہا۔

یہ بات میں نے سب کے گوش گزار کر دی تھی مگر ذہن میں فرح کا نام رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ یہ کون تنک چڑھی اور مغرور لڑکی ہے جو دو لڑکوں کو یونیورسٹی سے نکلوا چکی ہے اور سب لڑکے اس کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔

ہماری کلاس کا پہلا دن تھا۔ کلاس میں کل ملا کر بارہ طالب علم تھے۔ دو لڑکیاں جن میں ایک فرح اور دوسری زاہدہ تھی۔ لڑکوں میں عارف اور شہزاد سے تعارف ہو چکا تھا۔ ہمارا کلاس روم فرسٹ فلور پر تھا۔ کلاس روم کے ساتھ ٹیرس تھی اور آگے ڈسپنسری اور ساتھ لائبریری تھی۔ ابھی پروفیسر صاحب نہیں آئے تھے اور میں شہزاد کے ہمراہ کلاس کے سامنے ایک ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دو لڑکیاں سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئیں تو شہزاد نے مجھے کہنی سے ٹہوکا لگا کر آہستگی سے کہا۔ ''یہ جو زیادہ خوب صورت ہے وہ فرح ہے اور دوسری تھوڑی کم ہے وہ زاہدہ ہے۔''

درمیانہ قد، سفید رنگت کھلتی ہوئی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، سیاہ بال کندھوں کے نیچے جاتے ہوئے، خوب صورت چہرہ اور پیاری سی چھوٹی ناک۔

میں نے ایک دو لمحوں میں اس کا جائزہ لے لیا۔ اس کی آنکھیں مجھے کچھ تنقیدی اور کچھ شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اپنا منہ پھیرا اور خاموشی سے آ کر کلاس میں بیٹھ گیا۔ ہماری دو کلاسز روزانہ ہوتی تھیں۔ ہر کلاس کے بیچ میں آدھے گھنٹے کا بریک ہوتا تھا۔ بریک ہوا تو سب کلاس

فیلوز ایک ساتھ کینٹین کی طرف چائے پینے جانے لگے۔ شہزاد اور عارف نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا مگر میں نے انکار کردیا۔ میں جا کر لائبریری میں بیٹھ گیا۔ مجھے روزانہ کینٹین پر بیٹھ کر اپنا بجٹ خراب نہیں کرنا تھا۔ لڑکیوں سمیت سب واپس کلاس لینے آئے تو میں لائبریری سے نکل کر کلاس میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ فرح مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑے دنوں بعد مجھے علیحدہ کمرا الاٹ ہوگیا لیکن میں نے اس میں رہنے سے انکار کردیا۔ میں نے امتیاز سے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ رہوں گا مجھے اکیلا نہیں رہنا۔''

اکیلا کمرا ہو تو دوسرے لڑکے ہر وقت آپ سے ملنے آتے رہتے ہیں اور ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ نئے دوست بنانے پڑتے ہیں جو میں نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں نے وہ کمرا خالی رکھا۔ امتیاز مجھ سے ایک کلاس سینئر تھا۔ اس کے چار اور دوستوں نے مل کر اسے کچن بنا لیا تھا۔ وہیں ہیٹر رکھا گیا۔ کیتلی، فرائی پین مگ، پلیٹیں، انڈے، پاؤڈر ملک، کوکنگ آئل، جام، چینی وغیرہ سب وہاں رکھی گئیں۔ کہیں سے کرسیاں لا کر بچھائی گئیں۔ صبح ہم سب وہاں ناشتے کے لیے جمع ہوتے۔ ڈبل روٹی، سلائس اور آملیٹ سے ناشتا کرتے۔ چائے پیتے، گپ شپ ہوتی اور پھر ہر کوئی اپنی اپنی راہ لیتا۔ چابی ہر ایک کے پاس تھی۔ کسی کا بھی چائے پینے کا دل کرتا تو وہ دروازہ کھول کر کچن میں جا کر چائے پی لیتا۔ سب نے مل کر اسے فرینڈز کچن کا نام دیا ہوا تھا۔ میں وہاں اپنی خاموش شمولیت لیے ان کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔

ایک بار ہم فرینڈز کچن میں ہیٹر جلائے اس کے گرد بیٹھے تھے کہ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ''فرح سے بات ہوئی ہے؟''

سوال سننے کے بعد سب مسکرانے لگے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو سب ہنس پڑے ایک بولا۔ ''اتنے محتاط کیوں ہو؟ کیا اس سے ڈر لگتا ہے؟''

دوسرا مسکرا کر بولا۔ ''خالی بات کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تعارف ہی کرا دو اپنا۔ کبھی کبھار نوٹس وغیرہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔''

''اسے اپنے پر گھمنڈ تو ہے مگر بات چیت روزمرہ کی ہو تو وہ سب سے اچھی طرح پیش آتی ہے۔'' میں نے سب کی سنی ان سنی کردی اور خاموشی سے چائے پینے لگا۔

ہماری کلاسز شروع ہوئیں تو میری مصروفیت بڑھتی چلی گئی۔ میں نے اپنے آپ کو پڑھائی میں غرق کرلیا تھا۔ رات دیر تک جاگتا رہتا۔ صبح آنکھ بمشکل کھلتی تھی۔ ہماری پہلی کلاس نو بجے شروع ہوتی اور میں ٹائم پر نہیں پہنچ پاتا تھا۔ میں نے شہزاد سے بات کی کہ کسی طرح سے کلاس نو بجے کی بجائے دس بجے کروا دے۔ شہزاد ڈین کے پاس گیا، اس نے لیکچرز کی ایڈجسٹمنٹ کی اور پہلی کلاس اب دس بجے شروع ہوگئی۔

شہزاد نے کلاس میں آ کر ٹائم کی تبدیلی کا بتایا تو فرح نے ناک بھوں چڑھالی۔ میں بیٹھا تھا اور وہ غصے میں آ کر کہنے لگی۔ ''ہمارے پوچھے بغیر اپنی مرضی سے کس نے کلاس کا ٹائم تبدیل کروایا ہے۔''

شہزاد نے میری جانب اشارہ کیا تو مجھے گھور کر بولی۔ ''میں دوسروں کے شیڈول کی پابند نہیں ہوں۔ ابھی جا کر کلاس دوبارہ سے نو بجے کرواتی ہوں۔''

زاہدہ نے اسے اشارے سے منع کردیا اور میں اسی دوران بے پروا بنا بیٹھا رہا۔ غصہ تو مجھے بہت آیا مگر میں اسے پی کر خاموشی سے کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔

ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ عارف نے مجھے دو ٹیوشن دلا دی جو وہ خود پڑھایا کرتا تھا۔ دو گھنٹے پڑھانے کے مجھے اتنے مل جاتے کہ میرا مہینا آسانی سے گزر سکتا تھا۔ میں اپنی کلاسز ختم کرکے تین بجے ہاسٹل آتا اور پانچ بجے ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا۔ ٹیوشن کے لیے فاصلہ زیادہ تھا اور آتے جاتے مجھے دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ واپس آتا تو ہاسٹل کا میس بھی بند ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا میں رات کا کھانا کسی ہوٹل سے پیک کروا کر ہاسٹل لانے لگا تھا۔ واپسی پر کھانے کے بعد میں رات گئے اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا اور دوسرے دن میری وہی روٹین شروع ہوجاتی تھی۔ ہفتہ اتوار کی چھٹی ہوتی تو میں امتیاز کے ساتھ کبھی کبھار باہر کھانا کھانے چلا جاتا تھا یا پھر وہ دن میرے دوڑتے گزرتے اور شام میں کینٹین کے پیچھے بچھی چارپائیوں پر سفیدے کے درختوں تلے اکیلے لیٹے گزرتیں۔

میرے تمام کلاس فیلوز وقفے کے دوران مل کر کینٹین پر بیٹھتے اور چائے پیتے تھے۔ ہر روز کوئی ایک سب کو چائے پلایا کرتا تھا۔

مجھے ٹیوشن ملی تو شہزاد ایک دن کہنے لگا۔ ''اب تمہاری آمدن شروع ہوگئی ہے اور تم بھی ساتھ بیٹھا کرو۔ اتنا دور رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

اس کے بعد میں بھی بریک کے دوران سب کے ساتھ کبھی کبھار پیپل کے درخت کے تلے یا اس کے آس پاس چائے پینے کے لیے بیٹھنے لگا۔ میں زیادہ تر خاموش رہتا۔ جب کوئی بات کرتا .... تو جواب دیتا ورنہ سگریٹ کے دھوئیں خلاؤں میں چھوڑتا رہتا تھا۔

ایک دن ہم پیپل کے درخت تلے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ فرح نے ہمارے ایک کلاس فیلو ندیم سے میرے بارے میں پوچھا۔ ''یہ خاموش اور سنجیدہ کیوں رہتے ہیں۔ ہم لوگوں سے بولتے کیوں نہیں؟''

میں یہ سب سن رہا تھا۔ ندیم بولا۔ ''یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔''

فرح نے ایک بار نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور میں فضاؤں میں گھورنے لگا۔ میری بے اعتنائی اب اسے بھی بے چین کرتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں طیش ہوتا کیونکہ اس کی جانب دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔

کچھ دن بعد مجھے ایک اور ٹیوشن مل گئی۔ اب میں تین بجے یونیورسٹی سے نکل جایا کرتا تھا۔ میری آمدن بھی دوگنی ہوگئی تو میں نے اپنے لیے کچھ نئے کپڑے خریدے۔ سابقہ کپڑے پرانے ہوچکے تھے اچھی ڈریسنگ کرکے اپنا وقار بھی ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔

ہمارے ایک پروفیسر ہمیں میتھ پڑھانے آتے تھے۔ وہ پڑھائی کم اور باتیں زیادہ کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مذاق کے موڈ میں ہوتے اور ہمارے ساتھ اپنا بھی وقت ضائع کرتے۔ ایک دن باتوں باتوں میں لڑکیوں کے سامنے اپنی اہمیت جتلانے لگے۔

''میں جب شام کو گھر پہنچتا ہوں تو میری بیوی مجھے کرسی پر بٹھا کر پہلے میرے بوٹ اتارتی ہے پھر موزے اتارتی ہے پھر ایک برتن میں نیم گرم پانی میں نمک ملا کر میرے پاؤں اس برتن میں رکھتی ہے انہیں دھوتی ہے۔ مساج کرتی ہے تو میری تھکاوٹ دور ہوجاتی ہے۔''

یہ سن کر میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر بات کرنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے مسکراتے ہوئے دے دی۔ میں نے پوچھا۔ ''سر! وہ تو یہ سب آپ کے لیے کرتی ہیں مگر آپ بھی ان کے لیے کبھی کچھ اس طرح کا کرتے ہیں؟ کبھی اس کے سر میں تیل لگا کر سر کی مالش بھی کی ہے؟ کبھی آپ نے پوچھا ہے کہ آج تم بہت تھکی لگتی ہو، تم اس کرسی پر بیٹھو۔ میں آج تمہارے پاؤں دھوتا ہوں۔''

پوری کلاس چپ سادھے بیٹھی تھی۔ پروفیسر صاحب کا رنگ سرخ ہوا مگر وہ ضبط کر گئے۔ خاموشی اختیار کرکے بھنویں اچکائے ہمیں پڑھانے لگے۔

کلاس ختم ہوئی تو ہم باہر نکلے۔ دیکھا تو فرح میری جانب بڑھتی چلی آرہی ہے۔ میرا شکریہ ادا کرکے بولی۔ ''آپ نے آج بڑی ہمت دکھائی ہے اور عورتوں کی وکالت کرکے آپ نے اس مظلوم طبقے کے لیے آواز بلند کی ہے۔ میں دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

میں نے سپاٹ چہرے سے جواب دیا۔ ''آپ کا شکریہ بنتا ہی نہیں کیونکہ تمام عورتیں مظلوم بھی نہیں ہوتیں۔ بہت سی اپنے عورت ہونے کا ناجائز فائدہ بھی اٹھاتی ہیں۔ مظلوم عورت ہو یا مرد، کوئی بھی ہو، میں ان کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں۔'' میں یہ کہہ کر سیڑھیاں اترتا نیچے چلا گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے تھے۔ آنکھوں میں غصہ تھا۔ میں اسے متواتر نظرانداز کرتا چلا آرہا تھا۔

ایک دن پوری کلاس لان میں دائرہ بنائے بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ہمارا کلاس فیلو ندیم ہمیشہ کی طرح فرح کے قریب بیٹھا سب کو لطیفے سنا کر ہنسانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ سب اس کا دل رکھنے کے لیے پھیکی ہنسی ہنس کر چپ ہو جاتے تھے۔ اسے پچھلے کئی ماہ سے مسلسل اچھی ڈریسنگ کرنے پر فیکلٹی کی جانب سے ایوارڈ بھی ملتا چلا آرہا تھا۔ وہ اس پر بہت نازاں رہتا تھا جو اس کا حق بھی تھا۔ اس نے چند بار مجھے بھی ڈریسنگ کے مشورے دیئے تھے۔ میں گھاس پر کہنی لگائے نیم دراز لیٹا تھا۔ فرح میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بغیر اپنی پلکیں جھپکائے مجھے دیکھے جارہی تھی۔ میں اس طرح دیکھنے پر بے آرام ہو رہا تھا۔ اس طرح مسلسل گھورنے پر میں پہلو بدلنے لگا مگر اس کی نظریں مسلسل مجھ پر گڑی تھیں۔ آخر میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''کیوں مجھے اس طرح گھور کر دیکھ رہی ہو۔ محفل میں بیٹھنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔''

یقیناً اس کو مجھ سے یا کسی سے بھی ایسے بدتمیزی کے الفاظ سننے کی توقع نہ تھی۔ سب کلاس فیلوز چونک کر اس کی جانب اور مجھے دیکھنے لگے۔ وہ روہانسی ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ اس طرح سے کھری کھری سنا کر میں دل میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا پھر سوچا جو ہوگیا... وہ ٹھیک ہوا۔

اس دن کے بعد وہ مجھ سے دور دور رہنے لگی مگر میں

سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے جلانے کے لیے ندیم سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔ کبھی اسے چائے کا کپ پکڑا رہی ہے اور کبھی اس سے نوٹس مانگ رہی ہے۔ میں اپنی زندگی میں اتنا مصروف تھا کہ ان کی جانب دیکھنے یا سوچنے کا میرے پاس وقت ہی نہ تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس کی بے قراری اور میری نظر اندازی بڑھتی چلی گئی۔

ایک دن پروفیسر صاحب لیب میں پریکٹیکل کے لیے نوٹس لکھوا رہے تھے۔ سب کھڑے ہوئے نوٹس لکھ رہے تھے۔ وہ عین میرے پیچھے کھڑی رجسٹر پر نوٹس لے رہی تھی۔ اس نے اپنے رجسٹر سے میری پیٹھ پر ٹہوکا دیا۔ میں خاموش کھڑا لکھتا رہا۔ اس نے جب دوبارہ ٹہوکا لگایا تو میں نے مڑ کر اسے غصے سے کہا۔ ”تم سے ٹھیک طریقے سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا سکتا؟“

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بے پروائی اور بے اعتنائی کی حدیں پھلانگ رہا تھا۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر میں اندر سے کسی کے دیئے زخموں کی وجہ سے چور چور نہ ہوتا۔ میں اب کسی سے کوئی بھی تعلق نہیں جوڑنا چاہتا تھا۔ بھلے وہ محبت کا ہو یا دوستی کا۔ میں اپنوں کے دیئے زخموں سے چور تھا۔ میں ڈسنے سے مرا تو نہ تھا مگر اس کا زہر میرے اندر مکمل طور پر سرائیت کر چکا تھا۔ کوئی بھی نیا تعلق مجھے بچھو کی مانند دکھائی دیتا۔ میں ایسے کوئی جھمیلے بھی نہیں پالنا چاہتا تھا جو میرے پاؤں کی زنجیر بن جائیں۔

میرے رویے نے فرح میں اگر کوئی غرور تھا تو اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اب ندیم سے فاصلہ رکھ کر اپنی نگاہیں میرے اردگرد رکھنے لگی تھی۔ میں ہر روز صبح ایک ہی مخصوص وقت پر فیکلٹی آتا۔ میں Love Tree کے قریب پتے راستے سے گزرتا تو فیکلٹی کی ٹیرس مجھے وہیں سے نظر آ جاتی تھی۔ وہ مجھ سے پہلے ٹیرس پر کھڑی اس راستے کو دیکھتی نظر آ جاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے ہٹ جاتی تھی۔ میں فیکلٹی میں سیڑھیاں چڑھ کر کلاس کی جانب آتا تو وہ سامنے ریلنگ سے ٹیک لگائے دوسری جانب دیکھ رہی ہوتی تھی۔ میں دل میں مسکرا پڑتا اور اسے نظر انداز کر کے لائبریری کی جانب بڑھ جاتا۔

اس کے کپڑے شوخ رنگ کے ہوتے جو اس پر خوب جچتے تھے مگر چہرے پر اس کے ایک اداسی سی چھائی ہوتی۔ چمک دار آنکھوں میں مجھے کسی محرومی کا سایہ نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہیں جب ایک لمحے کو بھی میری جانب اٹھتیں تو جیسے مجھے نثول رہی ہوتیں۔ ستائش ہر ایک کو اچھی لگتی ہے مگر اب ایسی ستائشیں شاید میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ یہ نہیں کہ میں کوئی زیادہ ہینڈسم یا کوئی پرنس چارمنگ قسم کا لڑکا تھا۔ ایک سادہ چہرہ ایک سادہ انداز اور سادگی زندگی میں جیتا تھا۔ اپنے وقار اور اپنی عزت کا مجھے بہت پاس تھا۔ بے عزت ہو کر رہنے سے زیادہ عزت سے مرنے میں مجھے ذرا بھر کی قباحت نہ تھی۔ ان دنوں نہ مجھے اپنی اہمیت جتلانے کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی اور کو اہمیت دینا چاہتا تھا لیکن میری بے اعتنائی نے اس کے پندار پر چوٹ کی تھی جس کی وجہ سے وہ میری طرف کھنچ رہی تھی۔

ہمارے کلاس فیلو ندیم کی حالت اب خاصی غیر ہو رہی تھی۔ وہ اور دوسرے کلاس فیلو صاف دیکھ رہے تھے کہ فرح میری جانب مائل ہے۔ محبت کی خوشبو کبھی بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ نگاہوں کے پیام گو الفاظ میں رکھے مگر تاثیر بے پناہ رکھتے ہیں۔ مجھ سے کئی بار ڈانٹ کھا لینے کے بعد فرح وہ فرح نہ رہی تھی جس نے دو لڑکوں کو فیکلٹی سے نکلوایا تھا۔ اب یہ وہ ندی تھی جو کسی دریا کے ملاپ کے لیے بہہ رہی تھی۔ ندیم اس کے قریب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتی تھی مگر نگاہیں کہیں اور بھٹک رہی ہوتیں۔ یہ سب کچھ پہلے کی طرح اب بھی میرے لیے بے معنی تھا۔

اسی فضا میں ہمارا پہلا سال مکمل ہونے والا تھا۔ پہلے سال کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ دوسرے سال میں ہماری صرف ریسرچ تھی اور ہمیں تھیسس لکھنا تھا۔

ایک دن فرینڈز کچن میں ہم بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک دوست نے پوچھا۔ ”کیا تم نے شادی بھی کی تھی؟“

میں حیران ہو کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سوال اس نے کیوں پوچھا۔

اس نے سوال دہرایا تو میں نے پوچھا۔ ”تمہارے سوال کا میں نے مطلب نہیں سمجھا اور اچانک میرے شادی شدہ ہونے کا خیال تمہیں کیسے آ گیا؟“

کسی اور جانب سے دوسرا سوال آیا۔ ”اور یہ کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور تمہاری ایک بیٹی بھی ہے اور یہ بھی کہ تم نے ماں سے بیٹی زبردستی چھین کر اپنے پاس رکھ لی ہے۔“

میں غصے میں بھر گیا۔ طیش میں ہاتھ کانپا اور چائے چھلک اٹھی۔ میں بولا۔ ”یہ مذاق ہے تو بھی بے ہودہ ہے اور اگر آپ لوگ سیریس ہیں تو اس سے بڑی بے ہودگی نہیں ہو سکتی۔“

پہلا دوست بولا۔ ”یہ بات ندیم پوری فیکلٹی میں کہتا پھر رہا ہے اور اب تو فیکلٹی میں لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری بے زاری اور سب سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ تمہارا یہ راز فاش نہ ہو جائے۔“

”ہوں تو یہ بات ہے۔“ میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ میں نے سگریٹ کی ڈبیا جیب سے نکالی اور سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔ میں ندیم کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت، عداوت اور رقابت کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے فرح کو متنفر کرنے کے لیے یہ اوچھا ہتھکنڈا استعمال کیا تھا۔ وہ فرح کو پانے کی خاطر یہ سب کر رہا تھا اور میں نے اس کے سامنے فرح کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب لے آنے کا پختہ فیصلہ کر لیا۔ مجھے اب فرح کو ندیم کے سائے سے بھی دور رکھ کر اسے اذیت دینی تھی۔ اسے اپنی ڈریسنگ، رکھ رکھاؤ اور شخصیت پر جو گھمنڈ تھا مجھے اس کو خاک میں ملانا تھا۔ میرے اندر ایک آگ بھڑک اٹھی تھی اور جب تک یہ آگ ٹھنڈی نہ ہوتی مجھے چین نہ آتا۔ میرے پورے پلان میں فرح کے لیے محبت نہیں بلکہ ندیم کے لیے دشمنی تھی۔ میں نے جھوٹی محبت کا جال فرح پر پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس پلان پر عمل درآمد پیپرز ختم ہونے کے بعد کرنا تھا جو ایک ماہ بعد شروع ہو رہے تھے۔

امتحان کی تیاری کے لیے میں نے ٹیوشن ایک ماہ کے لیے چھوڑ دی اور اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ سارا وقت پڑھائی میں گزارنے لگا۔

ایک دن میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ شہزاد میرے کمرے میں آیا اور بولا۔ ”فرح کے والد کی وفات ہو گئی ہے وہ بیمار تھے۔“ ساتھ ہی وہ یہ بولا کہ ہم سب کلاس فیلوز تعزیت کے لیے اس کے گھر جا رہے ہیں تم بھی چلو۔ میں نے بے خیالی میں کہا۔ ”تم لوگ جاؤ میری جانب سے بھی افسوس کر لینا اور جب وہ پیپر دینے آئے گی تو وہیں تعزیت کر لوں گا۔“

وہ چلے گئے۔ جب واپس آئے تو شہزاد نے بتایا کہ اس کے بھائی نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور وہیں تعزیت لے لی۔ پھر خود ہی بولا۔ ”فرح تو نیچے بھی نہیں آئی۔ ہمیں امید تھی کہ وہ بھی آئے گی۔“

میں نے دل میں سوچا کہ یہ سب تعزیت کی بجائے اس سے ہمدردی جتانے گئے تھے اسی لیے میں نے ساتھ نہ جا کر اچھا کیا تھا۔

ایک دن میں بیٹھا پڑھ رہا تھا اور مجھے میرے کچھ نوٹس نہیں مل رہے تھے۔ بار بار ڈھونڈا پھر بھی نہ ملے پھر یاد آیا کہ وہ ہماری دوسری کلاس فیلو زاہدہ کے پاس ہیں۔ زاہدہ یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل میں رہتی تھی۔ میں اس سے نوٹس لینے کے لیے باہر جانے لگا تو امتیاز بولا۔ ”کپڑے تو بدل لو، ڈھنگ سے شیو بنا کر جاؤ۔ بالکل جنگلی لگ رہے ہو۔“

”جس کے پاس جا رہا ہوں مجھے اس کے لیے کیا بننا سنورنا ہے اور نہ ہی اسے کوئی فرق پڑتا ہے؟“ یہ کہہ کر میں نے بائیک نکالی اور گرلز ہاسٹل آ گیا۔ میں نے لٹھے کا کرتا اور شلوار پہنی تھی۔ پاؤں میں چپل تھے اور گریبان کھلا تھا۔

زاہدہ سے نوٹس لے کر پوچھا۔ ”تمہاری دوست کیسی ہے؟“

وہ طنزیہ بولی۔ ”شکر ہے تم کو بھی آخر اس کا خیال آ ہی گیا۔“

وہ کہہ رہی تھی۔ ”اس کی ماں کی وفات چند سال پہلے ہو چکی ہے۔ اب والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ کوئی بہن بھی نہیں ہے۔ ایک بڑا بھائی ہے اور دوسرا صرف گیارہ سال کا ہے۔“ میں سر جھکائے سن رہا تھا۔ وہ دکھی لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ تو ٹوٹ چکی ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہے۔ پہلے تو میری اس سے فون پر بات بھی ہو جایا کرتی تھی مگر اب وہ بھی نہیں ہوتی۔ وہ کسی سے بھی نہیں ملتی اور نہ ہی کوئی بات کرتی ہے۔ ہر وقت خاموش رہتی ہے اور تو اور وہ اب تہیہ کیے بیٹھی ہے کہ پیپرز بھی نہیں دے گی۔“

زاہدہ بول رہی تھی اور میں تنکوں کی مانند بکھر رہا تھا۔ چند سال پہلے میں بھی اپنے ماں باپ دونوں کو کھو چکا تھا۔ میں بھی اسی طرح ٹوٹ چکا تھا۔ آج بھی بکھرا کھڑا تھا اور تب بھی بکھرا تھا۔ زاہدہ بول رہی تھی اور میں اپنے وجود کی کرچیاں چن رہا تھا۔

میں زاہدہ کے سامنے سر جھکائے شرمندگی اور ندامت سے کھڑا تھا۔ میں بھی کتنا کم ظرف تھا کہ ایک دکھی اور معصوم لڑکی کے جذبات کو استعمال کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سوچ سوچ کر شرم آ رہی تھی کہ میں کیا اتنا بھی گر سکتا ہوں۔ مجھے یہ خلش بھی مارے جا رہی تھی کہ کیوں میں نے اسے بے اعتنائی کی زد پر رکھ لیا

تھا۔ مجھے یہ ندامت بھی تھی کہ میں نے کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں تھا کہ تمہاری ماں کیسی ہے۔ تمہارے والد کیسے ہیں؟ تم جو مجھے دیکھتی ہو تو کس کو تلاش کرتی ہو۔ کیا کوئی ہے جو کھو گیا ہے یا کوئی ہے جو ابھی تک ملا نہیں؟

میں نے بوجھل دل سے زاہدہ سے کہا۔ ''میں آج ہی فرح سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے والد کی تعزیت بھی کرنی ہے۔''

وہ بولی۔ ''جب سب جا رہے تھے تو تب کیوں نہیں گئے؟''

''پہلے کیا ہوا تھا۔ وہ میں بھول گیا ہوں۔ مجھے صرف یہ بات یاد ہے کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

اس نے مجھے ایڈریس لکھوایا اور میں اسی حلیے میں فرح سے ملنے چلا گیا۔

ڈور بیل بجائی تو دروازہ اس کے بھائی نے کھولا۔ میں نے اپنا نام بتا کر آنے کا مقصد بتایا تو وہ پہلے کھڑا میرا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرے میں چائے کا ایک کپ اور کچھ لوازمات لے آیا۔ انہیں میز پر رکھا اور دوبارہ گھر کے اندر چلا گیا۔

میں نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگایا اور دل میں طوفان و شرمندگی لیے بیٹھا رہا۔

پھر فرح سر پر سفید دوپٹا اور پاؤں میں گھریلو چپل پہنے سادہ کپڑوں میں اندر آگئی۔

وہ آئی اور میں کھڑا ہو گیا۔ اپنے لیے میرے احتراماً کھڑے ہونے پر وہ ایک لمحے کے لیے چونکی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے میں ہوں۔ اس کی نظریں ذرا دیر کو میری جانب اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور ان میں وہ شوخی نہ تھی جو پہلے نظر آتی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

وہ بیٹھی تب میں بیٹھا۔ اس کی نظروں میں حیرت تھی کہ وہ جو اس سے ہمیشہ سرد مہری برتتا تھا آج اتنا کیوں بچھے جا رہا ہوں۔

سادہ لباس میں ایک وقار اس کے چہرے پر تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ میں بولنے سے کترا رہا تھا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں نے ہمدردی کا مرہم اس کی روح پر لگے زخموں پر رکھا تو اس کی آنکھیں برس پڑیں گی۔

میں اسے سر جھکائے بیٹھا دیکھ رہا تھا اور اسی لمحے میرے اندر کی شرمندگی پہلے ہمدردی میں بدلی اور پھر نہ جانے کیسے وہ پیار میں ڈھل گئی۔ وہ فرح جس کو دیکھ کر میں منہ پھیر لیتا تھا، اب اس پر سے نظریں بھی نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ فاصلے ایک پل میں طے ہو جائیں گے، یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے رخی لمحوں میں پیار میں بدل جائے۔ وہ سامنے بیٹھی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ یہ تو مدتوں سے میرے وجود سے جڑی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیوں اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرنے کو جی کر رہا تھا۔ اس پر کبھی غم کا سایہ نہ پڑے۔ اسے سدا خوشیاں ملیں۔ یہی دعائیں میرے دل سے نکل رہی تھیں۔ میں اسے تکے چلا جا رہا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا وہ مجھے دیکھتی تھی۔ وہ سر جھکائے میرے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے آپ کے والد کی وفات کا بہت افسوس ہوا ہے۔''

وہ خاموش اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ میں نے پھر کہا۔ ''مجھے تو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ آپ کی والدہ بھی وفات پا چکی ہیں، یہ تو زاہدہ نے مجھے آج بتایا ہے۔'' وہ تب بھی خاموش رہی۔ نظریں اس کی اپنی گود میں رکھے ہاتھوں پر تھیں۔ میں کرب سے بولا۔ ''اس درد کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے جو چند سال پہلے اپنے والد کو ان ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دفنا چکا ہو۔''

سرعت سے اس کی نظریں میری جانب اٹھیں۔ ڈبڈبائی آنکھیں حیرت اور صدمے سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ دکھ سانجھے تھے تو نظریں بھی ایک ہوئیں۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور آنسو موتیوں کی طرح اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ آنسو اس کے دیکھ کر آنکھیں میری بھر آئیں۔ پانی میری آنکھوں میں اترا تو سوال اس کی نگاہوں سے آیا کہ جب یہ سب کچھ تھا تو دیر کیوں لگی تمہیں۔ اتنا بے قرار مجھے کیوں رکھا۔ کیوں اتنا تڑپایا جواب میرا چہرہ اسے دیتا تھا کہ دیر تو واقعی میں نے کر دی مگر اب معافی بھی تو مانگ رہا ہوں۔ کبھی کبھی دیر تو ہو ہی جاتی ہے مگر یہ بھی تو دیکھو کہ چلا بھی تو آیا ہوں۔

اس سے میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ بتا رہی تھی کہ آپ نے پیپرز نہ دینے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔''

''میں اب نہیں دے سکتی۔ اس حالت میں مجھ سے اسٹڈی نہیں ہو سکے گی۔''

''خواب صرف اپنے نہیں دوسروں کے بھی ہوتے ہیں جو ہم سے جڑے ہوتے ہیں۔ آپ کے والد نے آپ کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خواب دیکھا ہوگا۔ کیا وہ نہیں پوچھیں گے کہ میرے جاتے ہی میرے خواب بھی دفن کر دیے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں کھڑا ہوا تو وہ بھی صوفے سے اٹھ گئی۔ بولی۔ ''چائے تو پی لیں۔''

''چائے اس دن پیوں گا جب آپ پیپر دینے آئیں گی۔'' جاتے جاتے میں نے اس سے کہا۔ ''تمام نوٹس میں کل تک زاہدہ کو دے دوں گا تاکہ وہ تمہیں پہنچا سکے۔ میری اگر ضرورت پڑے تو بتا دینا۔'' میں نے باہر قدم نکالنے سے پہلے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور زور دے کر کہا۔ ''یہ پیپرز آپ دے رہی ہیں اور بھرپور تیاری سے دے رہی ہیں۔ ایک بات یاد رکھنا۔ نہ مجھے مایوس کرنا ہے اور نہ اپنے والد کو۔''

وہ اب خوشی اور حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اسے مجھ سے ایسے الفاظ کی توقع نہیں تھی۔ میں یہ سب کہہ کر واپس چلا آیا۔ دوسرے دن نوٹس کی فوٹو کاپیاں بنوائیں اور انہیں زاہدہ کے پاس چھوڑ آیا۔ اسے تاکید کی کہ آج ہی فرح کو پہنچا دے۔

پھر میں اپنی پڑھائی میں غرق ہو گیا۔ جب تھک جاتا تو ہاسٹل کے ساتھ کینٹین کے پیچھے رکھی چارپائیوں پر آ لیٹتا۔ فرح کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ پیپر دے گی کہ نہیں؟ یہ سوال اپنے آپ سے کرتا۔ میرا یقین پختہ تھا کہ وہ ضرور پیپر دینے آئے گی۔ اتنا اعتماد تو مجھے اپنے آپ پر تھا کہ میرا کہنا وہ کبھی نہیں ٹالے گی۔

جس دن پہلا پرچہ تھا تو وہ آخر میں آئی۔ میری نظریں اسے بے تابی سے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسے آتا دیکھا تو میں خاموشی سے مسکراتا امتحان ہال کی طرف چل پڑا۔

پیپر ختم ہوا تو سب کلاس فیلوز پیار کے درخت تلے بچھی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ اس کی آنکھوں میں چھایا غم اب مدھم پڑ چکا تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا۔ ''آپ نے تو پیپرز نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر یہ ارادہ کس طرح سے بدلا؟''

میری جانب اس کی تشکر بھری نظریں اٹھیں اور وہ بولی۔ ''میں اپنے والد کی روح کو اور دوسرے لوگوں کو مایوس نہیں کر سکتی تھی۔''

اے ڈی اظہر (1904 یا 1974_1901)

احمد الدین اظہر کو علم و فن کے حلقوں میں اے ڈی اظہر کے نام سے جانا پہچانا گیا۔ پروفیسر ہارون نے 1904 اور ساجد حسین صدیقی نے 1901 سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں ان کی پیدائش کا سال درج ہے۔ اے ڈی اظہر نے ابتدائی تعلیم گاؤں کی مسجد و مدرسے میں حاصل کی۔ قرآن کریم ناظرہ پڑھنے سے اردو کے حرف شناس ہو گئے مگر پرائمری کے بعد دل اچاٹ ہو گیا۔ گلستان سعدی اور عربی کی صرف ونحو پڑھی اور پھر مرے کالج سیالکوٹ سے بی اے کیا۔ آڈٹ اور اکاؤنٹس کا امتحان پاس کیا۔ راولپنڈی اور دہلی میں تعیناتی ہوئی۔ تقسیم سے قبل آسٹریلیا میں تجارتی مندوب رہے پھر پاکستان آ گئے۔ سابق مشرقی پاکستان میں مشیر ریلوے رہے۔ پنجاب حکومت میں بھی خدمات انجام دیں۔ 1954 میں لندن میں سفارت خانہ پاکستان کے مشیر مالیات اور وزیر اقتصادیات رہے۔ 1958 میں کراچی آئے اور ایک فرم کے ایم ڈی بنائے گئے۔ 4 فروری 1974 کو وفات ہوئی کراچی میں سپرد خاک ہوئے۔ ''ہمارے اہل قلم'' میں اے ڈی اظہر کے مجموعہ کلام کا نام ''لذت آوارگی'' لکھا ہے اور سن پیدائش 1904 اور وفات 24 فروری 1974 تحریر ہے۔

☆☆☆

رسا بدایونی (1967-1894)

مقبول حسن صدیقی بدایوں میں 15 ستمبر 1894ء کو حافظ مولوی رفعت اللہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی آئے رسا بدایونی قلمی نام تھا۔ ''برگ و بار'' ان کا مجموعہ کلام تھا۔ معروف شاعر محشر بدایونی نے اپنے مکان کے باہر یہ نام کندہ کرایا تھا۔ 14 نومبر 1976 شعرائے بدایوں کے اس نمائندہ شاعر کا کراچی میں انتقال ہوا اور خفتگان کراچی میں شمار ہوا۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقرا سٹی، کراچی

اس دن سب کو چائے اسی نے پلائی۔ کسی نے اصرار کیا کہ ادائیگی میں کر دیتا ہوں تو وہ بولی۔ ''یہ چائے کی ادائیگی نہیں بلکہ کسی شکریے کا اظہار ہے جو مجھے آج بھی کرنا تھا۔'' کوئی بھی اس کی بات کو نہ سمجھ سکا۔ زاہدہ بھی نہیں، پر میں سمجھ کر مسکرا رہا تھا۔

پیپرز ختم ہو گئے۔ ہمارے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ امتحان کے دنوں میں، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا ذہن کہیں بھٹکے۔ میں پیپر دے کر سیدھا ہاسٹل آجاتا۔ پیپرز کے بعد پریکٹیکل ہوئے اور پھر پندرہ دن کی چھٹیاں ہو گئیں۔

میں چند دن اپنے گھر میں ٹھہرا اور بقیہ دن ایک پہاڑی مقام پر کیمپنگ کر کے گزارے۔ میرے اکاؤنٹ میں اب میری ضرورتوں سے زیادہ رقم تھی جسے میں نے رکھ کر کیا کرنا تھا اس لیے کیمپنگ پر خرچ کرتے مجھے کوئی تردد نہ ہوا۔

پھر آخری سال کی لیب تیاری کے لیے کچھ کلاسیں شروع ہوئیں۔ وہ پہلا دن تھا اور مجھے فرح کو بیچ میں لائے بغیر ندیم سے حساب بھی چکانا تھا۔ جسے میں بھولا نہیں تھا۔ میں اسے فیکلٹی میں ڈھونڈ رہا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے میں نے ایک لیڈی پروفیسر کے کمرے میں فرح کے ساتھ بیٹھے پایا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر جا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ فرح دوسری کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے فرح نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن اور پریشانی تھی۔ ندیم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''کیا تم کو معلوم ہے کہ میری شادی ہوئی تھی؟ اور یہ کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق بھی دے دی؟ اور یہ بھی کہ میری ایک بیٹی بھی ہے جسے میں نے اس کی ماں سے چھین کر زبردستی اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟''

میرے سوالات سن کر الفاظ اس کے منہ میں پھنس گئے۔ اس کے فقرے ٹوٹ گئے اور وہ منمنانے لگا۔ فرح اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے بغور مجھے سن رہی تھی اور ندیم کے چہرے کو بھی دیکھ رہی تھی۔ جواب زرد پڑ چکا تھا۔

میں نے غصے سے دوبارہ پوچھا۔ ''جواب دو مجھے۔ کیا تمہیں پتا تھا؟ اگر نہیں پتا تھا تو پھر یہ بکواس سب سے کیوں کرتے پھرتے ہو؟''

وہ اب بے بسی سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یہ غصہ بھی تھا کہ وہ کیوں فرح کے قریب پھٹکتا ہے۔ وہ جواب دینے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر بات کر لینے سے پہلے تصدیق کر لیتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا اور آئندہ میں نے کوئی غلط پروپیگنڈا تمہارے منہ سے سنا تو نہ تمہارا منہ سلامت رہے گا اور نہ تم۔''

وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

فرح اب مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھی اور میں غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کیوں مسکرا رہی ہو۔ میں نے اپنا غصہ مشکل سے دبایا ہوا ہے ورنہ یہیں اس کو بچھا دیتا۔ اس نے میرے کردار پر وار کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے ایک بچی کو اس کی ماں سے چھین رکھا ہے یہ سب نرا جھوٹ ہے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''ایک تو آپ ہمیشہ غصے میں رہتے ہیں۔ اس غصے کو تو قابو میں رکھا کریں۔'' میرے کچھ کہنے کا انتظار کرنے کے بعد بولی۔ ''وہ ابھی یہی سب باتیں مجھ سے کر رہا تھا اور میں پریشان تھی کیونکہ یہ بہت بڑی بات ہے مگر آپ نے موقع پر آ کر اس کا پول میرے سامنے کھول دیا۔'' پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر اس کے جھوٹ کا پول آپ بعد میں کھولتے تو شاید میں کبھی مطمئن نہ ہو پاتی؟''

میں چپ بیٹھا اسے سنتا رہا۔ وہ کچھ سوچ کر پھر بولی۔ ''تو پھر آپ اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں رہتے ہیں؟''

''میری جڑیں بھی لوگوں نے اکھاڑ دی ہیں۔''

''مناسب سمجھیں تو بتا دیں کہ آپ کے ساتھ ایسا ہوا کیا تھا؟''

''آپ سن کر کیا کریں گی؟''

''آپ نے میرے گھر آ کر میرا دکھ بانٹا، مجھے ایک سمت دکھائی۔ کچھ امید دی۔ شاید اسی طرح میں بھی آپ کے کچھ غم بانٹ سکوں۔''

''تمہارے اپنے دکھ زیادہ ہیں اس پر اپنا بوجھ بھی تم پر ڈال دوں؟''

پھر وہ اپنا سارا پیار ساری محبتیں چاہتیں اپنے چہرے اور آنکھوں میں لا کر بولی۔ ''ایک ڈیل کر لیتے ہیں، میرے دکھ تم لے لو اور اپنے سارے مجھے دے دو۔ یہ نہ تم سے سنبھل پائیں گے اور نہ مجھ سے۔ اچھا ہے ایک دوسرے کے حوالے کر دیں۔''

''تھک جاؤ گی۔''

''آزما کر دیکھ لو تھکوں گی نہیں بلکہ آپ کو بھی تھکنے بھی نہیں دوں گی۔''

میں نے اس کی جانب دیکھا تو محبت کا پیام اس کی آنکھوں میں تھا۔ ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہوا ٹھاٹھیں اور موجیں مارتا، اس کی آنکھوں نے اس کی اندرونی حالت کو مکمل طور پر عیاں کر دیا تھا۔ ایک تلاطم تھا اس کے وجود میں اور وہ ہلکا سا کپکپا رہی تھی۔ اس کے دونوں سفید مرمریں ہاتھ میز پر رکھے تھے وہ بھی ہولے سے کپکپا رہے تھے۔

میں تو پہلے ہی اس کی جانب مائل ہو چکا تھا۔ اگر نہ بھی ہوا تو آج ضرور ہو جاتا۔

میں نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ میرے ہاتھوں کی گرفت پڑی اور چند قطرے آنسوؤں کے اس کی آنکھوں سے ڈھلکے۔ وجود کے دھارے طوفانوں سے نکل کر ایک پُرسکون موج میں بہنے لگے۔ خوشی کے رنگ اس کے چہرے پر پھیلنے لگے اور میں نے رک رک کر اس سے کہا۔ ''آج سے یہ ہاتھ میں نے تھام لیے ہیں۔ ایک بات ذہن نشین کر لو اگر انہیں کبھی چھڑانا بھی چاہا تو کہیں چھڑا سکو گی۔ اپنے لیے تمہاری آنکھوں میں چاہت میں نے شروع ہی میں دیکھ لی تھی۔ میں نظر انداز کرتا رہا، بے اعتنائی برتتا رہا اس لیے نہیں کہ تم مجھے اچھی نہ لگیں تھی، صرف اس لیے کہ میرے ساتھ کسی کا بھی چلنا بہت مشکل ہے۔ میں اپنی آگ میں خود ہی جل رہا ہوں۔ میں کسی بھی تعلق کو اپنی کسی جنگ میں شامل نہیں کرنا چاہتا مگر آج تمہاری آنکھوں نے مجھے پیار کا اجلا اور کھلا پیام دیا تو میرے ضبط ٹوٹ گئے۔ میں بگڑا اور بھٹکا ہوا انسان ہوں۔ چاہو تو مجھے سنوار دو اور چاہو تو مزید بگاڑ دو۔ یہ زندگی آج سے تمہارے نام کرتا ہوں۔ میں پیار میں شرطوں کا قائل نہیں اور نہ ہی تمہارے سامنے کوئی شرط رکھوں گا اور نہ ہی تم رکھنا۔ بس ایک ہی شرط رکھے دیتا۔ وہ یہ کہ کبھی یہ مت لکھنا کہ مجھے چھوڑ دو۔ اگر کبھی ایسا کہا بھی تو میرا وہ روپ تم دیکھو گی جو آج تک کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔''

میری باتیں وہ ساری توجہ اور پیار سے سن رہی تھی۔ میں نے بات ختم کی تو اس نے لب میرے ہاتھوں پر رکھ دیے جو اس کے سفید اور خوب صورت ہاتھوں پر تھے۔ بوسہ دے کر اپنے گال ان پر رکھے اور سکون کی لہروں پر بہنے لگی۔ وہ کچھ نہ بول رہی تھی مگر میں اسے سن رہا تھا۔

برصغیر کا پہلا خودکش دھماکا

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ برصغیر کا پہلا خودکش دھماکا کب اور کس نے کیا تھا۔ 1857 میں پہلی جنگ آزادی کے وقت، میرٹھ چھاؤنی سے آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے سپاہی جب دہلی کی جانب بڑھے تو ان کے سامنے بریگیڈیئر گریوس آگیا۔ آزادی کے متوالے سپاہیوں نے دہلی میں داخل ہونے کے لیے کشمیری گیٹ کا استعمال کیا اور گیارہ مئی کو اندر داخل ہو گئے۔ گریوس کے سپاہیوں کی نفری ہتھیار کے ساتھ فرار ہو گئی اور میرٹھ کے سپاہیوں کے ساتھ مل گئی۔ اسلحہ خانے کی حفاظت پر مامور لیفٹیننٹ ویلے بی تھا۔ وہ اندر چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس اسلحہ خانے میں بہت بڑی مقدار میں بارود تھا۔ بارود کی لالچ میں ہزاروں کی تعداد میں سپاہی بارود خانے میں داخل ہو گئے۔ ویلے بی نے جب دیکھا کہ پوری عمارت ان سپاہیوں سے بھر گئی ہے تو اس نے اپنے کپڑوں میں آگ لگا کر بارود سے بھرے ایک تھیلے پر خود کو گرا لیا۔ تھیلے میں آگ لگتے ہی دھماکا ہوا اور پورا بارود خانہ روئی کے گالے کی طرح اڑ گیا۔ ایک ویلے بی کے خودکش اقدام سے تقریباً دو ہزار آزادی کے سپاہی جان ہار گئے۔

ابن الحسن میجر سید

(1994-1927)

''جوئے تشنہ'' (1974) اور ''آبگینہ (1982) نامی دو شعری مجموعوں کے شاعر مضامین کے مجموعے ''شمع اور در بیچے'' (1984) کے مصنف، تحریک پاکستان کے کارکن، ملٹری اکاؤنٹس کے اے جی پاکستان کا اکانومسٹ (1970 تا 1982) کے بانی و مدیر تکبیر میں ''گوشوارہ'' کے کالم نگار ماہر اقتصادیات، شاعر اور صحافی جیسی صفات کے حامل محمد ابن الحسن کو میجر ابن الحسن کے نام سے شہرت ملی۔ 1988 میں سندھ کے گورنر نے آپ کو اپنا مشیر بنایا تھا۔ مذکورہ تصانیف کے ساتھ ہی کالم کا مجموعہ ''جملہ معترضہ'' اور کہانیوں کا مجموعہ ''روزنِ در'' بھی شائع ہوا۔ انگریزی میں بھی ایک تالیف چھپی۔ حکومت پاکستان نے ان کی بیش بہا علمی اور صحافیانہ خدمات پر ستارۂ امتیاز (1991) دیا۔ 11 فروری 1994 کو بھرپور قلمی مجاہدہ کرنے والے میجر سید ابن الحسن ڈیفنس قبرستان کراچی میں ابدی نیند جا سوئے۔

مرسلہ: نزہت جبیں۔ چنیوٹ

پھر ہم آپس میں ملنے لگے۔ کبھی پیار کے درخت تلے اور کبھی نرم و دبیز گھاس پر۔ میں نیم دراز ہوں اور وہ گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کیے بیٹھی ہے۔ کبھی دھوپ سے بچنے کے لیے سائے میں بیٹھے ہیں اور کبھی سایوں کی ٹھنڈک سے بچنے کے لیے نرم و گداز دھوپ میں بیٹھے ہیں۔ جیسے جیسے اس کے پیار کی شدت بڑھتی گئی تو میری کرختگی نرم پڑ کر اس کی محبت میں ڈھلتی چلی گئی۔

ایک بار کہنے لگی۔ ''مجھے اپنی پسند بتاؤ، میں ویسے ہی کپڑے پہن کر آیا کروں گی۔''

''تم جیسے بھی کپڑے پہن لو، تم پر جچ جاتے ہیں۔ تمہارے کپڑوں کے رنگوں سے زیادہ تمہاری شوخ آنکھوں میں کھلتے خوابوں اور ان میں بچی گہری جھیلوں سے پیار کرتا ہوں۔ ان آنکھوں کو کبھی مت بدلنا۔''

فرینڈز کچن میں دوست مجھ سے پوچھتے تھے کہ واقعی تم اس کے بارے میں سنجیدہ ہو، یا ندیم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟'' میں جواب میں کہتا۔ ''اس سے پیار کیا تو سارے حساب ساتھ ہی چکا دیے۔ اب تو اسی کی چاہت میری زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وقت گزاری تو میں پہلے بہت کر چکا ہوں، اب وقت اس طرح سے گزرتا ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا۔''

ہمارے دن رات ایک دوسرے کے خیالوں میں گزرنے لگے ہم کتابیں پڑھنا بھول گئے اور ایک دوسرے کو زیادہ پڑھنے لگے تھے۔ کلاسوں میں دلچسپی ختم ہو گئی۔ زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ کر گزارنے لگے۔

ان دنوں کسی شہر میں کرکٹ کا ون ڈے میچ ہو رہا تھا۔ میں نے نہ جانے کس خیال سے اس سے کہا۔ ''یار جی کرتا ہے کہ میچ دیکھنے جاؤں پر مجبوری ہے نہیں جا سکتا۔''

وہ سمجھی کہ میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں اور پیسے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکتا۔ وہ بولی۔ ''کرکٹ سے اتنی دلچسپی ہے کہ میچ دیکھنے دوسرے شہر جانا چاہتے ہو؟''

میں بولا۔ ''ہاں! لیکن چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔'' میں تو دراصل اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ کہیں کھو سی گئی۔ وہ کوئی بات کرنا چاہتی تھی مگر دیکھا کہ فیکلٹی کا چپڑاسی ہماری جانب بھاگا چلا آ رہا ہے۔ وہ قریب پہنچا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سانس درست کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''آپ دونوں پہلے مٹھائی کھلائیں پھر ایک خبر سناتا ہوں۔''

میں نے اس کے ہاتھوں پر کچھ نوٹ رکھے اور کہا۔ ''ہم اپنے ساتھ مٹھائی لیے نہیں پھر رہے۔ یہ شہر جا کر خرید لینا۔ اب جلدی سے خبر سناؤ اور اس بات کا خیال رہے کہ خبر فرح کے لیے زیادہ اچھی ہو۔''

وہ بولا۔ ''دونوں کے لیے اچھی ہے۔ رزلٹ آ گیا ہے۔ آپ کی پہلی پوزیشن ہے اور فرح باجی کی دوسری۔''

میرے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی۔ فرح اوّل آتی تو مجھے شاید زیادہ خوشی ہوتی۔ وہ چلا گیا اور فرح بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔ آنکھیں اس کی نم ہو گئی تھیں۔ میں بولا۔ ''اس خوشی کی خبر پر بھی تم نے رونا شروع کر دیا؟''

''یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ تم نے مجھے اس وقت اٹھایا۔ جب میں غموں میں نڈھال ہو کر گر گئی تھی۔ مجھے نئی زندگی کے ساتھ نئے خواب بھی دیے۔ سوچتی ہوں اگر تم نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟'' پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ''سوچتی ہوں کہ کاش ایسا ہو سکتا کہ میں تمہیں اپنے گھر بلاتی۔ خود تمہارے لیے کچھ بناتی اور اپنے ہاتھوں سے کھلاتی۔''

میں بولا۔ ''اپنے ہاتھوں سے کھلانے کا تکلف چھوڑو۔ گھر کا کھانا بہت دنوں سے نہیں کھایا، وہی کھلا دینا۔''

مسکرا کر بولی۔ ''بھائی سے کیا کہوں گی؟''

''کہہ دینا کہ یہی ہے جس سے مجھے شادی کرنی ہے۔''

''اور اس نے کہا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی تو پھر؟''

''وہ انکار کر کے تو دیکھے۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ بولی۔ ''یہی تو تم سے ڈرتی ہوں۔ غصہ تو تمہارا ہر وقت ناک پر رہتا ہے۔ کہیں بات ہی خراب نہ کر دو۔''

میں بولا۔ ''تم کو پانے کے لیے میں کچھ بھی کر گزروں گا۔''

وہ بولی۔ ''تمہاری پہلی پوزیشن آئی ہے۔ اب تو تمہارا اسکالرشپ بھی ہو جائے گا اور ٹیوشن پڑھانے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی؟''

مجھے معلوم تھا کہ اسکالرشپ ملنے کے بعد میری مالی پوزیشن بہتر ہو جائے گی. پھر بھی ایک ٹیوشن جاری رکھنی تھی کیونکہ بچوں کی والدہ اتنی زیادہ مطمئن تھیں کہ وہ مجھے جانے ہی نہ دیتی تھیں۔ میں جاتا تو کئی اقسام کے کھانے میرے

آگے رکھ دیے جاتے۔ کسی نہ کسی بہانے سے تحائف دیے جاتے۔ وہ اتنی عزت دیتے تھے کہ انہیں چھوڑنے کا جی بھی نہ کرتا تھا۔ دوسرے دن تمام کلاس فیلوز نے ہمیں مبارک باد دیے مگر ندیم سامنے بھی نہیں آیا۔ پورا دن سب نے کینٹین پر بیٹھے گزارا تھا۔ زاہدہ کہتی تھی کہ اللہ نظر بد سے بچائے۔ تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگتے ہو جیسے دونوں کو اللہ نے ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے۔

کینٹین سے اٹھ کر میں اور فرح لان میں آ بیٹھے۔ اسے مجھ سے کوئی بات کرنی تھی۔ صبح سے کہہ رہی تھی مجھے اکیلے میں ایک ضروری بات تم سے کرنی ہے۔

ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ بولی۔ ''تم سے ایک بات پوچھنی ہے؟''

''مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے تمہیں اجازت لینے کی ضرورت کب سے پڑ گئی؟''

''یہ بتاؤ کتنی محبت کرتے ہو مجھ سے، سچ سچ بتانا؟''

''پیار تولا یا ناپا نہیں جا سکتا کہ تمہیں اعداد بتاؤں۔''

''چلو تم مجھ سے یہ سوال پوچھ لو۔''

''تم بغیر پوچھے ہی بتا دو۔ کم از کم یہ تو مجھے کبھی برا نہیں لگے گا کہ تم کتنا پیار کرتی ہو۔''

''جب بھی ہم کینٹین پر بیٹھے ہوتے تو تمہاری بے پروائی اور نظر اندازی مجھے گھائل کر جاتی تھی۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے اچھا نہیں لگتا کہ میں کن کن لوگوں کو ٹھکرا چکی ہوں مگر تم مسلسل پورا سال مجھے ٹھکراتے رہے۔ میں ہر روز تمہارے لیے نت نئے کپڑے پہن کر آتی کہ کسی طرح سے تمہاری توجہ حاصل کر سکوں مگر تم اتنی ہی زیادہ بے پروائی برتتے اور تم نے مجھے تب اپنایا جب میں مکمل طور پر تھک چکی تھی۔ تمہارے لیے میں بے چینی رہتی اور فیکلٹی جلدی آ جاتی تھی کہ شاید کبھی تو تم اظہار کر دو گے مگر ہر بار تم نے منہ پھیر لیا۔ کیا تم کو کبھی بھی میری آنکھوں میں کچھ نظر نہ آیا؟''

میں کچھ دیر خاموش ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ''ایک تو تم سوال بہت ٹیڑھے کرتی ہو مگر جب پوچھ لیا ہے تو سنو۔ میں نے تو اسی دن بھانپ لیا تھا جب پروفیسر صاحب کے ساتھ ان کی بیوی کے متعلق بحث ہوئی تھی اور تم میرا شکریہ ادا کرنے آئی تھی مگر میں تم سے دور بھاگنا چاہتا تھا کیونکہ میرا اپنا ذہن بہت سے محاذوں پر الجھا ہوا تھا مگر جب تمہارے والد کی وفات ہوئی اور پھر تمہاری والدہ کی وفات کا معلوم ہوا تو میرے سارے زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ جب تمہارے گھر تعزیت کے لیے آیا تو تمہاری آنکھوں سے جو آنسو ڈھلکے تو وہ سیدھا میرے دل پر گرتے چلے گئے۔ میں پھر بھی تم کو اور اپنے آپ کو کچھ وقت دینا چاہتا تھا مگر تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا پیام اتنا دلنشین اور گداز تھا کہ مجھے اقرار کرنا ہی پڑا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم سے میں کتنا پیار کرتا ہوں مگر یہ جانتا ہوں کہ کوئی بھی اگر ہمارے بیچ میں آیا تو اسے راستے سے ہٹا دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کیونکہ تم کو میں کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

خوشی اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ آس پاس دیکھ کر بولی۔ ''ارد گرد اگر لوگ نہ ہوتے تو تمہارے سینے سے لگ کر خوشی سے اتنا روتی کہ تمہارا گریبان بھی گیلا ہو جاتا۔'' پُرمسرت چہرے سے اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اظہار تم کرتے نہیں بلکہ کروانا پڑتا ہے مگر جب بھی کرتے ہو تو الفاظ میرے دل میں اتر جاتے ہیں۔''

پھر کہنے لگی۔ ''کل کہہ رہے تھے ناں کہ مجھے کرکٹ میچ دیکھنا ہے۔'' یہ کہہ کر اپنا بیگ کھولا اور سفید لفافہ مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ''تم اپنا شوق ضرور پورا کرو۔ میں تب خوش ہوتی ہوں جب مسکراہٹ تمہارے چہرے پر دیکھتی ہوں۔ یہ کم ہوں تو اور مجھ سے لے لو مگر جانا تم نے ضرور ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیا اور کھول کر دیکھا تو اندر بہت سے نوٹ تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''لگتا ہے دس ہزار کم ہیں کل میں اور لے آؤں گی۔''

صدمے اور غصے سے میں کانپنے لگا۔ میرا چہرہ ایکدم سرخ ہوتا چلا گیا۔ مجھے اتنی شدید بے عزتی محسوس ہوئی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے سے لفافہ اس کی گود میں پھینکتے ہوئے بولا۔ ''اگر تمہارے ابو تمہارے لیے کوئی رقم چھوڑ گئے ہیں تو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تم نے اگر کسی کو ٹھکرایا ہے تو پیسے والوں کو میں نے بھی ٹھوکر ماری ہے۔ یاد رکھنا مجھے ان نوٹوں کی جھلک بھی مت دکھانا۔''

میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ میرا طیش آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ میرا یہ روپ اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پریشانی اور کرب اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ میں شدید ہزیمت سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے جو پیسے کے بل بوتے پر دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور میں اپنی راہیں خود متعین کرتا ہوں اور اسباب بھی خود تلاش کرتا ہوں۔''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑی اس کے چہرے پر تھی۔ میں نے جاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”ایک تو مجھے پیچھے سے آواز نہ دینا۔ میں کل میچ دیکھنے اب جا رہا ہوں اور میرے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھی موجود ہے۔ میں تو اس لیے نہیں جا رہا تھا کہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر......“ میں نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا ہاسٹل کی جانب چلا آیا۔ مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ اسے کس حالت میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

اگلے دن میچ دیکھنے دوسرے شہر چلا آیا۔ ٹکٹ خریدی مگر میچ دیکھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسٹیڈیم کے گیٹ پر ٹکٹ پھاڑ دی اور ہوٹل کے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

میرے دماغ میں غصہ بھر گیا تھا۔ اپنی تضحیک محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے یہ کیوں کہا کہ یہ رقم رکھ لو اور کم ہوں تو کل اور لا دوں گی۔

میری روح پر مایوسی اور شکستگی طاری تھی۔ میری ماں کو میرے خاندان والوں نے پیسا نہ ہونے کی وجہ سے بہت تڑپایا تھا۔ میری بہن کا رشتہ میرے رشتے داروں نے صرف اس وجہ سے توڑ دیا تھا کہ دوسری جانب زیادہ پیسے والے لوگ تھے۔ میرے وہ زخم کبھی مندمل نہ ہوئے تھے، ہمیشہ ہرے ہی رہے۔ ماں اسی دکھ میں مر گئی۔ بہن میرے سامنے کبھی نہ روئی مگر اکیلے میں روتی رہتی تھی۔ میرے والد پیسا نہ ہونے کی وجہ سے اپنا علاج نہ کروا سکے تھے اور میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا تھا۔ اسی پیسے کی وجہ سے مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو امیر رشتہ داروں نے کیا کیا نہیں سنایا تھا۔ میں نفرتوں کی آگ میں جل رہا تھا۔ اب کسی کی مالی امداد مجھے گالی لگتی تھی۔ میں اپنے بل بوتے پر وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں اور میرے بہن بھائی ذہنی اذیت کا شکار ہوئے تھے۔ میں ذہنی مریض بن گیا تھا مگر سوچتا کہ فرح تو یہ سب نہیں جانتی تھی۔

میں چار دن بعد یونیورسٹی پہنچا۔ وہاں پہنچ کر دو دن تک فیکلٹی بھی نہ گیا۔ میں کینٹین کے پیچھے چارپائی پر سویا رہتا۔ میں غصے کی حالت میں اس کے سامنے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جتنا اسے سنا چکا تھا اس پر بھی میں بہت زیادہ رنجیدہ تھا۔ اسے میں دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجھے اپنی اس ذہنی حالت پر قابو بھی نہ تھا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ اس کا کیا قصور ہے۔ وہ تو میری خوشی کے لیے مجھے اتنی بڑی رقم دے رہی تھی۔ اسے تو اندازہ ہی نہ تھا کہ مالی امداد مجھے پاگل بنا دیتی ہے۔ ہمارے گھر میں جب کھانے کو نہ ہوتا تو رشتے دار مالی امداد کر دیتے تھے۔ امداد دے کر باتوں باتوں میں بہت کچھ سنا بھی جاتے تھے۔ ماں اپنے اندر دکھ پالتی رہی۔ آنسو پی پی کر خاموشی سے اپنے اندر کئی مرض پالتی گئی اور میں دھاڑ دھاڑ کر وحشی بنتا گیا۔ ماں مر گئی اور اس کے سارے زخم میں نے اپنے اندر تازہ رکھے۔

☆......☆

میں فیکلٹی گیا، فرح اور زاہدہ لیب میں بیٹھی تھیں۔ اس دن وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ میں اندر گیا تو فرح تڑپ اٹھی اور میری جانب بڑھی مگر زاہدہ کی موجودگی میں وہیں تھم گئی۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی سوجی ہوئی تھیں، مجھے دیکھ کر رونے لگی۔ زاہدہ لیب سے باہر جاتے ہوئے شکایتی انداز میں بولی۔ ”آپ کو کیا اندازہ ہے کہ پچھلے چند دنوں سے اس نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے۔“

زاہدہ گئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بھی اپنے پر ضبط نہ کر سکا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور وہ اپنا چہرہ میرے سینے پر رکھے روتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کی آنکھیں چومتا، اسے چپ کراتا رہا۔ وہ مجھ سے لگی میرے اندر جذب ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کے نازک ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط ہوگی مجھے اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ کہتی جا رہی تھی۔

”مجھے جتنا بھی ڈانٹنا چاہو، ڈانٹ لیا کرو مگر روٹھ کر اس طرح کبھی مت جانا۔ میں مر جاؤں گی۔ تمہارے بغیر میں اب نہیں رہ سکتی۔ مجھ سے وعدہ کرو، روٹھ کر کبھی نہیں جاؤ گے۔ مجھے اس طرح چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ وعدہ کرو۔“

میں نے اس سے وعدہ کیا۔ اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کیے۔ اس کے الجھے بال سنوارے۔ اسے دلاسے دیے۔

پھر اسے کرسی پر بٹھا کر پہلی بار اپنے ماضی کے بارے میں بتایا۔ اپنی محرومیاں بتائیں، اپنے اندر سلگتی آگ کا بتایا، اپنے اکھڑ اور غصیلے مزاج کی وجہ بتائی تو تب کہیں جا کر وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میرے لیے ایک نعمت تھی۔ وہ بولی۔ ”آپ کا دل کتنا وسیع ہے جہاں سارے غم ڈوب جاتے ہیں اور چہرے پر اداسی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔“ پھر میرے کندھوں کو ہاتھ سے پکڑ کر بولی۔ ”آپ کی محبت سے بھی ڈر لگتا ہے اور آپ کی ڈانٹ سے بھی مگر یہ دونوں ڈر مجھے آپ ہی کی طرح پیارے ہیں۔“

ہماری محبت کے چرچے پوری فیکلٹی میں ہونے لگے تھے۔ ہماری اس چاہت کی وجہ سے میرے کچھ دوست مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔

اکثر پیار کے قصوں میں ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔ قریبی دوست حریف بن جاتے ہیں۔ مختلف انداز سے طنز کے نشتر چلاتے ہیں۔ ہم اکٹھے بیٹھے ہوتے تو ان کے تیور بدل جاتے، ماتھے پر شکنیں اور آنکھوں میں غصہ ہوتا تھا۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ میں اپنی استعداد سے بڑھ کر صبر سے کام لے رہا تھا۔ فرح بھی مجھے سمجھاتی رہتی تھی کہ ان کی پروا مت کیا کرو کہ ان سے الجھنے کا فائدہ کچھ نہیں ہے۔ میری وہ استانی بن گئی تھی اور آج میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر وہ مجھے بار بار نہ سمجھاتی تو میں ان دنوں کسی نہ کسی سے بری طرح الجھ جاتا۔

میں نے تو پروا کرنا چھوڑ دی تھی مگر ایک کم ظرف اپنا وار کر گیا۔ آخری سال میں ہمیں لائبریری اور لیب میں رہنا پڑتا تھا۔ گھنٹوں گزر جاتے اور ہم لائبریری میں بیٹھ کر ریفرنس چیک کیا کرتے تھے۔ میں اپنے کاموں میں اتنا منہمک تھا کہ ہم دونوں کو بات کرنے کا موقع بھی کم ملتا تھا۔

ایک دن میں لائبریری میں اپنے اردگرد سے بے پروا اپنے کام میں الجھا ہوا تھا۔ کئی جرنلز میرے سامنے بکھرے پڑے تھے۔

ایک دوست قریب آبیٹھا اور کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھنے لگا۔ ”سناؤ، سب کیسا چل رہا ہے؟“

”دن رات کی مصروفیت ہے۔ اللہ کرے تھیسس وقت پر مکمل ہو جائے۔“

وہ آنکھ مار کر بولا۔ ”تھیسس کی بات نہیں کر رہا۔ وہ بات، ندیم کو فرح کے سامنے ذلیل کرنے کا منصوبہ۔ ایک بار تو اسے رسوا کر لیا ہے کیا بار بار کرو گے؟“

میں آہستگی سے بولا۔ ”وہ بات پرانی ہو چکی ہے۔ اب اس سے میرا لینا دینا کچھ نہیں ہے۔“

وہ بات کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ بولا۔ ”سزا تو تم نے چالاکی سے اسے بہت بڑی دے دی۔ فرح کی نظروں میں گرا کر خود اس کے قریب ہو گئے۔“

میں خاموش رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بات کو جان بوجھ کر آگے بڑھا رہا ہے۔ میں نے فرینڈز کچن میں ندیم کو نیچا دکھانے کی بات کی تھی اور وہ اسی کا حوالہ دے رہا تھا۔

میں بولا۔ ”اب ختم کرو اس بات کو۔ میں سب بھول چکا ہوں اور اس وقت صرف مجھے اپنا تھیسس یاد ہے۔“

وہ با آواز بلند بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ ختم بھی کر دیتے ہیں مگر ایک بات تمہاری ماننے پڑے گی۔ فرح کو استعمال کر کے ندیم کو تو چت کر دیا۔ اب اس بے چاری کا کیا کرو گے۔ اپنے ساتھ لٹکائے رکھو گے یا نکال پھینکو گے۔“ پھر دوبارہ آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ”میں تو کہتا ہوں اپنے ہاتھ میں اسے ابھی رکھے رہو۔ ڈگری ملے تو کام نکال کر کھسک جانا۔“

میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور میرا تھپڑ اس کے چہرے پر پڑنے ہی والا تھا کہ دیکھا فرح الماری کے پیچھے سے نکل کر مجھے وحشت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس کمینے کو معلوم تھا کہ فرح الماریوں کے پیچھے کھڑی ہے۔ اسے یہ موقع غنیمت لگا اور وہ کم بخت اپنا کام کر گیا۔ فرح نے ہماری ساری باتیں بڑی میز کے پار کھڑے ہو کر سن لی تھیں۔ جب میں اس سے باتیں کر کے اپنے کام میں بھی محو تھا۔

اسے دیکھا تو میرا اٹھا ہاتھ رک گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے چہرے پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ زرد چہرہ اور برستی آنکھیں لیے وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ گرنے والی ہے۔ میں اس کی جانب بڑھنے لگا تو ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے وہیں روک دیا اور خود کرسی پر ڈھے گئی۔ دوست کھسک چکا تھا اور میں اب فرح کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ اسے کچھ ہو نہ جائے۔ شاید اس کی زندگی کے تمام شکوے، محرومیاں، غم، دکھ اور اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے تھے۔ اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا مگر نظریں مجھ پر تھیں۔ اس کی نگاہوں میں بے بسی، درد اور خوف کے سائے تھے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو روتے ہوئے بولی۔ ”دھوکے باز، جانور، بھوکے، تم نے یہ کیا کر دیا میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا اور فریب؟ مجھے تو پہلے ہی چند لوگوں نے تمہارے بہروپ کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ میں تو تمہارے بارے میں کسی کی سنتی ہی نہ تھی مگر آج تو کانوں سے سن بھی لیا۔“ وہ سسکنے لگی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ اس وقت میرا اسے سمجھانا اور یہ بتانا کہ سچ کیا ہے بے سود تھا۔ وہ اپنے حواس میں نہ تھی اور میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کے انبار بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ نفرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اور غم۔ سب کچھ تم کو سونپ

دیئے تھے۔ میں تو تمہارے قدموں میں بیٹھی تھی۔ اس تصور کو بھی پاس نہ بھٹکنے دیتی جو تم سے ذرا سا بھی دور لے جائے اور تم نے میرے ساتھ یہ کھیل کھیلا؟ اپنی انا کی تسکین کے لیے میرے جذبات، میری محبت کو استعمال کر ڈالا۔'' وہ روتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''میں تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ تمہیں معاف نہ کروں۔ مجھے کبھی مخاطب نہ کرنا، میں مر گئی تمہارے لیے۔ جس طرح محبت پر اپنا بس نہیں اسی طرح نفرت پر بھی اپنا بس نہیں چلتا۔'' وہ لائبریری کے دروازے سے نکلنے کے لیے میرے قریب سے گزری تو رک کر مجھ سے بولی۔ ''مجھے بار بار ڈانٹتے تھے جو اچھا لگتا تھا مگر تذلیل کوئی لڑکی برداشت نہیں کر سکتی۔''

وہ چلی گئی اور میں سکتے کی حالت میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے الفاظوں کی بازگشت بار بار میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ میں مایوسیوں میں گھرا کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ ایک پل میں میرا سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔

میں دوست نما دشمن کی تلاش میں ہاسٹل کی جانب بھاگا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ نہ وہ کینٹین میں تھا اور نہ کہیں اور تھا پھر معلوم ہوا کہ وہ اپنا بیگ اٹھا کر شہر نکل گیا ہے۔

میں اپنے کمرے میں آیا اور دروازہ بند کر کے سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ شام تک میں سنبھل چکا تھا۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ وہ کیا کر رہی ہوگی۔ اس نے کھانا بھی کھایا ہوگا کہ نہیں، اسے رات کو نیند بھی آئے گی یا نہیں۔ میں اپنے آپ سے سوالات کرتا رہا۔ دکھی وہ بھی اور نڈھال میں تھا۔ اگر اس کی عزت کا پاس نہ ہوتا تو اس کے گھر چلا جاتا۔ میرے دل میں ہوک سی اٹھی جب یہ سوچتا کہ کہیں وہ رو تو نہیں رہی ہو گی۔ میرا کلیجہ کٹ جاتا تھا اس کے بارے میں سوچ کر۔ مجھے ڈر اور دکھ یہ نہ تھا کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکی ہے۔ دکھ یہ تھا کہ اس کا اعتماد میں کھو چکا ہوں۔ اسے میرے بارے میں شدید غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کی غلط فہمی کو میں کس طرح دور کرتا؟ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے میں کوئی وضاحتیں نہیں دوں گا۔ اب اپنے رویے اور طرز عمل سے ثابت کروں گا کہ میں اس سے کتنا زیادہ پیار کرنے لگا ہوں۔ اس طرح سے وہ اپنی ریسرچ کو بھی مکمل وقت دے سکے گی۔ اب اس سے دور رہ کر اپنی اور اس کی محبت کا اثر دیکھوں گا۔ میں ذہن بدلنے کے لیے شام کو شہر فلم دیکھنے چلا گیا۔ فلم میں نے خاک دیکھی، بس پورا وقت سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ واپس ہاسٹل آیا... تو چوکیداروں کے ساتھ رات گئے باہر آگ جلا کر اس کے شعلوں سے محو گفتگو رہا۔

اگلے دن علی الصباح میں فیکلٹی پہنچا۔ وہ نہ آئی۔ میں اسے ہر جگہ ڈھونڈتا رہا۔ کبھی میٹرلیس پر کبھی پیار کا درخت کے تلے کبھی لیب کبھی لان اور کبھی لائبریری۔ اس کی موجودگی کا گمان ہوتا تھا پر وہ نہ تھی۔ میں اکیلا پیار کے درخت تلے بیٹھا تھا۔ دو کپ چائے کے منگوائے، ایک اپنے لیے اور دوسرا اس کے لیے۔ اس کا کپ پیا اپنا چھوڑ دیا کہ ایسے جیسے وہ ہے میں نہیں ہوں۔ کسی کے نہ آنے کا انتظار بھی اچھا لگتا ہے۔ جیسے لوگ اکثر کہتے تھے وہ موم کی طرح پگھل رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے دل میں اس کے پیار کو پروان چڑھاتا رہوں گا۔ اسے مناؤں گا نہیں مگر اس کا سائبان بن کر رہوں گا۔ اسے اپنی ڈگری مکمل کرنے کا پورا موقع دوں گا۔ مجھے اپنے پیار پر یقین تھا کہ وہ ایک دن حقیقت تک پہنچے گی اور خود ہی میرے لیے تڑپے گی۔ یہ ٹھیک راستہ تھا یا نہیں مگر میرا یہی راستہ تھا، اپنی زبان سے نہیں بلکہ محبت سے جیتنے کا۔

اگلے تین دن بھی وہ نہ آئی۔

چوتھے دن زاہدہ آئی تو اس نے مجھے دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ میں اسے زبردستی کینٹین تک لایا اور اپنے سامنے کرسی پر بٹھا دیا۔

وہ بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا انسان بھی ایسا کر سکتا ہے۔ ہم دونوں کیا سب لڑکیاں آپس میں یہی بات کرتی تھیں کہ آپ جیسا یہاں سچا، خوددار اور غیرت مند کوئی نہیں ہے۔ آپ کی شخصیت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان اتنے بہروپ بھی بدل سکتا ہے اور آپ کے لیے ایک اور خوش خبری یہ بھی ہے کہ اس نے یونیورسٹی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی ہے۔ اپنی ڈگری اپنے خواب اور اپنی چاہتیں سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔''

میں اس کے فقرے سن کر طیش میں آ گیا اور غراتا ہوا بولا۔ ''بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو کہ کس سے مخاطب ہو۔ اتنے زیادہ القابات سن کر میرا اس طرح سے خاموش بیٹھے رہنا بھی ایک طرح کی دلیل ہے کہ میں سازش کا شکار ہوا ہوں۔ میں اپنی سچائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اسے اگر مجھ پر یقین تھا تو اسے میرا یقین کرنا پڑے گا اور فرح سے کہنا کہ کل مجھ سے آ کر ملے ورنہ میں اس کے گھر پہنچ جاؤں گا۔

اسے کہنا کہ صرف ایک بار مل لے اور میرا ایک پیغام اس تک پہنچا دینا کہ میری محبت کسی نازک پودے کی طرح نہیں جسے میں یا وہ جب بھی چاہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔''

میرے کاٹ دار لہجے پر وہ سہم گئی۔ میں نے سگریٹ کا آخری کش لے کر دو انگلیوں سے اسے پرے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اسے کہہ دینا کہ صبح وہ نہ آئی تو شام کی چائے اس کے گھر پیوؤں گا۔'' میں اٹھا تو وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ میں بولا۔ ''اب تم جاؤ اور میرا پیغام آج ہی پہنچا دینا۔''

دوسری صبح وہ آئی تو میں پہلے سے ٹیرس پر موجود تھا۔ الجھی اور پریشان آنکھیں صاف بتاتی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ سادہ کپڑے، ڈگمگاتے قدم اور لرزتے ہاتھ کو دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ دکھ میری ذات تک رہتا تو اسے سہنا میری عادت تھی مگر درد اس کا تھا اور تکلیف مجھے ہو رہی تھی۔ وہ واقعی مجھے بدلتی جا رہی تھی۔

وہ ٹیرس پر آئی تو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اس کی سادگی میں سب سے دلکش چیز اس کی تمکنت تھی۔ بے غرض بے پروا ہو کر کسی جانب تکتی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا یہ برتاؤ مجھے اس کے پیار میں زیادہ سرشار کر گیا۔ مجھے تکلیف اس وقت ہوتی جب وہ مجھ سے خفا نہ ہوتی۔ اسے اپنی عزت اور وقار کا پاس تھا۔ تو وہ میری عزت بڑھا گئی تھی۔

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''چلو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''اب کہنے سننے کو کچھ باقی رہ گیا ہے؟'' اس نے میری جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

''میں نے ابھی تک کچھ تم سے کہا بھی نہیں۔ کہنے کے دن میرے آئے اور تم روٹھ گئیں۔'' میں نے اپنا لہجہ وہی برقرار رکھا۔

اس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''جو تم سے نہیں سنا تھا وہ لائبریری میں سن لیا تھا۔ اس کے بعد اب آپ کو کبھی بھی نہیں سننا چاہوں گی۔''

آج تو اس کی شان ہی نرالی تھی۔ کچھ غرور اور باقی بے پروائی۔

''یاد کرو جب ہم آفس میں بیٹھے تھے اور پہلی بار تمہارا ہاتھ پکڑ کر میں کیا بولا تھا۔ یہی کہ اب یہ ہاتھ پکڑے ہیں تو تمہارے کہنے پر بھی نہیں چھوڑوں گا پھر بھی پروا کرتا ہوں مگر جب بھی تم مجھے یہ احساس دلا دو کہ میرے بغیر کسی اور کے ساتھ تم خوش رہو گی تو تمہیں تمہاری خوشی کے لیے چھوڑ دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے بغیر تم بھی مر جاؤ گی اور میں تمہیں مرنے کے لیے تو نہیں چھوڑ سکتا۔''

میری بات سن کر حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی مجھ سے توقعات لگائے بیٹھے ہو۔ میری انا آپ کی محبت سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ آپ کے پیچھے بھاگ سکتی ہوں مگر آپ کے پیچھے رسوا نہیں ہو سکتی۔ وہ فرح اور تھی جو آپ کی چاہت میں ماری ماری پھرتی تھی۔ آپ کو اپنے پر اتنا زعم ہے تو اب آپ مجھے بھی جان لیں گے۔ میں تو آپ کی شخصیت پر مرمٹی تھی مگر جب آپ نے اپنا بت خود ہی توڑ ڈالا تو آپ کی شخصیت بھی ٹوٹ گئی۔ اب جتنے بھی اپنے آپ پر مختلف خول چڑھا لیں، آپ میرا دل نہیں بدل سکتے۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر میں بولا۔ ''بس اور کچھ نہیں کہنا، کہہ لو دل ہلکا ہو جائے گا۔ میرا دل تو سمندر ہے اور اس جیسے طعنوں کی کئی مچھلیاں اب بھی تیرتی پھرتی ہیں۔ پیار تو میں بہت کرتا ہوں تم سے اور اگر تمہاری عزت کا خیال نہ ہوتا تو سب کے سامنے تمہیں اپنی بانہوں میں لے لیتا پھر دیکھتا کون یہاں مرد کا بچہ تمہیں میری گرفت سے بچاتا ہے اور یہ جو اتنا گھمنڈ اور اکڑ دکھا رہی ہو اس کا بھی مجھے معلوم ہے، تم سے بڑا ڈرپوک اور بزدل تو میں نے دیکھا بھی نہیں۔ ہاں سنو تو آسمان کے قلابے ملا رہی ہو اور خوف اتنا کہ میری وجہ سے یونیورسٹی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔''

وہ غصے میں پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''اب کے بعد تو یونیورسٹی میں نہیں چھوڑوں گی۔ آپ کو ڈگری ملے گی تو مجھے بھی۔ ضد آپ میں بھی ہے اور کسی سے کم میں بھی نہیں۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لاکھ سمجھاتا تو بھی یونیورسٹی نہ آتی۔ اسے اپنے گھمنڈ کے جال میں پھنسایا تو وہ ڈگری لینے پر تل گئی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''شاباش! اب تم جا سکتی ہو اور جاتے جاتے ایک بات اپنے دل و دماغ میں بٹھاتی جاؤ۔ تم میری ہو اور صرف میری۔ کبھی بھول کر بھی اس بات کو نہ بھولنا اور ہاں اب پھر رونے مت بیٹھ جانا۔ یہاں سے تو غرور کی چادر لپیٹے جا رہی ہو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسے ہی مجھ سے دور ہوئی اور سسکیاں بھرنے لگی بزدل، ڈرپوک۔''

وہ غصے میں اسٹاپ کی طرف چلی گئی۔ وہ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہوئی میں اسے پیار بھری نظروں سے

دیکھتا رہا۔

اس کا غرور مجھے بھا گیا۔ مجھے کبھی یہ ڈر نہ تھا کہ وہ مجھے چھوڑ دے گی۔ میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کرنا چاہتا تھا۔ کچھ کیے بغیر وضاحتیں دیئے بغیر۔

وہ مجھ سے روٹھی تھی تو مغموم اس سے زیادہ میں تھا۔ اس کا قرب اس کا ساتھ اس کی ہنسی اس کی پیار سے تکتی نگاہیں "پیار کا درخت" تلے بیٹھ کر اس کا سر اٹھا کر درخت کی شاخوں پر چہچہاتے پرندے تلاش کرنا، پھولوں کی پتیوں پر سے صبح شبنم کے قطرے انگلیوں پر لے کر اسے اپنے ہونٹوں پر رکھنا، نئے کپڑے پہن کر آنا اور مجھ سے پوچھنا کہ دیکھ کر بتاؤ کیسی لگ رہی ہوں۔ موقع ملتا تو اردگرد دیکھ کر میرے سینے سے لگ جانا۔ میں رہ رہ کر اپنے خوابوں کی یہ رنگین تعبیریں یاد کرتا تھا اور میری آنکھیں اس کی دوری میں نم ہو جاتیں۔

جاڑوں کی سرد شام تھی اور میں ہاسٹل کے ساتھ کینٹین کے پیچھے سفیدوں کے درختوں تلے چارپائی پر چادر اوڑھے اکیلا لیٹا تھا۔ رات کے اندھیرے نے میرے اندر یادوں کے جگنوں کو روشن کر دیا تھا۔ یہ روشنی میرے اندر خوشی بھر رہی تھی۔ دوری میں ایسی کسک تھی کہ اس کا پیار میرے روئیں روئیں میں پھیل گیا تھا۔ میرے اندر اس کے پیار کی تپش بھی اتنی تھی کہ جاڑوں کی یہ سرد شام اور ہوا کے خنک جھونکے مجھے اچھے لگ رہے تھے۔ ابھی کینٹین بوائے مجھے چائے کا گرم مگ تھما گیا تھا۔ ایسے ہی ذائقے کی چائے پیتے ہم پہروں بیٹھے رہتے تھے۔ میں ہمیشہ اسے محبت سے سنا کرتا تھا۔ وہ میرے سامنے بہت بولتی تھی اور بولتے ہوئے مجھے بہت پیاری لگتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے حسن سے نہیں بلکہ پیار سے اسیر کیا تھا۔ اس کی یاد میرے دل میں ایسے تیر رہی تھی جیسے کسی جھیل کی سطح پر کنول کا پھول ہوا سے ڈولتا ہے۔ بدنصیبی ہمیشہ میرا کاشانہ بنی تھی مگر اب کی بار میں نے ایسا نہ ہونے دیا تھا۔ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتا اتنا ہی اس کے پیار میں ڈوبتا جاتا تھا۔ میرا دل ملائمت سے بھرا تھا۔ سوچتا تھا کہ وہ مجھے پہلے کیوں نہ ملی۔ پہلے ملی ہوتی تو میں کب کا سدھر چکا ہوتا۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
کہ تو بڑی دیر سے ملا ہے مجھے

وہ فیکلٹی آتی تو کبھی لیب میں اور کبھی لائبریری میں ہوتی۔ میں اس سے ذرا فاصلے پر رہنے لگا۔ وہ اردگرد سے بے نیاز اپنے کام میں جتی رہتی۔ اس کے زخم بھی کاری تھے جنہیں مندمل ہونے میں وقت لگتا۔ اسے لگن سے کام کرتے دیکھتا تو مجھے تسکین ملتی۔ میں نے ایک ٹیوشن چھوڑ دی اور دوسری چھوڑنا چاہتا تھا مگر بچے بھی میرے ساتھ خوش تھے۔ ان کی ماں انہیں شام کو ہاسٹل میں بھیجنے لگی۔ ڈرائیور انہیں لے آتا اور پڑھائی کے بعد واپس لے جاتا۔ میں فیکلٹی سے ہاسٹل اس وقت نہ جاتا جب تک وہ گھر نہ چلی جاتی۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ میں جب خود کام کرتے کرتے تھک جاتا یا فارغ ہوتا تو شجرِ عشق کے نیچے آ بیٹھتا۔ میری محبتوں کا گواہ وہ درخت جاڑوں میں اب بے برگ کھڑا تھا۔ اس کی سوکھی ٹہنیاں ہوا کے زور سے جب ہلتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ سسکیاں لے رہی ہوں۔ یہ درخت مجھے آج کتنا وحشت ناک لگ رہا تھا جو کبھی اپنی ٹھنڈی چھاؤں کی پناہ میں ہم دونوں کو رکھتا تھا۔ آج اس پر بیٹھے چند پرندے کوئی نالہ وشیون بلند کر رہے تھے۔ میں ان کے مرثیے سنتا سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہا تھا۔

اتنے میں وہ زاہدہ کے ہمراہ سیمنٹ کے پختہ راستے سے ہوتی ہوئی مین لائبریری کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے تنہا سوچوں میں گم بیٹھے دیکھا تو ایک پل کو رکی۔ اسے دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ایک گہری اداسی نے اسے بھی گھیرا ہوا تھا۔ زرد دھوپ اور آسمان پر چھائے غبار نے فضا کو غمگین بنا دیا تھا۔ اس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں صاف کیں، زاہدہ سے کوئی بات کی اور پھر زاہدہ میری جانب بڑھتی چلی آئی۔

میرے قریب آ کر کھڑی ہوئی تو سوالیہ نظروں سے میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "آپ اسموکنگ بہت زیادہ نہیں کر رہے ہیں۔ پہلے سے کمزور بھی نظر آ رہے ہیں۔ کھانا ٹھیک سے کھاتے ہیں؟ سوتے وقت پر ہیں یا نہیں؟ اور......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ "اس سے کہنا کہ تمہارے سارے پیام مجھے مل گئے ہیں۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ میری فکر میں گھلنے کی بجائے اپنی فکر کیا کرے۔ یہ بھی کہنا کہ تم میری امانت ہو اور وقت آنے پر تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ہاں آخر میں یہ کہنا کہ اداس نہ رہا کرو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔"

زاہدہ نے اس سے کچھ کہا۔ وہ میری جانب مڑی تو آنسو اس کے گالوں پر لکیریں بنائے بہہ رہے تھے۔ وہ تیز

قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

ایک دن میں ڈسپنسری کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ وہ مجھے لائبریری کے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ میں نے اپنے آپ کو دروازے کی اوٹ میں کر لیا۔ ندیم اس سے کہہ رہا تھا۔ "میرے ساتھ بات کرنے سے اب کیوں کترائی ہو؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اگر ایسی بات نہیں تو ہم کینٹین میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"میں کہیں نہیں جا سکتی۔ جو بات کرنی ہے وہ یہیں کر لو۔"

"اس چالاک اور مکار انسان کی اصلیت تو تم پر کھل گئی ہے۔ کس منصوبہ بندی سے اس گھٹیا انسان نے مجھے تمہاری نظروں سے گرانے کی سازش کی تھی۔ اسے ہم دونوں کی دوستی ہضم نہ ہو سکی تھی۔ اسے تم سے کوئی پیار نہیں تھا بلکہ میرے خلاف انتقام کا جذبہ تھا یقین کرو میں تم کو بہت چاہتا ہوں......"

فرح نے اس کی بات کاٹ دی اور تڑپ کر بولی۔ "ہمت ہے تو اس کے منہ پر یہ سب باتیں کرو اور تمہاری یہ بھول ہے کہ اس کے خلاف میں ایک بات بھی سنوں گی۔ ہٹ جاؤ یہاں سے مجھے بہت کام کرنے ہیں۔"

ندیم غصے میں آ گیا اور اس سے تیز لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے، میری اور تمہاری دوستی پہلے کی ہے اور تم اس کمینے کے لیے مجھے نیچا دکھا رہی ہو۔"

یہ سننا تھا کہ بجلی کی سی تیزی سے میں دروازے کی اوٹ سے نکلا۔ فرح نے مجھے غصے کی حالت میں دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ میں اس کی جانب لپکا۔ مجھے اپنے قریب پا کر وہ مڑا ہی تھا کہ میرا تھپڑ اس کے چہرے پر اس زور سے پڑا کہ وہ بھی لرز گئی اور ندیم دروازے سے جا ٹکرایا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔

میں اب اس کے سر پر قہر بن کر کھڑا تھا۔ میں نے فرح کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ گرج کر اس سے بولا۔ "آئندہ اس کے راستے میں آئے تو چیر کے رکھ دوں گا تمہیں۔" یہ کہہ کر میں پلٹا اور سیڑھیاں اترتا نیچے چلا گیا۔

دوسرے دن میں لیب میں کام کر رہا تھا کہ زاہدہ میرے پاس آئی اور بولی۔ "وہ کہتی ہے کہ میری خاطر تمہیں کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ آپ کو میری فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ میں اپنا دفاع خود کر سکتی ہوں۔"

میں نے قہقہہ لگایا اور زاہدہ سے بولا۔ "اس سے کہہ دو کہ وہ وہی کرے جو اس پر جچتا ہے اور اس سے کہہ دینا کہ ایک دو ماہ میں تھیسس جمع کروانے ہیں، وہ اس کی فکر کرے۔ دیر نہیں کرنی کیونکہ میں جلدی میں ہوں اور بہت کام نمٹانے ہیں۔"

زاہدہ نے سنا تو مسکرا اٹھی۔ سر ہلایا اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ "آپ کی طرح آپ کا پیغام بھی لاجواب ہے۔"

ہم پچھلے سات ماہ سے ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔ زاہدہ اکثر پیغام لے کر آتی رہتی تھی اور میں انہیں ہنسی مذاق میں اڑا کر اسی قسم کے جوابی پیغام بھیج دیا کرتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی مگر انا کے ہاتھوں مجبور تھی۔ میں اسے اپنی محبت کا شدید احساس دلا کر پانا چاہتا تھا۔ میں اسے تب اپنانا چاہتا تھا جب وہ میرے پیار کے سحر میں مکمل گرفتار ہو جائے۔ میری محبت میں ہیر نہیں رانجھا بن جائے کیونکہ ادھوری محبت کا میں قائل نہ تھا۔

فیکلٹی میں کام اتنا زیادہ ہوتا کہ اکثر ہمیں شام ہو جایا کرتی تھی۔ محبت تو میں بھی کر رہا تھا مگر اس کا جنون الگ ہی تھا۔ صبح سے شام ہو جاتی اور اسے ہوش بھی نہ ہوتا۔ میرا کام ختم ہو جاتا تو تب بھی میں اس کے محافظ کے طور پر فیکلٹی میں رہتا تھا۔ جب تک وہ اپنے گھر نہیں چلی جاتی تھی۔ وہ بس میں بیٹھ کر روانہ ہوتی تو تب کہیں جا کر میں ہاسٹل واپس پہنچتا تھا۔

ایک روز شام ہو کر گزر گئی اور وہ ابھی کام کر رہی تھی۔ میں اپنا کام کب کا ختم کر کے اس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا شام کے بعد اکیلے رکنا مجھے بے چین رکھتا تھا۔ فیکلٹی میں اس دن صرف چوکیدار تھا۔ اس سے مصلیٰ منگوا کر میں نے نماز ادا کی۔ چوکیدار سے پوچھا تو وہ بولا۔ "بی بی ابھی کام کر رہی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اس نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔"

وہ بولا۔ "انہوں نے دوپہر میں صرف چائے پی۔ اس کے بعد تو کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے اسے کچھ رقم دی اور بولا۔ "کینٹین سے کچھ کھانے پینے کا لے آؤ۔"

وہ بولا۔ "کینٹین تو شام سے پہلے ہی بند ہو جاتی ہے۔"

میں غصے میں آ گیا۔ یہ سوچ کر میرا پارہ چڑھنے لگا کہ وہ صبح کا ناشتا کر کے آئی ہوگی اور اب تک کچھ کھائے پیے بغیر کام کر رہی ہے۔ اگر گر گئی تو کسی کو گھنٹوں خبر بھی نہ ہو گی۔

میرے دماغ میں طوفان سا اٹھا کہ ”مجھے اپنا چوکیدار سمجھا ہوا ہے صبح سے شام اس کی رکھوالی کرتا رہوں۔ یہ خیال کرتا پھروں کہ وہ مشکل میں تو نہیں ہے، اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اس نے کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں، کوئی اسے تنگ تو نہیں کر رہا، کہیں اس کی آخری بس بھی مس نہ ہو جائے۔ کیا اس نے مجھے اپنا تنخواہ دار ملازم سمجھا ہوا ہے۔ میں اس کا اتنا خیال رکھتا ہوں اور وہ ٹکر ٹکر دیکھتی ہوئی پاس سے گزر جاتی ہے۔“

چوکیدار کھڑا میرے جواب کا منتظر تھا۔ میں نے کچھ اور نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے اور غصے میں بولا۔ ”فوراً ٹیکسی پکڑو اور شہر سے کچھ کھانے پینے کا سامان اس مہارانی کے لیے لے آؤ اور اسی ٹیکسی میں واپس آنا۔ دیر نہیں کرنا، سمجھے......“

وہ مسکرا رہا تھا۔ ”سر ابھی گیا اور ابھی آیا۔“ کہتا ہوا تیزی سے نکل گیا۔

میں اپنے قدم بڑھاتا لیب کی جانب چلا آیا۔

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ کام کیے جا رہی تھی۔ مجھے گھورتے دیکھا تو تنک کر بولی۔ ”میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے، اگر ہاسٹل میں کوئی کام نہیں تو کہیں اور چلے جایا کریں۔ یہاں فیکلٹی میں کیوں ٹکے رہتے ہیں۔“

میں نے اس کے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟ ٹائم دیکھا ہے رات ہو رہی ہے اور تم یہاں اکیلے ایسے کام کر رہی ہو جیسے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے والی ہے اور صبح سے بھوکی بھی ہو۔ شکل دیکھی ہے کہ برسوں کی مریضہ لگ رہی ہو۔“

”آپ میرے لیے اتنے پریشان نہ ہوا کریں۔ نہ میں نے آپ سے کہا ہے کہ میرے لیے رکیں اور نہ ہی مجھے ضرورت ہے اور ہاں میرا باڈی گارڈ بننے کی کوشش بھی مت کریں۔“

میں اب تک تو بڑے آرام سے بات کر رہا تھا۔ اس کے یہ الفاظ سنتے تو میرا غصہ تیز ہو گیا۔ آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا شیشے کا بیکر چھین کر اسے کاؤنٹر پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے اور اسے اپنی جانب کھینچا۔

وہ درد سے کراہنے لگی اور میں سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارا نوکر نہیں ہوں اور تمہارا بھائی یا تم مجھے کوئی معاوضہ نہیں دیتے کہ تمہاری حفاظت کے لیے تین تین گھنٹے یہاں رک کر خوار ہوتا رہوں۔ جی کرتا ہے تمہاری قینچی کی طرح چلتی زبان کو کھینچ ڈالوں۔ آئندہ شام سے پہلے یہاں سے دفع ہو جایا کرو۔ مجھے اور بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں اور تمہاری چاکری میں یہاں اپنا سارا وقت برباد نہیں کر سکتا۔“ یہ کہہ کر جب میں نے اسے ایک زوردار جھٹکے سے چھوڑا تو وہ کاؤنٹر سے جا لگی۔

وہ درد سے کراہتے ہوئے چیخ کر بولی۔ ”تم جنگلی، گنوار اور وحشی ہو۔ میرا دماغ چل گیا تھا جو تمہارے پیچھے پورا سال دوڑتی پھرتی تھی۔ تمہاری اصلیت کا پتا ہوتا تو تم سے بات کیا کرنا، تمہاری جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ مجھے تم سے نفرت ہے، شدید نفرت، مجھے چھوڑ دو اکیلا اور چلے جاؤ یہاں سے۔“ یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ کر رونے لگی۔

ایک تو اس کا رونا بھی مجھے مار دیتا تھا مگر کیا کرتا مجھے اپنے پر قابو بھی نہیں رہتا تھا۔ اب تو اس کی تھکاوٹ بھی مجھے گھائل کر دیتی تھی۔ اس کے آنسو میرا دل پگھلا گئے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس کے لیے بے انتہا محبت لیے اسے ... نم آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

اسے روتے دیکھ کر میں اپنے لہجے میں نرمی لے آیا اور بولا۔ ”اب اپنا رونے کا یہ ڈراما بند کرو۔ چوکیدار ٹیکسی پر تمہارے لیے کھانا لینے گیا ہے۔ کھانا کھا کر گھر چلی جانا اور بس سے جانا۔ بلکہ میں بھی بس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر تمہارے ساتھ تم کو چھوڑنے جاؤں گا۔“

”مجھے نہیں کھانا تمہارا کھانا... مجھے زہر ہی دے دو۔“ وہ آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔

”کیا کہا تم نے؟“ میں نے پوچھا تو بولی۔

”کچھ نہیں کہا۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم جلدی سے یہ سارا سامان سمیٹو، میں باہر بیٹھا ہوں۔“ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا تو وہ بھیگی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں مجھے اپنے لیے بہت سی شکایتیں اور محبتوں کے دریا موجزن نظر آئے۔ میں مسکرا اٹھا اور سر ہلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے بعد میں کھانا کھایا۔ چوکیدار بتا رہا

تھا۔ ”صاحب! وہ اتنی بھوکی تھی کہ سارا ہی کھا گئی۔“

اس رات اسے میں نے گھر کے اسٹاپ تک چھوڑا اور واپس ہاسٹل پہنچا تو میس بند ہو چکا تھا اور کینٹین پر آملیٹ بنوا کر اپنا ڈنر کیا۔

ریسرچ کے بعد تھیسس مکمل کرنے میں دو ماہ اور لگ گئے تھے۔ ادھر بہار اتری اور ادھر میرا تھیسس مکمل ہوا۔ کام تو اس کا بھی مکمل ہو چکا تھا مگر اب وہ بے حد تھکی تھکی دکھتی تھی۔ ایسے کہ اس نے ایک بڑا معرکہ سر کیا ہے۔

پیار کی کشش ہی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ کہیں بھی ہوں اور کسی کو یاد کرتے ہوں تو دور بیٹھے دوست کا دل بھی محبت میں ڈوبا ہوتا ہے۔ میں نے پچھلے دس ماہ اس کی یاد کو سینچ سینچ کر رکھا تھا۔ اپنے پیار کی عمارت اینٹ پر اینٹ رکھ کر تعمیر کی تھی۔ جب بھی وہ فیکلٹی میں ہوتی تو اسے اپنے حصار میں رکھتا اور جب گھر چلی جاتی اپنے پیار میں۔ میری محبت کی آنچ بھی اتنی تھی کہ وہ بھی اس میں جھلسنے لگی تھی۔ میں دس ماہ پہلے کی فرح میں اور آج کی فرح میں بہت فرق دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی متلاشی نگاہیں ارد گرد کچھ دیکھ رہی ہوتیں جو پہلے انہیں جھکائے گزر جاتی تھی۔ اب وہ کوئی بھی کپڑے پہن لیتی تو نڈھال نہیں بلکہ شان سے گزرتی تھی۔ اب وہ سر پر دوپٹا رکھنے لگی تھی اور جب گزرتی تو سر اٹھا ہوتا۔ پہلے تو وہ کترا کر پاس سے گزرتی اور اب پاس سے ہو کر گزرنے لگی تھی، اتنے قریب سے کہ مجھے یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ آج خوشبو اس نے کون سی لگائی ہے۔ عموماً وہی خوشبوئیں لگا کر آتی جو میں نے اسے تحفتاً دی تھیں۔ اب آخر میں مجھے اسے ایک ہی وار میں اپنے پیار میں اس طرح سے ڈھالنا تھا کہ اسے جب اپناؤں تو اس کا سارا بھروسا پہلے سے بھی بڑھ کر مجھ پر ہو چکا ہو۔ میں اپنے آگے کے لائحہ عمل کا سوچ ہی رہا تھا کہ ڈین صاحب نے ایک دن اپنے آفس میں مجھے بلا لیا۔ اس دن فیکلٹی بند ہو چکی تھی۔ فرح بھی جا چکی تھی۔

میں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ بولے۔ ”اپنا تھیسس کب جمع کروا رہے ہو؟“

”سر مجھے ایک ہفتہ اور دے دیں۔ سورہ فلق کا انگریزی ترجمہ حاصل کر لیا ہے۔ اب اسے سرورق کے اندر لگانا ہے۔“

”اچھا تو تم سمجھتے ہو کہ یہاں حسد کرنے والے تم سے...... بہت ہیں؟“

”جی سر ایسا ہی سمجھ لیں۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تمہارا تھیسس ممتحن کو بھجوا کر تمہارا Viva (زبانی امتحان) جلد سے جلد کروا لوں۔“ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ”اس کے بعد تم نے ضروری کام تو بہت کرنے ہیں؟“ ان کا انداز سوالیہ تھا۔

میں الجھ گیا کہ کس ضروری کام کی وہ بات کر رہے ہیں۔ وہ میری جانب دیکھتے ہوئے لگاتار مسکرا رہے تھے۔

میں اپنی کرسی پر تھوڑا سا آگے کھسکا اور حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”میں نہیں سمجھا سر؟“

مسکرا کر بولے۔ ”وہی جو تم نے مجھ سے بولا تھا۔ ڈگری لیتے ہی فرح سے شادی کروں گا۔ اپنی بات پر ابھی تک قائم ہو؟“

میں ان کی ساری بات سمجھ چکا تھا کرسی سے ٹیک لگائی اور مسکرا کر بولا۔ ”بات کر کے پیچھے ہٹنے والوں میں سے میں نہیں ہوں۔ ایسی غلطی ایک بار کر چکا ہوں اور دوبارہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

اپنی کرسی سے ٹیک لگا کر وہ بولے۔ ”میں بھی بیٹیوں والا ہوں۔ ہر باپ چاہے گا کہ داماد تمہاری طرح کا ہو۔ مستقل مزاج، نڈر اور ہدف پر نظر رکھنے والا۔ وہ یتیم بچی خوش نصیب ہے کہ اسے تم جیسا ساتھی ملا ہے جو اس کا ہمیشہ خیال رکھے گا۔“ پھر میری جانب بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اس سے کیا تمہارا جھگڑا ہوا ہے۔ مہینوں سے اکٹھے نظر نہیں آ رہے؟“ میرے جواب دینے سے پہلے ہنس کر بولے۔ ”یہ مت سمجھنا کہ کسی بات کی مجھے خبر نہیں ہوتی۔ اپنے آفس میں یہاں بیٹھ کر ہر ایک پر اپنی نظر رکھتا ہوں۔“

میں بھی مسکرا پڑا اور بولا۔ ”سر! جھگڑا تو دس ماہ پہلے ہوا تھا۔ مجھے اسے اور اپنے آپ کو وقت دینے کا بہانہ مل گیا تھا کہ پوری یکسوئی سے ریسرچ اور تھیسس مکمل کر سکیں۔ اسے منانا تو کوئی بڑی بات نہ تھی میرے لیے مگر کبھی کبھار دوری بھی اپنے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔ ہم قریب ہوتے تو بیشتر وقت باہر بیٹھ کر باتوں میں گزار دیتے اور آج آپ مجھے ڈانٹ رہے ہوتے کہ تم جیسا ناسمجھ اور غیر ذمہ دار میں نے نہیں دیکھا جس نے جانتے بوجھتے اپنے اور اس کے تھیسس کو مہینوں آگے کر دیا ہے۔“

میں خاموش ہوا تو وہ مجھے تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، بولے۔ ”فرح کے والد میرے دوست تھے۔ اس کے داخلے پر وہ میرے پاس آئے تھے۔ مجھ سے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو اوپر والے اور آپ کے حوالے کر رہا

ہوں۔ وہ تو وفات پا گئے مگر فرح مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔ اب میں بھی سرخرو ہوں کہ اس کی بیٹی کے لیے میں نے بہترین رشتہ چنا ہے۔ فرح کے بھائی سے میں تمہاری بات پہلے ہی کر چکا ہوں۔ ایک بار اس سے جا کر مل لو۔ بھائی ہے تو اس کی تسلی بھی ضروری ہے ورنہ تو راضی ہے۔ تم مل لو تو اس کے بعد ایک بار میں تم کو لے کر ان کے گھر جاؤں گا اور رشتے کی ابتدائی بات بھی ہو جائے گی۔ باقی کے معاملات تمہارے گھر والے ہی طے کریں گے۔"

"ٹھیک ہے سر، کب ملنا ہے؟ مگر سر ہم باہر ہی ملیں گے۔ ابھی ان کے گھر نہیں جانا چاہتا۔"

انہوں نے جواب نہ دیا اور ہاتھ بڑھا کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ نمبر ملا کر اس کے بھائی سے بات کی۔ کل شام چھ بجے ایک ریسٹورنٹ میں ملنے کی بات پکی کر کے میری جانب دیکھ کر بولے۔ "گڈ لک ینگ مین اب تم جاؤ اور کل ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جانا۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور وہ اٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔

میں باہر آیا تو میرے لبوں پر وہ مسکراہٹ تھی جو شاید ان بادشاہوں کے چہروں پر ہوتی ہوگی جو ایک سخت معرکے کے بعد جنگ جیتنے لگے ہیں۔ میں قدم بڑھاتا ہوا Love Tree کے نیچے آ بیٹھا۔ دن ڈھلنے میں کچھ وقت رہتا تھا۔ آسمان کی بلندیوں میں اجلے اجلے بادل کہیں کہیں تیر رہے تھے۔ آسمان آج اتنا چمکدار کیوں تھا۔ شاید اس کا چہرہ دیکھ لیا ہوگا۔ خوشیوں کی آمد کے پیغام مجھے ان معطر ہواؤں سے آ رہے تھے جو نئے کھلے پھولوں سے خوشبو چرا کر مجھے چھوتی تھیں۔ میں اس درخت تلے کرسی ڈال کر بیٹھا تھا جو ابھی سرسبز تھا۔ سردیوں میں پھر کملا گیا تھا اور ہواؤں کے زور سے اب دوبارہ جھومتا تھا۔ ایسی بہار میری زندگی میں پہلی بار آئی تھی جو میرے لیے مسرتوں کے سندیسے لائی تھی۔ شام کا رنگ زمین پر پھیلنے لگا تو آسمان پر شفق کے رنگ کہیں سے اترے۔ وسیع لان کے کناروں پر لگے پھول مسکرا مسکرا کر جھولتے تھے۔ رنگ اتنے کہ آپس میں گھل مل کر مجھے مبارک بادیں دیتے تھے۔ اس درخت تلے میں نے اس کے ساتھ محبت کا دم بھرا تھا اور پھر کئی ماہ اس کے نیچے بیٹھا اس سے دوری کا درد سہتا رہا تھا۔ سکھ کے دن نہیں رکے تھے تو دکھ کے دن بھی چلے گئے۔ میں سوچتا تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ یہ خبر تو میں نے ہی اسے دینی تھی۔ سوچتا تھا کہ اسے پہلے تنگ کروں گا۔ ڈراؤں گا اور جب سہم جائے گی تو سینے سے لگا لوں گا۔ اپنی ساری خطائیں معاف کرواؤں گا۔ اس کی بہت ساری محبتوں، نوازشوں کا شکریہ ادا کروں گا۔ کیا وہ یہ سب سن کر حیران ہوگی، خوش ہوگی؟ کہیں سکتے میں نہ آ جائے؟ نہیں بس تھوڑی دیر کے لیے ستاؤں گا اور پھر حقیقت اسے بتا دوں گا۔ میری زندگی کی سب سحر کاریاں سارے خوابوں اور تعبیروں کے ساتھ عود کر آئیں۔

اگلے روز میں فیکلٹی صرف اس لیے گیا کہ اسے ایک نظر دیکھ لوں۔ آج اس کے بھائی سے ملنا تھا اور وہ زاہدہ کے ساتھ بے خبر بیٹھی تھی۔ رنگ اس نے وہی پہنے تھے جو پھولوں کے تھے۔ وہ خود بھی بہار کا کھلتا پھول نظر آ رہی تھی۔ میں بے پروائی سے چلتا ہوا ان کی جانب گیا۔ قریب پہنچ کر سلام کیا اور اسے نظر انداز کر کے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں پھیل کر بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے تھے۔ کتنے ماہ بعد ہم تینوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی طرف سے مجھے نظر انداز کر کے بیٹھی تھی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا سارا دھیان میری جانب ہے۔

زاہدہ نے پوچھا۔ "ڈگری لینے کے بعد اور کیا ارادے ہیں آپ کے؟"

میں نے پوچھا۔ "کس چیز کے ارادے؟"

وہ بولی۔ "جاب کہاں کرنی ہے؟ یہاں سے تو اب جانا ہی ہوگا ہم سب کو۔"

میں نے بے پروائی سے کہا۔ "گھر والے کہہ رہے ہیں کہ پہلے شادی کر لو۔ سب کہتے ہیں کہ شادی کر کے ملک سے باہر جاؤ، اکیلے نہیں۔"

زاہدہ مسکرا کر بولی۔ "کیا انہیں اپنی پسند کا بتایا ہے؟"

"بتانے لگا تھا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ جس کو میں پسند کرتا ہوں وہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ سوچتا ہوں اسے اپنی ضد میں آ کر اپنا تو لوں مگر اس کی زندگی تو خراب ہو جائے گی۔ کس طرح وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی جب وہ مجھے سخت ناپسند کرتی ہے۔"

وہ اب سخت بے چینی میں مبتلا ہو گئی۔ کرسی پر جیسے پہلو بدلنے لگی۔ چہرہ اس کا زرد ہو گیا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

زاہدہ پریشان ہو کر بولی۔ "تو پھر کیا کرو گے؟"

"اب میں نے کیا کرنا ہے۔ سب بہنوں پر چھوڑ دیا ہے کل بتا رہی تھیں کہ انہیں ایک لڑکی بہت پسند آئی ہے۔

میں نے کہا کہ جہاں چاہو گی شادی کر لوں گا۔" پھر دونوں ٹانگیں زمین پر رکھیں اور آگے بڑھ کر زاہدہ سے بولا۔ "بہت جلد تمہارا اور تمہاری سہیلی دونوں کا منہ میٹھا کرواؤں گا۔" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اب سر اٹھا کر میری جانب دیکھ رہی تھی اور میں اسے نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ میں نے جھک کر زاہدہ کو سلام کیا اور بغیر اس کی جانب دیکھے اپنی موٹر بائیک کی جانب بڑھ گیا۔

اسی دن شام کو میں اس کے بھائی کے سامنے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ڈین صاحب کے انتخاب کو وہ نہیں ٹھکرا سکتا تھا اور اس کے پاس کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ میری مخالفت میں اٹھ کھڑا ہو۔ کچھ بنیادی سوالات کرتا رہا۔ گھر والوں کے بارے میں پوچھتا رہا پھر کہا کہ ڈین صاحب آپ کو لے کر گھر تو آئیں گے مگر آپ کے گھر والوں کا بھی ہمارے ہاں آنا بہت ضروری ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں یہ رشتہ ہونا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ تو ضرور آئیں گے اور میں ان کے بغیر اکیلے یہ رشتہ نہیں کرنا چاہوں گا۔ آخر میں بولا کہ میری رضامندی تو ابھی سے ہے۔ کچھ باتیں ڈین صاحب کے سامنے ہوں گی اور باقی معاملات آپ کے گھر والوں کے ساتھ طے ہوں گے۔

اٹھنے سے پہلے میں نے اس سے کہا کہ میری ایک گزارش ہے۔ فرح کو یہ خبر میں خود دینا چاہتا ہوں۔ فیصلہ تو آخری آپ نے کر لیا ہے تو یہ خوشی کی خبر میں ہی اسے دینا چاہتا ہوں۔ وہ سن کر خاموشی سے سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

اگلے دن کا سورج میرے لیے خوشیاں اور مسرتیں لے کر طلوع ہوا۔ آج مجھے فرح کو ایک سرپرائز دینا تھا۔ وہ خبر جس کی توقع وہ نہیں کر رہی ہوگی اسے میں ہی کچھ سنانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بھائی نے کل مجھے رسماً بلایا تھا ورنہ ڈین صاحب کی تائید و حمایت ہی کافی تھی۔ اب فرح کو صرف اوپر والا ہی میرا بننے سے روک سکتا تھا۔

اس دن میں خوب تیار ہوا۔ اس کے پسندیدہ کلر کی پینٹ اور ٹی شرٹ پہنی، بال سنوارے، اس کی دی ہوئی خوشبو اپنے پر چھڑکی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آج ضرور آئے گی۔ کل ایک پریشانی لے کر گھر گئی تھی اور آج میرے سامنے کئی گلے، کئی شکایتیں اس نے رکھی تھیں۔ آج بھی میں نے اسے سب محبتیں دینی تھیں جو پچھلے دس ماہ سے اپنے اندر جمع کرتا آ رہا تھا۔ خود کو خالی کر کے اپنی تمام خوشیاں اس کے

اردو کے تین مرکز ہیں۔ یوپی، حیدرآباد دکن اور لاہور لیکن اہلِ بینش بھی یہ بات گاہے گاہے بھول جاتے ہیں کہ یوپی میں یہ زبان خودرو ہے۔ حیدرآباد میں یہ زبان ایک والیٔ ملک کے سایہ عاطفت میں پل رہی ہے اور صرف پنجاب ہی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اس کی نشوونما محض جوشِ عشاق کی رہینِ منت ہے جس جگہ یہ زبان خود رو ہے وہاں خود بین بھی ہے۔ جہاں اتالیق شاہی سے تعلیم پا رہی ہے وہاں عوام سے کچھ کھنچ کے رہتی ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کی حالت ایک ہونہار تنومند نوجوان کی ہے جس کا خون گرم ہے اور جس کے اعضاء میں لچک ہے جو چھلانگیں مارتا جاتا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا ہر قدم پگڈنڈی پر پڑتا ہے یا نہیں۔ اسے سمت کا اتنا ہی شعور ہے جتنا کسی اور قدرتی نمو کو ہوتا ہے۔

☆☆☆

"رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انہوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب! ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کر پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی، اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا لیکن ایسے موقعوں پر دھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔"

(اقتباس: پطرس کے مضامین)

دامن میں بھر دیتی تھیں۔ تھوڑا ستاتا تھا کچھ تڑپاتا تھا اور پھر بہت سا اسے مناتا تھا۔

میں ٹھیک اس وقت پہنچا جب میرے اندازے کے مطابق وہ اس وقت آئی ہوئی ہوتی تھی۔ اپنے بندوں سے معلوم کیا تو بتایا گیا کہ وہ اور زاہدہ لیب میں بنے ایک کیبن میں صبح سے بیٹھے ہیں۔

لیب کا دروازہ کھول کر میں اندر گیا تو زاہدہ نے کیبن کے شیشے سے اٹھ کر مجھے دیکھا۔ میں ادھر ہی بڑھ گیا۔ فرح کل والی کیفیت میں ابھی تک تھی۔ پریشان اور روتی بسورتی صورت۔ اس کا یہ چہرہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور سوچا کہ اس وقت ستانے سے بہتر ہے کہ صاف لفظوں میں خوش خبری سنا دوں پھر سوچا کہ کوئی چھوٹا سا ڈراما پیدا کر کے یہ لمحہ میں اس کی زندگی کا لازوال لمحہ بھی تو بنا سکتا ہوں۔ اس کو یہ خوش خبری سنا کر میں اس سے انعام مانگوں گا۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں پر رکھنے کا انعام۔

میں زاہدہ کے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا۔

میں نے زاہدہ سے مدھم اور شکستہ لہجے میں کہا۔ ''تم اگر باہر چلی جاؤ تو میں اس سے ایک ضروری بات کرلوں گا۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''کیا بات کرنی ہے؟''

میں اسی لہجے میں بولا۔ ''ایسی بات کرنی ہے کہ اس کے بعد میں ہی اسے سنبھال سکتا ہوں۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ میں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری رکھی۔ زاہدہ اٹھ کر چلی گئی۔ جاتے جاتے بولی۔ ''کوئی ایسی بات نہیں کرنا اسے ورنہ یہ مکمل ٹوٹ جائے گی۔''

میں ٹیبل پر رکھے گلاس ویٹ سے کھیلنے لگا اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

وہ اب سہمی ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی انا کو نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ ایسی کوئی صورت حال اگر درپیش آ ہی گئی تو اس کا غرور اسے لوٹا دوں گا کہ وہ تمام عمر سر اٹھا کر جیے گی۔

اس نے سبز رنگ کا سوٹ اور اسی رنگ کا دوپٹا سر پر ڈال رکھا تھا۔ میں اس کا خوب صورت چہرہ دیکھ رہا تھا جو ایسے دکھ رہا تھا کہ سبز کلیوں میں کھلا گلاب کا سفید پھول، گوری رنگت پر کئی رنگ آتے جاتے تھے۔ میں اب اس سے نظریں چرائے میز پر نظریں رکھے بیٹھا تھا۔

اور پھر میں گہرا سانس لے کر رک رک کے بولنے لگا۔ ''اپنی زندگیوں میں بہت سے لوگ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں خوش نصیب ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں اور باقی اپنی حسرتیں دلوں میں دبا کر سسکتے رہتے ہیں۔ وہ بدقسمت صبر کی سل اپنے سینے پر رکھ کر زندگی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ جو اپنا ماضی جلد بھلا دیتے ہیں۔ وہ پھر بھی بہت سی خوشیوں سے مستفید ہوتے ہیں اور جو نہیں بھلا پاتے معصوم سی آن ان کے ساتھ......''

میں نے یہیں اپنی بات کاٹ دی۔ وہ اپنی آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے مجھے حیرت اور بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ میں نے پھر اس کی جانب تائید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ ضروری ہے کہ سب لوگ خوش قسمت ہوں؟'' اپنی بات آگے بڑھائی اور بولا۔ ''ہم تقدیر کے تابع ہیں۔ اس سے لڑ نہیں سکتے۔ نہ تم اور نہ میں۔''

میرے انہی الفاظ کے ساتھ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں اس کی یہ حالت بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سر پیچھے کی جانب جھکا کر اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ اسی حالت میں بولا۔ ''میں زیادہ تمہید نہیں باندھوں گا یہ بتانے کے لیے آج آیا ہوں کہ میں جلد شادی کرنے والا ہوں۔ کل گھر میری فون پر بات ہوئی تھی۔ اس لڑکی کا تذکرہ چلا جو میری دلہن بننے والی ہے۔ میرے ساتھ وہ بھی بہت خوش ہیں۔ وہ مجھے مبارک باد دیتے تھے اور میں انہیں۔ گھر والے بھی اگر راضی ہوں تو خوشی دوبالا ہو جاتی ہے اور امید ہے تم بھی میری خوشی میں خوش ہوگی۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر الفاظ اس کے گلے میں پھنس گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی برس پڑی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں اور رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ پہلے معلوم تھا اور اب یقین تھا کہ وہ میرے لیے اپنے اندر کتنا پیار رکھتی ہے۔ اسے سہارا دینے کے لیے میز پر رکھے اس کے دونوں ہاتھ میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے اور وہ کپکپا رہی تھی۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے اس میں رتی برابر بھی جان نہ ہو۔ میں نے اس سے کہا۔ ''فرح! تم ٹھیک تو ہو ناں؟''

ہڑبڑا کر بولی۔ ''کیا؟ ہاں ہاں......تم کیا کہہ رہے تھے......ہاں کہ تمہاری شادی؟'' اس کے الفاظ ٹوٹ گئے تھے۔

میں بولا۔ ''ہاں میری شادی!'' میں نے اس کے

ہاتھ نہیں چھوڑے تھے۔

ہچکی لے کر تڑپ کر بولی۔ ''مجھے یہ بتانے آئے ہو کہ تم شادی کر رہے ہو؟ تم نے اپنی شادی کا سوچ بھی کیسے لیا؟''

''میں شادی کا کیوں نہیں سوچ سکتا؟ یہ میرا شرعی حق ہے۔''

''شرعی حق کا تو معلوم ہے مگر یہ نہیں سوچا کہ میں تو مر جاؤں گی۔ جیوں گی کیسے؟''

''تم ہی نے تو کہا تھا کہ محبت کی طرح نفرت پر بھی اپنا بس نہیں چلتا اور یہ کہ تم مجھ سے بے انتہا نفرت بھی کرتی ہو۔''

وہ چیخ کر بولی۔ ''میں نے صدمے کی حالت میں کہا اور تم نے مان بھی لیا۔ میں لائبریری میں وہ ساری باتیں سن کر یہ نہ کہتی تو کیا کہتی؟ اپنی تذلیل ہونے پر بھی کیا تم یہ توقع کر رہے تھے کہ کہتی نہیں مجھے تم سے محبت ہے۔''

پھر اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں سے چھڑوا کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ میں اس کے دونوں ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں دیکھ رہا تھا جو میرے ہاتھوں کو کس کر تھامے ہوئے تھیں۔ وہ رو رہی تھی اور روتے روتے بولی۔ ''ایسا مت کرو، تمہیں میری قسم یہ مت کرو۔ تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے کتنی زیادہ محبت کرتی ہوں اور......اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے بے انتہا پیار کرتے ہو۔ میں بتا رہی ہوں تم بھی نہیں رہ سکو گے میرے بغیر، مجھ پر رحم نہیں آتا تو اپنے پر تو یہ ظلم نہ کرو۔''

میں مصنوعی حیرت سے بولا۔ ''اپنے پر ظلم؟''

''ہاں اپنے پر ظلم میں زندہ نہ رہی تو کیا تم جی سکو گے؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو بولی۔ ''دیکھا؟ تم میرے بغیر کیسے زندہ رہ سکتے ہو۔ تم بھی تو مجھ سے پیار کرتے ہو۔ اگر نہیں کرتے تو مجھے معلوم ہو جاتا۔ تم پچھلے کئی ماہ سے میرا کتنا زیادہ خیال کرتے چلے آ رہے ہو۔ میں تو سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی رہی تھی۔ مجھے اپنی نظروں سے دور بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ میرے کھانے کا بھی خیال کرتے تھے۔ ایک بار میرے کھانسنے کی آواز سنی تو اسی وقت لیب بوائے کے ہاتھوں سیرپ بھیج دیا۔ دن میں دو دو بار تو چائے بھیج دیتے تھے۔ تمہاری وجہ سے کوئی بھی لڑکا میرے ساتھ بات تک نہیں کر سکتا تھا۔ میری اتنی حفاظت کہ میں تمہارے ہوتے ہوئے بے خوف ہو جایا کرتی تھی اور اب مجھے اکیلے اس دنیا کے حوالے کر کے جا رہے ہو؟ میں تو تمہاری سب دی ہوئی محبتیں سمیٹ رہی تھی کہ ایک دن تمہیں ان سے زیادہ لوٹا دوں گی اور آج اچانک مجھ سے کہا کہ میرے تمہارے راستے الگ ہیں۔''

وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑے روتی جاتی تھی۔

میں بولا۔ ''اب کیا ہو سکتا ہے میں بہن بھائیوں کو اب منع بھی تو نہیں کرسکتا۔ لگتا ہے اب دیر ہوگئی ہے۔''

اس نے میرے ہاتھ چھوڑے اور بپھر کر کھڑی ہوگئی۔ غصے میں بولی۔ ''کیا میری خاطر تم ان لوگوں کو انکار بھی نہیں کر سکتے؟''

''زبان بدلنا بھی تو اچھی بات نہیں ہے۔''

اس نے پھر میز پر سے پیپر ویٹ اٹھا لیا۔ ''تمہارا سر پھاڑ دوں گی اور خود تیزاب پی کر جان دے دوں گی۔'' وہ اب پیار سے نہیں غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم سے شادی کروں تو سر نہیں پھاڑو گی؟''

حیرت سے بولی۔ ''کیا مطلب؟''

میں کرسی پر سے اٹھا اور میز کے گرد گھوم کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ حیرت و استعجاب سے پیپر ویٹ ہاتھ میں تھامے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ بھاری پتھر لیا اور میز پر رکھ دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک بار اس لڑکی کا نام تو پوچھ لیتیں۔''

وہ خاموش کھڑی مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہوئی اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ وہ خاموش رہی۔ میں بولا۔ ''اس کا نام میں بتا دیتا ہوں۔ میری دلہن کا نام فرح ہے۔''

''فرح؟'' اس کی آنکھوں میں اب الجھن تھی۔

''ہاں فرح اور وہ تم ہو میری اپنی فرح۔'' میں پیار میں ڈوب کر بولا۔ ''مجھے معاف کردو۔ تم کو میں نے ستایا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کا خیال میرے قریب بھٹکے۔ میں مر نہ جاؤں۔ جب یہ کہوں کہ میں تمہیں یا تم مجھے چھوڑ رہی ہو۔ میں نے تمہاری بات کا تب بھی یقین نہیں کیا تھا جب تم نے غصے میں مجھے چھوڑا تھا۔ فرح! مجھے بتاؤ تم نے کیسے میری ان باتوں کا یقین کرلیا؟''

اس کی آنکھوں میں محبت کے ساتھ عقیدت بھی تھی۔

وہ کہنے لگی۔ ''میری محبت تم سے بہت کم ہوگی اسی لیے تمہارے مذاق کو میں نے سچ سمجھا اور تم نے میرے سچ کو بھی نہ مانا۔'' وہ رونے لگی۔ ''تم سراپا محبت ہو۔ باہر سے پتھر

نظر آنے والے کا دل اندر سے اتنا نرم بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہیں سخت الفاظ سنائے تھے۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ تم مجھے کہیں چھوڑ نہ دو مگر تم نے تو دور رہ کر بھی مجھے اپنے زیادہ قریب کرلیا تھا۔"

میں نے اس کے کان میں ہولے سے کہا۔ ''فرح! مجھ سے شادی کروگی؟''

ایک سرخی اس کے چہرے پر چھا گئی بولی۔ ''میرے بھائی سے کسی طرح بات کرو ناں۔''

''وہ تو کر چکا ہوں۔''

یہ سن کر جھٹکے سے علیحدہ ہوئی اور بولی۔

''کیا کہا تم نے؟''

''یہی کہ کل اس سے مل چکا ہوں اور بھائی صاحب تیار بیٹھے ہیں کہ اپنی دلہن کو جلد سے جلد لے جاؤ۔''

اسے یقین نہیں آرہا تھا مگر جب ڈین صاحب سے لے کر کل کی اس کے بھائی سے ملاقات کے بارے میں بتایا تو خوشی کے مارے میرے بال پکڑ لیے۔ بولی۔ ''کل سے مجھے سولی پر لٹکا رکھا ہے اور خود ساری باتیں پکی کرتے پھرتے ہیں۔ میں بھی کہوں کہ کل بھیا شام کو گھر آئے تو مجھے کیوں مسکرا مسکرا کر دیکھے جارہے تھے۔'' پھر بولی۔ ''مجھے دس ماہ تک منایا کیوں نہیں؟''

میں بولا۔ ''منا لیتا تو نہ مجھے میرا تھیسس مکمل کرنے دیتی اور نہ خود اپنا کام مکمل کرتی۔'' پھر اسے ساری تفصیل بتائی تو مسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اتنا پیار کرنا تم نے کہاں سے سیکھا ہے؟ اتنا خیال اتنا دھیان اتنی چاہت؟ تم کیا واقعی زمین پر بستے ہو یا کہیں اور سے آئے ہو۔''

''ابھی بہت سا پیار بچا کر رکھا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی دے دوں گا۔''

وہ میرے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا دل کتنا بڑا ہے۔ سارے غم والم، دکھ درد اس میں ڈوب جاتے ہیں اور تمہارا پیار کرنے کا انداز بھی عجیب ہے۔ تمہاری بے اعتنائی میں بھی محبت پوشیدہ ہوتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''شادی تو میں نے تین چار ماہ ہی میں کرنی ہے۔ بتاؤ کی نہیں۔ شادی پر کون سا لباس پہنو گی؟''

اب اس کی آنکھوں میں کچھ حجاب بھی تھا اور کچھ بے باکی بھی۔ محبت سے تکتی ہوئیں اور تک کر جھکتی ہوئیں۔

پھر ہماری شادی طے پا گئی۔ پورے کیمپس میں یہ خبر پھیل گئی۔ پھر میرے کمرے میں مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ میری ٹیوشن والے بچوں کی ماں نے فرح کے لیے تحائف کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

فیکلٹی نے ہماری کلاس کے لیے الوداعی پارٹی کا انتظام کیا۔ فیکلٹی کی تمام لڑکیوں نے بھڑکیلے اور شوخ و چنچل لباس پہنے تھے۔ فرح نے میری پسند کا لباس پہن رکھا تھا۔ نہ زیادہ سادہ اور نہ ہی نظروں کو چبھتا ہوا مگر پروقار جو اس پر خوب بج رہا تھا۔ اس کا چہرہ گلنار تھا۔ اس کی ضد پر میں نے سوٹ پہنا۔ فیکلٹی آیا تو وہ مجھے لائبریری میں الماری کے پیچھے لے گئی بولی۔ ''بال آپ ہمیشہ ٹھیک نہیں بناتے۔'' اپنے پرس سے ہیئر برش نکالا اور میرے بال اپنی پسند کے مطابق بنائے۔ مجھے غصہ بھی آرہا تھا مگر اس نے میری پروا تک نہ کی۔ بار بار میرا جائزہ لیا اور پھر جانے دیا۔ باہر جانے سے پہلے میں بولا۔ ''اتنی زیادہ محبت مجھے دے رہی ہو۔ مجھ سے تو نہیں سنبھالی جارہی۔ تھوڑی سی واپس لے لو۔''

پارٹی ختم ہوئی تو ہم دونوں پیار کے درخت تلے کرسیوں پر آبیٹھے۔ اس سے کہا۔ ''دو سال گزرے اور پتا بھی نہیں چلا۔ ایک سال تم سے بھاگتے ہوئے اور ایک سال تمہارے پیچھے بھاگتے ہوئے گزر گئے۔''

شام آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔ شفق کی گلابی روشنی سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پھسل رہی تھیں۔ ہم پھولوں میں گھرے بیٹھے تھے اور ہوا کے خنک جھونکے ہم سے لپٹ رہے تھے۔ میں اس درخت کو دیکھ رہا تھا جو آج بہت حسین اور دلفریب لگ رہا تھا۔ مجھ کو یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ زیادہ حسین کون ہے۔ افق پر چھائے گلابی، سرخ اور نارنجی رنگ یا اس درخت کا سیاہ ہیولیٰ۔

پھر ہماری شادی ہوگئی۔ دلہن بن کر وہ میرے گھر کسی پری کی طرح اتری پھر ہم ملک سے باہر چلے گئے۔ ہر دوسرے سال پاکستان آتے تھے۔ ہمارے بچے ہوگئے۔ بچے جب بھی اس سے پوچھتے ہیں کہ یونیورسٹی میں پاپا کی کون سی چیزیں آپ کو پسند تھیں تو وہ ان کو اپنے سے لپٹا کر مسکرا کے میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولتی۔ ''ایک ان کی ڈانٹ اور دوسرا ان کے حوالے سے پیار کا درخت۔''

▼▼▼

قاتل لکیر

محترم معراج رسول
السلام علیکم
یہ دنیا ایک ایسا اسٹیج ہے جس پر ہر کردار اپنے اپنے انداز میں اداکاری کررہا ہے۔ زیر نظر روداد ایک ایسے ہی کردار کی زندگی کا احاطہ کررہی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔

یاسین صدیق
(بورے والا، وہاڑی)

''کیا لکھا ہے میری قسمت میں۔'' میں نے استفسار کیا۔

''آپ کی ہتھیلی میں گہرائی ہے، جو بدقسمت ہونے کی علامت ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکی میرے چہرے پر پھیلتے غم کے سائے دیکھے اور بولی۔ ''ماجد! میرا مطلب ہے جن افراد کی ہتھیلی گہری ہوتی ہے زندگی بھر وہ مشکلات کا شکار رہتے ہیں۔ انہیں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

میں نے سب سے اہم سوال پوچھا۔ ''کیا مزید تعلیم

میری قسمت میں ہے؟"

اس نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھا اور بولی "علم تو آپ کی قسمت میں ہے۔" ایک لمحے رکی، مجھے دیکھا اور دوبارہ گویا ہوئی۔ "میں نے علم کہا ہے ڈگری نہیں۔"

میں نے پہلو بدلا، اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجالی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ بجتی بہت تھی لیکن اس لمحے اس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگی۔

اس نے اسی زہریلی مسکراہٹ سے کہا "تمہارے ہاتھ میں محبت کی لکیر بڑی اسٹرونگ ہے، تمہیں محبتیں بہت ملیں گی۔"

اب کی بار میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ وہ ایک طرف بدقسمت کہہ رہی تھی اور دوسری طرف کہہ رہی تھی مجھے محبتیں ملیں گی۔ اس نے میری طنزیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا۔ اپنی بات جاری رکھی۔ "لیکن محبت پا نہیں سکو گے، اس میں دکھ ہی ملیں گے۔"

میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا۔ اور پژمردگی سے کہا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی، آپ کو ہاتھ دکھایا۔ ایک اچھی بات کے ساتھ ایک بری بات بتا رہی ہو۔"

وہ اٹھی اور یہ کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ "مجھے بھی تم یاد رکھو گے اور میری ان باتوں کو بھی۔"

میں نے بلند آواز سے کہا۔ "دست شناسی کی دکان کھول لو۔ اچھی کمائی ہو جائے گی۔"

وہ دروازے پر رک کر، صرف گردن گھما کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ان میں سے کوئی بات بھی غلط ہو تو جرمانہ دینے کو تیار ہوں۔ یہ ایک دو دن کی سرسری پڑھائی نہیں، زمانہ گزار دیا ہے۔ اس فن پر پڑھتے ہوئے۔ ابھی بھی میرے کمرے کے بک شیلف پر دیکھ لو۔ انگلش اور اردو میں پندرہ بیس کتابیں دست شناسی کی مل جائیں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ چائے بنا لائی اس کے چہرے پر وہی سکھ بھری مسکراہٹ تھی۔ جو میرا دل جلاتی تھی۔

چائے پیتے ہوئے اس نے کہا "آج کے بعد میں تم سے دست شناسی پر کوئی بات نہیں کروں گی۔ آج سن لو جو میں نے دیکھا ہے ہاتھ پر۔"

میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "تم باہمت ہو، ناکام نہیں رہو گے، بہت نشیب و فراز آئیں گے زندگی میں، دو شادیاں ہوں گی، ڈھیروں عشق اور درجنوں کام کرو گے اور سب سے خاص بات تمہارے ہاتھ میں قتل کی لکیر ہے۔ تم سے ایک قتل بھی ہوگا۔"

اس کی یہ بات سن کر میں اندر سے کانپ گیا لیکن اسے مسکرا کر دیکھتا رہا پھر ہمارے درمیان طویل خاموشی کا وقفہ آگیا۔

وہ خالد کی بیوی تھی۔ خالد کے والدین گاؤں میں ہمارے پڑوسی تھے۔ اس کی شادی کشور سے شہر میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد وہ سسرال والوں کی شرط پر شہر میں ہی شفٹ ہوگیا تھا اس لیے بھی کہ اس کے سسرال والوں نے کاروبار کے لیے اسے ایک لاکھ روپے دیئے تھے جس سے اس نے جنرل اسٹور کھول لیا تھا۔ پہلے تو خالد کی والدہ نے خالد کے شہر شفٹ ہونے کی مخالفت کی پھر بیٹے کے بہتر مستقبل کے لیے صبر کر لیا تھا۔ اب وہ اکثر کہا کرتی تھیں۔ "بیٹے شادی کے بعد کون سا ساتھ رہتے ہیں، لڑ جھگڑ کر الگ ہو جاتے ہیں، ہم نے تو خود ہی اپنے بیٹے کو الگ کر دیا ہے۔"

ایسا کہہ کر اصل میں وہ اپنے دل کو تسلی دیتی تھیں۔ خالد کی بیوی کشور غضب کی حسین تھی اسے ایک بار پہلے میں نے تب دیکھا تھا جب وہ دلہن بنی بیٹھی تھی پھر اب دیکھ رہا تھا۔

میں نے میٹرک کا امتحان دیا، غریب گھرانے سے تعلق تھا۔ اس سے زیادہ پڑھنے کی استطاعت نہیں تھی پھر بھی میں مزید پڑھنا چاہتا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد ایک راہ سمجھائی دی کہ چند ماہ کہیں کام کرلوں۔ کچھ پیسے جمع کرلوں گا تو فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لوں گا۔ انہی دنوں خالد گاؤں آیا ہوا تھا۔ اس سے بات ہوئی تو اس نے اپنا ایڈریس دیا اور کہا۔ "میرے جنرل اسٹور پر کام کر لینا۔ رہنے کے لیے میرا گھر ہے۔ کھانا بھی مل جائے گا۔ تین چار ماہ میں دس پندرہ ہزار جمع ہو جائیں گے۔"

ان دنوں دس پندرہ ہزار کی بڑی ویلیو تھی۔

میں نے چند دن بعد تیاری کی اور فیصل آباد روانہ ہو گیا۔

خالد کا جنرل اسٹور تلاش کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مین بازار میں اسٹور تھا۔ خالد بڑے تپاک سے ملا۔ کام سمجھایا کہ کیسے کرنا ہے۔ مختلف اشیاء کے نرخ بتاتا رہا جنہیں میں ذہن نشین کرتا رہا۔ دوپہر کے وقت وہ مجھے بائیک پر گھر چھوڑ گیا۔ دوسرے دن سے میری ڈیوٹی شروع ہونا تھی۔ اس دن میں نے پہلی مرتبہ جیسے دیکھنا کہتے

ہیں کشور کو دیکھا۔ سانولا رنگ، بھرا بھرا جسم، لمبی سنہری زلفیں لمبا قد، بڑی بڑی آنکھیں، جس میں شوخی ناچتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میرا تعارف کروانے کے بعد خالد دکان کے لیے نکلنے لگا۔ دروازے سے باہر نکلتے نکلتے اس نے کشور کو میری رہائش کے لیے بیٹھک مخصوص کرنے کا کہا۔ پھر مجھ سے بولا۔

"ماجد اپنی بھابی سے مل کر اپنے کمرے کی سیٹنگ کر لینا۔"

یہ کرایہ کا مکان تھا۔ اس میں تین کمرے ایک ساتھ بنے تھے۔ پہلے بیٹھک اس کے ساتھ ہی دوسرا کمرا پھر تیسرا کمرا۔

دوسری طرف بیٹھک کے ساتھ دروازہ اس کے ساتھ غسل خانہ۔ درمیان میں صحن۔ آخر میں باورچی خانہ۔

باقی وقت میں نے بیٹھک کو سیٹ کرنے میں گزارا۔ وی سی آر میرے کمرے میں رکھ دیا گیا۔ (ان دنوں وی سی آر کا زمانہ تھا۔ سی ڈی یا کمپیوٹر عام نہیں ہوئے تھے یہ 1985ء کی بات ہے)۔ ایک چارپائی، چار کرسیاں ایک میز بس یہ کل کائنات تھی جو میرے تصرف میں تھی۔ ساتھ والا کمرا خالد و کشور کا بیڈ روم تھا اور آخری کمرے میں جہیز اور دیگر سامان تھا۔ بیٹھک کے دو دروازے تھے ایک صحن میں کھلتا تھا دوسرا باہر گلی میں۔ نہا دھو کر شام کو کشور نے کھانا تیار کیا اور میرے پاس ہی آبیٹھی۔ وہ بھی عام عورتوں کی طرح باتونی تھی۔ ویسے اس دن مجھے پہلے تو... احساس ہوا بے چاری سارا دن بور ہوتی ہوگی۔ اگر شام کو رات گئے تک باتیں کرتی ہے تو کیا ہوا۔ اس نے میرا انٹرویو شروع کر دیا۔ مجھے پتا چلا کہ کشور نے بی اے کیا تھا۔ اور وہ مطالعہ کی بہت شوقین تھی۔ ہر قسم کی کتابوں کے گھر میں ڈھیر تھے۔ اس نے خود بتایا وہ جب بھی بازار جاتی ہے کتابیں ضرور خرید کر لاتی ہے۔

میں نے اپنے پڑھنے کے شوق اور گھر کے حالات بتائے تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک وہ میرے دونوں ہاتھوں کی لکیروں میں کھوئی رہی۔ پھر ہاتھ کی پشت پر کچھ تلاش کرتی رہی۔ پھر گہری سانس لے کر رہ گئی۔ میں بے چین ہوگیا۔ اس کے بعد میرے پوچھنے پر اس نے جو بتایا اس نے میری بے چینی میں اضافہ کر دیا۔

رات آٹھ بجے خالد آگیا تو گھر میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ دس بجے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئے۔ میں چارپائی پر لیٹا تو کشور کی باتیں یاد آنے لگیں۔ میں نے خود کو تسلی دی۔

"آئی بڑی پامسٹر، مقدر، قسمت لکیروں کی محتاج نہیں ہوتی۔ میں کسی کو کیوں قتل کروں گا۔ بڑی دیر تک میں اس پریشانی میں رہا۔ خود کو سمجھایا۔ یہ تو ہاتھ جس شیپ میں ہم بند کرتے ہیں اس کے نشان پڑ جاتے ہیں، میں اپنی قسمت خود بناؤں گا۔"

بڑی دیر تک میں اپنے ہاتھ میں قاتل لکیر کو ڈھونڈتا رہا مگر ناکام ہی رہا۔

لیکن اس کی دوسری بات سوچی تو چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ڈھیروں عشق کرو گے۔ میری نظروں کے سامنے کشور کا مسکراتا چہرہ آگیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جمائی اور کہا۔ "پہلا عشق تم سے ہی سہی۔" ایسے خیالات میں جانے کب نیند آگئی۔

جب آنکھ کھلی۔ ایک پہلا جملہ ہوا کے دوش پر مجھ تک پہنچا۔ "میں تھک گئی ہوں۔"

اسی وقت چوڑیوں کی چھنک، مدھم قہقہوں کی کھنک، سن کر میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میری بے قراری و بے چینی عروج پر تھی۔ انجانا سا خوف و اضطراب تھا۔ ان آوازوں کا منبع دوسرا کمرا تھا۔ دوسرے کمرے میں خالد اور کشور تھے۔

سرگوشیوں کو سن کر مجھے ندامت نے گھیر لیا کہ مجھے ان سرگوشیوں کو کان لگا کر سننا نہیں چاہیے۔

میں خود کو کوسنے لگا۔

آج سے تین ہزار سال قبل ارسطو سے بھی پہلے ایک دانشور گزرا ہے اس نے کہا تھا۔ "اکثر آدمی برے ہوتے ہیں۔"

اس کی اس بات کو اس وقت کے "اچھے" لوگوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ اسے برا بھلا کہا تھا۔ میں بھی شریف اور اچھا ہوں۔ مجھے کوئی برا کہے یہ مجھے پسند نہیں۔ اگر میں کوئی کہانی لکھتا تو اس میں اس واقعہ کو تبدیل کر دیتا لیکن یہ تو سچ بیانی ہے۔ حقیقت ہے۔ جیسے جیسے جو جو جب جب ہوا میں نے بیان کر دیا ہے۔ کوئی اچھا کہے یا برا۔ ہمارے ہاں عام طور پر ہیرو اور ہیروئن کو کسی اور دنیا کی مخلوق بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت سے بہت دور لکھا جاتا ہے۔ یعنی جھوٹ لکھا جاتا ہے۔ جھوٹ پڑھا جاتا ہے۔ جھوٹ کو پسند کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے۔ اپنے اردگرد

دیکھنا چاہیے۔ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رات نے مجھے ایک دم بالغ کر دیا۔

☆......☆

دوسرے دن صبح کے وقت وہ چہکتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ میں جاگتا ہوا سوتا بن گیا۔ اس نے دو تین بار کہا۔ ''اٹھ جاؤ۔ ماجد!''

میں اٹھ بیٹھا۔ لیکن ندامت سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔

''جلدی تیاری کر لو آج آپ نے کام پر جانا ہے۔ شاباش اٹھو۔'' اس کی آواز میں خوشی تھی، شوخی تھی، اپنا پن تھا۔

میں سر جھکائے، گھبرایا گھبرایا سا اٹھا، اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

ناشتا کرتے ہوئے بھی میں گھبرایا سا بلکہ شرم سار سا رہا۔ جسے خالہ کچھ اور سمجھتا رہا۔

''اسے اپنا ہی گھر سمجھو، تم ہمارے پڑوسی ہو، رشتے دار ہو، پڑوسیوں اور رشتے داروں کے اتنے حقوق ہوتے ہیں وہ اس موضوع پر حدیث و قرآن کی آیات کے مفہوم سناتا رہا۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا مزید شرم سار ہوتا رہا۔

دوسری طرف کشور کے چہرے پر کچھ اور تھا۔ اصل میں اس کی نسوانی حس نے بتا دیا تھا کہ بات کچھ اور ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔ ایک رات میں مجھ میں اتنی تبدیلی آ چکی تھی۔ کل تک ہنس ہنس کے باتیں کرنے والا آج آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ میں اور خالد کام پر چلے گئے۔ میں نے دل لگا کر کام کرنے کی کوشش کی۔ شام ہوئی ہم گھر آ گئے۔

کھانا کھایا اور وی سی آر پر ایک انڈین مووی دیکھی غالباً اس کا نام ''پریوار'' تھا۔ اس کے بعد اپنے اپنے کمرے میں سونے آ گئے۔ میں رات کا جاگا ہوا تھا۔ صبح ہی آنکھ کھلی۔ میں نے خود کو فریش محسوس کیا۔ آج بھی کشور نے ہی جگایا لیکن آج میں اتنا چپ چاپ نہ تھا۔ دوسرے دن شام سات بجے خالد کا ایک دوست آ گیا۔ وہ اس کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنانے لگا پھر مجھ سے بولا کہ تم دکان بند کر کے گھر چلے جانا۔ میں رات دس گیارہ بجے تک آ جاؤں گا۔ جاگتے رہنا، ایسا نہ ہو کہ مجھے رات باہر ہی گزارنا پڑے۔''

میں نے دکان بند کی اور آٹھ بجے گھر آ گیا۔ راستے میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ دروازہ کشور نے کھولا، خالد کا پوچھا، میں نے بتایا کہ وہ لیٹ آئیں گے۔ وہ کچھ بجھ سی گئی۔ کھانا کھانے کے بعد میں بیٹھک میں آ گیا تو تھوڑی دیر بعد وہ بھی وہاں آ گئی۔ ہم باتیں کرتے رہے، گاؤں کی، شہر کی، رشتے داروں کی، کہانیوں کی، فلموں کی کتابوں کی، باتوں ہی باتوں میں بات یہاں تک آ پہنچی اس نے مجھ سے بلا جھجک پوچھ لیا۔ ''کسی لڑکی سے عشق وشق کیا یا نہیں۔'' اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''نہیں ابھی تک تو ایسا موقع نہیں ملا۔''

وہ ہنس دی ''یعنی ابھی موقع کی تلاش میں ہو۔''

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''شریف وہی ہوتے ہیں جن کو موقع نہیں ملتا۔''

کہنے لگی۔ ''ایک بات سچ سچ بتاؤ گے۔''

میرا دل ڈول گیا۔ ''ہاں پوچھیں؟''

''پرسوں صبح جب میں نے تمہیں جگایا تو تم پہلے سے جاگ رہے تھے ناں، دیکھو سچ بتانا۔''

میں نے اس کی سوالیہ آنکھوں میں دیکھا اور جواب دیا ''جی بالکل۔''

''اس رات تم سوئے نہیں تھے۔'' اس نے میرے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''ہاں اس رات مجھے نیند نہیں آئی تھی۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ ہم کافی دیر تک خاموش رہے۔ اس دوران وہ پاؤں کے انگوٹھے سے خوامخواہ زمین پر دائرے بناتی رہی اور میں اس کے چہرے پر تذبذب کے رنگ دیکھتا رہا۔ کافی دیر بعد کہنے لگی۔ ''ایک بات کہوں مجھے ایک شک ہے سچ بتانا۔'' اس کے لہجے میں ندامت بھی تھی اور کچھ شرمندگی بھی۔

میں خاموش رہا۔ وہ خود ہی بولی۔ ''سچ بتاؤ گے نا۔''

''بتانے والا ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سچ بتانا میرا وعدہ ہے۔ کچھ نہیں کہوں گی۔'' اس نے مجھے حوصلہ دیا۔

''آپ کو کیا شک ہے۔''

''اس رات تم واش روم گئے تھے۔ ہمارے دروازے تک آئے تھے۔''

''آپ کا شک درست ہے'' میرا جواب سن کر وہ

چونک پڑی۔

''ایسا ہی ہے جیسا میں سوچ رہی ہوں۔'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

''مجھے نہیں علم آپ کیا سوچ رہی ہیں۔'' میں نے ذو معنی جواب دیا۔

''ابھی تم نے کہا۔ آپ کا شک درست ہے۔''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ''ہاں آپ نے کہا تھا سچ بتانا میں نے بتا دیا۔'' وہ مرجھا سی گئی۔

''مجھے کیا شک ہے؟'' میں نے سوچا یہ مجھ سے سننا چاہتی ہے اور میں اسے نہیں بتاؤں گا۔ میں نے بات پلٹی۔

''اب مجھے کیا علم کہ آپ کیا سوچ رہی ہو۔''

''دیکھو ماجد تم نے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے۔''

اس کے انداز میں لگاوٹ تھی یا مجھے محسوس ہوئی۔ میں نے اس کے انداز کی کاپی کی۔ ''دیکھو کشور میں سچ بول رہا ہوں۔''

وہ مجھے گھور کر رہ گئی۔

ایک خاموشی کا طویل وقفہ آیا۔ اس دوران وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تولتی رہی۔

''اچھا جو ہوا اسے بھول جاؤ اور کسی کو بتانا نہیں کچھ بھی۔'' اس نے خاموشی توڑی۔

میں نے کہا۔ ''اچھا۔''

اس کے بعد باتوں کا رخ بدل گیا۔ میں نے بتایا کہ کام پر میرا دل لگ گیا ہے۔ میں یہاں چار ماہ آپ کا مہمان ہوں۔ مجھے دس ہزار جمع کرنا ہیں۔ اس کے بعد چلا جاؤں گا۔ آپ اور خالد مجھے بہت یاد آئیں گے۔ آپ کی یہ محبت میں بھول نہیں پاؤں گا۔

''تم چند دنوں میں بھی دس ہزار جمع کر سکتے ہو۔''

نہیں میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔''

وہ بولی۔ ''ایک طریقہ ہے لیکن ابھی نہیں بتاؤں گی۔ اس کے لیے تمہیں اپنا اعتبار قائم کرنا ہوگا۔ جب تم پر میرا اعتبار قائم ہو جائے گا تو ایک راستہ بتاؤں گی اس پر چل کر تم بہت جلد اس سے زیادہ بلکہ بہت زیادہ کما سکو گے لیکن یہ سوچ لو۔ یہ حرام کمائی ہوگی۔''

میں نے چند دنوں میں دس ہزار کے الفاظ سنے تھے تو دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں تھیں۔

''خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔''

''اس میں کوئی بھی خطرہ نہیں ہے۔ ایک وعدہ کرنا ہوگا اور اسے زندگی بھر نبھانا ہوگا۔''

یہ کون سا مشکل کام تھا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور کہا۔ ''اب مجھے نہیں معلوم کہ کیسے تم کو مجھ پر اعتبار آئے گا۔''

''سچ بول کر، مجھے اپنی دوست سمجھو۔''

پھر میں نے سب سچ سچ بتا دیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔ ''گاؤں جا کر کسی بھی دوست کو یہ سب نہیں بتاؤ گے وعدہ کرو۔''

میں نے وعدہ کر لیا۔ وہ اٹھی اور بولی۔ ''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' دروازے پر پہنچی اور رک کر بولی۔ ''تمہاری کمائی حرام کی ہوگی۔ اگر قبول ہو تو بتا دینا۔ اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ بلکہ ایسا کام ہے جسے لوگ اپنے پاس سے پیسے دے کر کیا کرتے تھے اور تم کو اس کے پیسے ملیں گے۔ شرط صرف ایک ہے کہ وعدہ نبھانا ہے۔ وہ بھی زندگی بھر۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ لیکن میں الجھ گیا۔ ایسا کون سا کام وہ مجھ سے لینا چاہتی ہے جس میں کمائی ہوگی اور وہ بھی چند دنوں میں دس ہزار سے بھی زائد۔ وہ حرام کی کمائی ہوگی۔ میں سوچتا رہا کہ ایک کام سوچے، سب سے پہلے چوری کا خیال آیا، اسے میں نے مسترد کر دیا کیونکہ اس میں خطرہ تو تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جتنے بھی برے ہوں اندر بہت اندر کہیں گہرائی میں خوف خدا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا مجھے کسی بھی حرام کی کمائی کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ آخر موت آئے گی حساب کتاب دینا ہے۔ جو بھی ہے میں انکار کر دوں گا۔

اس طرح وقت گزرتا چلا گیا۔ میرے اندر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ضمیر اور نفس کی جنگ۔ اچھے خیالات اور برے خیالات کی جنگ۔ اس جنگ میں کبھی شیطانی خیالات اور کبھی انسانی خیالات کا پلا بھاری ہو جاتا۔

چائے اس نے میرے پاس بیٹھ کر پی۔ پھر یہ کہہ کر وہ سونے چلی گئی۔ ''جب تمہارے بھائی آئیں تو دروازہ کھول دینا۔''

میں لیٹ گیا۔ کروٹ بدلتا رہا۔ سوچ بدلتا رہا۔ دس ہزار وہ بھی چند دن میں۔ دس ہزار کی ان دنوں اتنی ہی اہمیت تھی جیسے اب ایک لاکھ کی ہے۔ میں ذہنی جنگ میں مصروف تھا۔ آخر بارہ بجے خالد آ گیا۔ میں نے دروازہ

کھولا۔ اس کی آواز مجھے بہکی بہکی لگی۔ اس نے منہ رومال سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا بھی رہا تھا۔ جیسے نشے میں ہو۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ سچ مچ نشے میں تھا۔ وہ بیٹھک میں آیا میں نے دروازہ بند کیا۔ اسے اس کا ایک دوست چھوڑنے آیا تھا۔ خالد نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہاری بھابی سوگئی ہے کیا؟''

میں نے کہا'' مجھے علم نہیں شاید سوگئی ہو۔''

وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم بھی سوجاؤ۔''

میں حیران حیران سا اسے دیکھتا رہا۔ خالد کا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کشور شاید اس سے واقف تھی۔ تبھی تو جب میں نے اسے بتایا تھا کہ خالد اپنے کسی دوست کے ساتھ گیا ہے تو اس کے چہرے پر ملال چھا گیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرے کمرے سے خالد کی بتیں کرنے کی بلند اور کشور کی دھیمی آواز آنے لگی تھی۔ میرے پلے کوئی کوئی لفظ پڑ رہا تھا۔ اب کشور محتاط ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا ان کی زندگی کے یہ دن بڑے حسین ہیں۔ میں کباب میں ہڈی بنا ہوا ہوں۔ خاص کر کشور کے لیے میں ذہنی بے سکونی کا باعث بن گیا ہوں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ کشور کو علم تھا کہ مجھ تک آواز پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے وہ مدھم آواز میں بات کر رہی تھی لیکن خالد ایک تو نشے میں تھا دوسرا کسی کے سن لینے کا اسے ڈر نہیں تھا اس لیے وہ معمول کی آواز میں بات کر رہا تھا۔

''وعدہ...... رہنے دو...... چلو معاف کر دو...... عادت...... قسم...... وغیرہ۔'' ان سے ہم نے خود فقرے بنائے۔ کافی دیر تک کھسر پھسر ہوتی رہی۔ پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ اس دوران نہ چاہتے ہوئے بھی میری توجہ ان کی طرف رہی لیکن سوچا تھا ہنگامہ ہوگا، کچھ بھی نہ ہوا۔ شاید وہ سو گئے تھے۔ میں نے بھی کمبل میں منہ کیا۔ کافی دیر میں خود سے لڑتا رہا۔

اسی وقت دروازہ کھلا، میں نے کمبل سے منہ نکال کر دیکھا تو کشور کھڑی تھی۔ مجھے کمبل سے منہ نکالتے دیکھ کر بولی۔ ''میں نے سمجھا سو گئے ہوں گے۔''

میں اٹھ بیٹھا۔ ''بس سونے ہی والا تھا۔''

وہ چلتی ہوئی میری چارپائی کے پاس آگئی۔ میں سمٹ گیا۔ وہ ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''خالد ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ اس میں تین خامیاں ہیں۔''

اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی جیسے مجھ سے یہ بات کرنی چاہیے یا نہیں یہ سوچ رہی ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت کسی دوست کی ضرورت تھی جس کے پاس اپنا غم ہلکا کر سکے اور میں نے اس کا دوست بننے کا فیصلہ کرلیا۔

''ایک تو شراب پیتا ہے۔ ہفتہ دس دن بعد پینا اس کا معمول ہے۔ غیر مسلموں کو کئی گنا زیادہ پیسے دے کر وہ شراب حاصل کرتا ہے اور دوسری خامی نا قابلِ برداشت ہے۔ اور تیسری بھی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بتا سکتی ہیں تو بتا دیں۔ تجسس کیوں پیدا کر رہی ہیں۔''

''ان دو میں سے ایک بتائی جا سکتی ہے دوسری نہیں۔''

''چلو ایک ہی بتا دیں۔''

''خالد اور اس کے دوست ہر پندرہ دن بعد ایک طوائف کا مجرا کرواتے ہیں اور...... اور......''

''کہاں لاتے ہیں؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔

''سب نے باری بنائی ہوئی ہے۔ جب اس گھر میں لاتے ہیں تو مجھے میکے بھیج دیتے ہیں۔''

کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس مدھم روشنی میں وہ میرے بستر پر پائنتی کی طرف بیٹھی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ آدھی رات کو میرے پاس کیا لینے آئی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ''پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

''مجھے سمجھ نہیں آتی ان عورتوں میں ایسی کیا خاص بات ہے۔''

میں اس بات کا کیا جواب دیتا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور کہا۔ ''ہاں کچھ تو ہوگا۔ آپ بھی وہ سب کریں۔ بلکہ ان سے بڑھ کر کریں۔''

''نہیں وہ سب ممکن نہیں ہے لیکن کسی حد تک کوشش کرتی ہوں''

''آپ بھی ڈانس سیکھ لیں تاکہ یہ لت ان کی چھوٹ جائے۔''

''یہ کام کیا جا سکتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو خوش ہوئی۔ پھر منہ لٹک گیا۔

میں نے دیکھا کشور کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری

ہوئی تھیں۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کے لیے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے اسے اپنے قریب کیا تو وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ ایک جوان عورت ایسے رو رہی تھی جیسے چھوٹی سی بچی ہو اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے خاموش کیسے کرواؤں۔ حوصلہ کیسے دوں۔ میں نے کوشش کی لیکن پھر ترک کردی وہ بڑی دیر تک روتی رہی۔

پیار ہے یہی تو پیار ہے۔ اسے اپنے خاوند سے پیار تھا۔ بلکہ شدید پیار تھا۔ یہ پیار ہی اسے رلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھو۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگی۔ ''ماجد تم بہت اچھے ہو۔ معاف کرنا میں بڑی تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس سے یہ سب کہہ پاتی۔''

''مجھے اپنا ہی سمجھیں۔ میں کبھی اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں بتاؤ۔ کیا بات ہے۔ پوچھ کر شرمندہ کیوں کر رہے ہو۔''

''میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ کل بھائی خالد سے کہوں گا اور اسٹور میں ہی سو جایا کروں گا۔''

''کیوں۔'' وہ سراپا حیرت بن گی۔

''میری وجہ سے آپ ڈسٹرب ہوتی ہیں اور میں بھی۔''

وہ مسکرا دی۔ پھر کہنے لگی۔ ''روئی کانوں میں ٹھونس لیا کرو۔ ادھر سے جانے کی بات نہ کرنا اور ہاں خبردار جو رات کو کبھی ہمارے کمرے کی باتیں سنیں۔''

''یہ بہت مشکل امتحان ہے۔ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''اچھا کل ہم کمرا تبدیل کرلیں گے۔ بیڈ وغیرہ آخری کمرے میں رکھ دیں گے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے رکی اور کہنے لگی۔

''میرے اچھے دوست بن جاؤ۔''

میں اس کی بات پر مسکرا دیا تھا۔ ''دوست ہوتے ہی اچھے ہیں۔''

''نہیں دوست مطلب پرست، خود غرض بھی ہوتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میں ان میں سے نہیں ہوں۔'' میں نے بلند آواز سے جواب دیا کیونکہ وہ دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی۔

اس نے دروازے کو بند کیا اور باہر چلی گئی۔ میں ایک بار پھر نیند کی تلاش میں لیٹ گیا۔

☆......☆

کشور دل و دماغ کی اچھی عورت تھی۔ وہ اپنے خاوند سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی لیکن خاوند غلط راہ کا مسافر تھا۔ ہمارے معاشرے میں ان دنوں بے حیائی نے نیا نیا فروغ پکڑا تھا۔ خالد گناہ میں ڈوب چکا تھا۔ حالانکہ اس کی بیوی خوبصورت تھی۔ خالد کے پاس سب کچھ تھا لیکن وہ اس کے باوجود غلط دوستوں کی صحبت میں بگڑ چکا تھا۔ شاید اسی لیے کہ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ میں نے اب اس کے دوستوں پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ امجد، غلام، زبیر وغیرہ سب امیر گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ وہ شراب و شباب کو فیشن کے طور پر اپنا رہے تھے۔ ان سب کے پاس پیسے، وقت اور جگہ کی کمی نہ تھی۔ ان پر کوئی خاص ذمہ داری بھی نہ تھی۔ والدین کی طرف سے روک ٹوک بھی نہ تھی۔ ان سب باتوں نے ان کو بے لگام کر دیا تھا۔ جب ان میں سے کوئی آتا تو میں ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا۔ وہ بڑی کھلی ڈھلی باتیں کرتے۔ میں ایک کمزور سا فرد تھا۔ خالد بے شک میرا دور کا کزن تھا لیکن حقیقت میں، میں اس کا نوکر تھا۔

میرے کچھ مقاصد تھے۔ میں ان سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔ مجھے چند ماہ میں دس پندرہ ہزار جمع کرنا تھے۔ ویسے بھی خالد کا رویہ گھر میں کچھ اور ہوتا تھا اور دکان پر وہ باس بن جاتا تھا۔ ذرا سی بھی کام چوری برداشت نہ کرتا تھا۔ کئی بار میری بے عزتی کر چکا تھا۔ میں اسے کسی شکایت کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔ اس لیے دبا دبا سا رہنے لگا تھا۔ ویسے میں نے سوچ لیا تھا کہ جب یہاں سے جاؤں گا تو اسے آئینہ ضرور دکھا کر جاؤں گا۔ ایسے ہی دن گزرنے لگے۔ کشور سے اس کے بعد اس موضوع پر اکثر بات ہو جایا کرتی۔ وہ مجھے اور میں اسے بہت اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ ہر جمعرات کو خالد گھر میں رات گئے آتا۔ اس رات کشور میرے پاس بیٹھی رہتی ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے۔ جمعہ کو کام سے چھٹی ہوتی تھی اس لیے دیر تک جاگتے رہتے۔ یہ رات خالد کو اپنی بیوی کے ساتھ گزارنی چاہیے تھی لیکن وہ یہ رات اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ اس کی بیوی کردار کی بہت اچھی تھی ورنہ انتقاماً وہ بھی کچھ کر سکتی تھی۔

دوسری طرف میں نے خالد کے معمول کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ ایسے ہی دو ماہ گزر گئے۔

خالد نے مجھے پانچ ہزار دیے اور کہا۔ ''گھر سے ہو آؤ۔''

میں نے تیاری شروع کر دی۔ دو دن بعد میں گاؤں میں تھا۔ ابھی میٹرک کا رزلٹ نہیں آیا تھا۔ اُمید تھی کہ ابھی ایک ماہ مزید لگ جائے گا۔ گاؤں میں، میں دو دن ہی رہا اور واپس کام پر آ گیا۔ اس طرح دو ماہ میں پانچ ہزار جمع کر لیے تھے۔ کئی بار مجھے کشور کی بات یاد آئی کہ چند دنوں میں بھی اتنے پیسے کمائے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے مجھے اپنا اعتبار قائم کرنا ہوگا۔ یہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب کشور مجھ پر اعتماد کرنے لگی ہے بلکہ میں ہی اس کا ہمراز تھا۔ ہمارے درمیان ایک عجیب سا رشتہ تھا اس رشتے کو سوائے دوستی کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف خالد دکان پر باس ہوتا اور گھر میں بھائی ہوتا۔ گھر میں تو میرے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا مثلاً کئی بار اپنے جوتے پالش کیے تو میرے بھی کر دیے۔ دکان میں وہ خود پانی بھی نہیں پیتا تھا وہ بھی اسے پلانا پڑتا۔ ہمارا جنرل اسٹور اچھا چل رہا تھا۔ صبح سے شام تک وہاں رش ہوتا۔ اب خالد پہلے سے زیادہ مجھ پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ مجھے گاؤں سے واپس آئے چند دن ہوئے تھے کہ گاؤں سے ایک آدمی آیا اس نے خالد کو بتایا کہ خالد کی امی بیمار ہیں۔ اسی وقت خالد نے مجھے بلایا اور کہنے لگا۔ ''ماجد اب تمہیں اسٹور سنبھالنا ہے، میں گاؤں جا رہا ہوں۔ کل دن بارہ بجے آ جاؤں گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے دو چار دن لگ جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

''شام کو ایک گھنٹا پہلے اسٹور بند کر دینا اور صبح وقت پر کھول لینا۔ تاکہ گاہک خراب نہ ہوں۔'' اس نے مزید کہا۔

میں نے اسے یقین دلایا۔ ''ایسا ہی ہوگا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

اسٹور پر میرے علاوہ ایک اور لڑکا کام کرتا تھا۔ خالد دکان سے گھر گیا اور وہاں سے تیار ہو کر گاؤں چلا گیا۔ اس دن میں نے پورے وقت پر یعنی شام سات بجے ہی اسٹور بند کیا اور گھر چلا آیا۔ کشور کھانا تیار کیے انتظار میں تھی۔

''ماجد جلدی جلدی کھانا کھا لو اور تیار ہو جاؤ آج ہم سیر کریں گے۔''

''خیر تو ہے۔''

''ہم دو گھنٹے میں آ جائیں گے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ دوسری گلی میں جانا ہے۔ میری ایک دوست ہے کافی دن پہلے مجھ سے ملنے آئی تھی میں نے وعدہ کیا تھا کہ ملنے آؤں گی آج موقع ملا ہے چلو مل آتے ہیں۔''

میں نے منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھایا، اس دوران وہ اپنی دوست نرگس کے بارے میں بتاتی رہی۔

''اس کے خاوند شہر کے بہت بڑے سنار ہیں۔ شہر میں ان کی دو تین دکانیں ہیں۔ بہت امیر ہیں۔ صبح جاتے ہیں رات گئے واپس آتے ہیں۔ نرگس کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔ اب سنا ہے اس کا خاوند دوسری شادی کے چکر میں ہے۔ بڑی پریشان ہے وہ۔ میں نے سوچا اس کا غم بانٹ آئیں۔''

بیس پچیس منٹ بعد ہم ان کے گھر میں تھے۔ پورے محلے میں سب سے شاندار ان کا ہی گھر تھا۔ نرگس اور ان کے دو نوکر جو کہ میاں بیوی تھے گھر میں تھے۔ دونوں کی عمریں چالیس سال ہوں گی۔ ان کے لیے سرونٹ کوارٹر الگ بنے ہوئے تھے۔ ان کے دو بچے بھی تھے جب ہم گھر میں داخل ہوئے بابا جی نے دروازہ کھولا اور کشور کو دیکھ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم سیدھے بیڈ روم میں چلے گئے وہاں نرگس ملی۔ ایک چالیس سال کی بھرے بھرے جسم کی ہلکہ موٹاپے کی طرف مائل عورت۔ کشور کے گلے ملی۔ مجھ کو صرف سلام کیا۔ میں نے جواب دیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت چائے بنا لائی۔ اس دوران دونوں سہیلیاں آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ میں بور ہوتا رہا۔ چائے پینے کے بعد میں اس کمرے سے نکل آیا۔

سرونٹ کوارٹر کی طرف گیا۔ وہاں بابا اللہ دتہ اور اس کے بچوں سے ملا۔ بڑے پیارے بچے تھے۔ مجھے اپنے بہن بھائی یاد آ گئے۔ بڑی بیٹی تھی جس کی عمر دس بارہ سال ہوگی۔ اس سے چھوٹا بیٹا تھا آٹھ نو سال کا۔ بچے بڑے تمیز دار تھے بلکہ سہمے ہوئے تھے۔ میں بابا اللہ دتہ کے پاس بیٹھ گیا۔ پتا چلا وہ گاؤں سے آیا ہے۔ بیس سال سے اس گھر میں ملازم ہے۔ شادی ہوئی تو بیوی کو بھی یہاں ہی لے آیا۔ ہر ماہ گھر جاتا ہے کچھ پیسے دے آتا ہے۔ یہاں اس کی بیوی گھر کے کام کرتی ہے اور وہ چوکیدار، مالی، ڈرائیور، اور بازار سے سودا سلف لا دیتا ہے۔ اس کام کے انھیں ہر ماہ پانچ ہزار مل جاتے ہیں۔ کھانا پینا فری ہے۔ وہ ہر ماہ چار ہزار اپنے گھر

دے آتا ہے۔ ایک گھنٹا میں وہاں بیٹھا رہا۔ اس وقت بابا اللہ دتہ کی بیوی مجھے بلانے آ گئی۔ جاتے ہوئے میں نے بابا اللہ دتہ کے انکار کے باوجود بچوں کو بیس بیس روپے دیے۔ کشور اور نرگس اسی جگہ بیٹھی تھیں۔ اب میں نے محسوس کیا نرگس مجھے کھوجنے والی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک چمک سی لہرائی تھی اس کی آنکھوں میں لیکن میں نے نظر انداز کر دیا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم واپس اپنے گھر آ گئے۔ راستے میں کشور نے کوئی بات نہیں کی بلکہ وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ جیسے کوئی فیصلہ نہ کر پا رہی ہو۔ میں نے بھی اس سے کچھ پوچھا نہیں۔ جب ہم واپس آئے تو رات کے نو بجنے والے تھے۔ وہ میرے پاس بیٹھک میں ہی بیٹھ گئی۔

''ماجد تجھ سے ایک بات کرنی ہے۔'' اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

''پہلے تو کبھی آپ نے مجھ سے پوچھ کر بات نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات ہی ایسی ہے۔'' اس نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''ایسی کیا بات ہے۔'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اب تمہیں ہمارے گھر میں رہتے ہوئے تین ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ میں نے دیکھا، سمجھا، جانا تم ایک بہت ہی اچھے لڑکے ہو اور اس کا تمہیں بھی علم ہے کہ میں تم پر سب سے زیادہ اعتبار کرتی ہوں۔ تم نے بھی میرے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔''

''آپ بھی تو بہت اچھی ہیں۔ آپ نے بھی میرا ہر طرح خیال رکھا۔ میں آپ کا کچھ نہیں لگتا تھا۔ آپ نے اپنا سمجھا۔ مجھ پر اعتبار کیا۔'' میں نے سچ بیانی سے کام لیا۔

''میں زندگی بھر کا ایک عہد لینا چاہتی ہوں۔ میں ایک ایسے راز میں تم کو شامل کرنے جا رہی ہوں۔ دیکھو کبھی دھوکا مت دینا۔ ابھی فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ کرنے کے بعد اپنی بات سے مکر نہ جانا۔''

''ایسی کیا خاص بات ہے۔'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ میرے اندر تجسس کروٹیں لینے لگا۔

''ایسی ہی بات ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

تجسس میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ کئی ایک خیال آئے دل میں۔ کیا یہ مجھ سے جسمانی تعلق چاہتی ہے۔ اس کے لیے اب سے پہلے بھی موقعے تھے۔ میں بھی رضامند تھا بلکہ اسے کئی بار دبے دبے لفظوں میں اس بارے میں کہہ بھی چکا تھا اس لیے اسے تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ حالات ایسے پیدا کر سکتی تھی کہ اس پر الزام بھی نہ آتا۔ مجھ پر احسان بھی ہوتا اس لیے یہ بات تو نہیں تھی۔

''اچھا اب بتا بھی دو۔'' اس کی خاموشی سے اکتا کر میں نے کہا

''نرگس سے ملے ہو ناں۔''

''ہاں!''

''اس کی اولاد نہیں ہے۔ سارا قصور اس کے خاوند کا ہے لیکن اس کا خاوند اسے اس کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔''

میں خاموش رہا تا کہ اس کی بات کا تسلسل قائم رہے۔ ''اب اس کا خاوند دوسری شادی کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔''

''اسے کون روک سکتا ہے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''دوسری شادی کا مقصد اولاد ہے۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''نرگس سوچتی ہے۔ اگر دوسری بیوی سے اولاد ہو گئی تو اس کی قدر ختم ہو جائے گی اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ہر روز میں تو اس کے پاس جا نہیں سکتی تم چلے جایا کرو۔ اس طرح وہ کچھ دیر کے لیے اپنے فکر تردد سے نکل آئے گی۔ آگے جو قسمت۔''

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔'' کہہ کر میں اٹھ گیا اس لیے کہ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی تھی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ کشور نے کئی بار کہا بھی کہ ایک چکر نرگس کے ہاں کا لگا آؤ مگر میں گیا نہیں لیکن ایک دن جب میں دکان جانے کے لیے اٹھا تو اس نے ایک لفافہ دے کر کہا۔ ''یہ بہت ضروری ہے آج ہی نرگس کو پہنچا دینا ہے۔''

میں دوپہر میں خالد کی دکان سے ضروری کام کا بہانا کر کے اٹھا اور نرگس کے گھر آ گیا۔ گھر بالکل خالی پڑا تھا۔ بابا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں میں ہوئی کسی فوتگی میں گیا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے آئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ بولی۔

میں خاموش رہا۔ میرے پاس بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی اس بار اس کی آواز میں رنج تھا۔ ''وہ اگر اپنی خامی دور کر لیتا تو میں آج اس راہ کو نہ چنتی۔'' اس نے کہا۔ ''اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے، میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔''

میں نے محسوس کیا اسے پچھتاوؤں نے گھیرا ہے فطری طور پر وہ اچھی عورت تھی۔ مجھے نرگس سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی اپنی سی لگی۔ میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا اس لیے خاموش ہی رہا۔

''میرا خاوند مجھے بہت پیار کرتا ہے۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔'' اولاد چاہیے اسے، ساری جایداد کا وارث، اس لیے وہ دوسری شادی کرنے جارہا ہے۔ میں اسے اولاد دوں گی۔'' اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ میری تیز ہوتی سانسوں کو اس نے مزید تیز کردیا۔ ایک لمحہ ایسا آیا کہ میری سانسیں رک سی گئیں۔ اس کے بعد خوف، ڈر کی جگہ حیرت و مسرت نے لے لی جو لطف و آگہی میں بدلا جس کی زیادتی نئے جہانوں کی سیر میں لے گئی۔ جہاں سے واپسی پر نرگس اور میرا سر شرم سے جھکا ہوا تھا۔ میں اب وہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ فوراً اٹھ آیا۔

اڑھائی ماہ مزید گزر گئے۔ ان اڑھائی ماہ میں چار پانچ بار کشور نے زبردستی مجھے نرگس کے ہاں بھیجا۔ میرے لیے اس کے گھر جانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میرا ایک دوست مجید جو میرے ہی گاؤں کا تھا اسی طرف رہتا تھا۔ مجید کے گھر جانے کے دو راستے تھے۔ اگر اسکول کی طرف سے آئیں پہلے نرگس کا گھر آتا تھا۔ تین گھر چھوڑ کر گلی کا موڑ تھا۔ گلی کے موڑ سے پانچواں گھر مجید کا تھا۔ دوسری طرف سے آئیں تو پہلے مجید کا گھر آتا تھا۔ میں ایک راستے سے جاتا گلی میں کوئی مشکوک فرد نہ ہوتا تو اس کے گھر گھس جاتا ورنہ سیدھا مجید کے گھر چلا جاتا۔ ویسے بھی مجھ پر کس نے شک کرنا تھا۔ نرگس کی عمر چالیس سال تھی اور میں سولہ سترہ سال کا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ گھر کے ملازم بھی خوش اخلاقی سے ملتے۔ ملازم تو ملازم ہی ہوتے ہیں انہیں بلاوجہ کسی کے بیڈ روم میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ نرگس بڑا اہتمام کرتی۔ دروازہ خود بند کرکے آتی۔ میرے آنے سے پہلے دروازہ کھلا ہی ہوتا تھا۔ مجید اکثر پوچھا کرتا۔

''فضل دین جیولرز کے گھر بہت جاتے آتے ہو، خیر ہے؟''

میں آئیں بائیں شائیں کر جاتا۔

یہ جمعرات کی شام تھی۔ بھائی خالد اپنے دوستوں کے ساتھ جاچکا تھا۔ جب میں اور کشور، نرگس کے گھر اس سے ملنے کے لیے گئے۔ نرگس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے من کی مراد پوری ہوچکی تھی۔ چہکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔''میں ماں بن گئی ہوں۔ فضل کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ مجھے کل ایک جیولری کا سیٹ لے کر دیا ہے۔''

دوسرے لمحے اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔''ماجد اب میرا تم سے تعلق ختم۔''

میں نے آہ بھر کر کہا۔''یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔''

''میں تم کو بھول نہیں پاؤں گی لیکن وعدے کے مطابق تم کبھی اب یہاں نہیں آؤ گے۔''

میں خاموش رہا، مجھے محسوس ہوا کہ بے شک میں نے چند بڑے حسین لمحات گزارے ہیں، لیکن کچھ گنوا چکا ہوں۔ کیا گنوا چکا ہوں، اس وقت اس کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اس نے ایک پیکٹ لاکر کشور کو دیا جسے اس نے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

جب ہم جانے لگے تو نرگس مجھ سے لپٹ گئی، اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ میری آنکھوں کے آگے دھواں چھا رہا تھا۔

''مجھے بھول جانا۔ بالکل بھول جانا۔'' وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے خود کو کہہ رہی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ کیا۔ اور سر جھکا کر وہاں سے آگیا۔

گھر تک کا سفر ہم نے خاموشی سے کیا۔ گھر آکر بھی خاموش ہی رہے۔ کشور نے اداس نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پیکٹ میری چارپائی پر رکھ دیا اور خود اندر چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ پیکٹ اٹھایا اس میں مزید ایک ڈبا تھا۔ اس ڈبے میں زیور تھے۔ اور پانچ پانچ سو کے نوٹ تھے۔ جن کو گنا تو وہ چالیس ہزار تھے۔

میں اپنے ایک ہاتھ میں وہ نوٹ پکڑے بیٹھا تھا جب کشور دو کپ چائے بنا لائی۔

''ماجد یہ اتنی رقم ہے کہ تم اپنی زندگی کی کامیاب شروعات کرسکتے ہو۔''

''نہ جانے میں اداس کیوں ہوں۔''

''میں بتا سکتی ہوں کہ تم اداس کیوں ہو۔''

''کیوں ہوں میں اداس؟'' میں نے اس سے پوچھا

''میں فی الحال بتانا نہیں چاہتی۔ مجھے بتاؤ اب کیا ارادہ ہے۔ کب گاؤں جارہے ہو۔''

''میں کل خالد سے بات کروں گا۔ میری جگہ نیا ملازم

رکھا جائے گا۔ اسے کام سمجھائے جائے گا، اس کے بعد ہی جاؤں گا۔''

☆......☆

تقریباً دس سال گزر گئے۔ اب میرے پاس سب کچھ تھا۔

میں نے ایف اے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ تب تک مجھے سمجھ آچکی تھی کہ نوکری کی بجائے اپنا بزنس بہتر ہوتا ہے۔ کوئی بھی نوکری کرکے اچھی زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ نوکری لفظ غلامی کا متبادل ہے۔ اپنا کام کروں تو کیا کروں؟ مجھے کون سا کام کرنا چاہیے۔ میں نے درجن سے زیادہ تجربات کیے۔ جو پیسے میرے پاس تھے وہ ختم ہوتے چلے گئے۔ آخر جب صرف دس ہزار رہ گئے تو میں نے ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور کھول لیا۔ اس کا تجربہ بھی تھا۔ پانچ چھ سال میں جنرل اسٹور شہر کا معروف اسٹور بن گیا۔

میں جب بھی اکیلا بیٹھا ہوتا تو نرگس اور کشور کی یاد آجاتی۔ ساتھ ہی ان سے کیا ہوا وعدہ بھی۔ کئی بار خیال آیا کہ ایک بار فیصل آباد جاؤں، حال چال پوچھ آؤں، کم از کم کشور سے مل آؤں، لیکن سوچ کر ہی رہ جاتا۔ ہمارے شہر احمد پور شرقیہ سے فیصل آباد زیادہ دور نہیں تھا لیکن وعدوں کی زنجیر نے مجھے باندھ رکھا تھا۔

میرا گھر گاؤں میں تھا میں صبح شہر آجاتا اور شام کو واپس جاتا۔ خالد کی والدہ کو فوت ہوئے کئی برس گزر گئے تھے۔ والد پہلے ہی فوت ہوچکا تھا۔ اس وجہ سے خالد گھر میں کم ہی آتا تھا۔ اس کے بھائیوں کی شادیاں بھی ہوچکی تھیں۔ صرف ایک سب سے چھوٹی بہن کی شادی رہتی تھی۔

اسی کی شادی تھی۔ اس شادی میں خالد اور اس کی بیوی کشور بھی آئے۔ مجھے علم ہوا تو میں بھی اس شام جا پہنچا۔ دس سال بعد میں کشور سے مل رہا تھا۔ وہ کافی موٹی ہوچکی تھی۔ بالوں میں چند بال سفید ہوچکے تھے۔ اب اس کے تین بچے تھے۔ اس کے بھرے بھرے متناسب جسم پر آسمانی رنگ کا شلوار سوٹ تھا جس نے اس کی شخصیت کو مزید جاذب نظر کردیا تھا۔

مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر تعجب کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔''بیٹھ جاؤ۔''

میں بیٹھ گیا۔''ماجد! تم تو بہت بدل گئے ہو۔ پہچانے ہی نہیں جاتے۔''

''آپ بھی بہت بدل گئی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ہماری بہت اچھی دوستی رہی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ ان کہی باتوں کے دل میں ڈھیر لگے تھے لیکن شادی والے گھر تو ہم کھل کر بات نہیں کرسکتے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد کشور اور میں ہمارے گھر میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو لے کر آگئی تھی۔ میری بہن اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی تو اس نے پوچھا۔''شادی کی۔''

''نہیں ابھی نہیں کی۔''

''کوئی نئی محبت۔'' محبت بڑا خوبصورت، بہت پیارا لفظ ہے۔ جو کسی محبت کرنے والے کی زبان سے ادا ہونے کے بعد اور زیادہ خوبصورت، اور زیادہ پیارا ہوجاتا ہے۔

میری نظروں کے سامنے نرگس کا چہرہ گھوم گیا۔ میں نے جواب دیا۔''نہیں۔'' پھر پوچھا۔''آپ کے میاں کچھ بدلے۔''

''نہیں۔ میں نے خود کو بدل لیا۔'' اس کے سرخ و سپید چہرے پر کوئی رنگ آنے ہی والا تھا کہ اس نے زبردستی چہرے کو سپاٹ بنالیا۔

میں نے سوال بدل دیا۔

''اچھا تو سنایئے پھر کیسے گزری۔ میرے بعد؟''

''جو ہم پہ گزری سو گزری۔ آپ سنائیں۔'' اس نے بات کو گول مول کیا۔

میں نے اسے اب تک کی زندگی کا مختصر خاکہ سنایا اور پھر اصل بات کی طرف پلٹ آیا۔

''آپ کی ایک سہیلی بھی تھی نرگس۔''

''کون نرگس؟'' اس نے درمیان سے میرا سوال اچک لیا۔''میں کسی نرگس کو نہیں جانتی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت میری بہن ریحانہ چائے اور بسکٹ لے کر آرہی تھی۔ کشور کو جانے کے لیے تیار دیکھا تو کہنے لگی۔''بیٹھیں بیٹھیں باجی۔''

کشور، ریحانہ کی بات مان کر، مجھے گھورتے ہوئے بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے بدلے ہوئے رویے سے اندازہ لگایا کہ بہت کچھ بدل گیا ہے اس لیے میں نے نرگس کا سوال بھول کر، اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں بے تکا سوال کیا۔''کیا تم نے خاوند کے کہنے کے مطابق اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا ہے؟''

''میں اس کی بیوی ہوں، بالکل ایک کھلونے جیسی جس سے جب دل چاہا، جیسے دل چاہا کھیلا، دل بھر گیا تو ایک طرف رکھ دیا۔'' اس نے چائے پی کر کپ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''رہا مسئلہ ماحول سے ہم آہنگی کا تو میرے پاس دو راستے تھے، میں نے ایک چن لیا۔ اب وہ شراب چھوڑ چکے ہیں، دوست چھوڑ دیے ہیں، راتوں کو باہر نہیں رہتے۔''

ہمارے درمیان خاموشی پھیل گئی۔ جسے اس نے ہی توڑا۔ ''اب کوئی وجہ نہیں رہتی تھی باہر رہنے کی۔ اسے سب کچھ گھر میں میسر ہے۔''

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمارے پاس کرنے کو بہت باتیں تھیں۔ میرے دل میں نرگس، اس کے بچے یا بچی کے بارے سوال مچل رہے تھے لیکن میں یہ سوال اس سے کر نہیں سکتا تھا۔ یہ سوال میرے چہرے پر لکھے تھے لیکن کشوران کو مسلسل نظر انداز کر رہی تھی۔ اس کی بجائے اس نے فلسفہ چھیڑ دیا۔ ''میرا تجربہ بھی یہ ہے اور مشاہدہ بھی کہ انسانوں کی دنیا بہر حال انسانوں کی دنیا ہے۔ ہم نہ شیطان ہیں نہ فرشتے۔ ہم انسانوں کی اس دنیا میں اچھائی بھی ہے اور بہت برائی بھی۔ ہم اچھے ہوتے ہیں ہم برے بھی ہوتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہماری برائی بیان کرے۔''

میرے اندر لاوا پک رہا تھا۔ مجھ سے کھیلا گیا۔ مجھ کو استعمال کیا گیا۔ ایک سوال مچل رہا تھا کہ مجھ سے اپنے مطلب کے لیے ایک بچہ لیا گیا۔ جسم سے کھیلنے کی قیمت دی گئی۔ اب اس بارے میں سوال نہیں کر سکتا تھا۔ بے بسی کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ انہیں لمحات میں مجھے نرگس سے آخری ملاقات کے وقت کا اس کا چہرہ یاد آ گیا خاص طور پر وہ ڈبڈبائی آنکھیں، جن میں تشکر تھا، کوئی حسرت تھی، کوئی ان کہی کہانی تھی، جن میں اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ کشور میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن وہ ہر بات سمجھ گئی۔

''بیٹی ہوئی تھی، اب تو نو سال کی ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے اداسی سے اسے دیکھا۔

''کیا نام رکھا ہے۔''

''مجھے معلوم نہیں۔ تم یقین کرو اس کے بعد نرگس نے خود ہی مجھ سے رابطہ ختم کر لیا۔ ایک دو بار میں اس کے گھر گئی تو اس نے ایسا رویہ رکھا جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو۔ پہلے پہلے تو بہت صدمہ ہوا لیکن پھر میں نے اس کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میری اپنی اولاد ہو گئی، میں ان میں الجھ گئی۔ اب اس کا تو خیال بھی کبھی نہیں آتا۔''

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شادی کے دن گزر گئے۔ خالد نے شکوہ کیا کہ میں نے دس سال میں ایک بار بھی چکر نہیں لگایا تو میں نے جلد فیصل آباد آنے کا وعدہ کر لیا۔

اب تین راتیں گزر چکی تھیں اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا لیکن رات مشکل تھی۔ جیسے ہی سونے لگتا مجھے اپنی بیٹی یاد آ جاتی۔ جسے میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ جسے میں نے پیدا ہونے سے پہلے ہی بیچ دیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی اب کیا کروں۔ میں جتنا اپنے ضمیر کو سلاتا اسے دلائل دیتا لیکن دل تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔ آخر میں ہار گیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اسٹور اپنے بھائی کے حوالے کیا اور فیصل آباد روانہ ہو گیا۔

خالد دکان پر مل گیا، مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ شام تک میں دکان پر ہی رہا۔ خالد کو بتایا کہ چند دن ریسٹ کرنے آیا ہوں۔ فلمیں دیکھوں گا۔ پارک گھوموں گا۔ دوستوں سے ملوں گا۔ آپ کا مہمان ہوں۔ گھر پہنچا تو کشور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ویسے تو مجھ سے خوش ہو کر ملی بچے بھی جلد گھل مل گئے لیکن کشور کے چہرے پر پریشانی صاف پڑھی جا سکتی تھی اور میں جانتا تھا ایسا کیوں ہے۔

صبح آٹھ بجے میں خالد کے ساتھ ہی تیار ہو کر گھر سے نکل آیا۔ محلے میں چند دوست تھے۔ مجید، عمران، ندیم وغیرہ۔ مجید کا گھر نرگس کے گھر کے نزدیک ہی تھا اس لیے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک متناسب جسم کی مالک عورت نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے پہچاننے کے لیے غور سے دیکھا۔ دل میں سوچا شاید مجید کی بہن ہو لیکن حافظے نے جواب دے دیا۔ یہ عورت مجید کی بہن نہیں تھی۔ اس نے میرے اتنے غور سے دیکھنے کو نہ جانے کیا سمجھا۔ تلخی سے بولی۔ ''جی کس سے ملنا ہے۔''

اس کے لہجے کی زہر نے مجھے حیران کر دیا۔ اس وقت مجھے سمجھ نہیں آئی تھی کہ میرے اتنے غور سے مسکرا کر دیکھنے نے اسے غصہ دلایا ہے۔ وہ بلاشبہ خوبصورت تھی۔ سانولا رنگ، تیکھے نین نقش، آنکھوں میں بلاوجہ کا غصہ، پتلے پتلے

سرخی مائل ہونٹ، بھرا بھرا جسم، میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

''میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ مجھے مجید سے ملنا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں۔''

''کتنی دور سے آئے ہیں۔'' اس نے شک بھری نظروں سے پہلے مجھے اور پھر بائیک کو دیکھا۔

''میں احمد پور سے آیا ہوں۔''

''بائیک پر۔''

''نہیں۔ بس پر۔''

''یہ بائیک کس کی ہے۔''

''ایک دوست کی ہے۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ناجد۔''

''مجید کو کب سے جانتے ہیں۔''

''دس سال سے۔''

''پہلے کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔''

''میں دس سال بعد آیا ہوں یہاں۔''

تبھی گھر سے ایک نوجوان برآمد ہوا۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ مجید ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلد پہچان لیا ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔

''پہلے دروازہ کس نے کھولا تھا۔''

''تمہاری بھابی نے۔''

اس نے میری بائیک اپنے گھر میں کھڑی کی۔ میں نے پوچھا۔ ''شادی کب کی۔''

''دو سال ہو گئے۔ تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو۔''

''بچہ ہے کوئی۔ امی ابو۔ بہن بھائی سب کہاں ہیں۔''

''امی ابو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بہن کی شادی کر دی۔ بھائی کام پر گیا ہوا ہے۔ رات گئے واپس آئے گا۔ میں کام پر جانے ہی والا تھا۔''

ایسی باتیں کرتے ہوئے ہم گھر میں داخل ہو گئے۔

''یار تیری بیوی بہت اچھی ہے۔'' میں نے دل سے تعریف کی۔

''میں ہوں ہی بہت اچھی۔''

''اچھی بیوی اب اچھی سی چائے بنا دو۔'' مجید نے کہا تو وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

ہم برسوں بعد ملے تھے۔ ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ کسی حد تک مجید میرا راز دار تھا۔ اسے میرے اور نرگس کے تعلقات کا علم تھا۔ مگر اسے یہ علم نہیں تھا کہ یہ سب ایک مقصد کے تحت کیا گیا تھا اسی لیے وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نرگس سے ملنے آیا ہوں۔

''یار تم نے اس پر احسان کیا تھا۔ بھول جاؤ۔ کیوں اس کی زندگی میں زہر گھولنے آ گئے ہو۔''

میں نے وضاحت کی۔

''میں وہ پیسے واپس کرنا چاہتا ہوں تا کہ ذہنی کرب کم ہو۔'' ایک لمحے کے وقفے کے بعد میں نے دوبارہ بتایا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ کبھی کبھار اس سے ملتا رہوں۔ کبھی کبھار۔''

مقدس چائے دینے کے بعد کپڑے دھونے چلی گئی تھی۔ مجید نے اپنی بیوی کو آواز دی۔

''جی حکم کریں۔'' مقدس آ موجود ہوئی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ۔ ایک کام ہے۔'' مجید نے اسے کہا۔ اس کے بیٹھ جانے کے بعد مجید نے اس سے کہا کہ کبھی ستار کی بیوی نرگس اور اس کے درمیان گہرا رابطہ تھا اب آیا ہے تو یہ اس سے ملنا چاہ رہا ہے۔ تم اسے کسی طرح بلا لو تا کہ یہ مل سکے۔

جب وہ بیوی کو بتا رہا تھا تو مجھے عجیب طرح کی الجھن ہونے لگی تھی کیونکہ میں مقدس کو اس معاملے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اور ہاں نرگس کا فون نمبر بھی لے لینا۔''

وہ اسی وقت اٹھی اور نرگس کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ تبھی مجید کے موبائل پر کال آ گئی۔ مجید نے کال سنی۔ جس دفتر میں وہ کام کرتا تھا وہاں سے فون آیا تھا۔ پوچھا جا رہا تھا کہ ابھی تک دفتر کیوں نہیں آئے۔ اس نے مہمانوں کی آمد کا کہا پھر کافی دیر تک ہوں، ہاں، ٹھیک ہے کرتا رہا۔ کال سننے کے بعد مجھے بتایا کہ ''میرے پاس دفتر کے دراز کی چابی ہے میں ابھی دے کر آیا۔ تم آرام سے بیٹھو۔'' اور مقدس سے کہا۔ ''تم جاؤ۔ نرگس سے مل لو وہ کیا جواب دیتی ہے۔ آ کر بتاؤ۔''

دونوں میاں بیوی ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ میں چارپائی پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

زمانہ بدل گیا تھا۔ موبائل فون اب اس کے بھی پاس ہوتا ہے جس کے گھر میں شام کو اپنے بچوں کی روٹی کے پیسے

نہیں ہوتے۔ پہلے یہ ضرورت تھی اب فیشن بن گیا ہے۔ نرگس کے پاس تو ضرور ہوگا۔ میں نے ٹیلی فون جنرل اسٹور پر لگوا لیا تھا لیکن موبائل نہیں خریدا تھا۔ آج اس کا شدت سے احساس ہوا۔ اب جب مقدس، نرگس کا فون نمبر لے آئے گی تو اسے کال کیسے کروں گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ کہنا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں بھی موبائل خرید دوں گا۔

انہی سوچوں میں غرق تھا کہ مقدس لوٹ آئی۔

اتنی جلد اس کے واپس آنے کی توقع نہیں تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کیا اور اداس مسکراہٹ سجائے میرے پاس آگئی۔

''کیا ہوا۔'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''نرگس گھر میں نہیں ہے۔ وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔'' اس نے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو خیر اب مجید آتا ہے تو کچھ سوچتے ہیں۔''

''ان کے گھر میں آج پہلی بار گئی تھی۔ ویسے مجھے نرگس کے بارے میں علم تھا۔ ہمارے محلے میں جب بھی کوئی خواتین کی محفل میلاد ہوتو وہ اس میں لازمی شرکت کرتی ہے اور کافی پیسے دے کر جاتی ہے۔ کوئی شادی ہوتو بھی وہ مدد کرتی ہے۔ میں اس کی بہت عزت کرتی ہوں لیکن اس کا کردار ایسا ہوگا، مجھے علم نہیں تھا۔'' میرا ڈر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس وقت کو پچھتایا جب مجید مقدس کو اس راز میں شامل کر رہا تھا۔ مجھے اس کی بات پر نہ جانے کیوں غصہ آیا میں نے تلخی سے کہا۔ ''اس کے کردار کو کیا ہوا۔ تمہیں بتایا تو ہے اس نے ایسا کیوں کیا۔''

اس نے میرے لہجے کی ذہرتا کی محسوس کی۔ ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر رکھی اور بات بدل دی۔

''دس سال قبل اس نے آپ کو چالیس ہزار دیئے تھے، اب آپ اسے کیوں واپس کرنا چاہتے ہیں۔ گھر آئے پیسے کوئی لوٹاتا ہے۔''

اس نے چور نظروں سے اپنے بیٹھنے کے اسٹائل کو دیکھا اور مزید جسم کو ٹیڑھا کرلیا۔ اب وہ اس پوزیشن میں بیٹھی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں پھسل رہی تھیں۔

''ہاں لیکن میرے اندر ایک خلش ہے کہ میں نے جیسے خود کو بیچا ہے۔ مرد ہوکر عورت سے پیسے لیے ہیں۔''

اس کی نظروں کا انداز بدل چکا تھا۔ اب وہ مجھے لبھانے کے انداز سے دیکھ رہی تھی اور میں سمجھ چکا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ پیسا بہت بری چیز ہے۔ اسے علم تھا کہ میرے پاس پیسے ہیں اور وہ نرگس کو دینا چاہتا ہوں۔ اسے میرے کردار کا بھی علم ہوچکا تھا کہ میں اتنا پارسا نہیں ہوں اور اسے خود اپنے متناسب جسم کا بھی علم تھا۔ ان سے بڑھ کر اسے یہ بھی علم تھا کہ مرد کا شکار کیسے کیا جاتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں مجید کے جلد آنے کی دعا کی۔

''آپ نے خود کو بیچا تھا تو اس کے پورے پیسے لیے تھے۔ اب اگر میں آپ کو کچھ بیچ دوں اس کے پیسے بھی لے لوں تو آپ کا حق نہیں کہ آپ بعد میں پیسے واپس مانگیں۔'' اس نے اپنی آنکھوں میں برائے فروخت کا رنگ جھلکا کر کہا۔ سچ کہتے ہیں دو اجنبی مرد و عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ ہم دونوں پر اس نے قبضہ کیا تو میں نے نظریں چرالیں۔

نرگس کے گھر سے واپسی پر میں نے سوچا کہ آپ اسے پیسے کیوں واپس کر رہے ہیں۔ نہیں کرنے چاہیے۔ ان دنوں آپ کے دوست کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ آپ مجید کی مدد کردیں۔''

ہم ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد مجید آگیا۔ میں نے موبائل خریدنے کی خواہش کی۔ مقدس نے اسے نرگس کے بارے میں بتایا۔ مجید کہنے لگا۔ ''میں شام کو مقدس کو دوبارہ بھیجوں گا۔''

میں نے تختی سے کہا۔ ''مقدس صرف نرگس کا موبائل نمبر لا دے، باقی اس سے کوئی بات نہ کرے اور تم دونوں اس بات کو بھول جاؤ کہ میں نے کسی راز میں تمہیں شامل کیا ہے۔''

ان دونوں نے وعدہ کیا کہ وہ یہ راز کسی کو نہیں بتائیں گے۔

میں نے مجید اور مقدس دونوں کے نمبر ایک کاغذ پر لکھے اور وہاں سے اٹھ آیا۔ شام کو میں نے نیا موبائل خریدا جس میں کیمرا بھی لگا ہوا تھا اور واپس خالد کے پاس آگیا۔

تیسرے دن میں اور نرگس ان کے لاؤنج میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مقدس فون نمبر لے آئی تھی جو مجید نے مجھے کال کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے نرگس کو فون کیا۔ اپنا تعارف کروایا۔ اس نے پوچھا۔ ''اب کہاں ہیں۔''

میں نے بتایا۔ ''آپ کے شہر میں۔''

''میرا فون نمبر کیسے لیا۔''

''مقدس کے خاوند نے دیا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ نمبر لا دو۔''

''آپ نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' نرگس بولی۔ ''خیر آپ گھر آجائیں۔''

میں اسٹور پر تھا وہاں سے دس منٹ میں اس کے گھر کے سامنے جا پہنچا۔ برسوں بعد اس گھر میں جا رہا تھا میرا دل میرے قابو میں نہیں تھا۔ میں جب گھر میں داخل ہوا تو وہ سامنے کھڑی میرا انتظار کررہی تھی۔

''مجھے علم تھا کہ ایک دن آپ لازی آئیں گے۔'' اس نے سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ کافی بدل گئی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے نور پھیلا نظر آیا۔ ویسے بھی کھاتے پیتے گھرانے کی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔ اس نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھ کر مجھے دیکھا۔

''اگر آپ کو کوئی پریشانی ہوئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں وہ پیسے واپس کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ لان میں صدف کھیل رہی تھی۔ میرا دل اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ نرگس نے صدف کو آواز دی۔ وہ بھاگ کر آئی۔ نرگس نے اسے بتایا۔ ''تمہارے انکل۔'' اور مجھے کہنے لگی۔ ''ہمارا جو کچھ بھی ہے وہ صدف کا ہی ہے۔ پیسے اپنے پاس رکھیں اور میری بات توجہ سے سنیں۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ اب ماضی کو یاد کر کے خود کو اذیت نہیں دینا چاہتی۔''

اس نے آنکھوں سے چشمہ اتار کر اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔

ہم ایسی ہی باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ شام اتر آئی۔ ہمارے درمیان اتنی باتیں ہوئی تھیں کہ ہمیں خود نہیں پتا چلا کہ ہم اپنی زندگی کے کیسے کیسے گوشے بے نقاب کرتے گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اس دوران دوپہر کا کھانا بھی کھایا اور کئی بار چائے بھی پی۔ بچی جس کا نام صدف تھا، بڑی خوبصورت تھی، ہمارے پاس کھیلتی رہی، میں نے جی بھر کر اسے پیار کیا۔ اس کی کافی تصاویر بنائیں۔ میں نے کیمرے والا موبائل خریدا ہی اس لیے تھا۔ جب میں واپس آنے لگا تو نرگس نے کہا۔ ''تم نے مقدس اور مجید کو اس راز میں شامل کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مقدس ایک نمبر حرافہ ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''یہ سارا محلہ کہتا ہے۔ میرے لیے ان کا راز داں ہونا بہت بڑی پریشانی ہے۔''

''اور مجید۔'' میرے لہجے میں ہکلاہٹ اتر آئی۔

''وہ ایک شریف انسان ہے۔ اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم نے خود بتایا کہ وہ دس سال سے اس راز سے واقف ہے۔ وہ لالچی بھی نہیں لیکن مقدس......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

"اب ان کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔" اس نے خودکلامی کی۔

میں پریشانی کے عالم میں وہاں سے اٹھ آیا۔ مقدس کا نام ہی مقدس تھا مگر وہ مقدس نہیں تھی، یہ بات میں اچھی طرح جان گیا تھا۔

مجھ سے بڑی غلطی ہو چکی تھی لیکن اب پچھتائے کیا ہونا تھا۔ اس رات میں بڑا پریشان رہا۔ کشور نے دو تین بار پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن میں ٹال گیا۔ میرے اندر دکھ پھیلتا رہا۔ پچھتاوا بڑھتا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے میں واپس گھر آ گیا تھا۔

☆......☆

مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو چکی تھی۔ یہ غلطی جلد بازی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اگر میں سیدھا نرگس کے گھر چلا جاتا تو یہ بہتر تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں خوامخواہ نرگس سے ڈرتا رہا کہ وہ نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ رہ رہ کر مجھے خود پر غصہ آتا، اور میں اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتا۔ اب اس راز سے کشور، مجید اور مقدس واقف تھے۔ ان میں مقدس پر اعتبار نہیں تھا۔ پہلے بھی نرگس کا میرے دل میں بہت مقام تھا لیکن اب مزید بڑھ گیا تھا۔ میں اس کو اب کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کو سب سے بڑا دکھ اس کے راز کا افشاں ہونا تھا۔ جو میں کر آیا تھا۔ لوٹ آنے کے بعد بھی ہر دوسرے تیسرے دن مجھے مقدس کا فون آ جاتا۔ وہ بڑی لگاوٹ کی باتیں کرتی۔ بعض باتیں اس کی ذومعنی بھی ہوتیں۔ میں زیادہ تر "ہوں، ہاں" ہی کرتا رہتا۔

"آپ بہت بدل گئے ہیں۔" وہ اکثر کہتی۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔" میں ہر بار جواب دیتا۔

"آپ کب آئیں گے۔" اس کی آواز میں دعوت ہوتی۔

"پتا نہیں۔" میں ٹال جاتا۔

"مجھ سے ملنے کو دل نہیں کرتا۔" لگاوٹ سے پوچھتی۔

"کیا کروں مصروف بہت ہوں۔" میں بہانہ بناتا۔

"کیا میں نرگس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوں۔ مجھ سے ملنے کو آپ کا دل نہیں کرتا۔" وہ ایک تیر سے دو شکار کرتی۔ یعنی خود کو پیش بھی کر رہی تھی اور نرگس کا نام لے کر بلیک میل بھی کر رہی تھی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" میں گول مول جواب دیتا۔

"اچھا اب کب آئیں گے پکا وعدہ کریں۔" وہ اصل مقصد کی طرف پلٹ آتی۔

"جلد نہیں آسکوں گا۔" میں ہر بار کہتا۔

اس نے مجھ پر باتوں کے بڑے تیر چلائے لیکن میں اب اس کے کسی بھی چکر میں آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایسے ہی دو ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں ایک بار صبح گیا اور شام کو اپنی بیٹی سے مل کر واپس آ گیا تھا۔ یہ سارا کریڈٹ موبائل کو جاتا تھا۔ جو اس نے اتنی آسانی پیدا کر دی تھی۔ نرگس نے میرے جانے کے بعد سب کچھ کشور کو بتا دیا تھا۔ کشور نے دوبارہ اب نرگس کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ اس بار نرگس نے کہا۔ "مجھے سب کے سامنے آنٹی کہا کریں۔ اور کشور کو بھابی۔ یہ ہی سب سے مناسب رشتہ ہے۔"

مقدس نے بھی میری بے رخی کو محسوس کر لیا تھا۔ اب اس کا انداز گفتگو بدل گیا۔ اس کے لہجے سے بغاوت کی بو آنے لگی تھی۔ میں اکثر اس کی کال اٹینڈ ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ بار بار کال کرتی رہتی۔ میں بعد میں معذرت کر لیا کرتا۔ آخر ایسا کب تک چل سکتا تھا۔ ایک دن اس نے اجنبی نمبر سے کال کی، میں نے کال اٹینڈ کر لی۔ سلام دعا کے بعد شکوے شکایت کرنے لگی۔ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ "میں بہت بزی ہوں۔ فری ہو کر کال کرتا ہوں۔"

"ایک منٹ کال بند نہ کیجیے گا۔"

"جی بتائیں۔"

"مجھے تھوڑے پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنا علاج کروانا ہے۔"

"اچھا میں جلد آؤں گا۔ کتنے پیسے لے کر آؤں۔"

"آپ نرگس کو کہہ دیں میں اس سے لے لوں گی۔ آپ جب آئیں اسے دے دیجیے گا۔"

یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ "خبردار۔ جو اس سے ایسی کوئی بات کی......" مجھے سمجھ نہیں آیا مزید اس سے کیا کہوں۔

"اچھا نہیں کرتی۔ آپ ناراض تو نہ ہوں۔" اس نے لہجے میں محبت سموتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک گھنٹے بعد کال کیجیے۔ میں پی سی او سے آپ کو کال کر رہی ہوں۔ ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ جاؤں گی۔" اس نے کہا۔

جیسے ہی کال ختم ہوئی میں نے موبائل ہی آف کر دیا۔ نئی سم خریدی اور مقدس کے علاوہ باقی جس جس کو نمبر دیا تھا سب کو نیا نمبر سینڈ کر دیا۔ ان دنوں سم خریدنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بس سم لیں اور لوڈ کروائیں۔ بہت بعد میں سم خریدنا مشکل ہوا۔ اب تو مخصوص تعداد سے زیادہ کوئی سمیں نہیں خرید سکتا۔ کہتے ہیں جو ڈر ہوتا ہے وہ ایک دن سامنے آ جاتا ہے۔ اب وہ ڈر سامنے آ چکا تھا۔ مجھے اس کا کوئی حل نہیں سوجھ رہا تھا۔ پہلے بھی مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔ اب سم بند کر کے میں نے ایک مزید غلطی کی لیکن اس وقت مجھے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

دوسری طرف میرے گھر والوں نے میرا اور ریحانہ کا رشتہ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

دس پندرہ دن بعد ہی نرگس کا فون آ گیا۔

"میں نے کہا تھا اس حرافہ کو اس راز میں شامل کر کے غلطی کی ہے۔ میرے ساتھ تم نے بھی دھوکا کیا ہے اور میں نے یہ دھوکا کشور کے کہنے پر کھایا ہے۔ اب اس عمر میں ذلت اٹھانے سے بہتر ہے میں خودکشی کر لوں۔ دھوکے باز۔"

اس کی بات سن کر میرا سر گھومنے لگا۔ آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ موبائل کو میں نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی بات کاٹ کر میں نے کہا۔ "ہوا کیا ہے مجھے صرف وہ بتاؤ۔" میرے لہجے میں نہ جانے کیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"آج مقدس مجھ سے پیسے مانگنے آئی تھی۔"

"وہ اس حد تک جائے گی میں نے سوچا نہ تھا۔" ایک لمحہ رک کر میں نے دوبارہ کہا۔ "نرگس اب وہ آپ کے پاس کبھی نہیں آئے گی بلکہ کسی کے پاس بھی نہیں جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے کال بند کر دی۔

نرگس کو میں نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن میں مقدس کو کیسے باز رکھوں گا اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

شام ہو رہی تھی اس لیے میں نے مقدس کو کال نہیں کی۔ سوچا مجید اس وقت گھر آ چکا ہوگا یا مجید کا چھوٹا بھائی۔ ایسے ہی کروٹ بدل بدل کر رات کاٹی اور ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ یہ ایسی عورت نہیں تھی کہ ایک بار پیسے لے کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتی۔ اس کے ہاتھ نرگس کی کمزوری آ چکی تھی اور وہ بہت زیادہ چالاک عورت تھی۔ اسے خوف دلا کر بھی قابو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں پچھتا تا رہا کہ مجھے پرانی سم بند نہیں کرنی چاہیے تھی اسی غلطی کی وجہ سے اس نے نرگس سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا مقصد مجھ تک اپنا پیغام پہنچانا تھا جس میں وہ کامیاب رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا اس نے دونوں طرف سے بلیک میل کرنے کا ارادہ بنایا ہوا۔ میں کسی بھی قیمت پر نرگس کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کو دکھ دینے کا مطلب اپنی بیٹی کی زندگی برباد کرنے کے مترادف تھا۔ وہ ناجائز اولاد کہلاتی۔ انہی دنوں انڈیا کی ایک فلم بنی تھی اس نے بہت بزنس بھی کیا تھا۔ اس کا ہیرو ناجائز اولاد ہوتا ہے۔ اس کے اسے جو زمانے سے طعنے ملتے ہیں۔ میں وہ سوچ کر اندر سے کانپ گیا۔ نہیں میں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے نرگس کی طرف بڑھنے والے ہر الزام کو روکنا میری ذمہ داری تھی۔ چونکہ اس کا سبب بھی میں ہی تھا۔ دوسرے دن دس بجے میں نے مقدس کا نمبر ملایا دوسری تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"ہیلو۔ کون۔" اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"میں ماجد بول رہا ہوں۔" میری آواز سن کر وہ رونے لگی۔ "آپ نے مجھ سے رابطہ ہی ختم کر دیا۔ میں نے اتنا آپ کو یاد کیا۔ آپ کو علم ہی نہیں میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔" اسے کال کرنے سے پہلے میں نے کچھ اور سوچا تھا لیکن اس کی یہ بات سن کر میں نے فیصلہ بدل لیا۔ "میں شدید بیمار تھا۔"

"کیا ہوا تھا آپ کو۔" اس کی آواز میں تشویش و ہمدردی تھی۔

میں نے بتایا۔ "دل میں کوئی مسئلہ تھا۔ اب بہتر ہوں۔"

"میری یاد کیسے آئی۔"

اس کی آواز میں شکوہ تھا، طنز تھا، سرشاری بھی تھی۔ یہ سرشاری مجھے بتا رہی تھی کہ اس نے میری بات پر کتنا یقین کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے نرگس نے ہی کال کی ہوگی کیونکہ کل ہی تو وہ نرگس سے مل کر آئی تھی۔

شمارہ فروری 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش آپ کا انتخاب

☆ اول: بری عورت......ندیم احمد......(کراچی)

☆ دوم: سبق......غلام رضا جعفری......(کراچی)

☆ سوم: فین......تہمینہ درانی......(لاہور)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"آ جائیں آپ کے دوست کا گھر ہے۔"
"نہیں میں صرف تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اس ملاقات کا مجید کو بھی علم نہ ہو۔"
"اتنی باپردہ ملاقات۔"
"ہاں تم بہت یاد آتی ہو۔ میں گزرے وقت کو دوبارہ گزارنا چاہتا ہوں۔"
"کل کال کیجیے گا میں کچھ سوچتی ہوں۔"

اس کے بعد اس سے کافی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں لیکن نرگس کی نہ اس نے بات کی نہ میں نے کی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر میں نے اس کو دوبارہ کال کی۔ سلام دعا کے بعد میں نے پوچھا۔ "جی کیا سوچا پھر۔" میں نے اشتیاق لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔
"دو دن کے لیے چھٹی مل سکتی ہے۔ جہاں دل چاہے آ کر لے جائیں۔"
"گڈ۔ میں کل پھر اسی وقت کال کروں گا۔ اپنے آنے کا دن بتاؤں گا۔"

اس کے بعد بیلنس ختم ہونے تک ایسی باتیں ہوتی رہیں جن کا مقصد.. ایک دوسرے کو یقین دلانا تھا کہ وہ مجھ سے میں اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں ایسا کیا جادو کرنے جا رہا ہوں جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ میں نے سوچا اسے اپنے محبت کے جال میں پھنسا لیتا ہوں۔ کچھ پیسے بھی خرچ کر دوں گا۔ وہ ایسی ہی عورت ہے۔ اسی ہتھیار سے مارتے ہیں۔

میں نے فیصل آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ مگر ٹھہرنے کے لیے ہوٹل کو صحیح سمجھا۔ یہ سب سے بہتر تھا۔ دوسرے دن میں نے مقدس کو بتا دیا کہ اس سوموار کو صبح دس بجے وہ تیار ہو کر بس اڈے پر پہنچ جائے۔ میں وہاں سے اس کو لے لوں گا۔

☆.....☆

مری کا موسم بڑا خوشگوار تھا وہ مجھ سے ملنے خود ہی ہوٹل آ گئی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی مقدس کو سمجھا سکوں کہ وہ نرگس کو آئندہ بلیک میل کرنے کا ارادہ ترک کر دے لیکن اس کے دلائل ایسے تھے کہ میں نے سمجھ لیا یہ کسی بھی صورت نرگس کو بلیک میل کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ وہ کہتی۔ "اس نے اتنی دولت کیا کرنی ہے۔ اب بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس نے تمہیں بھی تو استعمال کیا تھا۔ مجھ سے زیادہ اس کی کیوں فکر ہے۔ وغیرہ۔" اس کی باتوں نے مجھے غصہ دلا دیا لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لیے باہر نکلنے کا پلان بنا کر اٹھ گیا۔ اس سے کہا کہ چلو لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔

وہ میرے ساتھ کار میں آ بیٹھی۔
ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے کہا۔
"مقدس میں ایک خاص مقصد لے کر یہاں آیا تھا کہ تم کو سمجھاؤں گا کہ تم ہمیشہ کے لیے اس بات کو بھول جاؤ گی کہ نرگس کے کسی راز کا تمہیں علم ہوا تھا۔"
"ماجد تمہارا کیا جاتا ہے۔ اس کے پاس بہت دولت ہے۔ کچھ میرے کام آ جائے گی۔ دیکھو میں سسک سسک کر غربی میں نہیں رہنا چاہتی۔"
"جتنے پیسے چاہیے مجھ سے لے لو ایک ہی بار۔" میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔
"میں زندگی میں شاید ہی اپنا خرچ کر پاتی۔ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ میرے پاس نرگس کی ایک کمزوری ہے جو تمہاری بھی کمزوری ہے ورنہ تم مجھے پیار تو نہیں کرتے۔" اس نے پورا سچ بولا لیکن مجھے بہت برا لگا۔
"میں یہ چاہتا ہوں اب نرگس اس عمر میں بدنام نہ ہو۔" میرے لہجے میں تلخی تھی۔
"میں کب چاہتی ہوں ایسا ہو۔" اس نے رک کر کہا۔ "اس کی اسے قیمت ادا کرنا ہوگی۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا، مجھے اس کی آنکھوں میں لالچ نظر آیا۔
"قیمت مجھ سے لے لو۔"
"کتنے پیسے دے سکتے ہو کیونکہ مجھے اپنا گھر بنانا ہے میں نرگس کی طرح شاہانہ زندگی چاہتی ہوں۔"
"اپنے میاں کو کیا بتاؤ گی کہ اتنے پیسے کہاں سے آئے۔"
"اسے سب سچ بتا دوں گی کہ نرگس کو بلیک میل کیا ہے۔ پیسے کیسے برے لگتے ہیں"
"کیا تم اب بتا کر آئی ہو۔"
"اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔ میں نے کہا ہے اسے بتا دوں گی کہ نرگس سے لیے ہیں۔ راز کی قیمت۔"
میں نے مقدس کو پیسے دینے چاہے۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا۔
"اپنے پاس ہی رکھیں۔ اگلی بار لے لوں گی۔ میں

بینک میں اکاؤنٹ کھول لوں۔ آپ سے ملنے والے پیسے میں مجید سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔"
"اچھا جیسی تمہاری مرضی۔"
"آپ صرف دو ہزار دے دیں تاکہ میں بینک میں اکاؤنٹ کھول لوں۔"
میں نے اسے دو ہزار دے دیئے۔ وہ چلی گئی۔ اگلے دن میں لوٹ آیا۔

اس دوران کئی بار خیال آیا نرگس کی عزت پہ حرف نہ آئے چاہے اس کے لیے قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہر بار سوچا ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن ہر بار دوسری سوچ نے ڈٹ جانے کا کہا۔

مجھے ہر صورت وعدہ نبھانا ہے۔ وہ وعدہ جو بہت پہلے نرگس سے کیا تھا۔ دراصل مجھے اپنی بیٹی کا مستقبل برباد ہونے سے بچانا ہے اور ہر صورت بچانا ہے۔ اب کوئی صورت نہیں رہی جس طریقے سے اسے سمجھایا جا سکتا۔ مقدس کے دل و دماغ پر ہوس نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس پر اب کوئی دلیل اثر نہیں کرتی تھی۔

پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ یہ عورت نہیں مجسم لالچ تھی۔ اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ میں اسے پیسے دے بھی دیتا تو بھی اس کا پیٹ بھرنا مشکل تھا پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ہم ایک پل سے گزر رہے تھے۔
"یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔"
چند کلومیٹر آگے ایک ہوٹل ہے اس کی لوکیشن بہت اچھی ہے۔
میں نے مقدس کو دیکھا اس کی آنکھوں میں تفکر کی گہری لکیریں تھیں۔

مجھے کچھ کچھ راستوں کا علم تھا۔ میں اسے اسی طرف لے کر چل پڑا جس طرف پہلے بھی جا چکے تھے۔ شہر سے باہر نکل کر ہائی وے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں سڑک کنارے ایک پل سے پہلے میں نے کار روک دی۔ دور دور تک ویرانہ تھا۔ یہ جگہ بہت مناسب تھی۔
"یہاں کار کیوں روک دی۔"
"انسان آزادی چاہتا ہے اور کمروں میں قید کر لیتا ہے خود کو۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے پیار کرتے ہیں۔"
وہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے۔ دھند اور موسم سرد تھا۔
"باہر تو بڑی سردی ہو گی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔
ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف چل پڑے۔ دو ٹیلے کراس کرتے ہوئے اس کی سانس پھول چکی تھی۔

سردی سے ہمارے جسم کانپ رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ سردی کا احساس جاتا رہا۔ اتنے سرد موسم میں جوان جسم کی قربت کیا گل کھلاتی ہے وہی جان سکتا ہے جو ایسے حالات سے گزرا ہو۔ دس پندرہ منٹ بعد میں نے جیب سے ڈوری نکالی اور اس کی گردن میں ڈال دی۔ ہماری پوزیشن ایسی تھی کہ ٹیلے کی طرف اس کا منہ تھا اور میں اس کی پشت پر تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے رسی کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ اس نے پورا زور لگا کر خود کو سیدھا کرنا چاہا۔ اس کا چہرہ میرے بالکل سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھیں حسرت اور تعجب سے پھیل گئی تھیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس نے رسی کو پکڑنا چاہا لیکن اب رسی گردن میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ میں نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی حل نہیں تھا۔ اس کو میں نے بہت سمجھایا تھا۔ بہت منایا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں پر دل و دماغ پر دولت کی ہوس نے پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت میری عزت کو ڈس سکتی تھی۔ میری بیٹی کو علم ہوتا کہ وہ ناجائز اولاد ہے تو اس پر کیا بیتتی۔ نرگس پچاس سال کی عمر میں الگ بدنام ہو جاتی۔ کتنے گھر اجڑ جاتے۔ اس کا انجام ایسا ہی ہونا تھا ایک نہ ایک دن تو آج ہی کیوں نہیں۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ اب اس کی تڑپ میں کمی آتی جا رہی تھی۔
میری آنکھوں کے سامنے ایک کے بعد ایک کئی منظر گزر گئے۔

جب پہلی بار وہ مجھے ملی تھی۔ میں ان کے گھر گیا تھا۔ اس کی شوخی تیزی طراری پھر اس کا خود ہی مجھے دعوت دینا۔ اس کے ساتھ گزارے حسین لمحات جن میں بے شک اپنی اپنی غرضیں چھپی تھیں لیکن وہ لمحے حقیقی تھے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اس کا جوش و خروش اور اب بے جان ساکت جسم۔ بڑا خوبصورت بھرا بھرا جسم تھا اس کا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ جب میں اسے ایک گڑھے میں پھینک رہا تھا میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل گھبرا رہا تھا۔ اس کے بعد میں وہاں کھڑا نہیں ہوا۔ کار تک پہنچنے میں چند منٹ لگے۔ واپسی پر میں سڑک کے کنارے اس کی ہر ایک چیز

پھینکتا رہا۔ رات دس بجے میں اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔

سارا سفر میں نے خود سے جنگ میں گزار دیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

دوسری صبح بیدار ہوا تو مجھے بخار تھا۔ علاج ہوتا رہا۔ میں خود سے جنگ میں مصروف رہا۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو میں نے قتل کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں جن میں حیرت تھی۔ مجھے سونے نہ دیتی۔ نیند کی گولیوں نے سہارا دیا۔ ایسے ہی ایک ماہ گزر گیا۔ میں پابندی سے بڑی باریک بینی سے اخبار پڑھتا رہا لیکن کہیں بھی اس قتل کا ذکر نہیں آیا۔

☆......☆

بارہ برس گزر گئے۔ میری شادی ہوگئی۔ بچے ہوئے۔ بالوں میں چاندی اتر آئی۔ میں نے واپس پلٹ کر نرگس کی اور نہ ہی صدف کی خبر لی تھی۔ فیصل آباد سے واپسی کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی سے انہیں بالکل خارج کر دوں گا۔ بھول جاؤں گا۔ کبھی نام نہ لوں گا لیکن اس کے باوجود ایسا کر نہ سکا۔ خود ہی تڑپتا۔ خود کو خود ہی سمجھاتا۔ اللہ نے جب مجھے بیٹی دی میں نے اس کا نام مقدس رکھا۔

میں بہت سی غلطیاں کر چکا تھا لیکن مزید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان غلطیوں کا ماتم کر کے اپنی رسوائی میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بیٹی کی محبت کو سینے میں دفن کر دیا تھا اور ان گڑے مردوں کو دوبارہ اکھاڑنا مناسب بھی نہیں تھا۔

ایک صبح جب میں اسٹور پر بیٹھا تھا۔ دن کے دس گیارہ بج رہے تھے۔ ایک اجنبی شخص دکان میں داخل ہوا۔ میں.... یہ سمجھا گاہک ہے لیکن اس نے سیلز مین سے میرا نام پوچھا تو سیلز مین نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ اس نے سلام کیا اور بتایا۔

"میرا نام شفیق ہے۔ میں فیصل آباد سے آیا ہوں۔"

میرے اندر رنگین و سنگین لمحات کے ساتھ ہی مقدس کا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ میں اندر سے لرز گیا۔ میں اٹھ کر اسے ملا۔ اسے پانی پلایا۔ اس نے ایک شادی کارڈ مجھے تھما دیا۔ میں نے کھول کر دیکھا۔

میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے کارڈ کو سینے سے لگا لیا۔

صدف کی شادی کا کارڈ تھا۔ میری بیٹی کی شادی ہونے جا رہی تھی۔

"فضل دین کا کیا حال ہے اب۔" نرگس کے خاوند کا نام فضل دین تھا۔

"ان کو تو فوت ہوئے تین سال گزر گئے۔"

"اور نرگس۔"

"بی بی نرگس اللہ کا شکر ہے سلامت ہیں۔ انہوں نے ہی بھیجا ہے۔"

بعد میں شفیق نے بتایا کہ کبھی بچپن میں اسے میں نے پچاس روپے دیے تھے۔ جو اس کی امی نے اس سے لے لیے تھے۔ وہ اللہ دتہ کا بیٹا تھا۔ اللہ دتہ نرگس کے گھر میں کام کرتا تھا۔ اس کا بیٹا میرے سامنے بیٹھا تھا۔

"بابا اللہ دتہ۔" میں نے ایک بار پھر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"انہیں اللہ کو پیارے ہوئے ایک سال ہی ہوا ہے۔ اب میں ہی سب کام کرتا ہوں۔"

"صدف کیسی ہے۔"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"کہاں ہو رہی ہے اس کی شادی۔"

"اس کے میاں پولیس میں انسپکٹر ہیں۔ ابھی نئے نئے انسپکٹر بنے ہیں۔ بی بی کے رشتے دار ہی ہیں۔ ان کا گھر لاہور میں ہے۔"

میں نے شفیق کو کھانا کھلایا۔ دوپہر کو وہ واپس چلا گیا۔ دس دن بعد شادی تھی۔ شادی کے دن میں سیدھا میرج ہال جا پہنچا۔

میرج ہال میں کافی رش تھا۔

مہمان ابھی تک آ رہے تھے۔ ان میں میرے جاننے والا کوئی نہ تھا۔ میں اسٹیج کے سامنے والی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ دولہا دلہن نے آ کر اسٹیج پر بیٹھنا تھا۔ میں آنے والے مہمانوں کو دیکھتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ نرگس بھاگی بھاگی پھر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے ہر حال میں خود کو سمیٹ کر رکھنا تھا۔ اسی وقت شفیق نے مجھے دیکھ لیا۔ "آپ کب آئے۔"

"ابھی آیا ہوں۔"

"بی بی نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں ان کو بتایا جائے۔ میں ابھی آیا" کہہ کر وہ چلا گیا۔

میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ نرگس کو میری آمد کا علم ہوا تو وہ فوراً میرے پاس آگئی۔ میرے پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ اب پہلے سے زیادہ موٹی، عمر رسیدہ تو ہو ہی چکی تھی لیکن پہلے سے کہیں زیادہ خوش اور مطمئن دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر ایک تقدس کا جیسے ہالہ تھا۔ اسے بارہ تیرہ برس بعد دیکھ کر میرے اندر اس کے احترام کا جذبہ امنڈ رہا تھا۔ کوئی ایسی چیز اس میں تھی جو اس کے سامنے باادب بنا دیتی تھی۔ میں جب سے آیا تھا تب سے دیکھ رہا تھا وہ سب سے اخلاق سے پیش آ رہی تھی۔ سب اس کا احترام کر رہے تھے۔

"کیسے ہیں آپ؟ کب پہنچے؟" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تھوڑی دیر قبل پہنچا تھا۔"

برات آگئی۔ کھانا چنا جانے لگا۔ میں نے دیکھا دولہا کافی خوبصورت تھا۔ سانولا رنگ، لمبے قد کا۔ مسکراتا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی تھی۔ چہرے پر ایک بے نام سا رعب تھا۔ اس کی شاید وجہ اس کا پولیس میں ہونا تھا۔ چوڑے ماتھے پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اتنا اچھا جیون ساتھی صدف کو ملا تھا۔

میں، نرگس اور امجد صاحب کار پر نرگس کے گھر گئے صدف کو لانے کے لیے۔ میں صدف کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میرے تصور میں وہی دس سال کی صدف تھی جو لان میں مجھ سے کھیلتی رہی تھی۔ بس اس سے پہلے زندگی میں ایک ہی بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب یہ دوسری اور شاید آخری ملاقات تھی۔ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتا رہا۔ اچانک محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے اور وہ اس پانی میں ڈوبتی جا رہی ہے۔ وہ خوش تھی اس کی چند سہیلیاں اسے تیار کر کے ہمارے پاس لے آئی تھیں۔ مجھے تو یہ احساس ہی ختم ہو گیا کہ میں کہاں ہوں، کس کے ساتھ آیا ہوں، کس کام سے آیا ہوں۔ میرے آنسو بہتے جا رہے تھے۔

نرگس صدف کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ بار بار اسے اپنے گلے سے لگا رہی تھی۔ اسی وقت اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے نہ جانے صدف کو کیا کہا۔ اندازہ ہے یہ ہی کہا ہوگا کہ یہ تمہارے بچپن کے استاد ہیں۔ صدف مجھے غور سے دیکھنے لگی لیکن میری آنکھوں میں اترے پانی میں دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ اسی وقت نرگس نے مجھے پکارا۔ "ماجد۔ صدف سے مل لیں۔ اسے یہاں ہی الوداع کر دیں۔ وہاں تو بہت رش ہوگا۔"

میں نے اسے گلے لگا کر ماتھا چوم کر الوداع کر دیا۔ باقی شادی کے سارے مرحلے کیسے طے ہوئے مجھے علم نہیں۔ شام کو ہم واپس نرگس کے گھر آئے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔ اس کھو جانے پر بھی نرگس بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

بہت سے مہمان شام کو ہی الوداع ہونے لگے۔ دوسرے دن میں بھی واپس جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا کہ نرگس میرے پاس آگئی۔ "آپ جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"شفیق آپ کو چھوڑ آئے گا۔"

میں نے نرگس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "آپ بہت بدل گئی ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں میں اب کسی بھی قسم کی تمنا کا کوئی بھی جال نہیں تھا اور نہ ہی چاہت کی کوئی لکیر تھی۔

کہنے لگی۔ "مجید۔ انسان اس دنیا میں آتا ہے، جاتا ہے، اس آنے اور جانے کے درمیانی وقفے کو انسان ایسے سمجھ لیتا ہے جیسے اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اس دنیا کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب گناہ، ثواب، بدنما داغ، خوبصورت ذائقہ، طہارت، گندگی۔ غلط اور صحیح سب کا علم ہو جاتا ہے اس وقت، بہت سا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ تب صرف پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ اب اس کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ اسے ایسی ہی باتیں کرنی چاہیے تھیں۔ میں نے سر تو جھکا لیا تھا لیکن گریبان میں جھانکنا نہیں چاہتا تھا۔ صرف ایک لمحے کو معمولی سی نظر پڑی تو میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھ میں اب ہمت نہ تھی اس کی مزید باتیں سنتا۔ میں نے بات کو بدلنا چاہا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن کیا کریں جینا بھی تو ہے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب ایسی زندگی جیو جیسی جینا چاہتے ہو۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ اس سے ہی معافی مانگو۔ وہ معاف کر دے گا۔ یاد رکھو گناہ کی بہت سی اقسام ہیں۔ کسی کا دل دکھانا بھی ایک گناہ ہے لیکن کسی کو جان سے مار دینا یہ گناہ سب سے بڑا گناہ ہے۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی کہ شاید میں کچھ

کہوں۔ میں خاموش ہی رہا۔ میرے پاس کہنے کو تھا ہی کیا۔

"دنیا میں ہی جنت ہے اور دنیا... میں ہی جہنم ہے۔ انسان اپنی جنت اور دوزخ اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ ساری عمر کی کمائی نیکی ساری عمر کی کمائی بدی۔ میں ہر وقت اللہ کے آگے گڑگڑاتی ہوں تم بھی گڑگڑا لیا کرو، معاف کرنے والا وہ خود ہے۔ نکاح سے پہلے میں نے نکاح خواں کو سمجھا دیا تھا کہ صیغہ میں تمہارا نام لے۔ اس سے یہی کہا تھا کہ فضل دین کا اصل نام ماجد ہے اس لیے نکاح کے وقت ماجد کہا جائے فارم میں فضل دین لکھا جائے۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں کیا تھا میں کانپ کر رہ گیا۔

"گناہ کے مرتکب ہم دو تھے۔ صدف معصوم ہے اسے سزا کیوں دی جائے۔" پھر اس نے رک کر سانس لیا اور بولی۔ "سب سے افضل نماز ہے۔ اس کی پابندی کرلیں۔ یہ میری آخری خواہش سمجھ لیں اور ہر وقت اللہ سے معافی مانگتے رہیں۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

اس نے باقاعدہ طور پر ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔

"مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ میں چاہتی ہوں اللہ تمہیں معاف کردے۔ اللہ مجھے معاف کردے۔" اس نے چشمہ اتار کر پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور آنکھوں پر چشمہ پھر چڑھا لیا۔ سکون اس کی آنکھوں میں اس کے لہجے میں براجمان تھا جبکہ میرے اندر بے سکونی کروٹیں لینے لگیں تھی۔

پھر مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں نے نرگس کو آخری سلام کیا اور اٹھ آیا۔

دوسری گلی میں مجید کا گھر تھا۔ اس گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم رک سے گئے۔ مجید کس حال میں ہوگا۔ اس نے اپنی بیوی کو تلاش تو کیا ہوگا۔ دروازہ بند تھا۔ میں گزرتا چلا گیا۔ میں گھوم کر کشور کے گھر میں آیا۔ برسوں بعد اس دروازہ پر دستک دی۔ کشور گھر میں ہی تھی۔ ایک پندرہ سولہ سال کے بچے نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ تھوڑی دیر بعد میں اور کشور آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اس کی بیٹی چائے بنانے چلی گئی۔ "آپ تو بہت بدل گئے ہیں۔"

"آپ بھی۔"

"وقت ہر چیز کو بدل دیتا ہے۔"

"کیسے آنا ہوا ہمارے شہر۔"

"صدف کی شادی تھی کل۔"

"اچھا۔"

"اپنا ہاتھ نہیں دکھاؤ گے۔"

"نہیں۔"

"یاد ہے وہ جو میں نے کہا تھا۔"

"ہاں سب یاد ہے لیکن تمہاری کوئی بھی بات سچ ثابت نہیں ہوئی۔ نہ ہی علم حاصل کرسکا ہوں اور نہ ہی محبت ملی ہے کوئی اور نہ ہی۔"

وہ مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پر آج بھی مسکراہٹ بہت سجتی تھی اور اس کی مسکراہٹ مجھے آج بھی زہر ہی لگی۔

"میں کچھ نہیں کہوں گی۔ بس یاد رکھنا پچیس سال قبل جب تم یہاں آئے تھے تب بھی میں تمہاری اچھی دوست تھی آج بھی ہوں۔"

"یہ بات تو میں مانتا ہوں۔" اس کا بیٹا جو دکان سے بسکٹ لانے گیا تھا اپنی بہن کو دینے کے بعد ہماری طرف آرہا تھا۔ میں نے کشور کی روشن روشن آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔ "وہ سب بھی مانتا ہوں جو تم نے کہا تھا۔"

اس کا بیٹا ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کشور نے بیوی بچوں کا پوچھا۔ میں نے چائے پی۔ اجازت طلب کی اور وہاں سے چل پڑا۔ کشور کا بیٹا مجھے اسٹور پر چھوڑ گیا۔ ایک گھنٹا میں نے وہاں گزارا۔ خالد بھی بوڑھا ہو چکا تھا۔ ماضی کو یاد کرکے وہ خوش ہوتا رہا۔

گھر آکر میں نے اپنا محاسبہ کرنا شروع کردیا۔ دن مہینے سال گزرتے گئے۔ کئی موڑ آئے زندگی میں۔ اب میں زندگی کے اس موڑ پر ہوں دنیا کی بجائے آخرت کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں اپنے محاسبے کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ اس کے بعد میں نہ ہی صدف سے کبھی ملا اور نہ ہی نرگس کا نام لیا لیکن مقدس روز میرے خیالوں میں چلی آتی ہے۔ اسے بھول نہ سکا۔ شاید بھول ہی نہ پاؤں گا اور یہ بات بھی بھول نہیں سکتا کہ ہاتھ کی لکیریں سچ کہتی ہیں، بس کوئی پڑھنے والا ہو۔